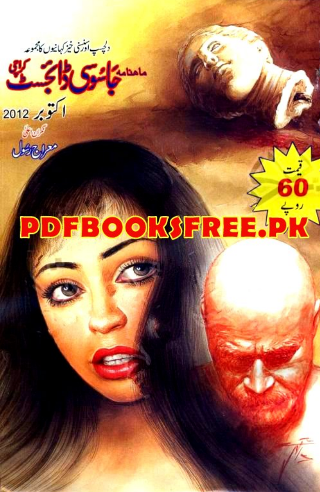

PDFBOOKSFREE.PK

11 — چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں، نامہ و پیام کی محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

18 — بہروپ کا راجا — احمد اقبال
رفاقتوں اور رقابتوں کے جال... رفتہ رفتہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جارہے تھے...

61 — معصوم قاتل — عبد القدیر
ایک پسندیدہ شخص کو خوش کرنے کے لیے کی گئی ناخوش گوار کوششیں

69 — چھٹیوں کا تحفہ — سیرینا راض
مغربی باشندوں کی ایک اور خوبی... جو زندگی کے سب رنگ دیکھ لینا چاہتے ہیں

85 — بھروسا — تنویر ریاض
بے اعتبار و بے اعتماد فضاؤں میں سانس لیتی ایک سنسنی خیز کہانی

96 — للکار — طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر بکھرے ہوئے شخص کی جدوجہد... اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

139 — دوسرا شکار — بابر نعیم
اپنے ہی تیر سے شکار ہوجانے والے شکاری کا ناہموار کھیل...

جلد 42 • شمارہ 09 • اکتوبر 2012 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

149 — بے ساختہ — مریم کے خان
اس شخص کا المیہ جس سے اچانک ہی ایک جرم سرزد ہوگیا تھا

161 — سرپرائز — سلیم انور
ایک چونکا دینے والے اختتام سے مزین...... جرم اور محبت کا انوکھا انجام

164 — گرداب — اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

199 — آخری ڈنر — مختار آزاد
ایک خوبصورت و پرخلوص زندگی کا پروردہ.. جس کی زندگی ایک پل میں ختم ہوگئی

215 — موسیقی کی مار — منظر امام
دلوں دماغ کو جھنجوڑ دینے والے شور و ہنگامے... استاد محترم کے نئے کارنامے

220 — آفت ناگہانی — سرور اکرام
وطن کے رکھوالوں کا گھناؤنا کھیل جو اپنے وطن کو رہن رکھنے کے درپے تھے...

253 — تاریخ کا انتقام — کاشف زبیر
ایک ستم گزیدہ خاندان کی داستان جس کے مکینوں کی تعداد لمحہ بہ لمحہ کم ہورہی تھی...

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
[illegible] جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدیر اعلیٰ

چینی کی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اکتوبر 2012ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے... اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یوم عشقِ رسول ﷺ پر بعض شہروں میں ہونے والے واقعات نے پوری قوم کا سر شرم سے جھکا دیا... سامنے کی بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں تشدد کا عنصر بہت تیزی سے سرایت کرتا جا رہا ہے... تحمل... برداشت اور رواداری کے جوہر ناپید ہو رہے ہیں... ہر قومی اور بین الاقوامی اختلاف پر تشدد آمیز اظہار گویا ہمارا مزاج بنتا جا رہا ہے۔ صرف طاقت ہی کو احتجاج کا مظہر سمجھ لیا گیا ہے۔ ہزاروں میل دور بیٹھے کچھ ملعون ایک شرارت کرتے ہیں، ردِعمل میں ہم اپنا سراپا خود لہولہان کر لیتے ہیں، اپنے اصل مجرموں کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ وہ ہمارے دین اور ہمارے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے چین کی بانسری بجاتے رہتے ہیں، ان کے حکمران آزادیٔ اظہار کے خود ساختہ اور نام نہاد اصول کی آڑ میں ان کی سرپرستی کرتے ہیں، یہاں بہت سے گھرانوں کے چراغ گل کر دیے جاتے ہیں، قومی اور نجی املاک کو کھنڈر کر دیا جاتا ہے... یوں ہم نادانی میں ان ہی کے شیطانی مشن کی تکمیل کرتے ہیں... یہ سیاسی، سماجی یا مذہبی رہنماؤں کی ذمے داری ہے کہ وہ کھلے الفاظ میں جوشیلے جوانوں کو یہ سمجھائیں کہ وہ نادانی میں اپنے دین کے دشمنوں کے آلۂ کار نہ بنیں ورنہ ہمارے دشمن دور سے یوں ہی مشتعل کر کے ہمیں، ہمارے ہی ہاتھوں برباد کراتے رہیں گے۔

اِن دگرگوں حالات اور بدترین صدمے کی حالت میں ایک اچھی خبر قارئین کی نذر ہے... بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ امن و امان اور انسانی جانوں کی سفاکانہ پامالی کے باوجود اس خطے میں ذہنی تعمیر کا عمل جاری و ساری ہے۔ حاجی طالب دین کے فرزند عبیداللہ نے ترکمانستان کے شہر اشک آباد میں منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی آئی ٹی مقابلے میں برطانیہ، جرمنی، کینیڈا اور بھارت سمیت 45 ممالک کے شرکا کے مقابلے میں اپنے پی بوٹ نامی پروجیکٹ پر ہارڈویئر کا گولڈ میڈل جیت کر پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ 45 ممالک کے طلبا نے اس مقابلے میں 150 پروجیکٹ پیش کیے تھے جن میں عبیداللہ نے اول پوزیشن حاصل کی... شاباش عبیداللہ! ایسے ہی ہونہار اور ذہین نوجوانوں سے پاکستان کا تابناک مستقبل وابستہ ہے۔

پچھلے شمارے میں ہم نے اپنی ناگزیر مجبوریوں کے ضمن میں بہت بوجھل دل کے ساتھ قیمت میں اضافے کا اعلان کیا تھا۔ ہمارے قارئین ہماری توقع سے زیادہ فراخ دل ثابت ہوئے، متعدد فون کالز اور خطوط میں ادارے اور پرچوں سے جس والہانہ وابستگی کا اظہار کیا گیا... اس کے لیے ادارہ دل سے اپنے قارئین کا مشکور ہے۔

ان خوشگوار و ناخوشگوار حقائق سے نظریں چراتے ہوئے اپنی محفل میں چلتے ہیں... جہاں یقیناً دل کو خوش کر دینے والے تبصرے ہمارے منتظر ہوں گے...

ڈاکٹر نعیم اکبر سحر، مانسہرہ سے اظہارِ خیال کرتے ہیں "6 ستمبر کو جاسوسی نے پورے ایک ماہ بعد دوبارہ دیدار کا موقع دیا۔ کتنے چکر لگائے، کتنے بک اسٹالز سے پتا کیا، کتنے فون کیے، کون کون بھیجا گیا، یہ ایک داستانِ عشق ہے۔ خطوط کی محفل میں عاشقانِ جاسوسی اکثر اس داستان کو دہراتے نظر آتے ہیں۔ بہرحال سرورق کے لیے خاتون دستیاب نہ تھی سو ڈاکر انکل نے گولڈن کیٹ سے کمی کو پورا کر دیا۔ صنف وجاہت کی وجاہت نے کافی متاثر کیا۔ سرسری نگاہوں سے دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ پورے چھ اشتہارات کو کراس کر کے دیدہ زیب فہرست کو دیکھا اور چینی ہٹکہ چکی میں جا کر دم لیا۔ انکل! آپ نے دوبارہ ہم قارئین کی دم کے ساتھ 10 روپے اضافے کا پٹاخہ باندھ دیا۔ لگتا ہے آپ بھی حکومت کی پالیسی سے متاثر ہیں۔ ہم عوام تو ازل سے "بے چارے" ہیں۔ یقیناً آپ کو علم ہے کہ مجبوری کا نام شکریہ لہٰذا ہم بھی آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، قبول فرمالیں۔ جزاک اللہ خیراً۔ سرمد مشتاق صاحب! ہمارے آبا کی سرزمین سے حاضر ہوئے اور اپنے مفصل تبصرے کے ساتھ اول نمبر پر براجمان ہوئے۔ محمد اسماعیل اجاگر صاحب شاید مشہور مصنف طارق اسماعیل ساگر سے کافی متاثر ہیں۔ برادرم! متاثرین میں تو ہم بھی شامل ہیں مگر آپ والا درجہ ہمیں نصیب نہ ہو سکا۔ یہی کہہ سکتے ہیں کہ نصیب اپنا اپنا۔ آپ کی بات سے مکمل اتفاق ہے کہ ڈاکر انکل کے ہاتھ میں وہ ذائقہ نہیں رہا جوان کا خاصہ ہے۔ تفسیر عباس بابر، ہماری بزم کے سینئر ہیں۔ اسی سینیارٹی کی بنیاد پر تمام دوستوں سے پنگا لیتے رہتے ہیں۔ آپ کا تبصرہ بھی پنگا نامہ تھا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی مزے دار تھے۔ کہانیوں کی بسم اللہ کاشف زبیر کے مکڑ جال سے ہوئی۔ یہودیت اپنے زہریلے وجود کا تعارف کرا رہی تھی۔ امتِ مسلمہ کو توڑنے، کمزور کرنے اور بالآخر نیست و نابود کرنے کے لیے یہودی کتنے اخلاص سے اور کتنے عرصے سے سرگرم ہیں، مکڑ جال نے سب کو عیاں کر دیا ہے۔ یہودی جہاں پر بھی ہے صرف یہودی ہے۔ اپنے کاز سے مخلص ہے۔ اپنے لیے یہودیوں کی یہی پالیسی ہے۔ مسلمان کو مسلمان نہیں چھوڑنا، فرقوں میں تقسیم کرنا، اخلاص کی دولت سے محروم مسلمان، یہ پالیسی مسلمانوں کے لیے یہودیت نے تیار کی۔ وہ اپنی پالیسی کی بنیاد پر کتنے کامیاب ہوئے، ہم سب ماشاء اللہ اپنا احتساب کر کے معلوم کر سکتے ہیں۔ سلیم انور صاحب، آخری تصویر مکمل تفسیر تھی کہ ادلے کا بدلہ یا جو بوؤ گے، وہی کاٹو گے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کا شاہکار للکار، للکارتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے کہ کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ مغل صاحب کی اکثر کہانیوں میں پاکستانی ہیرو کو انڈیا کے انڈر ورلڈ کا کوئی غنڈا ڈان ٹکراتا ہے۔ مغل صاحب کی سلسلے وار تحریروں کو سامنے رکھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ محض سوال ہے نہ کہ اعتراض۔ (پڑوسیوں کا خیال رکھنا چاہیے...) للکار میں ثروت، ستابی اور یوسف کی بھون ٹوٹنے کا انتظار ہے کہ کون سا کونا ٹوٹتا ہے اور لائن سیدھی ہو جاتی ہے۔ گرداب، اسما قادری کے قلم کا اعجاز ہے۔ اسما صاحبہ بڑی مہارت کے ساتھ آپریشن کر رہی ہیں۔ کرپشن بے نقاب کر رہی ہیں۔ اپنوں کی غداریاں اور ذاتی مفادات پر، اجتماعی مفادات کی کس طرح بلی چڑھائی جاتی ہے ہمیں بتا رہی ہیں۔ رہائی، اور بوجھ متاثر کن تحریریں تھیں۔ منزل، سرور اکرام صاحب کی تحریر تھی مگر اتنی اچھی نہ تھی کہ بطور سرورق کی کہانیوں میں شامل کی جاتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ممکن ہے دوستوں کو اس پر اعتراض ہو مگر پسند اپنی اپنی۔ کیا کہا جاسکتا ہے۔ البتہ احمد اقبال صاحب کی ٹشو پیپر ایک اچھی تحریر تھی جس کو احمد اقبال صاحب نے اپنے مخصوص اسٹائل میں لکھا۔ رانا عبدالغنی غمگین یہ کیوں بھول گیا تھا کہ مکافاتِ عمل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بہرحال، ٹشو پیپر ایک ملٹی کلر کہانی تھی۔"

جھنگ سے طاہر نواز کی سادگی "میں ڈائجسٹ اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب اس کی قیمت 35 روپے تھی۔ مجھے ماہا ایمان کا تبصرہ بہت اچھا لگتا ہے۔ اور یہ کیا ماہا ایمان جی! دو یا تین مہینے سے آپ کا تبصرہ پڑھنے کو نہیں ملا۔ اس بار سرمد مشتاق کو بہت بہت مبارک باد۔ مشتاق بھائی آپ نے کرن خان کی دل آزاری کی ہے۔ باقی تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی رائے "جاسوسی اس بار کافی انتظار کے بعد 6 تاریخ کو ملا اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش بھی۔ گرما گرم پکوڑوں کے ساتھ ساتھ مطالعہ شروع کیا۔ (پھر تو مزہ دوبالا نہیں سہ بالا ہو گیا ہوگا؟) کرسیِ صدارت پر اس بار سرمد مشتاق آئے۔ بھئی مبارک باد۔ کافی نئے اور پرانے لکھنے والے نظر آئے جو پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے گو کہ یوم آزادی کب کا گزر چکا۔ پہلی کہانی مکڑجال بہت زبردست رہی۔ للکار کی 32 ویں قسط اچھی رہی اور لگا کہ آرا کوئے کا مجسمہ خود جلالی صاحب نے ڈاکٹر مہناز کو دے کر انہیں فرار کرایا۔ راجا کا کردار اس بار بڑا پراسرار رہا اور عمران اور شاہین کی نوک جھوک بڑی زوردار رہی۔ دیکھیں اب عمران، تابش اور راجا کو اس نرغے سے کس طرح نکال پاتے ہیں۔ گرداب میں حسبِ توقع جاوید علی کا کردار اب ختم ہی ہے اور شہر یار اب ایک آزمائشی ایکشن میں نظر آیا۔ شاز مین کے بے گھر ہونے کا دکھ ہوا۔ نک ولیوٹ کی انڈے کی چوری دلچسپ تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں منزل اور ٹشو پیپر کوئی خاص تاثر نہ دے سکیں بس بھرتی کی تحریریں لگیں۔ اس بار بہترین کہانی مختار آزاد کی رہائی تھی۔ آئندہ ماہ سے جاسوسی کی قیمت میں اضافہ معمولی سا ہے اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے ورنہ مارکیٹ میں فضول رسائل کی کمی نہیں۔"

اوکاڑہ سے تصویر العین کی باتیں "ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ ذاکر انکل نے اس دفعہ بدیسی حسینہ کو ٹائٹل کی زینت بنایا۔ دائیں طرف موجود شخص مڑ کر شاید اس حسینہ کو ہی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس کی شرٹ کے بازو پر موجود بنایا گیا چہرہ زبردست لگا۔ واقعی ذاکر انکل بہت زبردست ٹائٹل تھا۔ نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے۔ 6 ستمبر کا دن مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے اپنے فوجی بھائیوں پر فخر ہے جس طرح انہوں نے پاکستان کا دفاع کیا، وہ قابلِ تحسین ہے۔ صدارت کی کرسی پر سرمد مشتاق براجمان تھے مبارکاں بھئی مبارکاں۔ محمد اسماعیل اجاگر! آپ کچھ بات دوستوں کی بھی کر لیتے تو کیا جاتا آپ کا۔ اختر عباس اور ظفر اقبال! آپ کیا ماہ تاب گل سے جیلس ہو گئے ہو جو اتنا چڑ رہے ہو؟ رانا حبیب الرحمٰن! اسنا تھا بھائی، بہنوں کے معاملے میں بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ اب یقین بھی آ گیا۔ جس طرح آپ نے عدنان یوسف کو للکارا ہے پڑھ کر۔ اور آپ لڑکی تھوڑا تھے جو ہمایوں سعید آپ سے فلرٹ کرتے اور آپ کو بات کر کے ہی پتا چل جاتا۔ آپ سے تو انہوں نے سیریس ہو کر ہی بات کرنی تھی نا۔ تفسیر عباس بابر! آپ ٹائٹل گرل کا اتنا تفصیلی معائنہ کرتے ہیں اور پھر اسے لفظوں کی صورت میں بیان بھی کر دیتے ہیں۔ ہماری بھابی صاحبہ آپ کو کچھ نہیں کہتیں کیا؟ عمیر شہزاد! مبارک ہو آپ کی پشاور پوسٹنگ ہو گئی۔ اسی وجہ سے آپ پاکستان کے تمام شہر دیکھ لیں گے۔ سپاہی صابر علی! یہاں سب دوست ایک دوسرے سے پیار و محبت اور خلوص سے ہی بات کرتے ہیں۔ بس تھوڑا سوچ ملیے اور شرارت کے لیے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے ہیں۔ علی آتش! آپ کے لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ گرمیوں کے بجائے صرف سردیوں میں ہی جاسوسی میں خط لکھا کریں کیونکہ آپ کا نام پڑھ کر شدید گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ آتش، آپ کا تخلص ہے یا واقعی نام۔ احتشام احسان! عدنان یوسف کا تو پتا نہیں لیکن لگتا ہے کہ آپ ضرور چوٹ کھائے ہوئے ہیں، وہ بھی کسی بہت اپنے سے۔ محمد قدرت اللہ نیازی! جب خود رسالہ پڑھنے بیٹھتے ہیں تب کوئی کام نہیں یاد آتا آپ کو بھولا ہوا۔ کبیر عباسی! آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارکاں۔ کاشف زبیر کی مکڑجال بہت زبردست کہانی تھی۔ اس کے سحر نے جیسے ہمیں جکڑ ہی لیا۔ للکار میں اس دفعہ تھوڑی تیزی آئی۔ ایکشن میں بھی مزہ آیا۔ شکر ہے کہ تھوڑی سی عقل ثروت کو بھی آ گئی۔ یقیناً آئندہ قسط یا اقساط میں یوسف کے بارے میں مزید پیش گوئیاں ہوں گی۔ گرداب میں شکر ہے کہ رائٹر اسما قادری کو بھی یاد آیا کہ اس کہانی کا ایک عدد ہیرو بھی ہے۔ مختار آزاد کی رہائی بھی بہت اچھی کہانی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اگر جیمز ڈیوس ہیڈلے گھر نہ چھوڑتا تو شاید اس کی بیوی جینی بھی خودکشی نہ کرتی۔ منزل، سرور اکرام کی اچھی کہانی تھی۔ چندا کا مسلمان ہونا اور بعد میں اتنی مشکلات سہنے کے بعد صفدر کے ساتھ مدرسہ رحمانیہ قابلِ ستائش تھا۔ ٹشو پیپر میں احمد اقبال نے جو نوجوان نسل کو پیغام دیا ہے، میرے خیال سے انہیں غنی کے کردار سے ضرور سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آخر میں آپ سے گزارش ہے کہ پلیز جاسوسی اب اوکاڑہ میں 6 یا 7 تاریخ سے پہلے نہیں ملتا پھر خط لکھنے میں بھی دیر ہو جاتی ہے۔ پلیز پرچہ جلدی بھیجا کریں۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی زمِ گفتاری "ماہِ ستمبر کا خوب صورت شمارہ ہاتھوں میں، سرورق قدرے بہتر لگا جبکہ حسینہ کی آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں!

آنکھ تخریب کار ہے اتنی
دل کی دنیا اجاڑ دیتی ہے!

دوستو! بارشوں کا یہ موسم بھی کچھ عجب ہے... کچھ بھولی بسری یادوں کو تازہ کر جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کاش پھر وہ پل لوٹ آئیں جو کھو چکا ہوں لیکن شاید یہ ممکن نہیں۔ بہرحال، اس جل تھل موسم میں بھی صحرائے دل کی تشنگی اپنی جگہ ہے... (درست کہا آپ نے) اپنی محفل میں حاضری دی۔ اپنے بچپن کے دوستوں اعجاز احمد فرام پاک پتن اور سپاہی صابر علی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سرمد مشتاق کو مبارک باد... اختر عباس تھراج اور ظفر اقبال کی مشترکہ کاوش زبردست رہی۔ دوستو! ماہا ایمان پر کچھ رحم کرو۔ بے چاری پہلے ہی..... عزیز از جان محفل کی شان میرے بہت ہی قریبی دوست تفسیر عباس بابر کی خصوصی آمد مزہ دے گئی۔ تہِ دل سے مشکور ہوں آپ نے ہمارے شہر کو شہرِ محبت لکھا... عمیر شہزاد گلشن چلو کوئی گل نہیں دوست نصیب اپنے اپنے... اعجاز احمد فرام پاک پتن! اب باقاعدگی سے حاضری دینا۔ محترم علی آتش صاحب! یہ سب تحفے مجھے آپ کے شہر سے ملے ہیں۔ ایم عزیز اسد صاحب! ابھی آپ سے ملاقات کر کے دل کا حال کہہ دیں گے

بشرطِ زندگی۔ احتشام احسان صاحب! کچھ لوگوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہوتے ہوئے بھی غیر ہو جاتے ہیں۔ محترم ہمایوں سعید صاحب! اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا بھلے آدمی۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب بھی اپنے لاجواب تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ یادِ ماضی میرے لیے بہت اہم ہے۔ کبیر عباسی صاحب! مگر اس دل کو سمجھائے کون؟ اپنی خوشیوں میں ہمیں بھی یاد رکھنا۔ تصویر العین صاحبہ! آپ کدھر غائب تھیں؟ ابتدائی صفحات پر موجود مکڑجال حد سے زیادہ پُرتجسس، سنسنی خیز رہی۔ بلاشبہ جب ظلم اپنی آخری حدوں کو چھو جائے تو مکافاتِ عمل شروع ہوتا ہے۔ یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں کو آشکار کرتی منفرد تحریر پسند آئی۔ سلطان کا کردار زبردست لگا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار بھی کافی تیز رفتار تھی۔ عمران اور تابش فل فل ایکشن میں تھے، راجا کا کردار بھی زبردست تھا۔ اسما قادری کی گرداب ونڈر فل تھی۔ جاوید علی کامیاب ہو کر بھی ناکام رہا، چلو کچھ تو ہوا۔ شہر یار نے انتہائی جذباتی قدم اٹھا کر آخر ورما کو قابو کیا۔ بہرحال، شاز مین کے تعاقب میں جانے والے سی پی ایف والوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے... سرورق کی پہلی کہانی منزل خاص موضوع پر لکھی گئی پسند آئی۔ احمد اقبال کی ٹشو پیپر بھی خاصے کام کی تھی۔ عبدالغنی کی زندگی حاصل اور لاحاصل کے درمیان رہی۔ یقیناً کچھ لوگوں کو وقت اور لوگ بہت بیدردی سے استعمال کرتے ہیں۔ مختصر تحریروں میں قیمت خواہش اچھی لگی، یقیناً خواہشوں کی بھی کچھ قیمت ہوتی ہے۔ اقبال کاظمی کی بچاؤ عمدہ اسٹوری تھی۔ ماضی اور ماضی سے جڑی کچھ باتیں انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ شیرانی کا کردار زبردست تھا۔ بوجھ، آخری تصویر، انڈے کی چوری، کھوج اور رہائی عمدہ تحریریں تھیں۔ ماہِ ستمبر کا شاہکار زبردست رہا۔"

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی دلی تمنا "ہم بے تحاشا خوش ہیں اور اس خوشی کا سبب جلد ہی آپ سے دو بدو ملاقات کر کے بتائیں گے۔ (یا اللہ خیر... ہم کہاں چھپیں......) سرمد برادر! کیا ست کم بیک کیا ہے، ویلڈن۔ عباس اینڈ ظفر برادر! صنفِ نازک کا انکشاف ہونا ہمارے لیے نئی اطلاع نہیں اور غصہ تو ہمیں کبھی آتا ہی نہیں۔ کیونکہ غصہ تب آتا ہے جب بندے کے پاس منہ توڑ جواب اور دلائل نہ ہوں۔ (کیا بات ہے۔ ملاقات پر پتا لگ جائے گا......) رانا حبیب صاحب! جن سے آپ نے فون پہ بات کی ہے وہ ہم نہیں۔ اس بندے نے میرے نام پہ بہت سے لوگوں کو بے وقوف بنایا۔ تفسیر صاحب! مانا کہ غرور اچھی چیز نہیں مگر یہ بھی عالمگیر سچائی ہے کہ غرور بندہ تب ہی کرتا ہے جب اللہ نے اسے بے تحاشا نوازہ ہو۔ (خالی ہاتھ کیسی آزمائش؟) بلال برادر! تمہیں ٹائٹل گرل اس لیے پسند نہ آئی کیونکہ اس وقت آپ پیاس سے بے حال تھے۔ ایسی حالت میں بندے کو پانی کے علاوہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ صابر علی برادر! آپ کا مشورہ لاجواب اور لاعلاج ہے۔ عمیر میاں! جملہ تو درست لکھا کرو۔ درست جملہ یوں ہے کہ جہاں راج ہو وہاں صنفِ نازک ضرور آدھمکتی ہے۔ (واللہ رے خوش فہمیوں کا پہاڑ......) آتش صاحب! اگر ہم سدھر جاتے تو آپ نے کون سا اپنی لائبریری ہمارے نام کر جانی تھی۔ ایم عزیز صاحب! ہمیں اس بک اسٹال والے کا نام بتاؤ جس نے ہمارے جاسوسی کو سر کے بل لٹکا رکھا تھا۔ مشائم جی! آپ کا سوال بھی آپ کی طرح غیر معصوم ہے۔ ہم ہرگز فلرٹ نہیں رہے۔ ویسے آپ کو اتنی شدید ناپ کی تکلیف کیوں ہوئی کہ ہم فلرٹ نہیں ہیں۔ قدرت برادر! اعجاز احمد کے لیے آپ نے اچھا شعر مار گرایا۔ کبیر عباسی نے فیس بک کے اشتہاری ہونے کا اچھا ثبوت دیا۔ سب سے پہلے کاشف زبیر کی کہانی سے خود کو لطف اندوز کیا۔ مکڑجال بین الاقوامی سیاست کی شاندار کہانی رہی۔ موساد کے مکروہ چہرے کی..... نقاب کشائی کی گئی۔ سلطان کی ذہانت نے شدید متاثر کیا تو دوسری طرف حسن بن صباح کی شاندار ایجاد نے حیرت کے سمندر میں ڈبو دیا۔ گرداب میں بالآخر جاوید علی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ نواب نوازش علی کو بھی بالآخر ذلت کی زندگی سے رہائی مل گئی۔ دوسری طرف شاز مین اور جاوید علی کی معصومانہ لو اسٹوری بھی پسند آئی۔ اقبال کاظمی کی بچاؤ بھی شاندار رہی۔ جمشید خاقانی کی پلاننگ شاندار تھی مگر اس نے ناصر شیرانی جیسے قابل بندے کو اپنی پلاننگ میں گھسیٹ کے اپنے جوتوں پہ کلہاڑی مار دی۔ مختصر ترین آخری تصویر بھی خوب رہی۔ کرکس کا اتنا قصور تھا نہیں جتنی اسے سزا ملی۔ وہ اپنے پیشے سے مجبور تھا۔ احمد اقبال کی ٹشو پیپر متاثر کرنے میں کافی حد تک ناکام رہی۔ انڈے کی چوری حسبِ توقع رہی۔ نک کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کوئی بے وقعت چیزوں کے لیے میری خدمات نہیں لیتا۔ پھر بھی بڑی شان سے کہتا رہتا ہے کہ بے قیمت اور بیکار چیزیں ہی چراتا ہے۔ منزل میں صفدر کے جنون اور سچی لگن نے متاثر کیا۔ کاش کوئی ایسے ہمارے بھی دل کے آر پار ہو۔" (انتظار کریں، کوئی مل ہی جائے گا یا آپ کسی کے لیے ایسے ثابت ہو جائیں)

اختر عباس تھراج اور ظفر اقبال ظفری کبیر والا سے لکھتے ہیں "اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ کچھ تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل پر سرسری سی نگاہ ڈالی مگر پسند نہ آیا۔ اس دفعہ خوشی بہت زیادہ تھی۔ وہ یہ کہ ہم نے دیہات میں رہتے ہوئے جو تقریباً شہر سے 50 کلومیٹر دور ہے B.Z.U سے بی کام کا امتحان پاس کر لیا ہے جو کہ ہمارے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ (ماشاء اللہ! بہت بہت مبارک ہو) ٹائٹل کو پھلانگتے ہوئے فوراً محفلِ یاراں کی طرف بڑھے۔ وننگ پوسٹ پر سرمد مشتاق کو پایا۔ سرمد بھائی مبارک ہو۔ اٹک سے اسماعیل اجاگر کافی عرصے بعد محفل میں دکھائی دیے۔ اتنا عرصہ کہاں تھے..... اسماعیل جی آپ کو ٹائٹل کی بڑی ٹینشن ہو رہی ہے۔ لگتا ہے اس پہ ماہا ایمان کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں۔ گوجرہ سے رانا حبیب بھائی، جس جگہ صنفِ نازک نہ دکھائی دیں، وہ جگہ سنسان سی لگنے لگتی ہے۔ یو آر رائٹ... رانا جی لگتا ہے اب ہمیں خاموش رہنا پڑے گا کیونکہ ماہا ایمان نے اپنے لیے آپ کو باڈی گارڈ سلیکٹ جو کر لیا۔ ذرا دھیان سے پہرا دینا۔ ورنہ وہ باڈی گارڈ تبدیل کرنے میں مہارت رکھتی ہے۔ (کیا آپ بھی بیڈ وولی کر چکے ہیں؟) اوکاڑہ سے تفسیر عباس آپ کے لیے میں نے کیا کیا لقب پائے مگر آپ کے خط میں اپنا ذکر کبھی بھی نہیں دیکھا۔ نیکسٹ ٹائم کم از کم میں آپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کہوں گا۔ آخر میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ بندے کو عاجز ہو کے رہنا چاہیے۔ بلال خان لودھی صاحب! یار اب اتنی بھی گرمی نہیں ہے۔ ویسے یہ بات آپ کی ٹھیک ہے کہ محبت انسان سے ہی نہیں بلکہ جاسوسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ کیا کہانیوں کا اصل مزہ تو یہ ہے کہ ان کی اقساط زیادہ سے زیادہ ہوں۔ انجینئر عمیر شہزاد! اگر رمضان شریف نہ ہوتا تو پھر کیا کرتے حسینہ کا غذ کے ساتھ۔ پاک پتن سے اعجاز احمد خوش آمدید۔ آتے رہیے گا پلیز... صابر علی! آپ کی انویسٹی گیشن کہاں تک پہنچی؟ یار سپاہی ہوتے ہوئے آپ ڈانس کرتے اچھے نہیں لگیں گے۔ تصویر العین بڑے عرصے بعد نظر آئیں۔ آپ تو آ گئیں پر اپنی لیڈر ماہا کو کیوں نہیں لے کر آئیں؟ دیکھیں تو سہی ان کے بغیر محفل پھیکی پھیکی سی لگ رہی ہے۔ شہزادہ کوہسار کبیر عباسی! آپ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے پر بہت بہت مبارک ہو۔ اب بیوی کی خوشی میں ہمیں اور جاسوسی کو مت بھول جانا۔ میں کہانیوں کی نسبت زیادہ تر تبصرہ دوستوں کا کرتا ہوں کیونکہ اس کا مزہ ان سے زیادہ ہے۔ اب کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ للکار میں سب سے زیادہ جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات ہے، وہ عمران اور شاہین کی نوک جھوک ہے۔ ہمیں سب سے زیادہ مزہ ان دونوں کے درمیان آتا ہے۔ ثروت نے عمران اور تابش کی طرف توجہ دینا شروع کردی ہے۔ امید ہے کہ نصرت کی محنت بر لائے گی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ پتا نہیں چلتا گرداب کے ساتھ کیا بن گیا ہے۔ وہ کردار ختم ہو چکے ہیں۔ ان کا تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا نہ تو ماہ بانو کا ذکر ہو رہا ہے اور نہ ماسٹر آفتاب اور کشور کا کوئی کردار دیکھنے کو مل رہا ہے۔ کبھی گرداب میری فیورٹ رہی ہے، اب تو اس کو برائے نام ہی پڑھتا ہوں۔ اسما قادری سے گزارش ہے مار دھاڑ کے بجائے اس میں لو اسٹوری یا رومانٹک انداز میں کہانی ملے تو مزہ آجاتا ہے۔ کاشف زبیر کی اولین صفحات پر مکڑ جال بھی پڑھی، بہت اچھی لگی۔"

کراچی سے اقرا بانو کی باتیں "اس بار جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ اس خبر کے ساتھ کہ آئندہ ماہ 60 روپے ادا کرنے ہوں گے۔ خیر انکل! یہ تو سیدھا سادہ ہماری جیب پر حملہ ہے۔ اس بار للکار بہت آہستہ روی سے آگے بڑھی ہے۔ مگر یوں لگتا ہے کہ آنے والی قسطیں بہت تیز ایکشن، سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور ثابت ہوں گی۔ کیونکہ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی لگتی ہے۔ گرداب میں جاوید علی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ پہلی کہانی جکڑ جانے والی واقعی پہلی کہانی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ میرے خدا! کس قدر گھناؤنی سازشیں مسلم ممالک کے خلاف ہو رہی ہیں اور ہم ہیں کہ چاند دیکھنے کے مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں اور وہ ہمیں ہمارے خوب صورت تہواروں سمیت مٹانے کے درپے ہیں۔ کاشف زبیر ایک بار پھر آئے اور چھا گئے۔ انکل تفسیر عباس! واقعی آپ اپنے نام کی طرح خوب ہو آپ نے میرے خط کی تفسیر بیان کی ہے اور ہاں سدرہ بانو تا گوری میری بڑی بہن ہے۔ انکل! آپ نے میرے لیے اچھے جذبات کا اظہار کیا ہے اس پر قائم رہیے گا۔ ایک بات تمام قارئین سے کہوں گی کہ خط میں ادب کی چاشنی ضرور شامل کیا کریں۔ جیسا کہ مری سے کبیر عباسی نے اپنی شادی کی خبر کس خوب صورت انداز میں سنائی ہے کہ مزہ آگیا۔ بھائی مبارک ہو۔ اسی طرح خوب صورت انداز میں کسی کا دل دکھانے سے اجتناب کرتے ہوئے خط لکھا کریں تو بہت اچھا رہے گا۔ انکل میرے میٹرک کا رزلٹ آگیا ہے اور آپ کی دعاؤں سے، بہت اچھا رزلٹ ہے۔" (مبارک ہو۔ منہ تو میٹھا کراؤ......)

پشاور سے عثمان غنی کا پہلا محبت نامہ "8 تاریخ کو جاسوسی ملا۔ سرورق پر ایک نوجوان حیران و پریشان کھڑا تھا جبکہ پاکستانی نما ماڈل یورپ کی نقل و نقش کی نمونہ لگی۔ سب سے پہلے جی، میں اپنی تعریف، یعنی تعارف کرانا چاہوں گا۔ (کرائیں) اس کے بعد باقی باتیں کروں گا۔ میرا نام عثمان غنی ہے اور میں اٹھارہ سال کا ہوں۔ بی اے کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ بچپن سے بچوں کے پرچوں میں لکھتا رہا ہوں اور بچپن ہی سے ریڈیو پاکستان کے بچوں کے پروگرام میں بطور چائلڈ آرٹسٹ حصہ لیتا رہا ہوں۔ جاسوسی میں یہ ہمارا پہلا خط ہے۔ جاسوسی سے ہم 2011ء کے اوائل میں روشناس ہوئے اور وہ بھی ایک انجان لڑکی کی وجہ سے۔ وہ لڑکی جس کا ہمیں ابھی تک نام بھی معلوم نہیں۔ وہ میری بہن کی سہیلی تھی۔ اب نہیں رہی۔ وہ جاسوسی بہت شوق سے پڑھتی تھی اور اس نے جاوید مغل صاحب کی تحریر للکار پورے اسکول میں مشہور کر دی تھی۔ وہ لڑکیوں کو عمران اور تابش کی بہادری کے قصے، کہانیاں سناتی اور ان کو سلطانہ کے بارے میں بتاتی۔ اکثر میری بہن کو جاسوسی کے شمارے بھی دیتی بلکہ غالباً ہر لڑکی کو پڑھنے کے لیے دیتی تھی۔ ایک دن ہمیں پتا چلا کہ ہماری پیاری بہن رسالے میں گم ہے اور اس وجہ سے اس سے ہانڈی جل گئی۔ اس نے بھی للکار کی تعریفیں کیں اور ہانڈی کا اسے ذرا بھی غم نہیں تھا پھر جب اس نے ہمیں عمران اور تابش کی کہانی سنائی تو ہمیں بہت ہی زبردست لگی۔ اب ہو جائے تبصرہ، مکمل ڈائجسٹ پر۔ ٹائٹل نے ذرا بھی ہمیں متاثر نہیں کیا۔ مصنف کرخت، غالباً دونوں ایک ہی شکل کے تھے۔ اپنی محفل چھپی، نکتہ چینی میں پہنچے مگر مدیر اعلیٰ کی باتوں نے ہی چینی دان کی مٹھاس ہی ختم کر دی کہ اگلے ماہ جاسوسی 60 کا ہو جائے گا۔ کرسیِ صدارت پر سرمد مشتاق صاحب ادا سی سے براجمان تھے۔ وزارت پر ادریس خان کو دیکھا مگر موصوف نے بھی تقریر سے پرہیز کر رکھا تھا جبکہ محمد اسماعیل اجاگر کی واپسی اچھی لگی۔ ماہا ایمان آپ بھی جلد واپس آگئیں جبکہ کبیرہ والا اختر عباس کی یہ بات دل کو لگی کہ یہ محفل نئے اور پرانے سب دوستوں کی اپنی محفل ہے جبکہ تفسیر عباس صاحب نے لیٹر میں جو باتیں لکھیں، وہ ہمارے دل کو لگیں۔ انجینئر عمیر شہزاد بلش کی پشاور منتقلی پر دلی مبارک۔ بھئی ہم تو قریب ہیں منہ میٹھا کرائیے نا۔ ریسکیو 1122 اعجاز احمد نے درست فرمایا کہ ایک دوسرے کی برائیوں سے قطع نظر کبھی کبھی اچھائیوں کو بھی بیان فرما دیا کریں مگر کیا کریں جو مزہ برائیوں میں ہوتا ہے، وہ اچھائی میں کہاں؟ تصویر الحسن باجی! اب ریگولر حاضری دیا کریں۔ علی آتش بھائی! آئندہ خط میں گرم مزاجی دکھائیے۔ مشائم جی! بس اتنا کہیں گے اپنا ڈھیروں ڈھیر خیال رکھیے۔ ہمایوں سعید! آپ ہمیں پسند کریں نہ کریں، ہمیں آپ کی اٹھکیلیاں بہت پسند ہیں۔ محمد قدرت اللہ، حکیم ٹاؤن خانیوال کا شکریہ۔ اتنی اچھی گفتگو کرنے پر جبکہ مری سے کبیر عباسی! اللہ آپ تینوں کی جوڑی کو سدا ہمیشہ ساتھ رکھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے جی۔ اب آپ سے گزارش پلیز، میگزین میں ہمیں ویلکم کریں ورنہ یہ ناانصافی ہوگی۔ ہمارے پسندیدہ ترین رائٹر کاشف زبیر ہیں۔ کہانیوں کی طرف سب سے پہلے گرداب سے اسٹارٹ لیا۔ اسما جی نے وہی کیا جو ہمیں پہلے سے خدشہ تھا یعنی عوام کی نظروں سے خواجہ سراؤں کا کارنامہ پوشیدہ رکھا۔ کہانی میں چودھری، بلنڈ ااور ماہ بانو کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ کشور اور آفتاب بھی غائب ہیں۔ للکار میں ثروت، نصرت، تابش اور عمران نے پھر دھما کا کیا۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ ایک بار پھر حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔ پلیز، عمران کو شاہین کے لیے بھی ذرا ٹائم نکالنا چاہیے۔ مکڑ جال نے ہمیں وہ خوشی نہیں دی۔ بورنگ تھی۔ (حیرت ہے آپ بور ہوئے... یہی کہہ سکتے ہیں پسند اپنی اپنی) جبکہ مغربی کہانیوں میں رہائی اچھی لگی اور اقبال کاظمی کی بچاؤ نے متاثر کیا۔ سرور اکرام صاحب کی منزل جو کہ سرورق کا پہلا رنگ تھا، وہ بہت زیادہ خوب صورت تھا۔ وہ کہانی ایسی تھی جیسے ریئل ہو اور ہمارے دل کو لگی۔ (آپ کا دل تو بڑا... لگتا ہے) دوسرا رنگ احمد اقبال کا تھا۔ ٹشو پیپر، آغا اور نسیم اتنے کمینے اور سفاک ہوں گے، ہم نے تو دور بین میں بھی نہیں سوچا تھا، وہ دونوں تو مسلمان کہنے کے روادار ہی نہیں تھے۔ سلیم انور کی آخری تصویر خوب صورت کہانی تھی۔ سلیم انور کی ہر کہانی چھوٹی ہوتی ہے مگر بہت ہی زبردست ہوتی ہے۔ قیمت خواہش، سیریناراض کی بس ٹھیک ہی تھی۔ انڈے کی چوری سب سے انوکھی کہانی تھی۔ نمک کی برف کی چوری بھی ابھی تک ہمیں یاد ہے۔ نجمہ مودی پلیز نمک کی کوئی نئی چوری بھی بہت جلد لکھیے۔ بوجھ، بابر نعیم کی کہانی واقعی بوجھ رہی ذہن پر، جبکہ تنویر ریاض کی کھوج نہیں پڑھی ہے۔ تو کمنٹس۔"

کراچی سے سارہ کے سوالات "یہ میری پہلی انٹری ہے اس محفل میں۔ ویسے میرا اور جاسوسی کا ساتھ 12 سال پرانا ہے۔ بہت وقت سے میں اس محفل کو جوائن کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس معاملے میں، میں کافی سست واقع ہوئی ہوں۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف... اف انکل جی! یہ کیا؟ کس کو دیکھ لیا آپ نے؟

جس کا پسند بھی آیا تو سائڈ پوز؟ پوری صورت ہی نہیں دکھتی۔ میں محفل کو بہت انجوائے کرتی ہوں، نوک جھوک، چھیڑ چھاڑ جو دوست کرتے ہیں وہ جچتے بھی ہیں۔ وکٹری اسٹینڈ کا بندہ وکٹری کا نشان بنائے ٹھیک لگا اپنی جگہ پر۔ تفسیر عباس بابر کے نام سے کافی محفل ہوتے ہیں۔ باقی بھی فرینڈز بہت اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے قسط وار اسٹوریز... اسما جی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اسٹوری میں کچھ غیر ضروری مکالمے بھی اکثر ہونے لگے ہیں۔ سوری بھی کبھی بہت بور کرتی ہیں آپ۔ اور وہ جو ہیں نا اپنے انکل جو ہر ماہ للکارتے ہوئے آتے ہیں اور کوئی ان کے مقابلے پہ ٹکتا نہیں ہے۔ جی ہاں اپنے طاہر انکل۔ لگتا ہے اسٹوری جہاں سے شروع ہوئی تھی، ختم بھی وہیں جا کے ہوگی۔ کبھی کچھ جسے پڑھ کر لگتا ہے بھاگتے دوڑتے لکھے ہیں آپ نے۔ ویسے یہ عمران کیا چیز ہے؟ مکڑ جال بہتر رہی۔ ایسی اسٹوریز بہت اٹریکٹ کرتی ہیں جو ایک تسلسل سے چلیں اور غیر ضروری وضاحتوں سے بور نہ کریں۔ باقی سب کہانیاں اچھی رہیں۔ ستمبر کا پہلا رنگ پڑھ کے ایک سوال ذہن میں آیا کہ یہ ہندو لڑکیاں، مسلمان لڑکے، ایک دوسرے کو بھگانے کے چکر میں کیوں رہتے ہیں؟ خاص طور پر پاکستانی بھگانے اور انڈین بھاگنے کے لیے تیار... فلم، ڈراما اور بے شمار کہانیاں... ارے بھئی کیا ہو گیا؟ کوئی اور کام نہیں ہے؟ ذرا محفل کے سارے انکل اس کا جواب تو سمجھائیں لیکن آرام سے، کوئی جذباتی نہ ہو۔ اور پیاری پیاری سی فرینڈز بھی اظہارِ خیال فرما سکتی ہیں۔ آخری رنگ چند صفحات پڑھ کے چھوڑ دی۔ ہم نے ٹشو پیپر کو ٹشو پیپر ہی سمجھا سو بورنگ۔ معذرت کے ساتھ۔ اگست کا شمارہ ستمبر کے شمارے سے زیادہ اچھا تھا۔"

محمد جاوید بلوچ تحصیل علی پور سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں "سال 2012ء کی محبوبہ نمبر 9 کے حصول کی تگ و دو میں دو چار نہیں پورے 9 دن تک کسی بے تاب بھونرے کی طرح منڈلاتا رہا۔ سب سے پہلے ڈائجسٹ کی قیمت میں اضافے کا ناگزیر فیصلہ بسر و چشم بہ دل سے قبول مگر ضخامت کی کمی ہرگز ناقابل منظور۔ سب سے پہلے گرداب سے شمارے کے سفر کا آغاز کیا۔ پچھلے ماہ کی نسبت ستمبر کی اسٹوری فل ایکشن نتیجہ خیز رہی۔ محترم طاہر جاوید مغل صاحب! لاہور کے بازارِ حسن المشہور ہیرا منڈی کی چکاچوند روشنیوں کو گل ہوئے محتاط اندازے کے مطابق لگ بھگ تین سال ہو گئے ہیں۔ آپ نے للکار میں پھر شاد و آباد کروا دی۔ بازارِ حسن میں مجرے کے لیے مخصوص کوٹھوں میں گھنگروؤں کی چھن چھن کی جگہ موچیوں کی ٹھک ٹھک سماعت کو سنائی دیتی ہے۔ محبت کی مورت نصرت کی دردناک علالت چشمِ تخیل سے دیکھ کر آنکھوں سے ایک بار پھر شبنم پھوٹ پڑی۔ اگلی قسط یقیناً دلوں کی دھڑکن کی ترتیب بدلے گی۔ خواہشات کی نیاد میں مجبور قص انسان انگاروں پر پھولوں کے دھوکے میں ہونٹ رکھ تو دیتا ہے پھر ہوش تب آتا ہے جب ہونٹوں کی جلن تلخ حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔ بے چارہ و بے کارہ دوسروں کے مال و دولت کا دلدادہ وغنی کا استعمال ٹشو پیپر کی طرح ہوتا رہا۔ مکڑ جال کے جلال نے آغاز و انجام تک حواس کو جکڑے رکھا۔ اقبال کاظمی کی بچاؤ میں نسرین اور یعقوب کے ناجائز تعلقات کئی جانوں کے زیاں کا سبب بنا۔ تاریخ گواہ ہے ایسے چور رشتے بموجب تباہی جن کا ازالہ ناممکن رہا ہے۔ چینٹ چینٹ چست دماغ ست ہمارے نالائق و نااہل پولیس ڈپارٹمنٹ کو کھوج جیسی کہانیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مغربی ممالک کی پولیس کی کارکردگی ہمیشہ مثالی رہی ہے۔ انگلش رائٹرز کا خاصہ رہا ہے کہ اسٹوری ریڈرز کے دل پر کوئی بوجھ نہیں چھوڑتے۔ ان کی کہانیوں سے عملی زندگی کے لیے سیکھنے کا بھی بہت مواد موجود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے تقریباً تمام رائٹرز کا دستور رہا ہے کہ بے چارے قارئین کو جذباتی دلی طور پر اتنا دل گرفتہ اور غمگین کر دیتے ہیں کہ بندے کی صورت بے چاری سے ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر رائٹر ماضی سے وابستہ کہانیاں لکھتا ہے۔ کوئی ہے دور اندیش اور مستقبل شناس لکھاری؟ جو ہمیں مستقبل کے ماحول سے آشنا کر کے اس اچھوتے خیال کو الفاظ کا پیراہن پہنا کر ایک نئی تاریخ رقم کرے؟ دیگر قلم کاروں کی قلم کاریاں جاسوسی کے عین وقت پر عدم فراہمی اور کئی دنوں سے دل و دماغ پر چھائے تناؤ کے بادل بہت جگہ کے عذاب مسلسل کے تسلسل کے کارن اس یقین کے ساتھ بشرط دائرۂ حیات میں مقید رہے تو پھر مطالعہ اور بزم پھلواری میں قلم کاری کریں گے۔ سب سے پہلے ستمبر کے وزیر سرمد مشتاق کو رسما نہیں دل و جان سے مستر جاسوسی بننے پر مبارک بادوں پر مشتمل تو کرا پیش کرنے کے فوراً بعد میرے بھائی عرض خدمت ہے کہ دماغ کا زرخیز اور تابکاری ہونا اولین شرط ہے۔ پھر ہمایوں کیا سعید کیا راج کیا اور آپ کیا... سب پانی بھرتے نظر آئیں گے۔ کیوٹ بے بی اقرا بانو جو بھی قلم کے نیچے آتا ہے بھون ڈالو ورنہ یاد رکھو جو ڈر گیا وہ سب سے پہلے مر گیا۔ خوش مزاج کبیر عباسی نئی نویلی کے ہمیشہ 9 دن ہوتے ہیں۔ تصویر الحسن نہیں اب بس بھی کرو، اتنی بھی کسی کی گوشمالی جنوبی اچھی نہیں ہوتی۔ کنواں جب خود پیاسے کے منہ سے مثل جام ہو جائے تو پیاسے کیوں نہ سنہری موقع سے استفادہ حاصل کریں۔ دم کو 100 سال بھی بانسری میں ڈالو پھر بھی اپنی اصلیت برقرار رکھتی ہے یعنی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ بھائی قدرت اللہ ہمایوں کے تجربہ کار ہاتھوں میں نظارہ چہرہ کے وقت آئینہ نہیں، کسی نرسری لیل بچے کی گمشدہ تختی ہوتی ہے سو تراخ تراخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوابی سے مشائم ہمیں کسی اور کے متعلق تو علم نہیں مگر میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں، بے شمار مواقع ملنے کے باوجود آج تک اپنے دامن کو پاک دامن رکھے ہوئے حسین و سنگین گناہ سے خدا کی اور اپنی عزتوں کی محبت اور حفاظت میں داغ دار نہیں کیا۔" (آپ سے اور تمام قارئین سے دست بستہ درخواست ہے کہ خط مختصر، صاف اور واضح لکھا کریں۔ تاکہ ہماری بینائی آئندہ ماہ کے خطوط پڑھنے کے لیے بچی رہے... جاوید بلوچ صاحب! کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے خیالات کا اظہار صاف اور سادہ تحریر کی صورت میں واضح کر دیا کریں)

بلال خان لودھی مالاکنڈ ایجنسی سے حاضر ہوتے ہیں "رسالہ 8 ستمبر کی ایک سہانی شام کو ملا۔ ٹائٹل یورپین گوری اور ایک ہینڈسم جوان کے مسکراتے ہوئے چہرے پر مشتمل تھا۔ اس طرح کا خوب صورت ٹائٹل ذاکر انکل کم کم ہی بناتے ہیں۔ بہرحال اس مہینے کا ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ (شکریہ) 162 کلومیٹر فی گھنٹا کے حساب سے دفتر چینی پہنچے۔ اس ریکارڈ ساز تیزی کی وجہ سے اپنے خط کے شامل ہونے کی آس تھی۔ اپنا خط شامل دیکھ کر جو خوشی ہوئی، وہ دو دن پہلے رزلٹ کے آنے پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی بی ایس سی کے امتحان میں کامیابی پر بھی اتنے خوش نہ تھے جتنے اپنا خط دیکھ کر خوش ہوئے۔ (یہ تو صحیح نہیں... بہت بہت مبارک باد دونوں کامیابیوں پر) ادارے کی جانب سے پرچے کی قیمت میں اضافے کی بات کی گئی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ لوگ مہینے کے 300 یا اس سے بھی زیادہ نسوار اور سگریٹ وغیرہ پر خرچ کرتے ہیں۔ اگر ہم 70،60 روپے خرچ کریں تو گھاٹے کا سودا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے پچھلے پانچ، چھ سال میں مختلف رسائل پڑھے ہیں اور پھر پڑھنا چھوڑ دیے۔ لیکن جاسوسی کی طرح معیاری رسالہ کوئی بھی نہیں ہے۔ سرمد مشتاق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب کا تبصرہ بہت جاندار تھا۔ ہم انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ سپاہی صابر علی نے بہت اچھی بات کہی کہ پیار و محبت سے ایک دوسرے کا ذکر کریں۔ کہتے ہیں کہ کھلاڑی اپنے ملک کے سفیر ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایک طرح سے ہم بھی اپنے اپنے علاقوں کے سفیر ہیں۔ اگر ہم کچھ غلط لکھیں گے تو ہم تو ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن اپنے علاقوں کی بدنامی کا باعث بنیں گے۔ اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کا تبصرہ پیارا، بہترین اور جامع تھا۔ لیکن بابر صاحب! اتنے سارے لفظے ڈالتے ہوئے آپ تھکتے نہیں ہو؟ باقی دوستوں کے تبصرے اپنی جگہ پر اچھے تھے۔ کہانیوں میں مکڑجال زبردست کہانی تھی۔ للکار میں تابش اور ثروت کی ملن کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔ کہانی کا اختتام سخت ایکشن میں ہوا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ گرداب میں اسٹیسے کے دھماکوں پر سخت مایوسی ہوئی۔ اگر خواجہ سراؤں کو زندہ پکڑا جاتا تو مزہ آتا لیکن جاوید علی اور شازمین کے بچ جانے پر خوشی ہوئی۔ منزل، سرور اکرام کی اس ماہ کی نمبرون کہانی تھی۔ لشو پیپر احمد اقبال صاحب کی اچھی تحریر تھی۔ عبدالغنی کے لیے ممتاز نے اپنے پیار کی قربانی دی۔ مگر وہ اسے بھول گیا اور آخر میں خود بھی ایسے ہی انجام کو پہنچا۔"

چکوال سے ایم عزیر کی شمولیت "ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی ہماری ٹھنڈی آہ خارج ہوگئی۔ دنیا چاند پہ پہنچ گئی ہے اور یہ لڑکی کچن کے دور سے تک لگائے سر پہ سویاں انڈیلے ہمیں ہنسانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، خیر ہم سنجیدہ سنجیدہ محفل والے ہال میں پہنچے۔ سب سے پہلے سرمد مشتاق سے ملاقات ہوئی۔ تبصرہ جاندار تھا۔ کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ محمد قدرت اللہ جی! آپ کا شعر واقعی پسند آیا۔ اختر عباس، ظفر جی دل تو تھا کہ ریوڑیاں لیتا آؤں مگر تفسیر عباس بابر کا خیال آ گیا۔ بے چارے بغیر دانتوں سے کیسے کھاتے ہوں گے۔ ماہا ایمان جی رمضان المبارک ختم ہو گیا ہے، آپ آزاد ہیں، محفل میں آسکتی ہیں۔ تصویر الحسین آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ پہلی کہانی مکڑجال کاشف زبیر کی ایک خوب صورت دلکش تحریر ثابت ہوئی۔ سلطان نام کا ہی نہیں کام کا بھی سلطان نکلا۔ اقبال کاظمی اور نجمہ مودی کی کہانیاں کافی عرصے بعد شائع ہوئیں۔ پہلا رنگ منزل ہندوستانی معاشرے کی عکاسی پیش کرتی احساسات کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ دوسرا رنگ لشو پیپر کہانی تو زبردست تھی پر غنی اور نازو کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہی آغا اور نسیم کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ للکار تجسس و ایکشن، تھرل سے بھرپور مجموعہ ہے۔ طاہر جاوید مغل اس انداز سے لکھتے ہیں کہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دکھتا محسوس ہوتا ہے۔ یوسف ... کا اونٹ دیکھتے ہیں کس کروٹ بیٹھتا ہے۔"

صفدر آباد سے احتشام احسان کی دگرگوں داستان "دکھی دل اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ قلم پکڑا اور خط لکھنے بیٹھا ہوں، آپ بتائیں یا کوئی تو بتا دے کہ ہم سے کس بات کا بدلہ لیا گیا ہے؟ کس جرم کی سزا ملی ہے؟ کہنے کو الفاظ نہیں مل رہے، دل و دماغ پر بوجھ ہے عجیب سا، مسلسل سوچیں۔ آخر کس کا گریبان پکڑ کر پوچھیں کہ آج آٹھ ستمبر ہوگئی ہمیں ڈائجسٹ کیوں نہ مل سکا؟ دل چاہ رہا ہے پھوٹ پھوٹ کر رو دوں مگر آنکھیں ساتھ نہیں دے رہیں۔ دکان والے ہر دفعہ ہری جھنڈی دکھاتے رہے کہ لاہور مارکیٹ میں نہیں آیا۔ باقی سارے ڈائجسٹ ملتے رہے مگر جاسوسی، آہ۔ ایک تو نہ ملا، ساری دنیا ملے بھی تو کیا ہے۔ پوچھ لیں ہمایوں سعید راج بھائی سے ہم نے ان سے چھ تاریخ کو تصدیق کرنے کے لیے پوچھا، انہوں نے بتایا مل گیا اور تمہارا لیٹر بھی شائع ہو گیا، دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے۔ نہیں جی ہمارے لیے کہ آج رزلٹ آ گیا ہے انٹر کا اور میں بمشکل پاس ہو گیا۔" (الحمدللہ)

عدنان یوسف فرام بنوں سے ملتمس ہیں "گھیرے بادل، رم جھم بارش، ڈھلتی ہوئی شام میں یوم دفاع کے موقع پر جاسوسی کا ملنا اک خوش آئند بات تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ 1965ء میں جس طرح فوجی جوانوں نے ہمارے دشمنوں کو للکارا تھا، ان کی کوئی مثال نہیں۔ سرورق پر موجود برٹش گرل تو میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ساتھ کھڑے رانا حبیب الرحمٰن، ماہا ایمان دفاع کرتے ہوئے نظر آئے۔ سرورق کو دیکھنے کے بعد چینی نکتہ چینی میں پہنچے تو پتا چلا کہ چینی کی قیمت بڑھ گئی۔ یعنی اکتوبر سے فی رسالے کی قیمت 60 روپے ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اسی رسالوں سے سالوں کا رشتہ ہے، چند روپے کی خاطر اس کو چھوڑ تو نہیں سکتے۔ سرمد صاحب! کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ اختر عباس تھراج! محفل میں رش اتنا تھا کہ مجبوراً مجھے چھلانگ لگانا پڑی۔ تفسیر عباس! ماما کی چونچ کی نوک نہیں رہی یا ان کی چونچ ہی نہیں۔ عمیر شہزاد کبھی آپ نے یہ محاورہ سنا ہے کہ پہلوئے حور میں لنگور، اس لیے مجھے دکھ ہوا۔ تصویر الحسین! کبھی کبھی تصویر کا چوتھا رخ بھی دیکھ لیا کرو۔ اگر میں نے جمناسٹک شروع کر دی تو پھر سب کی چھٹی۔ بلال خان آپ کی بات 101 فیصد درست ہے کہ عمران کو را جاسے چھٹکارا پانا چاہیے۔ ایم عزیر اسعد یار! چیز ہی کچھ ایسی تھی کہ باقی کچھ نظر نہ آیا۔ احتشام احسان! چوٹ لگی ہے لیکن چھلانگ لگانے سے پہلے۔ ہمایوں سعید! آپ نے کرن خان کی داستان بے دلی سے پڑھی اس لیے اچھا نہیں لگا۔ مشائم، ماہا ایمان کے بارے میں کچھ نہ کہو، رانا حبیب الرحمٰن گھور گھور کے دیکھ رہا ہے۔ کبیر عباسی! دو سے تین ہونے کی مبارک باد قبول کیجیے۔ اب بات ہو جائے کچھ کہانیوں کی۔ للکار سے پہلے کسی اور کہانی کا پڑھنا مشکل ہی نہیں بالکل ناممکن ہے۔ عمران اور تابش ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں، بہت خوب۔ طاہر جاوید مغل صاحب! آپ کی بھی کیا بات ہے۔ ویلڈن۔ سرورق پر منزل، سرور اکرام صاحب کی اک زبردست تحریر تھی۔ باقی کہانیوں میں آخری تصویر اور بچاؤ بھی زبردست کہانیاں تھیں۔"

کھاریاں سے خلیل احمد انجم کی تحریر "جاسوسی پبلی کیشن کے زیرِ صدارت تمام منتظمین، لکھاریں، قارئین، حضرات و خواتین اور تمام ناقدینِ ادب کو اس بزم میں اس بے ادب کا پرخلوص سلام قبول ہو۔ ستمبر کا جریدہ اس وقت سر اور آنکھوں کی خدمت پر مامور ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور جاذب کا عرق اپنے دلکش پیرائے میں سموئے ہوئے ہے۔ اس دفعہ محترم مصور اعلیٰ ذاکر صاحب نے مشرقی حسینہ کو ایک ماہ کی چھٹی دیتے ہوئے مغربی ماڈرن حسینہ سے ملاقات کا بندوبست فرما دیا۔ (پھر تو موجیں ہو گئیں ....) سرورق بے حد زبردست اور اچھوتا ہے۔ ماسوائے اس خنجر کے جو سینے میں پیوست ہوتے ہوئے بھی خون رنگ نہیں ہے۔ اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے فہرست پر پڑاؤ پڑا۔ ایک سرسری نظر کے بعد اولین صفحات پر موجود کاشف زبیر کا پھیلایا ہوا مکڑجال زیرِ مطالعہ ہوا۔ ہمیشہ کی طرح کاشف صاحب نے دل و دماغ کو ہلا کے رکھ دیا۔ اسرائیلیت کی بقا کے لیے صیہونی و فرعونی طاقتوں کا پھیلایا ہوا مکڑجال پڑھ کر دل لرز اٹھا۔ عمدہ تحریر پڑھنے کو ملی اور اختتام قدرے چونکا دینے والا تھا۔ تنویر ریاض کی کھوج، عمدہ تحریر تھی۔ لیری نے بالآخر بیری ایلر کو تاڑ ہی لیا۔ سلیم انور کی تحریر آخری تصویر، سسپنس سے بھرپور، چھوٹی سی کہانی پڑھ کر مزہ دوبالا ہو گیا۔ نجمہ مودی، انڈے کی چوری کے ہمراہ جلوہ افروز ہوئیں، چوری کا احوال پڑھ کر مزہ آ گیا۔ رنگوں میں

سرور اکرام کی منزل خوب صورت تحریر تھی اور احمد اقبال صاحب کا نام ہی کہانی کی عمدگی کی علامت ہے۔ دونوں رنگ عمدہ امتزاج سے مزین ثابت ہوئے۔ بچاؤ بے حد اچھی اور سنسنی خیز کہانی پڑھنے میں آئی۔ اقبال کاظمی جیسا عظیم نام بعد از مدت نظر سے گزر رہا ہے۔ کہانیوں کی تعریف و توصیف کے بعد اپنی محفل پر ایک نظر۔ (یقیناً) آپ کی باتوں نے سوچنے پر مجبور کر دیا اور ایک کڑوا سچ جو میرے منتظمین اعلیٰ کو غیرت دلانے کے لیے کافی ہے۔ قیمت کی بات پر میں حیران ہوں کہ آپ نے تین ماہ پر اپنا ذاتی نقطہ خرچ کیا تھا کہ مہنگائی کا عروج قبل از بجٹ ہے اور آپ کو بجٹ کے ساتھ ہی اس میں اضافہ کرنا چاہیے تھا۔ مسندِ صدارت سرمد مشتاق کے خوب صورت الفاظ سے سجی ہوئی تھی۔ تفسیر عباس بابر کا محبت نامہ اور سپاہی صابر علی کا الفت نامہ نمبر لے گئے۔ کبیر عباسی صاحب! شادی مبارک ہو۔ آخر میں اس آخری بات کے ساتھ اختتام کہ اب جریدوں میں کوئی بھی انعامی مقابلہ نظر نہیں آتا۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے کیا؟ کیا کہانیوں پر انعامی مقابلہ جاری و ساری ہے؟ کیا جاسوسی پر تبصرے کا انعامی مقابلہ موقوف ہے؟ کیا محفل شعر و سخن میں انعام یافتگان کے لیے کچھ خاص ہے؟ یا پھر ذوقِ قارئین ماند پڑ چکا ہے۔ اس کے بارے میں کائنڈلی وضاحت فرما دیں۔" (فی الحال ہر مقابلہ موقوف ہے)

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کی تند و تیز باتیں "ایک مہینے کی غیر حاضری کے بعد محفل کا چاند پھر حاضرِ خدمت ہے۔ امید ہے کہ تمام احباب نے بہت مس کیا ہوگا اور اگر نہیں کیا تو بھی کوئی بات نہیں۔ ہم ایسی ویسی باتوں کو دل سے نہیں لگاتے۔ (بہت اچھا کرتی ہیں) سرورق کچھ خاص نہ لگا۔ فہرست کی ترتیب اچھی لگی۔ محفل کے صدر اس مرتبہ سرمد مشتاق رہے۔ ہماری طرف سے مبارک باد۔ کبیر والا سے ڈبل اے ٹی اینڈ زیڈ آئی زیڈ! بھائی کھلانا آپ پر بنتا ہے کیونکہ بھائی بہنوں کو کھلاتے ہیں نہ کہ بہنوں سے مانگتے ہیں تو نکالیے مٹھائی۔ رانا حبیب الرحمٰن صاحب! میں سینڈل نہیں پہنتی بلکہ جاگرز یا سلیپر پہنتی ہوں۔ اور یاد رہے بوقتِ ضرورت اینٹ سے بھی کام چلا لیتی ہوں۔ تفسیر عباس صاحب! میں آپ کی عزت کرتی تھی آپ کے تبصروں کی بدولت لیکن آپ بعض اوقات صنفِ نازک پر تبصرہ کرتے کرتے تہذیب کے دائرے سے نکل آتے ہیں۔ سوچ سمجھ کے لکھا کریں اور جہاں تک بات ہے کہ آپ نے جو کہا یہ ساری کی ساری عقل سے پیدل ہیں تو اطلاعاً عرض ہے کہ عورت اپنا ذہن استعمال نہیں کرتی، دل کی سنتی ہے لیکن جب وہ دماغ سے کام لیتی ہے تو انقلاب آ جاتا ہے۔ عورت انارکلی جیسی بے بس و مظلوم ہے تو چاند بی بی جیسی نڈر و بے باک اور نور جہاں جیسی شاطر و خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ کبیر عباسی! مبارک باد اینڈ اب راجن پور آئیں لیکن مٹھائی کھانے نہیں بلکہ کھلانے وہ بھی اپنے خرچے پر۔ کاشف زبیر کی مکڑجال پڑھی، کہانی نے ایسے اپنے سحر میں جکڑا کہ وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا اور تحریر ختم۔ ویسے ایک کمی رہ گئی کہ تحریر بہت مختصر تھی۔ گرداب میں دشمنوں کی مکاریاں، وطن کے محافظوں کی حکمت عملیاں قابلِ داد رہیں۔ للکار میں تابش اور عمران کی پھرتیاں اور چالاکیاں، واہ مزہ آ گیا پڑھ کے۔ انڈے کی چوری، انک ویلوٹ کی ذہانت نے ایک اور معاملے کی تہ تک پہنچا دیا۔ سرورق کا پہلا رنگ ٹھیک تھا اور سرور اکرام بالکل منفرد امام کے اسٹائل میں لکھتے ہیں۔ دوسرا رنگ اچھا جا رہا تھا لیکن اختتام پذیر ہوا بڑے بورنگ اسٹائل میں۔ تنویر ریاض کی کھوج بھی اچھی کاوش تھی۔ سیریناراس کی قیمتِ خواہش بھی اچھی رہی۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی آمد "اس دفعہ سوچ رہا تھا کہ خط نہ لکھوں، اگلے ماہ شامل ہو جاؤں مگر دو وجوہات کی بنا پر مجھے بزم میں شامل ہونا ہی پڑا۔ اب محفل والے بھی مجھے شامل کرتے ہیں یا نہیں، یہ ان پر ہے۔ میں ٹیلی ویژن عام طور پر کم دیکھتا ہوں مگر ذرا باخبر رہنے کے لیے کبھی کبھار کوئی نیوز اپ ڈیٹ سن لیتا ہوں۔ جس دن میں نے کراچی میں واقع فیکٹری میں آتشزدگی کا سنا اور اس پر یہ ستم کہ تین سو سے زائد ہلاکتیں جن میں ایک خاندان کے کئی افراد اور شکیل بھی شامل تھے، بہت صدمہ پہنچا کہ آخر ان تمام افراد کا خون کس کی گردن پر ہے؟ حکومت پر، مالکان پر یا کسی ٹھیکے دار یا پھر کسی بھتا خور پر؟ اور کبھی اس واقعے کے ذمے داروں کو قرار واقعی سزا بھی ملے گی یا تمام بڑے سانحات کی طرح اس کو قومی سانحہ قرار دے کے تمام کارروائی داخلِ دفتر ہو جائے گی؟ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ تمام مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کریں۔ بے شک آزمائش ہی انسان کو اپنے خالق سے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔ مجھے اپنی پرانی کتب میں سے دسمبر 2009ء کا جاسوسی ملا تو تجسس کے تحت چینی، نکتہ چینی کا صفحہ کھول لیا جس میں دو اہم سراغ ملے۔ ایک تو یہ کہ ہمایوں سعید پہلے راج نہیں رومیو ہوا کرتے تھے اور اسی حساب سے مستقبل میں شاید راج سے چارلی ہو جائیں، بہرحال یہ میرا اندازہ ہے کیونکہ ہمایوں سعید کے ارتقا کی سمت کی قیادت آرائی میں نہیں کر سکتا۔ خیر محفل میں کبیر عباسی صاحب کی توجہ کا مشکور ہوں کہ وہ میری بات سمجھ سکیں۔ کبیر برادر! میں نے آپ کے نام پر کافی تلاش کی اور آپ کے بتائے گروپ پر بھی مگر مجھے دونوں میں سے کوئی نہیں ملا۔ آپ میری آئی ڈی لے لو اور مجھے ایڈ کر کے گروپ میں دعوت دے دو۔ میں جوائن کر لوں گا۔ میں فیس بک پر اس نام سے رجسٹرڈ ہوں اور یہ پورے گوگل اور فیس بک پر صرف ایک میرا ہی نام ہے، کوئی اور نہیں ملے گا میرے سوا۔ (Syed Shakeel Hussain Kazmi) بصورتِ دیگر یہ ڈائریکٹ لنک ہے پروفائل کا (www.facebook.com/dominant.attitude) امید ہے آپ یہ حصہ حذف نہیں کریں گے اشاعت میں... (کر دیا ہے) باقی کہانیوں کی طرف رخ کیا تو پہلے للکار کا مطالعہ کیا۔ کہانی کافی تیز رفتار ہوتی جا رہی ہے اور مجھے امید ہے ثروت اب یوسف کے دام سے نکلنے والی ہے۔ تابش کو انتظار کا میٹھا پھل مل ہی جائے گا۔ اسما قادری نے اس دفعہ گرداب میں اور جان ڈال دی ہے۔ شہریار کا جذباتی ہو کے غلطی کرنا اور عمر فاروق صاحب کا اس کی تمام غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور اس کا کامیاب تعاقب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ واقعی اس میدان میں سینئر ہیں۔ اولین صفحات پر کاشف زبیر مکڑجال کے ساتھ حاضر تھے۔ یہودی لابی اور موساد کے ہتھکنڈوں کے پردے فاش کرتی ہوئی بہترین تحریر تھی۔ سرورق کے رنگوں میں احمد اقبال بازی لے گئے۔ سرور اکرام کی منزل بھی بہت خوب صورت تھی کہ اچھی نیت نے آخر ان دونوں کو اچھا مستقبل دیا اور ایک عظیم مقصد کے لیے چن لیا کہ وہ دین کی تعلیم عام کریں۔ لشو پیپر میں احمد اقبال نے انسانی خودغرضی اور رانا عبدالغنی جیسے موقع پرست اور بے قدر انسان کا خوب نقشہ کھینچا۔ انجام حسبِ توقع ہوا کہ اتنی عنایات اور وہ بھی اس پر جو سب اندر کی باتیں جانتا ہو، آسانی سے چھوڑ دینا بھی ایک عمدہ چال ہی ہے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

طاہرہ گلزار، پشاور۔ محمد سعید ارشد، اوکاڑہ۔ ارسلان رضا بشارت، چکوال۔ کرن خان، لاہور۔ کلثوم نواز، ڈیرہ غازی خان۔ محمد اقبال، کراچی۔ عائشہ خان، حیدر آباد۔ حرا افتخار، کراچی۔ ہما انصار، کوٹری۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رفاقتوں اور رقابتوں کے جال... مدفتہ رفتہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جارہے تھے...

بہروپ کا راجا

احمد اقبال

کاغذی رشتوں اور خونی رشتوں میں کب کوئی دراڑ پڑ جائے... اس کے لیے وقت کی حد مقرر نہیں... محبت... جذبات اور رشتوں کی بنیادوں میں ایک دوسرے پر اعتماد و اعتبار کی خو بو ہوتی ہے... فریب اور مفاد پرستی کا معمولی سا خیال بھی اسے ہلا دینے کے لیے کافی ہے... حرص و ہوس اور جارحانہ مزاج رکھنے والے افراد کا غرور و تکبر... جن کے نزدیک زندگی صرف جیت کا نام تھا... وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے لیے ایک دن ہار کا بھی مقرر تھا... ہمارے معاشرے اور انسانی نفسیات میں تبدیلیوں کے نشیب و فراز...

مرزا شمشیر جنگ تفنگ چنگیزی مالک و مدیر اعلیٰ روزنامہ ''حقیقت ساز'' عرف توپ صاحب نے عادت کے مطابق اپنی کرسی کو ایک سو اسّی درجے کے زاویے پر گھمایا تو یہ پوچھنا بالکل ضروری نہیں رہا کہ اب وہ کیا کرنے والے ہیں۔ انہوں نے عین پیچھے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کے پانچویں منزل سے صرف گردن باہر نکال کے دنیا پر ایک طائرانہ نگاہ کی اور پھر منہ کھول کر خون کی طرح اس پیک کو اگل دیا جو ان کے منہ میں پوری طرح بھر چکی تھی... بارہ مسالے والے ایک پان کو وہ آدھے گھنٹے سے اپنے منہ کے مکسر میں گھوٹ رہے تھے۔

اس غلیظ اور داغِ رسوائی کی طرح بدنمائی عطا کرنے والے ایکچر نے ابھی کسی بے گناہ کے چہرے اور لباسِ فاخرہ یا کسی بے داغ اجلی سفید دکھنے والی کار تک نصف مسافت بھی طے نہ کی ہوگی کہ توپ صاحب سر واپس لا کے کھڑکی یوں بند کر چکے تھے کہ اب کوئی لاکھ منہ اٹھا کے کسی دوربین یا خوردبین سے بھی دیکھتا تو اسے پانچ منزلہ عمارت کی پچاس کھڑکیاں ایک جیسی بے گناہ نظر آتیں۔

کرسی پر پورے دائرے میں گھوم کے وہ پھر میرے روبرو ہوئے تو میں نے سر پکڑ کے اور رو کے کہا۔ ''توپ صاحب... آپ کو شرم نہیں آتی؟''

توپ صاحب کسی بلبل کی طرح ہنسے جو انڈا دے رہی ہو۔ ''آتی تھی برخوردار... اب کسی بات پر نہیں آتی... وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ اقبال نے... جس نے کی شرم... اس کے پھوٹے کرم۔''

''لاحول ولاقوۃ... ایسی نامعقولیت کی بات علامہ مرحوم کیسے فرما سکتے تھے؟''

انہوں نے کسی ماہر شکاری کی طرح تاک کے نشانہ لیا اور اس مکھی کو ہلاک کرنے میں کامیاب رہے جو مسلسل ان کی ناک کا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ''نہیں، انہوں نے نہ کہی... شیخ سعدی نے کہا ہوگا... کسی نے کہا ضرور ہے گویا... بزدل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میاں! مجھے جوانی میں اتنی شرم آتی تھی کہ شادی کے نام پر ہی لال ہو جاتے تھے، جیسے ٹماٹر... اب تو حیا بھی گویا اٹھ گئی دنیا سے... ایک تم ہو کہ بلا عقدِ مسنونہ تمہارے شب و روز اس کے ساتھ گزرتے ہیں... کیا نام ہے اس کا... وہ جو مسیحائے اطفال ہے۔"

میں نے جھلا کے کہا۔ "آپ نے یہی خطبہ دے کر مجھے شرمندہ کرنے کے لیے بلایا تھا... یہ تھا وہ ضروری کام؟"

انہوں نے ٹوپی ہٹا کے سر کی شفاف سطح پر ہاتھ مارا۔ "بھئی خوب یاد دلایا کہ ایک ضروری کام تھا تم سے... دراصل یہ جو ہمارے سر کے اندر کمپیوٹر نصب ہے... یہ بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اس کی میموری تو خیر ٹھیک ہے مگر کچھ سلو ہے... خیر سے آج وہ آئے تھے۔"

"وہ کون؟ ان کا نام لینے سے آپ کا نکاح تو نہیں ٹوٹ جائے گا۔"

"بھئی وہ صوفی... جو ہمارے خلاف فتوے جاری کرنے میں پیش پیش رہتا ہے... بخدا صرف جلال آنے کی دیر ہے... پھر بقلم خود اسے شہید کر کے اوپر ارسال کر دیں گے... جہنم میں جائے یا جنت میں مگر اس دنیا سے بہرحال جائے... ہمارے اس خیال پر کہو سبحان اللہ... مگر یہی تو نام بھی ہے اس کا۔" وہ بچّے کی آواز میں ہنسے۔

"مولوی سبحان اللہ... اسے کیا کام پڑ گیا ہے مجھ سے؟"

"برخوردار بزدل... آج تو وہ آیا تھا، مجسم نقشِ فریاد بن کے... اس نے زار و قطار لہجے میں کہا کہ وہ جو اس کی دخترِ نیک اختر ہے کرینہ کپور جیسی... شاید اس سے بہتر..."

"آپ نازنین کی بات کر رہے ہیں... نازو کی؟"

انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔ "نام اس کا زبان پر آئے تو ٹھنڈک گویا دل میں محسوس ہوتی ہے۔"

"اُفوہ... آخر کیا ہوا ہے اسے؟"

"بھئی اس نے وہ کر لیا تھا... نکاح الفت... یہ لو میرج ہمیں ذرا غیر اخلاقی سی حرکت لگتی ہے... اور وہ اپنے مجازی خدا کے ساتھ گئی تھی شہد والے چاند پر... ہنی مون کفار کا طریقہ ہے... اب وہ ہے سہاگن بیوہ گویا... کیونکہ اس کا شوہر غائب ہو گیا ہے۔"

"کیسے غائب ہو گیا؟ جن بھوت کی طرح۔"

توپ صاحب ہنسے۔ "میاں بزدل... ایسا ہوتا تو صوفی حکم دیتا اور جنات جو اس کے تابع ہیں... پلک جھپکتے میں اس کے داماد کو حاضر کر دیتے۔ سچ پوچھو تو وہ تمہیں پوچھ رہا ہے۔"

"خدا خیر کرے... مجھ سے وہ کیا چاہتا تھا؟"

توپ صاحب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "چاہتے تم تھے ایک زمانے میں اسے... یہ ایک ناقابلِ تردید سچائی نہیں ہے؟"

"وہ پرانی بات ہے۔"

"ہاں... مگر تمہارے دل میں آج بھی پرانی محبت کی چنگاریاں تو ہوں گی... آگ نہ سہی۔"

"یہ بتایئے انہوں نے کوئی پیغام دیا؟"

توپ صاحب نے لاعلمی کے اظہار میں سر ہلایا۔ "واللہ اعلم... دیا ہوگا چوتھی منکوحہ کے لیے تو ہم سے ذکر نہیں کیا۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "توپ صاحب... آخر وہ کیوں ملنا چاہتا تھا مجھ سے... کچھ بتایا تو ہوگا اس نے؟"

"اونہوں... حالانکہ ہم نے پوچھا بھی تھا... اس کے جانے کے بعد ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا گویا... کہ اسے شک ہوگا تم پر۔"

"کیسا شک... یعنی اس کے داماد کو میں نے غائب کیا ہے... یعنی اغوا... میں کیا کروں گا اسے اغوا کر کے؟"

"قتل اور کیا۔" توپ صاحب نے میز پر مکّا مارا۔ "رقابت کے جذبات کا آتش فشاں کبھی سرد نہیں پڑتا۔"

"لاحول ولاقوۃ... رقابت تو ایک سو ایک سے تھی میری۔"

"یہ ہمیں مت بتاؤ... تمہارے سارے اخلاقی جرائم کا پورا ریکارڈ ہمارے پاس ہے گویا... نیب کی طرح۔" توپ صاحب نے پان کی ایک اور گلوری بنانے کے لیے اپنی سپیرے جیسی پٹاری کھولی اور مسکرائے۔ "مگر اس خیال کو خود ہم نے بھی مسترد کر دیا... تم قتل ہو سکتے ہو... قتل کر نہیں سکتے... تم بزدل ہو۔"

"توپ صاحب... اس لڑکی سے ہم شاید چار پانچ سال سے نہیں ملے۔"

"وہ تو جب سے صائمہ نے تمہیں نکیل ڈالی ہے، تم اور کسی لڑکی سے نہیں ملے... نازو تھی تمہاری ہم پیشہ۔"

"یہ لڑکی صحافت کو بدنام کرتی تھی۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "کسی شوبزنس اور فیشن کے میگزین سے وابستہ تھی... وہ بھی ایک نیک پروین نکالتی تھی شوقیہ... ڈرائنگ روم میگزین تھا... اس نے انٹرویو کیے کچھ اور ٹی وی شو... کچھ ہیرو اور دو چار ٹی وی پروڈیوسر اس کے چکر میں آگئے... اور بلیک میل ہوئے۔"

"فرض کرو اسی نے تمہیں مدد کے لیے بلایا ہو؟"

"آئی ایم سوری... میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"تم واقعی بزدل ہو... یاد کرو محمد بن قاسم کو ایک لڑکی نے پکارا تھا۔" توپ صاحب نے گلوری کو منہ کے دہانے میں داخل کیا۔ "اور وہ پہنچ گیا تھا اس کی مدد کے لیے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں محمد بن قاسم نہیں ہوں... لیکن دوسری بات زیادہ اہم ہے کہ صائمہ اس کا غلط مطلب لے گی۔"

توپ صاحب ہنسے۔ "دیکھو میاں صاحبزادے... وہ لڑکی خیر سے تمہارے مقابلے میں بہت سمجھ دار ہے... اور ہم بھی صحیح مطلب اسے سمجھا سکتے ہیں... تم فکر کرو کالی ڈاک کی..."

"کالی ڈاک؟"

"بلیک میل... بھئی اس کی مدد تم نے نیکی سمجھ کے نہ کی تو وہ تمہیں مجبور بھی کر سکتی ہے کہ میرے میاں کا سراغ لگاؤ... ورنہ میں بتاتی ہوں صائمہ کو... اس کے پاس بھی کچھ تو ہوگا گولہ بارود... بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا... چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط..." وہ منہ اوپر اٹھا کے بچّے کی طرح پھر ہنسے۔

میں نے مُردہ آواز میں کہا۔ "وہ ہے بھی ایسی ہی... خیر، میں معلوم کرتا ہوں صوفی سے مل کے۔"

"تم آئے تھے غالباً اپنا کالم دینے... نکالو۔"

میں نے جیب سے دو کاغذ نکالے... "آپ معاوضہ نکالیں۔ آئندہ سودا نقد ہوگا اور پیسے نہیں ہیں تو کالم کی جگہ خالی چھوڑ کے لکھ دیں... کالم نویس بہت خبیث ہے... مجھے پروا نہیں۔"

میرے عزمِ صمیم کو میری صورت سے جان کے توپ صاحب نے ایک آہِ سرد بھری اور گریبان میں ہاتھ ڈال کے واسکٹ کی جیب میں سے ایک ہزار کا مڑا تڑا نوٹ نکالا۔

"مطلب یہ کہ سابقہ حساب ختم؟"

"وہ پٹھان کے قرض کی طرح مع سود چلے گا اور اس رقم سے آپ کے قارئین آدھا کالم پڑھ سکتے ہیں۔" میں نے ایک صفحہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔

توپ صاحب پر رقت طاری ہونے لگی۔ "ہم مسلمان سمجھتے تھے تمہیں برخوردار... یہودی ہو تم تو پیسے کے معاملے میں..." پھر انہوں نے دوسری طرف ہاتھ ڈال کے

دوسرا نوٹ برآمد کیا۔ "اب آج رہے گا فاقہ ہمارا..."

میں نے نوٹ اچک لیا اور دوسرا کاغذ آگے بڑھا دیا۔

"یہ دو قدم پر داتا صاحب کا لنگر چلتا ہے... فاقہ کریں آپ کے دشمن... بریانی زردہ ملے گا۔"

سیڑھیوں سے نیچے اتر کے میں نے گھڑی دیکھی تو تین بجنے میں اب بھی ایک گھنٹا باقی تھا، چنانچہ میں نے راہِ عشق کی مسافت کو پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ نے مجھے آج سرخرو کیا۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ رئیسانہ شان کے ساتھ صائمہ کو لنچ کے لیے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی لے جا سکوں... گزشتہ روز جب میں نے اسے مدعو کیا تھا تو میری جیب میں تقریباً پچاس ہزار تھے اور میں سچ مچ کا رئیس تھا لیکن اس کے بعد تقدیر نے میرے ساتھ وہی کیا جو کرتی چلی آئی تھی... میری جیب میں مال آتے ہی جانے کیسے اس کی بو میرے دوستوں تک پہنچ جاتی تھی۔ رات بھر میرے ساتھ تاش کھیل کے صبح تک انہوں نے مجھے پھر پھکّو کیا اور چلتے بنے۔

میرے لیے اطمینان کی بات یہ بھی تھی کہ اس واردات کی خبر ڈاکٹر صائمہ کو نہ ہوئی... ہوتی بھی کیسے... وہ نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی پر تھی اور مارننگ میں کسی کولیگ کے نہ آنے سے اس کو ڈبل ڈیوٹی دینی پڑی تھی۔

ایک سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے صائمہ کی نئی فلم کا پوسٹر دیکھا جسے مصور نے رنگ اور برش کے کمال سے اتنا سنسنی خیز بنا دیا تھا کہ اپنے سید نور صاحب دیکھتے تو پینٹر کو انعام میں دو جوتے لگاتے کہ سالے... تیری بہن اتنی جوان بھی نہیں... ایک اور نام دیکھ کے میرا ذہن نازنین عرف نازو کی طرف چلا گیا... جس کا شوہر غائب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ثابت یہی ہوتا تھا کہ نازو نے شادی کر لی ہوگی ورنہ یہ شوہر کہاں سے آ گیا... نازو کا شمار ایسی نیک نام خواتین میں کیا جا سکتا تھا جو شوہروں کے معاملے میں حد درجہ فراخ دل ہوتی ہیں... اتنی کہ بعض اوقات ان سے نکاح کا تکلف بھی غیر ضروری سمجھ لیتی ہیں... بیوی ایسی ہو تو کسی بھی شوہر کا غائب ہو جانا سمجھ میں آتا ہے... انہیں کوئی اور ایسی ہی رحم دل خاتون گود لے لیتی ہے... مگر پھر نازو جیسی بیوی کسی ایک شوہر کے گم ہو جانے پر آہ و فغاں نہیں کرتی... بقول شاعر... اگر کھو گیا ایک شوہر تو کیا غم... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں... بعض اوقات ایسے مجازی خداؤں کا نام کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنسنی خیز خبر میں نظر آجاتا ہے... آشنا کے ساتھ مل کے شوہر کا قتل... دریافت بہر حال وہ ہو جاتے ہیں۔

نازو نے جب صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تو اس سے پہلے وہ ایک اور کہکشاں کی سیر کر چکی تھی... جنوبی پنجاب کے کسی قصبے سے وہ لاہور میں وارد ہوئی تو فلمی افق کا سب سے روشن ستارہ بن کے جگمگانا چاہتی تھی... آئینے کے سامنے تو بھینس بھی میک اپ کر کے خود کو دیکھے تو ملکۂ حسن سمجھے لیکن نازو یقیناً حسنِ دستیاب کا ایک انمول خزانہ اپنے ساتھ لائی تھی... صرف اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ فلم نگری میں کیسے کیسے لٹیرے شرافت کا لبادہ پہنے پھر رہے ہیں... اس کا خزانہ اعتبار پر لٹتا رہا لیکن وہ خود ایکسٹرا سے زیادہ کچھ نہ بن سکی۔

تجربہ خود سب سے بڑا استاد ہوتا ہے... نازو کے پاس تعلیم تو واجبی تھی لیکن ذہانت کی کمی نہ تھی۔ بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس زوال پذیر فلمی دنیا میں دولت مندی کے خواب کو تعبیر نہیں مل سکتی... اس نے ماڈلنگ کے شعبے میں طبع آزمائی کی جہاں نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آنے والے لٹیرے تھے... اس کے دو فوٹو سیشن ہوئے لیکن اپنی اصل پروفائل کے ساتھ منسلک دوسرے البم کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی... اسے اندازہ نہ تھا کہ کیمرے کی نظر بھی اتنی مردانہ ہوتی ہے۔

اب اس کے سامنے صرف منی اسکرین کی دنیا رہ گئی تھی... کسی وسیلے سے وہ ایک سوپ میں ثانوی حیثیت کا کردار حاصل کرنے میں تو کامیاب رہی لیکن اسے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ وہ پروڈیوسرز اور طبقۂ اشرافیہ کا فنی کلب ہے... دولت کمانے سے زیادہ دولت کما کر دینے والے اور خود اپنی دولت لٹانے والے ہی وہاں راج کرتے ہیں... ٹیلنٹ رکھنے والوں کو دربان اندر نہیں گھسنے دیتا... اپر کلاس کے لڑکے لڑکیاں وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں... یہ نازو کی آبزرویشن تھی جس سے جزوی طور پر اتفاق ضرور کیا جا سکتا ہے۔

ٹی وی پر نازو کے آخری مخلص عاشق نے اسے ایک کارآمد مشورہ دیا کہ وہ فلم جرنلسٹ بن جائے... اسے کچھ ٹپس کے ساتھ شوبز اور فیشن کے ایک نامور میگزین کا پتا دیا جس کے مالک اور مدیر فلمی دنیا کے ڈان سمجھے جاتے تھے اور شوبزنس کے لیے سالانہ ایوارڈ بھی دیتے تھے۔

یہ ناممکن تھا کہ مدیر محترم کو نازو کی فلمی و غیر فلمی پرواز کی ناکامی کا علم نہ ہو لیکن نازو نے ان کے سامنے بڑی معصومیت سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ صحافت کرنا چاہتی ہے تو انہوں نے بھی ازراہِ بندہ پروری نہ اس سے ڈگری کے بارے میں سوال کیا اور نہ ''تجربے'' کے بارے میں... انہوں نے صرف اس کے حسنِ دستیاب کو دیکھا جس میں اب تجربے کی آب و تاب بھی شامل ہو چکی تھی۔

صحافت کے میدان کا ایک نیا شاہ سوار میں بھی تھا جو ان کے معاون کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور شوبز کے روز و شب پر تین صفحے کا تہلکہ خیز اداریہ لکھنا میرے فرائضِ منصبی کا حصہ تھا جو ان کے نام سے شائع ہوتا تھا... اس کے علاوہ فلمی دنیا کی چیدہ چیدہ خبروں کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتا تھا اور کسی فلم پر تبصرہ بھی لکھتا تھا جس میں ایک بے سر و پا اور فضول فلم کو فلمی صنعت کے لیے باعثِ افتخار... ملک کا نام روشن کرنے والی کاوش اور آرٹ کا نمونہ قرار دیا جاتا تھا... اس کی موسیقی سے کہانی... فوٹوگرافی سے اداکاروں اور ڈائریکشن تک سب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینا میرا کام تھا جس کے مجھے پیسے ملتے تھے... اس شرمناک جھوٹ کا معاوضہ فلمساز ادا کرتا تھا... شرم نہ مجھے آتی تھی اور نہ مدیر محترم کو... انٹرویو وہ خود لیتے اور لکھتے تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھے اپنے آفس میں طلب فرمایا۔

''بدیع الزماں... ان سے ملو... یہ ہیں نازنین سبحان اللہ... انہوں نے ہمارا ادارہ جوائن کیا ہے۔''

میں نے خوش خلقی سے کہا۔ ''ویلکم مسز سبحان۔''

نازو نے سخت بُرا مانا۔ ''سبحان اللہ میرے والد کا نام ہے۔''

مدیر نے مجھے سرزنش کرنے والی نظر سے دیکھا۔

''انہوں نے ابھی صحافت میں سند لی ہے ماشاء اللہ۔''

جس حیرانی کی نظر سے خود نازو نے مدیر محترم کی طرف دیکھا، اس نے جھوٹ کا راز فاش کر دیا مگر میں چپ رہا کیونکہ مجھے اپنی نوکری عزیز تھی۔

''انہیں شوق بھی بہت ہے... تھوڑا سا عملی تجربہ چاہیے... آپ انہیں انٹرویو لینا سکھا دیجیے... میں چاہتا ہوں یہ ذمے داری ان کو سونپ دوں۔'' انہوں نے میری طرف ایک مربیانہ مسکراہٹ سے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کے پاس واقعی کام بہت ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کے کمرے میں جگہ ہے۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ جگہ تو دل میں ہونی چاہیے کیونکہ درحقیقت میرے کیبن میں دوسری میز کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن میں نے نازو کو اشارہ کیا۔ ''آپ آیئے میرے ساتھ۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ میرے آٹھ فٹ لمبے چوڑے کیبن میں میرے مقابل میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی... اس نے دلچسپی سے میز پر رکھی میرے نام کی تختی کو دیکھا۔ ''آپ نے یہ نام قد کی مناسبت سے رکھا ہے؟ بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔''

میں نے مسکرا کے اعتراف کیا۔ ''دلنواز میرا تخلص ہے۔''

''یعنی شاعر بھی ہیں آپ خیر سے؟''

''لالہ موسیٰ میں اس شاعر نے جنم لیا تھا... سب مل کے میرا یہ نام بن گیا۔''

''لالہ موسیٰ کی کیا چیز مشہور ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک تو نہیں ہے... میں مشہور ہونے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''ابھی تک آپ نے چائے کو بھی نہیں پوچھا... کیا لالہ موسیٰ والے مہمان نواز نہیں ہوتے؟''

''جو چائے یہاں ملے گی... وہ جیل میں قیدیوں کو دی جائے تو ان کی اصلاح ہو سکتی ہے... ہاں چند قدم کے فاصلے پر ہے ایک جگہ۔'' میں نے گھڑی دیکھ کے اداکاری کی... ''اس وقت میں لنچ کے لیے وہاں جاتا ہوں۔''

اس نے بیگ اٹھایا۔ ''تو پھر چلیے... بھوک مجھے بھی لگی ہے۔''

کھانا آنے سے پہلے میں نے اس کا رسمی سا انٹرویو لیا جس کا مقصد صرف دوستانہ مراسم استوار کرنا تھا۔ ''کچھ لکھا ہے آپ نے پہلے... کسی اخبار، رسالے میں؟''

پہلے اس نے نفی میں سر ہلایا... پھر شاید یہ جواب اسے غلط لگا۔ ''دو چار کہانیاں لکھی تھیں... ایک شائع ہوئی... ایک دو مضامین تھے خواتین کے مسائل پر... ان کی کوئی اہمیت نہیں۔''

اب میں نے بھی مربیانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''یعنی دلچسپی کی وجہ سے آپ نے صحافت میں ایم اے کیا؟''

''ایم اے... میں نے تو انٹر کا کورس کیا تھا۔''

میں تقریباً اچھل پڑا... پھر بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس نے انٹر کا امتحان تک نہیں دیا تھا... اس کی یہ صاف گوئی مجھے اچھی لگی... علاوہ اس کی نیلی آنکھوں کے... اس لٹ کے جو بار بار ماتھے پر جھومنے لگتی تھی... اس کے گریبان کی کشادگی کے... اور...

وہ بڑی ہونہار شاگرد اور بڑی ہوشیار استاد ثابت ہوئی... صرف دو ہفتے میں اس نے مجھے اپنے عشق میں یوں اسیر کر لیا جیسے مکڑی کے جالے میں مکھی... اور میں نے اسے فلمی انٹرویو لینے کے سارے اسرار و رموز سمجھا دیے... وہ میری ہدایات کے مطابق سوالات لکھ کے لے جاتی اور جوابات اپنے پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر پر لے آتی تھی... پھر میں عاشقانہ تندہی سے سارا زورِ بیاں صرف کر کے وہ انٹرویو لکھتا اور مدیر محترم اسے بڑے اہتمام سے نازو کی تصویر کے ساتھ شائع کرتے... چھ مہینے میں نازو ایک سکہ بند فلم ٹی وی جرنلسٹ بن چکی تھی۔

میں صبح دس گیارہ بجے اپنی موٹر سائیکل پر اسے گھر سے لیتا تھا... میری دوسری جنگِ عظیم کے دور کی یہ ٹرائمف اس زمانے میں واقعی چلتی تھی اور پھٹپھٹی کہلاتی تھی... کچھ عرصہ استاد بجلی (موت کے کنوئیں والا) اس کے ختم ہو جانے والے پرزے کباڑی بازار سے تلاش کر کے لاتا رہا... اب عرصہ دراز سے یہ اس کے کارخانے میں لاوارث کھڑی تھی اور اس کے پرزے پراسرار طور پر غائب ہوتے جا رہے تھے...

واپسی پر مدیر محترم نازنین کو اپنی کار میں اس کے گھر ڈراپ کرنے جاتے تھے... اس کا غریبانہ سا گھر مغل پورہ کی گھاس منڈی میں تھا لیکن وہ مجھے ہمیشہ سڑک پر کھڑی ملتی تھی... میرے پوچھنے پر اس نے رسمی سا جواب دیا تھا کہ گھر میں صرف میری فیملی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ گلی کا راستہ بہت تنگ ہے اور میں گھر تک گیا تو لوگ شک کی نظر سے دیکھیں گے...

پھر نازو نے آہستہ آہستہ رنگ بدلا... ایک بار وہ کسی ایکٹریس کا انٹرویو کر کے لائی تو کیسٹ میرے حوالے کر کے چلی گئی... جب میں نے سارے جوابات کو ترتیب سے اور بڑی خوب صورتی سے لکھ لیا تو اس نے پڑھنے کے بعد مجھے شکریے کا ایک ''بوسہ'' دیا اور دوسرا کیسٹ نکالا...

''اب اسے سنو... زیادہ دھیان سے... اور مجھے بتاؤ کہ یہ کس طرح انٹرویو کا حصہ بن سکتا ہے...''

میں نے کیسٹ سنا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے... یہ انتہائی پرائیویٹ قسم کے سوالات تھے جن کے جواب بھی اعترافِ جرم و گناہ سے کم نہ تھے... میرے نزدیک وہ سب ناقابلِ اشاعت تھا۔

''یہ انٹرویو تم نے کیسے کیا؟ میرا مطلب ہے...''

وہ ہنسی۔ ''مطلب میں سمجھاتی ہوں... اس ہیروئن نے مجھے روک لیا تھا کہ کھانا کھا کے جانا... درمیانی وقفے میں اس نے بہت پی لی۔''

میں نے کہا۔ ''اور تم نے...''

''ایمانداری کی بات ہے... میں نے پی مگر بہت

تھوڑی... مفت کی تھی نا... میرے لیے پوری طرح ہوش میں رہنا ضروری تھا... جب وہ مدہوش تھی تو میں نے یہ سوالات کیے... اس نے کہا کہ تم کیا مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو؟ میں نے کہا کہ انٹرویو تو کب کا ختم ہوگیا... یہ آپس کی بات ہے... آف دی ریکارڈ... وہ چکر میں آگئی... اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ایک خفیہ ٹیپ ریکارڈر میں نے کہاں چھپا رکھا ہے۔"

"کہاں چھپا رکھا تھا؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

اس نے مسکرا کے کہا۔ "یہاں... دل کے پاس۔"

میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب شائع نہیں کیا جاسکتا..."

"کیوں؟ اس میں کوئی جھوٹ تو نہیں..."

"لیکن یہ رنگین راتوں کے پُرگناہ اعترافات... فحاشی کے زمرے میں آتے ہیں... اور فرض کرو ہم زبان و بیان کو شائستگی عطا کردیں... پھر بھی ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"ہم تو وہی لکھیں گے جو اس نے خود کہا..."

"اُفوہ نازو... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو... اوّل تو وہ خود انکار کردے گی... کہے گی یہ میری آواز ہی نہیں... جعلسازی ہے... ہم کیسے ثابت کریں گے عدالت میں کہ آواز اسی کی ہے... کورٹ میں ٹیپ کی گواہی کو قابلِ قبول بنانے کے لیے کسی ماہر ساؤنڈ ریکارڈنگ انجینئر کی گواہی کی ضرورت پڑے گی جو بیان حلفی دے کہ ٹیپ اصلی ہے... اس میں کوئی تبدیلی یا ایڈیٹنگ نہیں کی گئی..."

"فرض کرو ریڈیو سے یا ٹی وی سے انجینئر مل جائے؟"

"ان سے کون نمٹے گا... جن کے نام اس ٹیپ میں لیے گئے ہیں؟ ان کی طرف سے قانونی نوٹس الگ ہوں گے کہ ان کی عزت کو داغ دار کیا گیا..."

"اس سے پبلسٹی کتنی ملے گی..."

"لیکن اس انٹرویو کی اشاعت کے بعد کوئی تمہیں انٹرویو نہیں دے گا... یہ سوچا ہے تم نے... اور چھوڑو قانونی مسائل کو... غیر قانونی دھمکیوں سے کون نمٹے گا... یہاں غنڈا گردی کا راج ہے..."

وہ کچھ مایوس ہوئی۔ "اچھا... تم کہتے ہو تو..."

میں نے کہا۔ "نازو... یہ انٹرویوز دیتے ہیں اپنی پبلسٹی کے لیے، بدنامی کے لیے نہیں... حقیقت سب جانتے ہیں کہ انٹرویو میں پارسا اور فنکار بننے والی حقیقت میں کیا ہیں... اونچے درجے کی طوائفیں... چند ایک کے بارے میں تو مشہور ہے کہ نجی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے لاکھوں لیتی ہیں۔"

"میں نے ایک ایسا ہی مجرا دیکھا بھی ہے..."

میں حیران رہ گیا۔ "یعنی تم بھی شریکِ محفل تھیں؟"

وہ ہنس پڑی۔ "بھولے بادشاہ... مجھے کیا پتا تھا کہ شادی کے جشن میں یہ بھی ہوگا... اس فنکارہ کا رقص دیکھنے والے بڑے معزز لوگ تھے... ممکن ہے اس کی بھی ریکارڈنگ موجود ہو..."

"ضرور ہوگی ان کے پاس... لیکن انٹرویو کا یہ حصہ کسی صورت شائع نہیں ہوسکتا... تم چاہو تو مدیرِ اعلیٰ صاحب سے بھی مشورہ کرلو..." میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

انٹرویو اتنا ہی شائع ہوا جتنا میں نے لکھ کر دیا تھا... ابھی ایک مہینا ہی ہوا تھا کہ وہ اگلے شمارے کے لیے ایک اور انٹرویو لے آئی جو پھر دو حصوں پر مشتمل تھا... ایک اوپن اور دوسرا خفیہ... اس مرتبہ انٹرویو دینے والا کوئی ہیرو تھا جس نے کھل کر اعتراف کیا کہ اس نے کسی کو نہیں چھوڑا... وہ خود کے کہاں لے جاتا رہا... دبئی سے پیرس تک اس نے کے کتنی شاپنگ کرائی... کس ہوٹل میں رہے... یہاں کون اسے اپنی خواب گاہ میں بلاتی رہی... وہ خوب بڑھا چڑھا کے بتاتا رہا...

مجھے شک ہوا... "یہ نشے میں تو نہیں ہے؟"

"نہیں..."

"ٹیپ میں پہلے گیارہ گھنٹے سنائی دیے... پھر بارہ... یہ دن کا وقت تو نہیں ہوسکتا..."

وہ کچھ نروس ہوئی۔ "کیوں نہیں ہوسکتا؟"

"اس لیے کہ میں ان کے معمولات جانتا ہوں... ان کی صبح ہی بارہ ایک بجے کے بعد ہوتی ہے... تم نے ایڈیٹنگ بھی کی ہے..."

اس نے ٹیپ مجھ سے واپس لے لیا۔ "چھوڑو یہ سب... جب شائع نہیں ہوسکتا تو بیکار ہے... ایڈیٹنگ میں نے کوئی نہیں کی... وہم ہے تمہارا..."

لیکن میں جانتا تھا کہ اس نے ایک ٹیپ سے دوسرا تیار کیا ہے اور اس میں سے اپنی آواز نکال دی ہے... ہیروئن سے سوالات کرنے والی وہ خود تھی... اس میں صرف ہیرو کے جواب تھے اور اس میں بھی جگہ جگہ آواز کٹ جاتی تھی... اس کے باوجود میں نے سب سمجھ لیا... یہ ایک رات کا افسانہ تھا جو نازو نے ہیرو کے ساتھ گزاری تھی... نازو نے اپنی آواز ہی نہیں، اپنا نام بھی ٹیپ سے نکال دیا تھا... آخر وہ کس سے باتیں کررہا تھا؟ اپنے آپ سے؟

مزید غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ اس کی مخاطب کوئی عورت تھی اور یہ عورت نازنین کے سوا اور کون ہو سکتی تھی... نازنین کوئی پروفیشنل نہیں تھی... اگر یہی کام وہ کسی ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے کراتی تو وہ اصل سے دوسری کاپی بنا کر دیتا جس میں صرف ہیرو کے اعترافات رہ جاتے۔

شاید بعد میں نازنین کو بھی احساس ہوا ہوگا کہ اس نے مجھے یہ ٹیپ سنا کے غلطی کی تھی... وہ مجھ سے کچھ کھنچ سی گئی اور اگرچہ میرے لکھے ہوئے انٹرویو میں ایسی کوئی قابلِ اعتراض بات شامل نہیں ہوئی جو کسی کے لیے بھی باعثِ رسوائی ہوتی یا جس سے رسالے کو ہتکِ عزت کا قانونی نوٹس موصول ہو جاتا... لیکن نازنین کا کردار مجھ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا... جب وہ کسی ہیرو یا شوبز کی کسی نامور شخصیت کا انٹرویو لیتی تھی تو خود کو چارے کے طور پر استعمال کرتی تھی اور قربت کے لمحات میں بہت کچھ پوچھ لیتی تھی جو رسمی انٹرویو کے ماحول میں نہیں بتایا جاسکتا تھا... یہ سرخوشی، اپنائیت اور سرور کے لمحات ہوتے تھے جن میں نازنین سب اگلوا لیتی تھی... اور کہنے والا اسی بھروسے میں سب کہہ جاتا تھا کہ یہ تو آف دی ریکارڈ ہے اور آپس کی بات ہے... ایسے میں مائک یا ٹیپ ریکارڈر وہ کہاں رکھتی تھی؟

نازنین خود بخود مجھ سے دور ہوگئی... یا یوں کہنا چاہیے کہ میں محتاط ہوگیا... پھر یکے بعد دیگرے دو واقعات پیش آئے... ایک رات مجھے خیال آیا کہ مجھے نازنین کے فیملی بیک گراؤنڈ کو دیکھنا چاہیے... صبح میں طے شدہ وقت سے بہت پہلے گھاس منڈی سے اندر جانے والی تنگ سی سڑک پر جا کھڑا ہوا... میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس گلی سے نمودار ہوتی ہے... میری قسمت اچھی تھی کہ میں نے اسے ایک گلی سے نکل کر بیکری تک جاتے دیکھ لیا... اس نے ناشتے کا کچھ سامان لیا... ڈبل روٹی... انڈے اور مکھن وغیرہ... اور واپس گئی تو میں نے پیچھے سے اس کو ایک گھر میں داخل ہوتے دیکھا پھر میں سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا... وہ مقررہ وقت پر بیگ جھلاتی اور مسکراتی نمودار ہوئی تو میں اسے آفس لے گیا...

ابھی میری شناسائی کے دائرے میں دوست کم تھے... دوپہر کے کھانے کے لیے میں پریس کلب جاتا تھا تو اس کے دو سبب تھے... ایک تو وہاں کھانا اچھا اور سستا ملتا تھا... دوسرے اپنے ہم پیشہ لوگوں سے تعارف حاصل کرنے کے لیے وہ جگہ ایک مرکز کی حیثیت رکھتی تھی... ایک مقامی شام کے اخبار کا نیوز ایڈیٹر نثار حسین بھی میری طرح کامیاب ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا... وہ خوش مزاج اور بے تکلف آدمی تھا... شام کا کہلانے والا اخبار گیارہ بجے مارکیٹ میں آجاتا تو اسے فراغت ملتی تھی اور وہ بھی وہاں کھانے کے وقت موجود ہوتا تھا...

اپنے آفس سے فون کر کے میں نے نثار کو نازنین کے بارے میں بتایا... "کوئی ایسا رپورٹر ہے جو اس کے بیک گراؤنڈ کی تفتیش کرسکے؟"

وہ ہنسا۔ "یار! کسی اور کی کیا ضرورت ہے جب ہم ہیں... آج تو میں خود ایک نازنین کے چکر میں جارہا ہوں... کل بتاؤں گا..."

نثار اگلے دن کچھ تاخیر سے آیا، جب میں کھانا کھا چکا تھا اور اس کی طرف سے ناامید ہوگیا تھا... "معاف کرنا یار! اخبار کی کاپی کچھ دیر سے گئی... پھر میں گیا مغل پورے... وعدہ جو کیا تھا تم سے... لیکن بھائی میں زندہ رہا تو تمہیں کچھ بتاؤں گا... میں بھوک سے مرنے والا ہوں۔"

"یہاں اب کیا بچا ہوگا... چلو رشوت میں آج لنچ میری طرف سے کسی ریسٹورنٹ میں..."

اس نے انکار کردیا۔ "وہ پھر کبھی سہی... یہ جو تمہاری نازنین ہے دوست... بڑی پُراسرار چیز ہے... اور خطرناک بھی... اس گھر میں سال بھر سے کرائے دار ہے... میں مالکِ مکان سے ملا... ایک ریٹائرڈ پنشنر ہے اور اس کی چالیس سال پرانی گھر والی... بچے ان کے ساتھ نہیں رہتے... میں نے ہوا میں تیر چلایا کہ سنا ہے آپ کے مکان کا اوپر والا حصہ کرائے پر خالی ہے... انہوں نے کہا کہ ہے تو نہیں مگر ہونے والا ہے... میں نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اوپر لے گئے... نازنین سال بھر پہلے اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی جس کا نام اس نے بختیار بتایا تھا... ان کی نئی شادی ہوئی تھی... شوہر مغل پورہ ورکشاپ میں ملازم تھا اور ہر ہفتے اس کی شفٹ بدل جاتی تھی پھر وہ اوورٹائم بھی لگاتا تھا کیونکہ آمدنی کم تھی چنانچہ بعد میں وہ نظر نہیں آیا... وہ خود جلدی سو جاتے ہیں، اس لیے کرائے داروں کے معاملات سے سروکار نہیں رکھتے... خود نازنین کسی اسپتال میں نرس ہے اور اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے... یعنی اس کے جانے کا وقت تو مقرر ہے مگر واپس آنے کا نہیں... میاں بیوی شریف اور بے ضرر لوگ ہیں... کبھی کبھار لڑکی کے میکے سے کوئی آجاتا ہے، اس کا بھائی یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کزن... ورنہ میاں بیوی ہیں... کرایہ وقت پر دیتے ہیں اور ڈسٹرب بالکل نہیں کرتے...''

''اور تمہارا کیا خیال ہے؟''

''وہی جو تمہارا ہوگا... یہ سب جھوٹ ہے...'' نثار نے دروازے میں نمودار ہونے والے ایک شخص کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا...''یہ طلعت حسین ہے...''

''میں جانتا ہوں... فلم ایڈیٹر ہے۔''

''اس ملک کے سب سے بڑے ویکلی میں... بڑی چیز ہے... فلم انڈسٹری کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا... نازنین گھر چھوڑ کے جارہی ہے... اس نے مالکِ مکان کو نوٹس دے دیا ہے۔''

''یہ بہت چکر باز لڑکی ہے... بلکہ خطرناک...''

نثار نے دو کپ چائے منگوائی۔ ''تو بھی اس کے چکر میں تھا؟''

''اسی لیے تو پریشان ہوں... اگر اس نے اپنی اور میری باتیں ریکارڈ کرلی ہوں گی... میرے اپنے فلیٹ میں... تو وہ بلیک میل بھی کرسکتی ہے... میں نے بڑی اونچی چھوڑی تھیں... صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سچی محبت مجھے صرف اس سے ہوئی ہے۔''

نثار ہنسا۔ ''یار! تیرا کون سا گھر بار ہے یا بیوی بچے ہیں... تو کیوں ڈرتا ہے... وہ تجھے بلیک میل نہیں کر سکتی...''

''میں نے بہت جھوٹ بولا تھا...''

''یار! اس کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا... سچی محبت والے سارے ڈائیلاگ... قسمیں وعدے... سنہری مستقبل کے خواب... تارے توڑ کر لانے سے جان دینے تک کی باتیں... یہ سب تو کرنا پڑتا ہے بھائی...''

''اللہ تیرا بھلا کرے... تو آدمی سیانا ہے...''

اس نے میری بات کاٹ کے طلعت حسین کی طرف ہاتھ ہلایا۔ ''یار! ذرا اس سے بھی پوچھ لیں... یہ بڑا عالم فاضل شخص ہے...''

طلعت حسین نے کھانا کھالیا تھا۔ وہ چائے کا کپ اٹھا کے ہمارے پاس آبیٹھا... نثار نے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ ہے بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی... نیا کھلاڑی...''

طلعت حسین مسکرایا۔ ''دیکھا ہے میں نے پہلے بھی... لیکن اتنا بڑا نام رکھنے سے یہ بڑے صحافی تو نہیں بن سکتے... قلمی نام سوچو...''

''یہ ابھی شہاب حیرانوی کے ساتھ ہے...''

میں نے کہا۔ ''میرا کوئی ارادہ نہیں ہے وہاں رہنے کا...''

''وہ ہے دو نمبر آدمی... شہاب کیرانوی کے نقشِ قدم پر چلنے والے کے پاس وہ خداداد صلاحیت بھی تو ہونی چاہیے... صرف ملتا جلتا نام رکھنا تو ایسے ہے جیسے ہمارے ملک میں نیشنل اور سونی جیسے ناموں کو جعلساز بے دریغ استعمال کررہے ہیں... تمہیں بلیک میلنگ سے مال کمانا ہے تو لگے رہو ان کے ساتھ... صحافت کرنی ہے تو وہاں سے نکلو۔''

میں نے کہا۔ ''نکل کے کہاں جاؤں...؟''

نثار نے کہا... ''یہ کالم لکھ سکتا ہے... مزاحیہ قطعات بھی... لیکن ابھی تک بات بنی نہیں... میرا تو اخبار ہی چیتھڑا ہے... تم کچھ کرو یار...''

طلعت حسین نے سر ہلایا... ''وہاں سب کچھ تم ہی لکھتے ہونا... اداریہ بھی اور نازنین کے نام سے شائع ہونے والے انٹرویو بھی...؟''

میں نے خفت سے کہا... ''مجبوری ہے...''

''تمہیں معلوم ہے یہ شہاب حیرانوی صاحب اس لڑکی نازنین کو کیسے استعمال کررہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جیسے سب کرتے ہیں...''

طلعت حسین ہنس پڑا۔ ''وہ گولی ہے گولی... اور حیرانوی صاحب خوب نشانے لے کر فائرنگ کرتے ہیں... وہ خود پستول بنے ہوئے ہیں اور اسے خوب استعمال کررہے ہیں... دن میں الگ رات میں الگ...''

میں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کہا۔ ''فائرنگ کی زد میں کون آرہا ہے... وہی جن کے نازنین نے انٹرویو لیے ہیں...''

''ظاہر ہے انٹرویو میں نے پڑھے ہیں... بظاہر ان میں کوئی ایسی بات نہیں... روایتی سوال جواب ہیں... لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہے غیر مطبوعہ...''

''وہ میں آپ کو بتاتا ہوں...'' میں نے کہا۔

طلعت حسین نے میری بات دلچسپی سے سنی... ''یعنی میرا اندازہ ٹھیک تھا... تم نے تو اسے اپنی طرف سے ٹھیک ہی سمجھایا تھا، دراصل تم نے رکھا اپنے کام سے کام...''

نثار نے ایک آہ بھری۔ ''یہ خود اس کے چکر میں پڑ گیا تھا... اور اب اسے خوب چکر آرہے ہیں... متلی بھی محسوس ہوتی ہے...''

''تیسرے مہینے میں ایسا ہوتا ہے...'' میں نے جھینپ کے کہا۔ ''یہ مارچ کا مہینا ہے نا...''

طلعت حسین مسکرایا۔ ''ابھی کچھ دن لگیں گے اس دنیا کو سمجھنے میں... اور صحافی بنتا ہے وہی جس کو کھجلی ہو... کیا تم نے کبھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی... نہیں کی ہوگی... تم خود جو اس کے عشق کے گٹر میں گر چکے تھے...''

میں نے کہا۔ ''استادِ محترم! میری آنکھیں کھولنے کے لیے آپ کی بصارت ہی کام آسکتی ہے...''

طلعت حسین پھر ہنسا۔ ''یہ لڑکی آئی تھی جنوبی پنجاب کے ایک قصبے سے... جب سے یہ کیبل آیا ہے گھر گھر کی کہانی وہی ہے... سب لڑکیاں خود کو مادھوری سمجھنے لگی ہیں... شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی فلمی گانوں پر لڑکیوں کا ڈانس عام سی بات ہوگئی ہے... ننانوے فیصد صرف سوچتی ہیں اور خواب دیکھتی ہیں شوبزنس کی چکا چوند کے... پھر ان کی راہ میں ظالم سماج یا ماں باپ آجاتے ہیں اور اسے کسی شوہر کے سپرد کردیا جاتا ہے جو اسے لگا دیتا ہے امورِ خانہ داری اور بچے پیدا کرنے میں... مگر ایک فیصد میں نازنین جیسی ہوتی ہیں جو فرار ہو کے لاہور آجاتی ہیں... ان کا انجام کیا ہوتا ہے... ہم سب جانتے ہیں... نازنین ذرا ہوشیار تھی... خوب صورت ہونے کے علاوہ... نازنین کسی دلال کے ہتھے نہیں چڑھی... شہاب حیرانوی صاحب کے پاس پہنچ گئی... وہاں تم نے جو کیا سو کیا... اصل کام خود اس نے کیا... راستہ اسے حیرانوی صاحب نے دکھایا... اس نے انٹرویو کے غیر مطبوعہ قصے کو بڑی ذہانت سے استعمال کیا اور میری معلومات کے مطابق... ایک ہیرو سے اس نے کئی لاکھ طلب کیے...''

''لیکن یہ فلمی اسکینڈل تو ان کی پبلسٹی کا ذریعہ بن جاتے ہیں...''

''اس نے کچھ پردہ نشینوں کے نام لیے تھے... جو اثر رسوخ اور عزت دار گھرانوں کی لڑکیاں تھیں... ایک کسی ڈی آئی جی کی بیوی بھی تھی... ایک سندھی وڈیرے کی بیٹی تھی... ہیرو مارا جاتا... اس نے حیرانوی صاحب سے فریاد کی اور حیرانوی صاحب نے مک مکا کرادیا... وہ ثالث بھی بنے اور ضامن بھی... دس لاکھ میں خاموشی سے معاملہ طے پا گیا... ایسا ہی دوسروں کے ساتھ ہوا ہوگا... مجھے تفصیلات کا علم نہیں کہ کس سے نازنین نے کتنے مانگے تھے اور حیرانوی صاحب نے کتنے میں بات ختم کرائی... میرا اندازہ ہے کہ پہلی کامیابی سے نازنین کا حوصلہ بڑھا ہوگا... ممکن ہے دوسری بار اس نے بیس لاکھ وصول کرلیے ہوں... جو انٹرویوز شائع ہو چکے ہیں ان سے نازنین کم سے کم بھی ایک کروڑ تو کما چکی ہے...''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''ایک کروڑ... اور ابھی تک زندہ ہے؟''

''اس کے پیچھے شہاب حیرانوی کھڑا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں سے نازنین کو کیا ملا ہوگا؟''

''ان کے درمیان ففٹی ففٹی کا معاہدہ ہے... نازنین کو پچاس لاکھ ملے ہوں گے... لیکن تم لکھ لو... یہ کھیل زیادہ دن چلنے والا نہیں ہے... بہت جلد نازنین غائب ہو جائے گی... شہاب حیرانوی نے سب سے کہا تھا کہ وہ نازنین کو برطرف کردیں گے... لیکن ایسا ہوا نہیں... یہ سب جانتے ہیں... حیرانوی صاحب کی گڈول داؤ پر لگ گئی ہے... انہیں رہنا ہے فلمی دنیا میں تو ستاروں سے بگاڑ کیسے مول لے سکتے ہیں... ان کا ثالث اور ضامن والا ڈراما فلاپ ہو گیا ہے... انہیں پچاس لاکھ مل گئے... دوبارہ اپنی ساکھ بنانے کے لیے وہ نازنین کی چھٹی کردیں گے...''

''اسے وہ مروا بھی سکتے ہیں...'' میں نے کہا۔

''یہ ناممکن نہیں... شک جائے گا ان کی طرف جو بلیک میل ہوئے تھے... فلمی دنیا میں سب ایک دوسرے کے مخالف یا دشمن نہیں ہوتے... ایک نے کسی دوسرے کو رازدار بنالیا... جیسے پہلے کیس میں جو ہیرو تھا... اس نے میرے سامنے دس لاکھ دینے کا اعتراف کیا تھا... نازنین کی خوش قسمتی ہوگی اگر وہ پچاس لاکھ لے کر نکل گئی...''

طلعت حسین کے انکشافات نے میری بھی نیندیں اڑا دی تھیں... میں ڈرتا تھا کہ نازنین پھر نازل نہ ہو جائے اور مجھے مجبور کرے کہ میں اس کی روپوشی میں مدد کروں... ابھی میں بدنامی کے کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا جس سے میرے کیریئر کی نیک نامی پر حرف آئے... ٹھیک ایک ہفتے بعد نازنین غائب ہوگئی تو مجھے طلعت حسین کی پیش گوئی نے حیران کردیا... ایک مہینے بعد مجھے شام کے ہی ایک اخبار میں جگہ مل گئی... نہ میرے مزاج میں مستقل مزاجی تھی اور نہ وہ پیشہ ورانہ ڈسپلن جو کاروباری دنیا میں کامیابی کے لیے ڈگری سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے... غیر ذمے دارانہ رویّے اور کاہلی پر مجھے کئی جگہ سے نکالا گیا اور میں گھومتا پھرتا توپ صاحب کے اخبار ''حقیقت ساز'' میں پہنچ گیا جہاں انہوں نے بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی کے ابتدائی حروف لے کر مجھے بزدل بنادیا... پھر میری بے راہ روزندگی کی لگام ڈاکٹر صائمہ کے ہاتھوں نے یوں تھامی کہ میں ساری بے راہ روی بھول گیا... نازنین مجھے کہاں یاد رہتی جو ماضی کی گرد میں گم ہوچکی تھی...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک بار کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کراچی میں ہے اور اپنے سے دگنی عمر کے کسی مارواڑی میمن ٹائپ شخص کی شاندار مرسیڈیز سے اتر کے کسی شاپنگ مال میں جارہی تھی... پھر کسی نے اسے لندن میں دیکھا... طلعت حسین کی انٹیلی جنس نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ فی زمانہ وہ بڑے بڑے کاروباری اداروں کے سربراہان کی سیکریٹری... داشتہ اور بیوی وغیرہ بن کے شاہانہ زندگی گزار رہی ہے... دولت مندی اس کا واحد مقصدِ حیات تھا چنانچہ وہ رنگ... عمر یا نسل اور مذہب وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتی... عیاش دولت مند کوئی بھی ہو... بس اس کی نبض چل رہی ہو... میں نے ایسی تمام اطلاعات کو بالکل اہمیت نہیں دی... اس بات کا زیرو پرسنٹ بھی امکان نہ تھا کہ وہ پھر میری زندگی میں قدم رنجہ فرما سکے۔

لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ میرے اور اس کے راستے پھر مل گئے ہیں اور میری چھٹی حِس کسی ٹیلی کام کے اشتہار کی طرح میرے کان میں چلاّ چلاّ کے کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے... نازنین کا مجھے یاد کرنا بے سبب نہیں ہو سکتا... چور جو میرے دل کے اندر برسوں سے دبکا بیٹھا تھا، اب پکڑے جانے کے ڈر سے کانپ رہا تھا۔

ہاسٹل کے گیٹ پر پہنچ کے میں نے صائمہ کو فون کیا تو اس نے کال ہی ریسیو نہیں کی... دوسری اور تیسری بار بھی جواب وہی ملتا رہا... آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے فی الحال جواب موصول نہیں ہو رہا... ہاسٹل کے وردی اور دو طرفہ برش ٹائپ مونچھوں والے بلوچ دربان کے اور میرے مراسم اس ریپیٹر سے زیادہ خطرناک تھے جو وہ آلۂ قتل کے طور پر میرے سامنے لہراتا رہتا تھا... وجہ صرف یہ تھی کہ وہاں ملاقات کے لیے آنے والے دیگر عاشقوں کی طرح میں اسے پیغام پہنچانے اور اپنی آمد کی اطلاع دینے پر کوئی نذرانہ پیش نہیں کرتا تھا... دروازے کے سامنے کیا، اس کا بس چلتا تو وہ مجھے سڑک پر بھی کھڑا نہ رہنے دیتا...

میں نے مایوس ہو کے غزالہ کا نمبر ملایا، اس نے بھی فون ریسیو کرتے ہی بڑی بے مروتی سے کہا۔ ”صائمہ ڈبل ڈیوٹی دے کے آئی تھی... اب سو رہی ہے۔“

”دیکھو... تم اس کی عزیز سہیلی اور نائب محبوبہ ہو میری... میرے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہو کہ اسے جگا دو... بہت ضروری کام ہے۔“

”اس نے کہا تھا کہ فرشتۂ اجل بھی آئے تو مجھے مت جگانا... مگر آپ کی آواز میں جو درد ہے... اس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہے... بتائیے کام کیا ہے؟“ وہ عیاری سے بولی۔

”کام کیا ڈاکٹر غزالہ... اسے میرے ساتھ لنچ پر جانا تھا۔“

”یہ کام تو آپ کی خاطر میں بھی کر سکتی ہوں... پھر اس نے کھانا بھی کھا لیا تھا... ہاں، میں اب جا رہی تھی... آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔“

میں نے ایک آہ بھری... ”ٹھیک ہے... آپ آجائیے... میں نیچے کھڑا ہوں۔“

”میں آپ کو کھمبے کے ساتھ کھڑا دیکھ رہی ہوں بزدل صاحب... صرف دس منٹ دیں مجھے تیاری کے لیے... ہاں... ہم لنچ کہاں کریں گے؟“

”وہیں... کیفے ڈی پھونس آف گولی مار...“ میں نے کہا اور فون بند کر کے چل پڑا کیونکہ مجھے معلوم تھا اب نہ محبوبہ آئے گی نہ اس کی قائم مقام... پیدل چلنے سے میری بھوک چمک اٹھی تھی لیکن اب نہ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جانے کا امکان باقی رہا تھا اور نہ اس وقت پریس کلب میں کھانا ملنے کی امید تھی۔

اچانک مجھے مولوی سبحان اللہ کا خیال آیا... اس کا مرقد مبارک بھی زیادہ دور نہیں تھا... میں ایک ہاتھ سے برنس روڈ کا شہرۂ آفاق انڈے والا برگر کھاتے ہوئے نقلی کوک پی رہا تھا کہ وہ سمندری ہوا سے لہراتی داڑھی کے ساتھ میرے سامنے سے گزرا۔

”سبحان اللہ...“ میں نے چلاّ کے کہا۔

برگر والے کی بتیسی نمودار ہوگئی۔ ”اپنا برگر جو کھاتا ہے یہی کہتا ہے...“

میں مولوی کے پیچھے دوڑا تو برگر والا میرے پیچھے۔

”ابے بوتل تو دے جا۔“

میرے دوسری بار پکارنے پر مولوی سبحان اللہ رک گیا اور میرے اچانک رکنے سے برگر والا مجھ سے ٹکرایا... بقیہ برگر نگل کے میں نے بوتل حلق میں انڈیلی اور اپنے سے نصف قد کے برگر فروش کو پوری قیمت دے کر چل پڑا۔

”آج تم مجھے پوچھتے ہوئے میرے آفس کیوں گئے تھے مولوی امان اللہ؟“

اس نے مجھے دکھی نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے سبحان اللہ کی جگہ امان اللہ کہنے سے تم نے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا... مگر میں معاف کرتا ہوں۔“

”غالباً معاف کرنے کے تم عادی ہو... اپنی بیٹی کے

ہر گناہِ کبیرہ کو معاف کرتے رہے تھے... خیر، یہ بتاؤ کہ نازنین کا شوہر غائب ہو گیا ہے تو کیا میں نے کیا ہے؟ میں کیا کروں؟“

”تم اسے تلاش کرو۔“

”کہاں تلاش کروں... اپنی جیب میں یا اپنے گھر میں... وہ خود کوئی اور شوہر تلاش کیوں نہیں کر لیتی؟“

مولوی سبحان اللہ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ سب مجھ سے کہنے کا فائدہ؟ نازنین سے بات کرو... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ خود بزدل سے کہیں... یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا... میرا کام تھا یہ پیغام پہنچانا۔“

میں نے کہا۔ ”وہ خود بھی تو مجھ سے بات کر سکتی تھی... میرے آفس کا فون نمبر اسے معلوم ہوگا۔“

”نازنین کا خیال تھا کہ تم اس سے بات نہیں کرو گے... اور ایک ایسی بات تھی جو وہ فون پر کہنا بھی نہیں چاہتی تھی...“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”لیکن تم کہہ سکتے ہو وہ بات...“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اس نے کہا تھا کہ ابا جی! اس بزدل کو میری طرف سے سمجھا دینا کہ اگر اس نے فوراً مجھ سے بات نہ کی تو پھر میں صائمہ جی سے بات کروں گی... صائمہ کیا آپ کی والدہ ماجدہ کا نام ہے؟“

میں نے جز بز ہو کے کہا۔ ”بکواس مت کرو... اور کیا کہا تھا اس نے... کیا دھمکی دی تھی؟“

”یہ کہا تھا کہ وہ تمہارے سارے کرتوت صائمہ جی کو بتا سکتی ہے... اس کے پاس سارے ثبوت ہیں۔“

میرا دل بیٹھ گیا۔ بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا... وہ زمانہ اور تھا جب میں بلیک میل ہونے سے ڈرتا نہیں تھا... یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جوان تھا اور وہ میرے خلاف کچھ بھی کہتی، میرے ہم عمر یار دوست اس پر مجھے گلے لگا کے مبارک باد دیتے... اب میں صائمہ کی محبت میں اس کا بندۂ بے دام تھا جسے میں ہر جھوٹی قسم اٹھا کے یقین دلانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی وہی ہے... اس کے ملنے سے پہلے تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لڑکی ہوتی کیا ہے... اس نے دل سے مان لیا تھا کہ گو زمانہ بہت خراب ہے لیکن بقول شاعر... ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں... اور ایسا ہی ایک معصوم اور بھولا بھالا نمونہ قدرت نے بزدل کے روپ میں اسے عطا کر دیا ہے۔

میرے تو کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا... نازنین کے آڈیو ویڈیو ثبوت ملاحظہ فرمانے کے بعد صائمہ نے مجھے زہر کا انجکشن نہ لگایا تو اپنی محبت سے ضرور عاق کر دے گی... وہ تو ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے... ایسے الزام کے بعد قیامت تک اسے منانا مشکل ہوگا۔

شیر کی طرح غرانے والے بزدل کے حلق سے دوبارہ جو آواز نکلی وہ بلی جیسی تھی۔ ”صوفی صاحب... میں اس سے کہاں بات کروں؟“

”اس کے فون پر۔“ صوفی کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”نمبر نہیں ہے تو مجھ سے لے لو۔“

جب صوفی چلا گیا تو میں کچھ دیر کاغذ کے اس پرزے کو دیکھتا رہا جس پر نازنین کا موجودہ موبائل نمبر لکھا ہوا تھا... برنس روڈ پر بہت شور تھا... میں نے اس نمبر کو اپنے موبائل فون میں سیو کیا اور پریس کلب کی طرف چل پڑا جو وہاں سے نزدیک ہی تھا... مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت وہاں بہت کم لوگ ہوں گے اور مجھے کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کے نازنین سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

ہیلو کے جواب میں میری آواز سنتے ہی اس نے کہا۔

”تھینک یو بزدل!“

میں نے طنز سے کہا۔ ”شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مجھے یاد رکھا... اور یاد کیا...“

اس نے میرے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کر دیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم مجھے ضرور کال کرو گے۔“

”تمہارے پاس یقین کے ٹھوس اسباب تھے... اور تم جانتی ہو کہ میں بزدل ہوں۔“

”نہیں... میں جانتی ہوں کہ تم صرف نام کے بزدل ہو... میں نے دیکھے ہیں بڑے بڑے نام کے بہادر خاں۔“

”ضرور دیکھے ہوں گے... اور استعمال کر کے بھی دیکھے ہوں گے... تم محض سنی سنائی پر تو ایسا نہیں کہہ رہی ہو... عملی تجربہ...“

”دیکھو، فون پر یہ سب کہنے کا کیا فائدہ... کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا...“

”مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا...“ میں نے گویا شعر مکمل کر دیا۔ ”دیکھو، اس وقت میں بڑی مشکل میں ہوں۔“

”یہ بات مجھے انہونی سی لگتی ہے... خربوزے سے چھری کہے کہ میں کٹ رہی ہوں... مشکل میں تو تمہاری وجہ سے لوگ پڑتے رہے ہیں... گو میری باری ذرا دیر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئی... جب مجھے یہ خوش فہمی ہونے لگی تھی کہ میں خوش قسمت ہوں جو بچ گیا۔"

اچانک وہ دوسری طرف سے سسکیاں لینے لگی اور اس کی آواز بھی گلوگیر ہو گئی۔ "مجھ سے جو کہنا ہے میرے سامنے آ کے کہو... مجھے گالیاں دو، مجھے مارو... میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی... مجھے اپنے سارے جرائم کا اعتراف ہے... تم سے بہتر مجھے کون جانتا ہے... یا جان سکتا ہے... سچ تو یہ ہے کہ مردوں کی اس سفاک دنیا میں جو عورت کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیتی تھی، تم نے مجھے پہلا جذباتی سہارا فراہم کیا تھا... تم دل سے اچھے آدمی تھے... بس میں نے تمہاری قدر نہیں کی تھی۔"

"کیونکہ تمہارے عزائم کچھ اور تھے۔"

"میں انکار کیسے کر سکتی ہوں... لیکن پلیز بزدل... اس وقت مجھے واقعی تم بچا سکتے ہو۔" اس نے ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔

وہ اداکاری کرتی رہی تھی... لیکن اس وقت اداکاری نہیں کر رہی تھی... اسے آپ میری ہی نہیں... ہر شریف مرد کی کمزوری سمجھ لیں کہ وہ خوب صورت عورت کی نشلی یا غزالی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی نہیں دیکھ سکتا... دیکھیے تو یہ موتی اس کے دل پر تیزاب کے قطرے بن کے گرتے ہیں...

"بزدل... تم سن رہے ہو نا میری بات؟" اس نے سسکی لے کر کہا۔

"کیسے نہ سنوں... لیکن یہ فون ہے... اس کی بیٹری میرے حوصلے کی طرح جواب دے رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا تھا۔"

"ہاں... تمہارے ابا صاحب نے تمہارا پیغام بڑے موثر طریقے سے مجھ تک پہنچا دیا تھا... سبحان اللہ... اب تم فرماؤ، میں سر کے بل دوڑتا ہوا کہاں آؤں۔"

"میں پی سی میں ملوں گی۔"

"اچھا... پھر تو سمجھو میں صرف آدھ گھنٹے میں دو ٹانگوں پر پہنچتا ہوں... میں پریس کلب میں ہوں۔"

"میں بھوربن میں ہوں... یہاں تو میں کھانا کھانے آئی تھی... رہائش میری اس کے قریب ہی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "بھوربن؟ اس مارچ کے مہینے میں مری سے بھی آگے... جہاں صرف برف اور ویرانی ہو گی..."

"یار! تمہیں معلوم ہونا چاہیے... اس موسم میں یہاں کتنے سیمینار اور کانفرنس وغیرہ ہوتی ہیں... سیاح تو ہوتے نہیں... ملٹی نیشنل اور نیشنل کمپنیوں کو رعایتی نرخ پر کانفرنس ہال اور کمرے مل جاتے ہیں... وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں... اس کے علاوہ... یہاں مارچ سے بہار کا موسم شروع ہوتا ہے... خواہ آس پاس برف ہو اور سردی سخت ہو مگر درخت اپنا روپ بدل لیتے ہیں... سبزہ اور پھول نمودار ہونے لگتے ہیں... اوپر سفید آسمان ہوتا ہے اور نیچے..."

میں نے کہا۔ "اوکے... اوکے... میرے فون کی بیٹری مزید منظر کشی سے پہلے دم توڑ دے گی، میں آتا ہوں۔"

"سنو... اپنی اس ڈاکٹر صائمہ کو بھی لے آنا ساتھ۔"

میں نے سہم کے کہا۔ "آخر تم کیوں چاہتی ہو کہ میرا مزار شریف وہاں کسی پہاڑی پر بنے... جہاں برف گرتی ہے... ایک مارے گی... دوسری دفنائے گی... پھر وہی ہو گا بقول شاعر... آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں..."

"کیوں خود کو بزدل ثابت کرنا چاہتے ہو؟ روح کی طرح وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ رہتی ہے... خود روح کے لیے کوئی جسم نہ ہو تو اس کا کہاں ٹھکانا ہو گا۔"

"واہ... اس ڈائیلاگ نے مجھے متاثر ہی نہیں... قائل بھی کیا... ویسے تم اگر نہ کہتیں، تب بھی میں اسے ساتھ لانے کی کوشش ضرور کرتا... ہمارے علامہ صاحب فرما گئے ہیں... اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل... مجھے اپنا پتا تو سمجھاؤ۔" میری باقی بات اور مزید گفتگو بیٹری کے خلاص ہو جانے سے خلاص ہوئی۔

"یا اللہ... تو ہی اس بزدل کو مقتول ہونے سے بچا۔" میں نے پریس کلب سے باہر آتے ہوئے دعا مانگی... جس کے ایک پہلو میں خنجر ہے تو دوسرے میں چھری... میں نے دعا مانگی۔

☆☆☆

میرے لیے وہ کسی عید کارڈ کا جیتا جاگتا منظر تھا یا کوئی حسین خواب جو میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا... ایک طرف دھندلکے میں وہ چٹان سی تھی جس کے اوپر سے چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا تھا... دوسرا میرے سامنے صائمہ کے روپ میں موجود تھا... پس منظر میں ایک متحرک متلاطم سمندر تھا جس کی نرم رو لہریں ہمارے قدموں میں آ کے لوٹ رہی تھیں۔

صائمہ نے کچھ شرما کے کہا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ”ایک تو یہ سوال کرنا تھا کہ جتنی حسین تم آج لگ رہی ہو... اتنی پھر کب لگو گی؟“

وہ مزید شرمائی اور خوش ہوئی۔ ”میں کیا بتاؤں... تم اپنے دل سے پوچھو۔“

”یہ ساڑی بڑی قیامت خیز ہے جو تم نے آج باندھی ہے... اور جس انداز سے باندھی ہے۔“

وہ لال ہوگئی۔ ”یہ میں نے خاص طور پر آج کے لیے خریدی تھی... جب تم نے مجھے مدعو کیا تو مجھے یقین نہ آیا۔“

”یہ جگہ مجھے بزدل کے علاوہ مفلس ثابت کرنے کے لیے قطعی نامناسب ہے خاتون...“ میں نے احتجاج کیا۔

اس نے بڑے رومینٹک انداز میں میرے ہاتھ پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہیں یہ دن یاد رہے گا جب دو سال پہلے ہم پہلی بار ملے تھے... اور اس کی تمہارے نزدیک اتنی جذباتی اہمیت ہوگی۔“

میں بے اختیار قہقہہ مار کے ہنس پڑا اور سچ بول دیتا کہ بی بی... کیوں خوش فہمی میں یہ الزام عائد کر رہی ہو... کس کافر کو یہ دن یاد تھا... لیکن اس سے صائمہ کے جذبات کا خون ہو جاتا... پھر وہ میرے ارمانوں کا خون کر کے اٹھتی اور غصے میں واک آؤٹ کر جاتی... میں اکیلا احمقوں کی طرح بیٹھا رہ جاتا... چنانچہ میں نے لاٹری کی طرح ملنے والے اس جذباتی موقع سے پورا فائدہ اٹھانا بہتر سمجھا۔

میں نے چشمہ ہٹائے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں... اس نے ساڑی سے میچ کرتے کنٹیکٹ لینس لگا رکھے تھے... ہماری آنکھیں آٹھ ہوئیں... پھر میں نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”یہ دن تو میں مرنے کے بعد بھی نہیں بھول سکتا... میں پوری کوشش کروں گا کہ یہی میری تاریخِ وفات ہو... تم آؤ گی نا میری قبر پر پھول چڑھانے؟“

اس نے خفگی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ”بکواس مت کرو... کھانے کا آرڈر دو... جیب میں پیسے ہیں نا؟“

میں نے دیکھا تو ویٹر ہمارے درمیان کھڑا مسکرا رہا تھا... میں نے بھی مسکراتے ہوئے صائمہ سے کہا۔ ”لیڈیز فرسٹ... جو تمہیں پسند ہو۔“

جب صائمہ آرڈر دے رہی تھی تو میری نظر مینو میں درج قیمتوں کے مطابق آنے والے بل کا ٹوٹل کر رہی تھی... دس فیصد سرچارج اور ٹپ کی رقم شامل کر کے یہ رقم اکیس سو بنی تو میرا رکا ہوا سانس بحال ہوا... تقریباً ستر روپے میرے پاس پھر بھی بچ جاتے... میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ وہ بعد میں آئس کریم نہ مانگے۔

جب ویٹر چلا گیا تو صائمہ نے مسکرا کے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں... بل میں بھی دے سکتی ہوں... یہ آج اچانک پیسے کہاں سے مل گئے... اور بچ کیسے گئے تمہارے جواری ڈاکو دوستوں سے؟“

میں نے احتجاج کیا۔ ”یہ سو فیصد حلال کی کمائی ہے... میں نے توپ صاحب کو ادھار مال دینا ختم کر دیا ہے... دو ہزار ایک کالم کے ملے تھے۔“

”اور جو پہلے سے باقی ہیں؟“

”مل جائیں گے وہ بھی... یہ وقت کیا ایسی باتوں کا ہے؟“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔ ”کیوں نہ آج ہم اس دن کو یادگار بنائیں... ہم آج ہی شادی کر لیں تاکہ یہ ہماری شبِ عروسی بھی ہو جائے۔“

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ”لوگ دیکھ رہے ہیں... ہم آج ہی شادی کیسے کر سکتے ہیں... ذرا یہ بھی فرمایئے کیونکہ دس تو بج رہے ہیں۔“

”تم ہاں کہو... باقی انتظام میرا... گواہ تو ہمارے آس پاس ہی اتنے بیٹھے ہیں... سب معزز اور شریف لوگ ہیں... سمجھ لو برات کا کھانا ہی چل رہا ہے... نکاح خواں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں... ایک میرا جاننے والا ہے مولوی سبحان اللہ... وہ گھوڑے کی طرح دندناتا آئے گا۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”رخصتی کے بعد دلہن کو کہاں لے جاؤ گے؟ اسی کرائے کے کباڑ خانے میں جسے تم فلیٹ کہتے ہو؟“

”ایک روایتی مشرقی دلہن اور مسلمان بیوی کے لیے اس کے مجازی خدا کی جھونپڑی بھی محل ہوتی ہے... بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ...“

پڑھا میں نے کچھ نہیں تھا مگر سنا بہت کچھ تھا اور سناتا تو کون سا وہ مانتی... مگر صائمہ کے متاثر ہونے سے پہلے وہی... کم بخت ویٹر دوبارہ نمودار ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا بلکہ میری طرف دیکھ کے اس نے صائمہ سے پوچھا۔ ”کھانے کے بعد آئس کریم پسند فرمائیں گی آپ... ہماری اسپیشلٹی...“

میں نے اپنے دل کو رکتا محسوس کیا لیکن صائمہ کے انکار نے میری اس خواہش کو سچ ثابت نہیں ہونے دیا جس کا حوالہ اس نے کچھ دیر پہلے دیا تھا کہ کاش آج ہی کا دن میری تاریخِ وفات بھی ہو۔

میں نے متانت سے مسکرا کے کہا۔ ”ابھی کھانا شروع نہیں کیا اور یہ کھانے کے بعد کی بات کر رہا تھا...

نامعقول... ویسے بھی گرم کھانے کے بعد آئس کریم...“

اس نے اتفاق میں سر ہلایا۔ ”ہم کچھ دیر بعد وہاں جا کے کھائیں گے... کے ڈی اے اسکیم نمبر ون میں ہے جیلاٹو فیئر...“

میں نے خود کو بے ہوش ہونے سے بچایا... قدرت آج میری تذلیل کا فیصلہ کر چکی تھی تو میری قسمت... میں نے موضوع بدل دینا چاہا۔ ”مائی ڈیئر سویٹ مارٹ...“

”یہ کہاں ہے؟“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”ان کی بھی آئس کریم ہے؟“

”میرا مطلب تھا سویٹ ہارٹ... میرے ساتھ بھوربن چلو۔“

”جون میں دیکھیں گے... ابھی تو وہاں ہوگی کڑاکے کی سردی... ایک بار میں انہی دنوں میں گئی تھی... فارما کمپنی والوں نے سیمینار میں انوائٹ کیا تھا... سخت کوفت ہوئی۔“

میں نے کہا۔ ”میں جون کی نہیں... کل پرسوں جانے کی بات کر رہا تھا... اور جب ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو کوفت کیسی؟“

”صرف ہم دونوں ہوں گے اس برفانی جنگل میں تو اور کیا ہوگا... لیکن ذرا صاف بات کرو... یہ اچانک تمہیں بھوربن جانے کا خیال کیسے آگیا... اس موسم میں... تمہیں تو گرمی میں ہی سردی لگتی ہے۔“

میں نے ایک آہ بھری۔ ”کاش! میں تم سے جھوٹ بول سکتا۔“

”کاش، تم نے کبھی پورا سچ بولا ہوتا تو مجھے یہ نہ کہنا پڑتا کہ تمہیں میری قسم...“

”بس یہی مصیبت ہے تم عورتوں کے ساتھ... فوراً آجاتی ہو بلیک میلنگ پر... اب میں کس منہ سے کہوں کہ مجھے نازنین نے بلایا ہے... یہ نام ہے اس کا... صفت نہیں ہے...“ میں نے کہا اور پھر اسے ساری الف لیلہ سنا دی... جھوٹ کی اب گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

خلافِ توقع صائمہ کا جذباتی ردِعمل سرد رہا۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو پھر میرا وہاں کیا کام؟“

”تمہارا اصل کام تو ہے... میرا مورال نہ ڈاؤن ہونے دینا... نازو سے مجھے بچانا... میں بہرحال تمہارا سہاگ ہوں... اور جیسا کہ کہا جاتا ہے... لوہے کو لوہا کاٹتا ہے... تو نازو بھی عورت ہے... اس کا مقابلہ میرے جیسا بزدل خاک کرے گا... ایک ذہین اور تم جیسی باہمت خاتون کر سکتی ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں... میں چلوں گی۔ ذرا دیکھوں تو سہی یہ نازنین آخر کیا چیز ہے جس نے ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے... اب تو وہ بہت تجربہ کار ہو گئی ہے... اکیلا سمجھ کے سالم نگل جائے گی اژدہے کی طرح۔“

میں نے فرطِ جذبات میں اس کا ہاتھ چوم لیا... غالباً میری جرأتِ رندانہ سے متاثر ہو کے قریب کی ٹیبل پر ایک نوجوان نے بھی یہی کیا... چٹاخ سے ایک آواز آئی پھر لڑکی اونچی سینڈل پر کھٹ کھٹ پاؤں پٹختی واک آؤٹ کر گئی... نوجوان اس کے پیچھے دوڑا... ویٹر بل سمیت نوجوان کے پیچھے۔

صائمہ نے کہا۔ ”ایسا تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔“

”مگر میں بزدل ہوں... وہ بہادر بن رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اب یہ فرماؤ... تمہارے اسپتال کا کیا بنے گا؟“

”بھاڑ میں گیا اسپتال... آئے دن ڈبل ڈیوٹی دینی پڑتی ہے مجھے... اب کوئی اور دے میری جگہ ڈبل ڈیوٹی... ہاں، آج دن میں تم نے غزالہ سے کیا کہا تھا؟ وہ سخت چراغ پا تھی... خدا کے لیے کچھ میرا خیال کیا کرو... جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔“

جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی سے مؤثر انداز میں دیا جا سکتا تھا۔ ”میری تو اس سے بات ہوئی تھی... شاید ایک ہفتہ پہلے۔“

”کیا تم دن میں آئے نہیں تھے... مجھ سے ملنے؟“

”بالکل نہیں... میں تھا پریس کلب میں... ایک سو ایک گواہ ہیں۔“

”لیکن چوکیدار نے مجھے بتایا...“

”وہ چوکیدار... اسے تو میں خود قتل کرنے والا ہوں۔“

”آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ علاج کے لیے ایک صاحب نے گھوڑے کی دوا ایک نلکی میں ڈالی اور نلکی گھوڑے کے حلق میں رکھ کر پھونک مارنا چاہتے تھے کہ دوا گھوڑے کے حلق سے اتر جائے... مگر ہوا یہ کہ گھوڑے نے پہلے پھونک مار دی۔“

میں نے کہا۔ ”اس وقت مجھے یہ لطیفہ سنانے کا مقصد؟“

”اگر اس چوکیدار نے تمہیں پہلے قتل کر دیا... پھر؟“

وہ شوخی سے ہنسی۔ ”اس کا وہ ریپیٹر نقلی نہیں ہے... اور نہ اس کی محبت۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اُف... ایسی رسوائی سے تو بہتر ہے، میں ابھی ڈوب مروں... کہیں پانی کم نہ ہو جائے۔“

لیکن چاندنی کا طلسم سطحِ آب پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ ہم ہاتھوں میں ہاتھ دیے پانی میں چلتے رہے اور پانی مسلسل آگے بڑھتا رہا... صائمہ نے اپنی ساڑی کو بڑی نزاکت سے اوپر اٹھایا ہوا تھا لیکن اچانک کوئی لہر آتی تھی اور ہمیں سرتاپا شرابور کر جاتی۔

بہت رات گئے میں نے آخری بار چوم کے صائمہ کو ہاسٹل کے دروازے پر چھوڑا تو میرے دل میں جذبات کے سمندر کا جوار بھاٹا کہیں زیادہ شدید تھا... ایک بار پھر میں نے صدقِ دل سے تہیہ کیا کہ خواہ مجھے کسی سود خور سے قرض لینا پڑے... لیکن اب میں اپنا گھر ضرور بناؤں گا... اگر یہی ہے شرطِ وصل کے لیے...

ساری تیاری مکمل کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے نازنین سے اس کا پتا تو سمجھا ہی نہیں... اور یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر اس کے غائب ہو جانے والے شوہر نامدار کا نام کیا ہے...

اس نے کہا۔ ”مری کراس کر کے مجھے فون کر دینا... میں تمہیں پی سی میں ملوں گی... تم اپنی کار میں ہی آؤ گے نا؟“

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا۔ ”ظاہر ہے۔“

صائمہ کی اس چھوٹی سی چار پہیوں پر دوڑنے والی فولادی ڈبیا کو میں کار سمجھنے پر مجبور تھا... حضورِ یار میں سر تو جھکانا ہی پڑتا ہے لیکن مجھے تو خدا نے بنایا ہی اس لیے تھا کہ میں کبھی سر نہ اٹھا سکوں... اب گویا طے تھا کہ مجھے تمام عمر اسی گاڑی اور اسی مالکن کے ساتھ گزارنی ہوگی۔

ایک بار پھر میں نے اپنی تجویز اس کے سامنے رکھی۔ ”اگر تم نے میرے سر کے لیے چھت میں ایک سوراخ کرا لیا ہوتا تو کتنے مزے سے میں ہر طرف کے نظارے دیکھتا جاتا۔ مری کے سارے راستے یوں مرغا بن کے نہ جاتا۔“

وہ ہنسی۔ ”اور بارش ہو جاتی... پھر؟“

”میں نہا بھی لیتا... اندر ہی اندر تم صابن مل دیتیں۔“

اس کا موڈ بہت اچھا تھا... اس سفر کے لیے صائمہ نے خصوصی اہتمام کیا تھا... اس نے کپڑے بھی میری فرمائش کے مطابق پہن لیے تھے جو ویسے تو خیر نہیں تھے جیسے وہ میرے خوابوں میں پہن کر آتی تھی مگر پھر بھی بہت سنسنی خیز ثابت ہو رہے تھے... میں سمجھتا تھا کہ ایسا صائمہ نے میرا دل خوش کرنے کے لیے نہیں کیا... موسمِ گرما میں خواتین سارے ملک سے صرف مری کے مال پر فیشن شو کی کیٹ واک کرنے آتی ہیں... ابھی صائمہ کا مقابلہ تھا نازنین سے اور وہ ہر صورت میں یہ مقابلۂ حسن جیت کر نازو کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی تھی کہ دیکھ لو... میں ڈاکٹر ہی نہیں... حسن و شباب کا ایٹم بم بھی ہوں... تم کیا ہو میرے مقابلے میں... صرف بھنگیوں کی توپ... جواب دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہی۔

چھرا پانی پر رکنا مری جانے والوں کی روایت ہے... اس کا ایک مقصد تو شارٹ بریک ہوتا ہے... دوسرا زیادہ اہم مقصد انڈا پکوڑا کھانا اور چائے پینا کیونکہ یہ سوغات کہیں اور نہیں ملتی... کچھ لوگ پہاڑوں سے آنے والے قدرتی چشمے کے پانی سے گاڑیاں بھی دھلواتے ہیں... گردن سیدھی کر کے میں نے دیکھا تو موبائل فون میں سگنل بھی پورے موصول ہو رہے تھے... میں نے نازنین کا نمبر ڈائل کیا۔ ”ہم چھرا پانی پر ہیں... مری تک ایک گھنٹا... دو گھنٹے میں بھوربن... اپنا پتا سمجھا دو۔“

”میری رہائش ہے مارننگ فاریسٹ میں... یہ یہاں کی مشہور کوٹھی ہے... یہ ہندی کے بھوربن کا انگریزی ترجمہ ہے۔“

میں نے رشک اور حسد سے کہا۔ ”یہ کس کی کوٹھی ہے، تمہارے میاں کی؟“

”ان کی ہوتی تو میں اسے اپنا کہہ سکتی تھی... لیکن یہ ان کے ایک دوست حیدر کی ہے... عام لوگ وکیل صاحب کی کوٹھی کہتے ہیں۔“

”رام چندر جی نے تو سیتا کی وجہ سے بن باس لیا تھا... اس وکیل حیدر کو اس ویرانے میں آکر بسنے کی کیا سوجھی جہاں سال کے آٹھ مہینے الو بولتے ہیں۔“

”بس شوق ہے اپنا اپنا... بہت سے لوگوں نے کراچی اور لاہور کے بعد اسلام آباد میں کوٹھیاں بنوائیں... مری اور نتھیا گلی میں بھی... آخر پی سی بھی بھوربن میں بنا ہے یا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے میاں... کیا نام ہے ان کا؟“

”سرفراز خاں... ان کے دوست وقار حیدر پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں... دونوں بچپن کے ساتھی ہیں... میں نے دیکھا نہیں انہیں کیونکہ وہ کراچی میں ہوتے ہیں... اپنے مقدمات کے سلسلے میں... انہوں نے کہا کہ اپنا گھر ہے تو ہوٹل میں کیا ضرورت ہے ٹھہرنے کی...“

میں نے کہا۔ ”چلو باقی بر ملاقات...“ اور فون بند کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دو گھنٹے بعد جب صائمہ کی کار ”مارننگ فاریسٹ“ کا سائن بورڈ دیکھ کے رکی تو میں دم بخود رہ گیا... سائن بورڈ لکڑی کا بے ہنگم سا تختہ تھا جو ایک درخت پر کیلوں سے جڑ دیا گیا تھا اور کسی نے بھدے حروف میں بقلم خود تارکول سے یہ نام لکھا تھا... کوٹھی کی باڑھ اور اس کا گیٹ بھی جنگلی تھے چنانچہ اس ماحول سے بہت ہم آہنگ لگتے تھے۔

مسلح گارڈ نے حقارت سے مختصر سی کار پر نظر ڈالتے ہوئے بیریئر اٹھا دیا... آگے ایک مختصر سی سفید کنکروں والی سڑک تھی جو دونوں جانب کے سرسبز حاشیے میں زیادہ دلکش لگتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرو صف بستہ تھے۔ خوب صورت قالین جیسے لان کے گرد پھولوں کا حاشیہ آمدِ بہار کا مژدہ سنا رہا تھا۔ ایک مالی لان پر لگی سفید گارڈن چیئرز کو ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

صائمہ نے ایک لاہور نمبر والی سفید کار کے پیچھے اپنی گاڑی روکی اور پورے غرورِ حسن کے ساتھ نازنین سے ملنے بڑھی جو برآمدے کی آخری سیڑھی پر ہمیں ریسیو کرنے کے لیے کھڑی تھی... میں سو فیصد غیر جانبداری سے کہہ سکتا ہوں کہ نازنین پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو گئی... صائمہ نے ثابت کر دیا تھا کہ کار یا کوٹھی اس کے سامنے ہیچ ہیں کیونکہ وہ کون ہے... ملکۂ حسن... میرے دل کی رانی... اقلیمِ عشق کی مہارانی...

نازنین نے ہمارا استقبال بڑے تپاک اور حزن و ملال میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔ ”تم نے اچھا کیا جو آ گئے... میں بہت پریشان تھی۔“

”یہ تم سے زیادہ پریشان تھے۔“ صائمہ نے بڑی معصومیت سے پہلا وار کیا۔

نازنین نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ”آیئے ڈاکٹر صائمہ... اندر آیئے... آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔“

”حالانکہ یہ خوشی کا موقع نہیں۔“ صائمہ بولی۔

میں نے اسے گھورا... ”ہم سیدھے جا کے کھانے کی میز پر بیٹھ گئے کیونکہ لنچ کا وقت گزر چکا تھا... ایک خادمہ نے فوراً کھانا لگانے کا عمل شروع کر دیا... اس کی مدد کرنے والا غالباً اس کا شوہر تھا... کوٹھی میں قدامت کا جو حسن باہر نظر آتا تھا، اسے اندر بھی برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی تھی... اس کے باوجود آرائش اور اسباب سے دولت مندی خود اپنا اشتہار دیتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”تم خاصی بدل گئی ہو چار پانچ سال میں... میرا مطلب تھا... ایک وقار آ گیا ہے تمہارے حسن میں۔“

”بدلے تم بھی نہیں ہو... لیکن ڈاکٹر صائمہ واقعی میری توقع سے زیادہ خوب صورت ہیں... کب کر رہے ہیں آپ دونوں شادی؟“

صائمہ نے اس وار کو متانت سے جھیل لیا۔ ”بہت جلد... ویسے یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔“

نازنین نے دوسرا زیادہ سخت وار کیا۔ ”ہاں... باہر تو لوگ اسے ذاتی مسئلہ ہی رکھتے ہیں... شادی کا روگ نہیں پالتے... اب اثر تو ساری دنیا پر ایک جیسا پڑتا ہے... سیٹلائٹ کمیونیکیشن کے اس دور میں۔“

صائمہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے جوابی حملہ کیا۔ ”پھر بھی ہمارے ملک کی شریف خواتین ایک ہی شوہر سے وفادار رہنے کو اپنا ایمان سمجھتی ہیں۔“

میں نے فوراً مداخلت کی۔ ”ان باتوں سے میرا تو پیٹ نہیں بھرنے والا... ہاں نازنین... کچھ اس واردات کے بارے میں بھی بتاتی جاؤ... یہ کیسے ہوا... کب ہوا؟“

صائمہ نے کھاتے کھاتے معصومیت سے پوچھا۔ ”ان کا مطلب ہے کہ یہ شادی کیسے ہوئی، کب ہوئی... کتنا عرصہ ہو گیا؟“

میں نے سخت لہجے میں صائمہ کو روکا۔ ”میرا کیا مطلب ہے اور کیا نہیں... اگر نازنین نہیں سمجھے گی تو میں خود سمجھا دوں گا۔“

صائمہ نے عقل سے کام لیا اور اس بے عزتی کو پی گئی۔ وہ سر جھکائے مسکراتی رہی اور خاموشی سے کھانا کھاتی رہی... اسے جو کہنا تھا کہہ دیا تھا کہ شادیاں تو بہت کی ہوں گی تم نے مگر ”یہ شادی“ کب ہوئی تھی... جبکہ میں ان حالات میں نازنین کے ماضی سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اس واردات کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا جس میں اسے میری مدد درکار تھی... اگر میں سخت رویہ اختیار نہ کرتا تو جذباتی رقابت بڑھ کر سوکنوں والی جنگ بن جاتی۔

نازنین عام حالات میں ایسا جوابی حملہ کرتی کہ صائمہ چوکڑی بھول جاتی مگر وہ مشکل حالات کا شکار تھی اور یہ نہیں چاہتی تھی کہ صائمہ ناراض ہو کے مجھے بھی واپس کھینچ لے جائے... میرے اور صائمہ کے سوالات کا اس نے تفصیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے جواب دیا... ہم کھانے کی میز پر سے اٹھ کے باہر لان میں آگئے، وہیں شام کی چائے پی۔ یہ جواب نازنین کے اپنے الفاظ میں...

☆☆☆

قادر بخش کا تعلق سندھ سے تھا جہاں اس کا باپ ایک معزز شخصیت میں شمار ہوتا تھا... سلطان بخش کو ایک درگاہ کی سجادہ نشینی ورثے میں ملی تھی... اس کے ہزاروں مرید دور دراز کے دیہات میں پھیلے ہوئے تھے... درگاہ کی آمدنی معقول تھی اور اس کا حساب لینے والا کوئی نہ تھا... ہر سال عرس کے موقع پر حاضری دینے والے صرف چادریں ہی نہیں لاتے تھے، نذرانے اور چڑھاوے بھی پیش کرتے تھے... منت مانگنے والوں کی آمد کا سلسلہ پورا سال جاری رہتا تھا۔

عرفِ عام میں یہ سائیں سمندر کی درگاہ کہلاتی تھی اور اس سے ایک روایت بھی منسوب تھی جس کی تاریخی حیثیت کو نہ کسی نے چیلنج کیا تھا اور نہ کر سکتا تھا... مشہور یہ تھا کہ اورنگزیب بادشاہ کے عہد میں یہاں ایک درویش کا ڈیرا تھا جو ہر وقت عبادت کرتا اور مسافروں کو کنوئیں سے نکال کے پانی پلاتا تھا... یہ پانی میٹھا اور ٹھنڈا تھا... اس کی ایک عجیب تاثیر تھی کہ اسے پی کے مسافر کا پیٹ بھی بھر جاتا تھا پھر وہ کچھ کھائے پیے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔

ایک بار اورنگزیب کا اپنے لشکر کے ساتھ ادھر سے گزرا ہوا تو درویش نے سب کو پانی پلایا اور پیاس بجھنے کے ساتھ وہ شکم سیر بھی ہو گئے... ان کا ارادہ پڑاؤ ڈال کے لشکریوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کا تھا لیکن اب یہ ضرورت نہ رہی کیونکہ نہ کسی کو بھوک محسوس ہو رہی تھی اور نہ تکان!

اورنگزیب نے اس پر حیرت کا اظہار کیا اور بولا۔ ”یہ سب اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔“

درویش نے کہا۔ ”یہ میری عبادت گزاری کا انعام ہے... ورنہ یہ کنواں تو پہلے بھی تھا... اور ایسے ہی کنوئیں اور بھی ہیں۔“

اورنگزیب بولا۔ ”یہ صرف تیرا گمان ہے... اللہ چاہے تو اس کنوئیں کو سمندر کے پانی سے بھر دے... کیا تو نے کبھی دیکھا ہے کہ اس میں جہاز اور کشتیاں تو چل سکتی ہیں لیکن وہ پیاسے کے لیے ایک گھونٹ پانی نہیں رکھتا۔“

اورنگزیب کا لشکر واپسی میں ادھر سے گزرا تو اس نے درویش سے کہا۔ ”میرا لشکر بھوک پیاس اور تکان سے بے حال ہے۔“

درویش نے مریدوں کو حکم دیا کہ وہ سب کو پانی پلائیں اور خود بادشاہ کو پانی کا گلاس پیش کیا... بادشاہ نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور آخ تھو کر کے اگل دیا... پانی سخت کڑوا تھا... درویش کی حیرت کی انتہا نہ رہی... اس نے بادشاہ کے گلاس سے پانی پیا... وہ واقعی سمندر کے پانی سے زیادہ تلخ تھا۔

درویش کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ ”کل تک تو پانی کی تاثیر نہیں بدلی تھی۔“

”اب تو کچھ کر... کیا خدا نے تیری عبادت گزاری کا انعام واپس لے لیا ہے؟ جس پر تجھے بڑا غرور تھا۔“

”حضور! یہ کسی کی سازش ہے... آپ لشکریوں کو حکم دیں کہ وہ کنوئیں کو اس پانی سے خالی کریں۔“ درویش بولا۔

اورنگزیب نے حکم دیا۔ ”کنوئیں کا سب پانی نکال دیا جائے۔“

چار لشکری نیچے اتر گئے اور چار اوپر سے پانی کے بھرے ہوئے ڈول کھینچتے رہے لیکن نہ پانی کم ہوا اور نہ اس کی کڑواہٹ میں فرق آیا۔ انہوں نے بادشاہ کو بتایا کہ تہ کے قریب جو دھارا ابل رہا ہے وہ کڑوے پانی کا ہے چنانچہ وہ جتنا پانی کھینچتے ہیں، اتنا ہی اور آجاتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ دھارا کس سمت سے پھوٹ رہا ہے تو انہوں نے کہا کہ جنوب کی طرف سے جدھر سو کوس پر سمندر ہے۔

بادشاہ کے حکم پر درویش کو کنوئیں میں ڈال کے کنواں بھر دیا گیا اور لشکر کوچ کر گیا۔ آس پاس کے سارے کنوؤں کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہی تھا۔ وہ کنواں عبرت گاہ بن گیا جس میں اللہ نے سمندر کا پانی ڈال دیا تھا کیونکہ اس کے ایک بندے نے اپنی عبادت پر غرور کیا تھا۔

اس کہانی کی تاریخی سند نہ کسی نے تلاش کی اور نہ یہ ممکن تھا۔ درویش کے ایک مرید نے صرف چند گز دور دوسرا کنواں کھولا تو اس کا پانی اتنا ہی میٹھا تھا۔ وہ پرانے کنوئیں پر مجاور بن کے بیٹھ گیا اور یہ جگہ سائیں سمندر کی درگاہ مشہور ہو گئی۔ روایات کے مطابق تب سے یہ گدی قادر بخش کے خاندان میں تھی اور اس کے اجداد اس کے مجاور یا سجادہ نشین... تین چار سو سال کی تاریخ محض سنی سنائی کرامات کے ذکر سے پُر تھی لیکن درگاہ کی وسعت، اس کی شان و شوکت اور وقف جائیدادوں کی آمدنی ایک ایسی معاشی سلطنت تھی جو بڑھتی جا رہی تھی۔

وقت کے ساتھ درگاہ کے انتظام، آمدنی اور خرچ کے حساب کتاب کے لیے خاص مریدوں کو الگ الگ ذمے

داری سونپ دی گئی تھی۔ سلطان بخش ہر طرح سے ایک باعزت... پُرآسائش اور پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی ایک ہی بیوی تھی جس کے پانچ بچے تھے۔ دو بیٹیاں روایتی طریقے پر رخصت ہو کے اپنے ہی خاندان اور قبیلے میں وہی زندگی پھر جی رہی تھیں جو ان کی ماں کی تھی اور اس سے پہلے اور آس پاس ہر عورت کی۔

بڑے بیٹے کے لیے روایات کے مطابق اپنے باپ کی جانشینی طے تھی۔ سلطان کے بعد وہ گھر کا سربراہ تسلیم کیا جاتا اور سجادہ نشین ہوتا۔ باپ نے اسی انداز میں اس کی تربیت کی تھی کہ اس کو ولی عہد بننے کے بعد کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اسے وہ ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا تا کہ وہ دیکھے اور سمجھے کہ اسے عقیدت مندوں سے... عوام اور خواص سے... ہاری سے اور ملازم سے کیسا سلوک روا رکھنا ہے، کیسے بات کرنی ہے... کہاں رحم سے کام لینا ہے اور کہاں سزا کو درسِ عبرت بنانا ہے... نتیجہ یہ کہ اس نے تعلیم کو اہمیت ہی نہیں دی۔

قادر بخش کا دوسرا نمبر تھا۔ باپ نے اسے تعلیم حاصل کر کے سول سروس جوائن کرنے کی طرف راغب کیا اور پڑھنے کے لیے کراچی بھیجا لیکن اس نے آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ شہزادوں جیسی زندگی بسر کی اور بہ مشکل تمام پاس ہوتا رہا۔ اعلیٰ سرکاری ملازمت کے لیے نااہل ثابت ہونے کے بعد اس نے آسان راستہ اختیار کیا اور وکیل بن گیا۔ باپ نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ اسے ایک قانونی مشیر کی خدمات حاصل رہیں۔ بُرے وقت کا کیا بھروسا کب آجائے اور اس کے امکانات نہ ہونے کے باوجود بُرا وقت بہت جلد آگیا۔

ان کا تیسرا بھائی صورت شکل ہی نہیں، عادات و اطوار میں بھی بالکل مختلف تھا۔ اس حد تک کہ سلطان بعض اوقات مذاق میں بیوی سے پوچھتا تھا کہ یہ میرا ہی بیٹا ہے نا؟ اسے پڑھنے کا جنون تھا چنانچہ اسکول اور کالج کی تعلیم مکمل ہونے تک وہ کتابی کیڑا مشہور ہو چکا تھا اور افلاطون کہلاتا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اس کی خواہش کے احترام میں باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا اور اس نے آکسفورڈ کے تعلیمی ریکارڈ توڑنے کے بعد وہیں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور پڑھانے کے ساتھ کتابیں لکھنے لگا۔ وہ لوٹ کے پاکستان ہی نہیں آیا۔

کچھ عرصے بعد جو سیاسی آندھی چلی، اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سلطان بخش کو اس کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے مجبور کیا کہ وہ بھی اپنے علاقے کی سیاسی نمائندگی کے لیے الیکشن میں حصہ لے۔ سلطان کے اثر رسوخ کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس کے پاس نہ وسائل کی کمی تھی اور نہ کارکنوں کی۔ خود اسے بھی یقین تھا کہ اس علاقے کے سارے ووٹ اس کے حق میں پڑیں گے... لیکن اس انتخاب میں بڑے بڑے برج الٹ گئے تھے۔

سلطان کے علاقے سے ایک شوگر مل کا مزدور لیڈر بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوا۔ اس نے سلطان بخش کی ضمانت ضبط کرا دی... سلطان بخش کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ گرد و نواح کا سارا علاقہ اس کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ کہاں گئی ان کی عقیدت مندی اور وابستگی۔ وہ کیسے اس شخص کے حق میں ووٹ ڈال آئے جو سلطان بخش سے عناد رکھتا تھا اور اس کے مخالف عناصر کے اکسانے پر زہر افشانی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس کی ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی لیکن اب وہ اسمبلی میں پہنچ گیا تھا۔ حکومت کا حصہ تھا۔ اس کی کامیابی نے زندگی میں پہلی بار سلطان بخش کو اندیشوں میں مبتلا کیا۔ سیاست کی بازی میں تقریباً پچاس لاکھ گنوا دینے کا اسے رنج نہیں تھا... افسوس اس بات کا تھا کہ پیسا لینے والوں نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا، اسے بے وقوف بنایا۔

سلطان بخش کے اندیشے ایک سال پورا ہونے سے پہلے درست ثابت ہونے لگے۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے وہ مزدور لیڈر ایک پارلیمانی کمیٹی کا سربراہ بن گیا جو محکمۂ اوقاف کی نئی وزارت کے معاملات کا جائزہ لینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ سلطان بخش کا خیال تھا کہ اوقاف کا محکمہ اس کو درگاہ کی سجادہ نشینی سے محروم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ قائمہ کمیٹی اس کے مالی معاملات کی تحقیق کے لیے بنائی گئی ہے اور وہ مزدور لیڈر صرف اسے تباہ کرنے کے لیے اس کا چیئرمین بنا ہے۔

معاملات اس سے بہت آگے تک گئے۔ سب سے پہلے درگاہ کو تحویل میں لیا گیا اور اس کی ساری آمدنی جو نذر نذرانوں سے تھی، محکمۂ اوقاف نے حاصل کر لی۔ اس کے لیے ایک تجوری نما صندوقچی رکھ دی گئی اور ایک ایڈمنسٹریٹر مقرر ہو گیا۔ تھوڑے بہت عقیدت مند چوری چھپے سلطان کو اس کی اوطاق میں حاضر ہو کے نذرانے پیش کرتے رہے۔ ان کو پولیس نے ہراساں کیا گیا جو سلطان کی حویلی کی طرف جانے والے ہر شخص کو روک کے اس سے پوچھ تاچھ کرتی تھی۔

اس کے بعد وقف املاک کی باری آئی۔ درگاہ کے نام وقف زمین جائداد سب پر اوقاف والوں نے حقِ ملکیت حاصل کر لیا اور پھر تمام فائلیں اور دستاویزات لے گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے سلطان کے منشی اور مختار کار کو گرفتار کر لیا اور ان سے مار مار کے تمام آمدنی کی تفصیلات حاصل کرتے رہے۔ سلطان محسوس کرتا تھا کہ اس کے گرد قانون کے نام پر لاقانونیت کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

بالآخر سرکاری حکام نے اسے طلب کر لیا۔ اس سے ہر بینک اکاؤنٹس کی اور لواحقین کے تمام اثاثوں کی تفصیل مانگی گئی۔ اس کی بیوی کے پاس کتنا زیور ہے؟ اس کی پراپرٹی کہاں کہاں ہے؟ ٹیکس کتنا ادا کیا ہے؟ کاغذات میں ردّوبدل سے تمام وقف زمینوں پر اس کا غاصبانہ قبضہ ثابت کر دیا گیا...

قادر بخش نے ڈسٹرکٹ کورٹ سے ہائی کورٹ تک ہر جگہ اپنے باپ کا مقدمہ لڑا... اور اسے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے خلاف دشمنوں کی سازش کے ثبوت فراہم کیے... لیکن وہ اسے ضمانت پر رہا کرانے میں بھی ناکام رہا۔ اس کے خلاف دیوانی مقدمات نے فوجداری حیثیت حاصل کر لی... ان معاملات کو اخبارات کے ذریعے خوب اچھالا گیا۔

سلطان بخش کے خلاف مقدمات نے ایک نئی سمت اختیار کی جب ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ سلطان بخش نے اس کے باپ کو مروا دیا تھا کیونکہ وہ اپنی بیوی اس کے حوالے کرنے پر راضی نہیں تھا۔ اس کی ماں نے خود عدالت میں آ کے بیان دیا کہ سلطان نے کتنا عرصے اسے جبراً اپنے پاس رکھا تھا... پھر دوسرا کیس آیا... اس میں سلطان بخش پر الزام لگایا گیا کہ اس نے مدعی کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کی اور جب وہ حاملہ ہو گئی تو اس کا بچہ ضائع کرایا گیا جس سے وہ مر گئی۔

قادر بخش کی ماں نے ہر بے عزتی کو آزمائش سمجھ کے قبول کیا تھا لیکن یہ الزامات برداشت نہ کر سکی۔ سلطان اگر چاہتا تو ایک نہیں چار بیویاں رکھ سکتا تھا۔ دو کا رواج تو عام تھا۔ ایک خاندانی اور ایک اپنی مرضی کی۔ گھر کی ملازم عورتیں تو گویا کنیزیں تھیں۔ لیکن اس کے شوہر نے تمام عمر کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا تھا... کم سے کم وہ ایسا ہی سمجھتی تھی... اعتماد کی یہ شکست وہ برداشت نہ کر سکی اور اس نے ایک رات کنوئیں میں کود کے اپنی جان دے دی۔

تباہ و برباد کر دینے والے انتقام کی اس کہانی کا انجام وہی ہوا جو طے تھا۔ سلطان بخش کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔ اس کا بڑا بھائی جو باپ کی گدی سنبھالنے والا تھا، پراسرار طور پر غائب ہو گیا... قادر بخش نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی لیکن اگلے روز ان کے ایک ..... خیر خواہ نے خاموشی سے اسے مشورہ دیا کہ وہ روپوش ہو جائے کیونکہ بڑے بھائی کے غائب ہونے پر اس کو قتل میں ملوث کیا جائے گا۔ قادر بخش جانتا تھا کہ جو ایک بار پولیس کی تحویل میں گیا، وہ ہر جرم کا اعتراف کر لیتا ہے۔ خود اس کی بہنوں نے رو رو کے اس سے التجا کی کہ وہ اپنی جان بچا کے نکل جائے۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے ورنہ انصاف کے لیے یومِ حشر تک صبر سے انتظار کریں گے۔

قادر بخش کراچی چلا گیا۔ اس نے وکالت پڑھی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ عملی سبق زندگی کے تجربے سے حاصل کیا تھا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ منفی حالات کا ردِعمل مثبت صورت میں سامنے آئے... چور کا بیٹا چوری سے متنفر ہو کے کوتوال بن جائے۔ عام طور پر احساسِ محرومی اور ناانصافی سے انتقام کا جذبہ جنم لیتا ہے۔

قادر بخش نے دیکھ لیا تھا کہ حق اور انصاف کتنے کھوکھلے الفاظ ہیں۔ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ کمزور کے لیے شرافت... اصول اور ضمیر... خوفِ خدا اور یومِ حساب جیسے خوشنما الفاظ ہیں جن کے حصار میں صرف متوسط طبقہ مطمئن ہے۔

قادر بخش جب کراچی آیا تو اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصدِ حیات تھا۔ پیسا کمانا... بے حد و حساب... اس کے لیے حرام حلال یا جائز و ناجائز کا فرق بے معنی تھا کیونکہ دنیا ایسا ہی سمجھتی تھی... دھن ایک قوت ہے... یہ نہ کالا نہ سفید... ہزار کا نوٹ کاغذ کا ایک پرزہ تھا جو ہزار کی قوتِ خرید رکھتا تھا...

اسے یقین تھا کہ جب پیسا آ جائے گا تو سب کچھ آ جائے گا۔ طاقت... عزت اور عیاشی کے اسباب... کامیابی کی ضمانت اور زندگی کا تحفظ... ذہانت اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اپنی ذہانت سے سب کچھ حاصل کر لے گا...

کراچی پہنچ کے اس نے سب سے پہلے چودھری شہاب الدین کے نئے نام اور نئی ولدیت... تاریخ اور جائے پیدائش کے ساتھ اپنے لیے شناختی کارڈ حاصل کیا... پھر اسی کی بنیاد پر پاسپورٹ بنوایا... اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ اپنی خوش پوشی... خوش مزاجی اور خوش بیانی... عرفِ عام میں چرب زبانی... سے وہ ایک نامور وکیل کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ عدالتی نظام کی ساری خامیوں کو اس نے دیکھا، سمجھا اور بھگتا تھا۔ ایک لیگل فرم میں ملازمت مل جانے کے بعد اس نے اپنے تجربے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اب اس کی گھنی داڑھی بھی تھی چنانچہ اس کے پہچانے جانے کا امکان ہی نہ تھا... شہاب الدین نے گواہ خریدے اور توڑے... پولیس سے مل کر شہادتوں کو خراب کیا۔ عدالت کے ریڈر سے جج تک سب سے اپنی مرضی کی تاریخ اور من پسند فیصلہ حاصل کیا...

صرف ایک سال بعد ایک نامور وکیل نے شہاب الدین کو اپنی ساکھ کے لیے ایک خطرہ محسوس کیا۔ شہاب الدین نے مقدمات تو جیتے تھے لیکن ساکھ اس کی خراب ہو رہی تھی۔ شہاب الدین نے اعتراف کیا کہ کچھ گواہ اس نے خریدے تھے تو کچھ طاقت سے بھی ہٹائے تھے۔ اس کے چند پیشہ ور مجرموں سے مراسم تھے جو گواہوں کو دھمکیاں دیتے تھے کہ وہ عدالت گئے تو واپسی پر انہیں گھر میں بہن یا بیٹی نہیں ملے گی... اور ایک کیس میں گواہ کی ماں کو چند گھنٹے یرغمال بھی رکھا گیا تھا... اس نے پولیس کو رشوت دے کر کیس کمزور کرانے کا اعتراف بھی کیا۔

اس نامور وکیل نے شہاب الدین کی چھٹی کر دی۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اس لیگل فرم کو چھوڑنے سے پہلے ہی اس نے فرم کے لیٹر ہیڈ پر اپنے لیے ایک تعریفی سند حاصل کر لی تھی۔ اس پر فرم کے مالک، اس نامور وکیل کے دستخط جعلی ہونے کے باوجود اتنے اصلی تھے کہ وہ انہیں چیلنج کرتا تو مشکل میں پڑ جاتا۔ رہی سہی کسر نیچے اس فرم کی مہر نے پوری کر دی تھی۔ اسے مستند تسلیم کیا گیا۔

اب شہاب الدین کے لیے اپنی پریکٹس شروع کرنا آسان تھا۔ اس کی صورت، اس کا نام اور اس کی کارکردگی سب کے سامنے آ چکی تھی۔ مگر اس نے اپنا آفس دوسری عمارت میں .... قائم کیا اور بہت سوچ سمجھ کے اپنے لیے دیوانی مقدمات کا میدان چنا۔ فوجداری مقدمات میں جھگڑے زیادہ تھے، خطرات زیادہ تھے اور مقدمات کے فیصلے کم وقت میں ہو جاتے تھے۔

پھر وکالت کے پیشے میں وہ نہ نام کمانے آیا تھا، نہ حق و انصاف کا بول بالا کرنے... مطلوب و مقصود صرف دولت تھی... دیوانی مقدمات میں فراڈ اور ہیرا پھیری، جعلسازی اور عام لوگوں کی قانون سے ناواقفیت کے باعث فائدہ اٹھانے کے امکانات کہیں زیادہ تھے...

آہستہ آہستہ بڑی ہوشیاری سے اس نے پراپرٹی ڈیلرز سے کے ڈی اے کے متعلقہ شعبوں تک اپنی شناسائی کو بڑھایا... سال بھر بعد انتقالِ جائداد کے طریق کار سے پوری آشنائی حاصل کرنے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا... کے ڈی اے کا ایک شعبہ ایسا تھا جہاں مکانوں پر قرض لینے والوں کے اصل کاغذات ملکیت محفوظ رکھے جاتے تھے... قرض دینے والے بینک یا ادارے کو یہ ضمانت کے ڈی اے فراہم کرتا تھا کہ اگر قرض لینے والا ادائیگی میں ناکام رہا تو اس کی جائداد کو نیلام کر کے قرض وصول کر لیا جائے گا۔

شہاب الدین نے ایسی ہی ایک فائل حاصل کی۔ اس پر پانچ لاکھ کا قرض دوسری منزل کی تعمیر کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور ظاہر ہے، مالک کے پاس وسائل نہیں تھے ورنہ وہ بیس سال تک ادا ہونے والے قرض کے چکر میں کیوں پڑتا۔ ایک سال تک وہ اقساط کی ادائیگی کرتا رہا... پھر یہ سلسلہ رک گیا... شہاب الدین کو معلوم کرنے پر پتا چلا کہ مکان پر قرض لینے والا بڈھا مر گیا... اس کا ایک ہی بیٹا تھا... اس نے ماں کو اپنے پاس بلا لیا... غالباً اس کی آمدنی کم تھی کہ وہ ماہانہ قسط ادا نہ کر سکا اور بعد میں رقم بینک اکاؤنٹ کے ذریعے ادا کرتا رہا۔

شہاب الدین نے یہ گھر فروخت کر دیا۔ کاغذات اصل تھے۔ نیچے والوں کے شناختی کارڈ اصل تھے۔ ہر جگہ سے این او سی بھی جاری ہو گیا۔ پراپرٹی ڈیلر نے مکان کا سودا بیس لاکھ میں کرا دیا... جو رقم ملی، وہ سب میں طے شدہ فارمولے کے مطابق تقسیم ہو گئی۔ مکان کے نئے مالکوں نے قبضہ بھی لے لیا... فوری طور پر اصل مالک کے پاکستان واپس آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ کبھی وہ آیا تو اس کے پاس مکان واپس حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہو گا کہ وہ عدالت میں سول سوٹ فائل کرے مگر نہ اس کے پاس اصل کاغذات ہوں گے، نہ اتنا وقت کہ وہ اس کی پیروی کر سکے۔ اس کا وکیل فیس لے کے بیٹھ جائے گا۔ جن کے قبضے میں مکان ہے، وہ کسی کو قریب نہیں آنے دیں گے۔ بات وہی کہ قبضہ سچا دعویٰ جھوٹا... یہ پتا چلانا بھی ناممکن ہو گا کہ اصل ملکیت کے کاغذات کے ڈی اے سے کیسے نکلے اور کس نے نکالے... خریدار نے تو کوئی فراڈ نہیں کیا... جو ثابت کر سکتا ہو، وہ فراڈ ثابت کرے۔

قادر بخش عرف شہاب الدین کے اکاؤنٹ میں رقم بڑھتی جا رہی تھی... اس کے دو بینک اکاؤنٹس تھے۔ ایک قادر بخش کے نام سے اور دوسرا شہاب الدین کے نام سے... اس کے سامنے ٹارگٹ بہت واضح تھا... اسے دس کروڑ پورے کرنے تھے... وہ زمانہ گزر چکا تھا جب کہا جاتا تھا کہ پہلا ملین حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے یعنی دس لاکھ ہو جائیں تو پھر پیسے کو پیسا کھینچتا ہے۔ دوسرا اور تیسرا ملین خود بنتے ہیں۔ اب دس لاکھ کی جگہ دس کروڑ لازمی تھے۔ اس کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ سمجھ داری سے انویسٹمنٹ کرتے رہیں تو فراڈ کی ضرورت ہی نہیں... بس ایک اصول کو سامنے رکھیں کہ جوا نہ کھیلیں ورنہ تو سب کچھ آپ ایک رات ہی میں ہار سکتے ہیں... خرچ آپ جتنا کریں گے، اس سے زیادہ آمدنی ہوتی رہے گی۔

دس کروڑ ہوتے ہی وہ فراڈ کا چیپٹر کلوز کرے گا اور انویسٹر بن جائے گا۔ اس کی زندگی کا تیسرا دور نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ کسی نئی دنیا میں شروع ہوگا۔ وہ حصولِ مقصد کی نصف مسافت طے کر چکا تھا جب اسے علم ہوا کہ اس کا عمر قید کاٹنے والا باپ چل بسا ہے... قید کا جتنا عرصہ اس نے جیل میں گزارا تھا، اسے ہر سہولت اپنے بیٹے کی وجہ سے حاصل رہی تھی جو ان سہولتوں کا پورا معاوضہ ادا کرتا تھا۔ تاہم اس کا آزار اپنی جگہ تھا۔ ایسی بلندی سے ایسی پستی کا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا... یہ مکافاتِ عمل کا مسئلہ تھا یا کچھ اور... سلطان بخش کو اس سے سروکار نہ تھا... وہ ایک دشمن کے انتقام کا شکار ہوا تھا جس نے اسے یہ ذلت دی اور خود معزز ہو گیا۔

قادر بخش پہلی فلائٹ سے اپنے باپ کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے پہنچا۔ نمازِ جنازہ میں خاندان کے لوگوں کے علاوہ کافی تعداد میں اس کے سابقہ مرید بھی شریک تھے۔ کچھ وضع دار تھے... کچھ یہ سمجھ کر آئے تھے کہ نیکی بدی تو مرنے والے کے ساتھ گئی۔ اسے بھلا دینا ہی بہتر ہے... ان سب نے سلطان بخش کی قبر کے لیے اس کی بیوی کے ساتھ ہی جگہ کا انتظام بھی کر دیا تھا چنانچہ قادر بخش کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ اس ہجوم میں نہ کسی نے اسے پہچانا نہ کسی کا دھیان دوسرے لاپتا ہو جانے والے بیٹے کی طرف گیا۔ پہلے کے بارے میں یہ ثابت ہی کہاں ہوا تھا کہ اسے قتل کیا گیا تھا... تیسرا باپ کی زندگی میں ہی سات سمندر پار چلا گیا تھا اور لوٹ کے نہیں آیا تھا۔

شہاب الدین پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ وہ لوٹ کے حیدر آباد گیا اور اگلے روز رینٹ اے کار والوں سے ہوٹل میں ایک گاڑی منگوائی۔ ان کا آفس ہوٹل کی دکانوں میں تھا اور وہاں ٹھہرنے والے عموماً انہی سے گاڑی لیتے تھے۔ اس نے ڈرائیور نہیں لیا تھا چنانچہ اسے اپنا پاسپورٹ ان کے پاس رکھوانا پڑا۔ ہوٹل میں وہ اپنے پرانے قادر بخش ولد سلطان بخش کے نام سے مقیم تھا اور پاسپورٹ پر بھی یہی نام تھا۔ اس نے کہا کہ یہ داڑھی اس نے ابھی ایک سال پہلے رکھی ہے۔

اس بالکل نئی سفید کرولا کار میں واپس اپنے آبائی مسکن کی طرف جاتے ہوئے شہاب الدین یعنی قادر بخش نے سب سے پہلے گاڑی کی نمبر پلیٹس بدلیں جو وہ کراچی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ اس کی اپنی گاڑی کی نمبر پلیٹس تھیں مگر ان کو اس نے بڑی مہارت سے بدلا تھا۔ ابتدائی تین حروف میں سے ایک پر اس نے بالکل ملتا جلتا زرد رنگ کا کاغذ چسپاں کیا تھا۔ یوں اے سی ایس کی جگہ صرف اے سی رہ گیا تھا۔ آگے چار عدد میں سے اس نے پہلے کو دبا دیا اور صرف نائن زیرو سکس باقی رہے۔

راستے میں ہی اس نے اصل لباس کے اوپر وہ لباس پہن لیا جو تمام عرب بلاامتیاز پہنتے ہیں یعنی ایک لمبا سفید چوغہ اور سر پر شانوں تک آنے والا رومال۔ اس کے لیے وہ کارڈ بھی چھپوا کے لایا تھا جس پر کچھ بھی صحیح نہیں تھا۔ وہ سیدھا اس مزدور لیڈر سے ملنے گیا جو اس کے بھائی کا بھی قاتل تھا اور اس کے باپ کا بھی... وہ دوسری بار صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو چکا تھا اور اب خود ایک شوگر مل کا مالک تھا۔

گیٹ پر اس نے اپنا کارڈ دیا۔ ”میں دبئی سے آیا ہوں۔ مجھے رکن سندھ اسمبلی سکندر شاہ سے ملنا ہے۔“

گیٹ کیپر نے اسے آفس کا راستہ دکھایا اور فون پر وڈیرا سائیں کے پی اے کو مطلع کر دیا کہ دبئی سے کوئی سیٹھ ملنے آیا ہے۔ پی اے نے اسے بڑی عزت کے ساتھ بٹھایا اور اس کا کارڈ اندر پہنچا دیا۔ سکندر اس وقت فارغ ہو چکا تھا اور لوٹ کے گھر جانے والا تھا۔ اگلے دن اسے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ اس نے دبئی کے سیٹھ کو بلوا لیا۔

قادر بخش نے اپنا تعارف تیسرے نام سے کرایا جو کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ سکندر اس سے مل کر حیران ہوا۔ ”آپ پاکستانی ہو؟“

”الحمدللہ... یہ لباس وہاں سب ہی پہنتے ہیں۔ اب تو گویا عادت سی ہو گئی ہے۔ دراصل بائیس سال پہلے والد نے دبئی میں بزنس شروع کیا تھا تو میں بہت چھوٹا تھا۔ ہماری فیملی ایک طرح سے وہیں سیٹل ہو چکی ہے۔“

”اور آپ کے والد... کیا ان کا انتقال ہو چکا ہے؟“

اس نے شدت سے تردید کی۔ ”الحمدللہ وہ حیات ہیں اور یہ سارا کاروبار انہی کا ہے... لیکن ہم تین بھائی ان کے ساتھ ہیں... ایک بھائی الیکٹرونکس ڈویژن کو سنبھالتا ہے... دوسرا کنسٹرکشن سائیڈ پر ہے... میں امپورٹ ایکسپورٹ کو دیکھتا ہوں اور میرا تعلق زیادہ تر انڈیا، پاکستان اور بنگلا دیش کی تجارت سے ہے۔ میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کے لیے میرے پاس ایک بہت فائدہ مند بزنس پروپوزل ہے۔“

سکندر شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”مجھے آپ کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزنس کر کے خوشی ہوگی... آپ بتایئے۔“

”میرا پروپوزل بہت مختصر ہے۔ میں اگلے سیزن کے لیے آپ کی شوگر مل کی تمام پیداوار خریدنا چاہتا ہوں۔“

سکندر شاہ نے کہا۔ ”ساری پیداوار؟“

”بس... اور اس کے لیے ایڈوانس ادائیگی بھی کرنے کو تیار ہوں... واپس جانے سے پہلے۔“

”آپ کو اندازہ ہے یہ کتنی رقم ہوگی؟“

”مجھے آپ کی مل کی پیداوار کا اندازہ ہے... اور آج انٹرنیشنل مارکیٹ کے کیا ریٹ ہیں... یہ بھی معلوم ہے۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں اس دلچسپی کی وجہ؟“

”مجھے معلوم تھا کہ آپ یہ سوال کریں گے... حالانکہ خود آپ اس کا جواب جانتے ہیں... کیا یہاں شوگر مل مالکان نے مل کر یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اگلے سیزن کا سارا اسٹاک روک لیا جائے گا... مارکیٹ میں شوگر شارٹ ہوگی... لوگ چینی کے لیے دربدر ہوں گے اور چینی دگنے ریٹ پر بھی نہیں ملے گی... اس کے بعد ٹریڈنگ کارپوریشن چینی کی فوراً امپورٹ کے لیے لائسنس جاری کرے گی... سب سے پہلے چینی کہاں سے آئے گی... بھارت سے اور دبئی سے... کیا یہ درست نہیں ہے؟“

سکندر شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ شہاب الدین بولتا رہا۔ بہت کم وقت میں سکندر شاہ متاثر ہو گیا۔

”فرض کریں میں آپ کی بات مان لوں۔“

شہاب الدین ہنسا۔ ”فرض کیا کرنا... آپ جیسا بزنس مین فائدے کی ہر بات مانے گا... لیکن اس سے آگے کی بات... جب چینی کی امپورٹ کے لیے لائسنس جاری ہوں گے تو ہم آپ کی چینی آپ ہی کے ریٹ پر دوبارہ آپ کو سپلائی کر دیں گے... اسے آپ یہاں دگنی قیمت پر بیچ کے کتنا منافع کمائیں گے... یہ آپ خود حساب لگا سکتے ہیں... اتنا عرصہ چینی آپ کی ہوگی... ہم دبئی کے گودام میں رکھیں گے۔“

”لیکن اس میں آپ کا کیا فائدہ ہوگا؟“

”ابھی ہم آپ کو پاکستان کی کرنسی میں ادائیگی کریں گے لیکن بعد میں آپ سے جو سودا ہوگا وہ فارن ایکسچینج میں ہوگا۔“

سکندر شاہ نے بات پہلے ہی سمجھ لی تھی۔ بس وہ دبئی کے اس تاجر کی زبان سے اعتراف کرانا چاہتا تھا۔ سکندر شاہ اسے دوپہر کے لنچ کے لیے اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ ان کے درمیان مزید مذاکرات ہوئے اور یہ طے ہوا کہ سکندر شاہ کے وکیل ایک معاہدے کا ڈرافٹ تیار کر لیں گے جو دبئی ارسال کر دیا جائے گا۔ پھر اس پر دستخط ہو جائیں گے۔

دبئی کے تاجر نے معاملات طے ہو جانے کے بعد واپس کراچی جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حسبِ توقع سکندر شاہ نے اسے روک لیا۔ ”کل مجھے بھی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا تھا، آج آپ ہمارے مہمان رہیں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ شہاب الدین نے عیاری سے کہا۔ وہ خود مناسب موقع تلاش کر رہا تھا جو ابھی تک ملا نہیں تھا۔ اس نے دو چار فرضی فون کیے اور پھر سکندر شاہ کی میزبانی قبول کر لی۔ صبح وہ دبئی کے تاجر کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ خود اس کی گاڑی جسے صرف ایک ”شوفر کم گارڈ“ چلا رہا تھا، پیچھے رہی۔ اس نے بتایا کہ سرکاری گاڑی اس کے لیے کراچی میں موجود رہتی ہے اور اس کا دوسرا گھر ڈیفنس میں ہے۔

”میرا سوئٹ تو شیرٹن میں بک رہتا ہے۔ میرے آنے جانے کا کوئی شیڈول جو نہیں۔“

اپنے پلان پر عمل کرنے کا موقع شہاب الدین عرف قادر بخش کو آدھا راستہ طے ہو جانے کے بعد ملا۔ ایک جگہ گاڑی روک کے وہ پیشاب کرنے کے بہانے اترا اور پیچھے جا کے دوسری گاڑی کے ڈرائیور کے سر میں گولی مار دی۔ اس سے پہلے کہ سکندر شاہ حرکت بھی کر سکتا، وہ لوٹ کے اپنی گاڑی میں آیا۔ سکندر شاہ کی گاڑی کا ڈرائیور آواز نکالے بغیر مر چکا تھا۔ سکندر شاہ خوف سے مفلوج بیٹھا تھا۔

جب قادر بخش نے اس کا نشانہ لیا تو وہ چلّایا۔ ”یہ... تم ایسا کیوں کر رہے ہو... کون ہو تم؟“

قادر بخش نے سکون سے جواب دیا۔ ”ذرا غور سے دیکھو گے تو پہچان لو گے کہ میں سلطان بخش کا بیٹا ہوں... قادر بخش۔“

”آخر تم کیا چاہتے ہو؟“

”جو کچھ تم نے میرے خاندان کے ساتھ کیا... وہ میں نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا ہوتا تو تم کیا کرتے؟“

قادر بخش نے کہا اور اس کے سر پر پوری قوت سے ریوالور مارا۔ سکندر شاہ آگے جھکا اور ساکت ہو گیا۔ قادر بخش نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے پیچھے والی گاڑی کے ڈرائیور کو سیٹ سے نیچے گرا کے گاڑی کو لاک کر دیا۔ اب کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ گاڑی خراب ہے مگر سیاہ شیشوں کے اندر پڑی ہوئی لاش کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

حیدر آباد پہنچنے سے پہلے قادر بخش نے سکندر شاہ کی لاش کو ایک کھائی میں پھینک دیا جس کے گرد گھنی جھاڑیاں تھیں۔

حیدر آباد پہنچ کے اس نے کار واپس کی۔ اس پر سے اپنی نمبر پلیٹس وہ پہلے ہی اتار چکا تھا۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے وہ عام بس سروس کے ذریعے کراچی پہنچا۔ اس وقت تک سکندر شاہ کے بارے میں میڈیا کو بھی خبر نہیں ملی تھی۔ پولیس کے حیدر آباد جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کراچی نمبر کی ٹویوٹا تلاش کرتے پھریں گے اور معلوم نہیں کون پکڑا جائے گا جس کی گاڑی کا نمبر اس کے تبدیل کردہ نمبر سے مل جائے گا۔ ہر نمبرز کی سیریز میں ایسی ایک گاڑی ہوگی۔ ضروری نہیں کہ وہ سفید کرولا ہو... کراچی میں ہزاروں کی تعداد میں سفید کرولا ہوں گی۔

وہ صرف دو دن غیر حاضر رہا تھا۔ اس دوران میں اس کا آفس کھلا رہا تھا۔ اپنے منشی اور کلرک کو وہ سمجھا گیا تھا کہ کوئی پوچھے تو وہ کہہ دے کہ وکیل صاحب کورٹ میں ہیں... شام کے وقت آئے تو کہہ دیا جائے کہ کسی کلائنٹ کے ساتھ گئے ہیں۔ ایسا ہوتا رہتا تھا۔ ہر وکیل ہر کلائنٹ کو ہر وقت آفس میں نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا امکان صفر ہونے کے باوجود کوئی تفتیش کرنے آتا تو اسے یہی معلوم ہوتا کہ یہ چودھری شہاب الدین کا آفس ہے اور وہ گزشتہ ہفتے تو کیا، کئی سال سے کراچی سے باہر نہیں گئے۔

لیکن اس کے تمام خود حفاظتی انتظامات کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ شہاب الدین اخبار میں ہر روز قتل کے اس کیس کی تفتیش کرنے والوں کے بیانات اور کیس میں پیش رفت کی خبریں پڑھ پڑھ کے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ ہر سمت میں جھک مار رہے تھے۔ سوائے صحیح سمت کے۔ معاملہ صوبائی اسمبلی کے رکن کا نہ ہوتا تو چند روز میں کیس کو داخلِ دفتر کر دیا جاتا۔ اس کیس کی بازگشت دو چار مہینے سنائی دی... پھر خالی نشست پر ضمنی انتخاب کا اعلان ہوا تو گویا معاملہ ختم۔

شہاب الدین نے اپنا ٹارگٹ حاصل کرنے میں مزید ڈھائی سال لگائے۔ دس کروڑ ہوتے ہی اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حصولِ مقصد سے پہلے نہ وہ پکڑا گیا اور نہ کسی کی دشمنی کا نشانہ بنا۔ بعد میں کیا ہوتا ہے کیا نہیں... اس کی جانے بلا... بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا... اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما بسے... اب وہ خود بھی اس خطرناک کھیل سے اسی طرح تھک گیا تھا جیسے کوئی اسپورٹس کار دوڑانے والا... خطرات سے کھیلنے کی سنسنی خیزی... امیدوں اور خواہشوں کے مطابق بڑھتی ہوئی دولت... ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور سب کو بے وقوف بنانے کی خوشی اور اپنی ذہانت سے کی ہوئی پلاننگ پر غرور... ان سب کے باوجود وہ چاہتا تھا

کہ ہر وقت خطرات کی موجودگی کے احساس سے بھی نجات حاصل کرے۔ اس کے اعصاب پر خوف کا سایہ تک نہ ہو۔ وہ بے فکر ہو کے لائف کو انجوائے کرے اور اپنی طاقت کو آزمائے۔

ایک بار پھر اس نے اپنی شخصیت کو نیا روپ دیا اور نئی زندگی کے آغاز کے لیے اس نے لاہور کا انتخاب کیا جس کے باسی ساری دنیا کو بتاتے تھے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ تو پیدا ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ شہاب الدین نے فیصلہ کیا کہ اب اسے پیدا ہو جانا چاہیے۔

لاہور زندہ دلوں کا شہر تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی فلمی مرکز تھا۔ ادب... آرٹ اور کلچر کا گہوارہ تھا۔ شہاب الدین نے داڑھی صاف کی مگر قادر بخش جیسا کلین شیو نہیں کیا۔ اس نے درمیانی حلیہ اختیار کیا اور فیشن کے مطابق عرب شیوخ جیسی داڑھی باقی رہنے دی جو ٹھوڑی کے آس پاس نظر آتی تھی اور کناروں پر تراشی ہوئی مونچھوں سے مل کر ہونٹوں کے گرد حاشیہ سا بناتی تھی۔

کچھ دن وہ ہوٹل میں مقیم رہا۔ یہ ریلوے اسٹیشن سے لکشمی چوک جانے والی سڑک پر واقع ایک عوامی ہوٹل تھا۔ پانچ چھ سال کا تجربہ اس کے ساتھ تھا۔ کسی دشواری کے بغیر اس نے نوٹ پھینک کے ایک اور شناختی کارڈ حاصل کر لیا۔ وہ سرفراز خاں ولد دلنواز خاں بن گیا۔ اسی نام سے پاسپورٹ حاصل کرنے کے بعد اس نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے گلبرگ کے محفوظ علاقے کا انتخاب کیا۔ کوٹھی اس کی ضروریات کے مقابلے میں بہت بڑی تھی اور شاندار تھی۔ اگلا پورا مہینا اس نے کوٹھی کی تزئین و آرائش کے اسباب فراہم کرنے میں گزارا۔ اب اس کی ہر شام فائیو اسٹار ہوٹلوں، ایم ایم عالم روڈ کے ریسٹورنٹس اور لبرٹی کے کسی شاپنگ مال میں گزرتی تھیں۔

اس نے ذاتی استعمال کے لیے ایک مرسیڈیز بھی خرید لی تھی اور گھر کی چوکیداری کے لیے ایک سیکیورٹی ایجنسی سے گارڈ بھی لے لیا تھا۔ اس گارڈ کو رہائش کے لیے سرونٹ کوارٹر مل گیا تو اس کی بیوی اور بیٹی نے گھر کے اندر کا سارا کام سنبھال لیا۔ اب تک وہ پبلک ڈیلنگ کرتا رہا تھا چنانچہ اسے اپر کلاس میں اپنی پی آر بنانے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوا۔ خواتین کا ایک طبقہ جو سرفراز خاں جیسے لوگوں کی تنہائی کا درد اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، انہوں نے تن من دھن کی بازی یوں لگائی کہ ”تن من“ ہمارا دھن تمہارا... سرفراز خاں کی تنہا راتیں شراب و شباب کے سرور سے بھر گئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی حالت ایک ایسے پیاسے فاقہ کش جیسی تھی جس نے پانچ سال تک دن رات خزانہ حاصل کرنے کی دیوانہ وار جدوجہد میں دن کا چین، رات کا آرام سب بھلا رکھا ہو اور جب خزانہ اس کے ہاتھ آیا ہو تو برسوں کی بھوک پیاس جاگ اٹھی ہو۔ زندگی کا یہی دور تھا جب وہ ہوش سے بیگانہ ہوا تو جوش مستی میں عقل نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا... یا خود اس نے عقل کو چھٹی دے دی اور عشق سے ناتا جوڑ لیا۔

طبقۂ خواص کو دل بستگی کا سامان فراہم کرنے والی ان خواتین میں... جن کو فائیو اسٹار ہوٹل کی مناسبت سے فائیو اسٹار طوائفیں بھی کہا جا سکتا ہے... چند فلم اسٹار بھی شامل تھیں... انڈسٹری روبہ زوال تھی... فنکار... موسیقار... ٹیکنیشن مشکل میں تھے... اسٹوڈیو بند ہو رہے تھے اور سینما گرا کر شاپنگ پلازا بنائے جا رہے تھے۔

وہ وقت گزر گیا تھا جب ”رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی“ لکھا گیا یا شاعر نے کہا ”ہے طوائف تماش بینوں میں“... اب اس کا الٹ ہو رہا تھا... سرفراز خاں کو ہر طرف سے دولت پر منڈلانے والی تتلیوں نے گھیر لیا۔ ان میں ایک ایسی ہیروئن بھی تھی جس کا قادر بخش دیوانہ تھا۔ وہ آغازِ شباب کے دور میں اس کی ہر فلم دیکھتا تھا اور اس کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرتا تھا۔

تقدیر نے یہ دن دکھایا کہ تصویر کی جگہ وہ خود اس کے سینے سے آ لگی تو سرفراز نے اس کی فرمائش پر ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا جس میں وہی ہیروئن ہوتی اور اس کے مقابلے میں سرفراز ہیرو۔ وہ صورت شکل کا اچھا تھا اور صحت مند بھی تھا۔ اس ہیروئن نے اسے یقین دلا دیا کہ پاکستان کا کوئی موجودہ ہیرو... شان کے سوا... اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جذبات کی رو میں بہہ کے سرفراز خاں نے لکشمی چوک پر اپنا آفس قائم کیا۔ اس کے باہر آنے والی فلم کے بڑے بڑے سائن بورڈ پینٹ کر کے لگائے جن پر وہ ہیروئن ہر سنسنی خیز لباس اور پوز میں سب کی آتشِ شوق بھڑکاتی نظر آتی تھی۔ اب فلمسازی کے دیگر مراحل کا آغاز ہوا۔ فلم کا مہورت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ رات بھر ایک پرائیویٹ محفل رقص و سرور جاری رہی جس میں سرفراز راجا اندر بنا بیٹھا رہا اور فلم میں رول پانے یا سرفراز کی قربت حاصل کرنے کی خواہش مند حسیناؤں نے ہر قسم کا بالباس و بے لباس رقص پیش کرنے کے مقابلے میں حصہ لیا۔ اس پرائیویٹ محفل کا بڑا چرچا ہوا... بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا... سرفراز نے جو نام کمایا اس نے نازنین کو بھی چونکایا اور عادت یا فطرت سے مجبور ہو کے اس

نے بھی ایک اور بہتی گنگا میں اشنان کرنے کا فیصلہ کیا۔

فلمی... اور بعد میں غیر فلمی... دنیا سے عملی تجربات حاصل کرنے کے بعد اس کے لیے کسی مرد کو زیر کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ مرد سیانے اور بے وقوف... چالاک اور سادہ لوح... دانشور اور کم عقل... امیر غریب... کسی عورت کی خلوت میں صرف مرد رہ جاتے ہیں... اور اس کو خلوت میں گھیر لانا کسی بھی حسین اور پُر شباب عورت کے لیے ایسا ہی ہے جیسے کبوتر کو دانہ ڈال کے پکڑ لینا... کبوتر شاید پھر بھی بچ جائے کہ پیٹ بھرا ہو تو وہ دانہ ڈالنے کے باوجود نہیں آئے گا مگر مرد سدا کا بھوکا اور ہمیشہ بھوکا رہنے والا جانور ہے۔

نازنین بھی ایک ”نئی چیز“ تھی۔ وہ اپنے حسن کے اسلحے کو دیکھ بھال کے جدید اصولوں سے ہلاکت خیز رکھتی تھی اور اپنے شباب کو ہر دم تازہ دم، پُرکشش اور سنسنی خیز بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی... پھر جب وہ خود نمائی کے اہتمام کے ساتھ پورے آدابِ دلبری کے ساتھ کسی کو پیش کرتی تھی تو اس میں بھی طوائفوں والا خود فروشی کا انداز نہیں ہوتا تھا۔ مشرقی عورت کی جھجک ہوتی تھی... شرافت کی وضع داری ہوتی تھی... نسوانیت کی حیا ہوتی تھی اور ”ہاں“ والی ”نہ“ ہوتی تھی... پھر کیسے ممکن تھا کہ کوئی مرد خود اس کی طرف دیوانہ وار نہ لپکے... اور اس کے حصول کو مقصدِ حیات نہ بنائے... قادر بخش عرف شہاب الدین عرف سرفراز خاں جیسا مرد۔

سرفراز بھی ریشہ خطمی ہو گیا۔ نازنین میں جو بات تھی، کسی اور میں نہ تھی۔ نہ عام طوائف سا نہ خاص طوائف سا... نہ اس کی محبوبہ دلنواز فلمی اداکارہ میں اور نہ معصومیت میں شکار ہونے والی کسی گاؤں کی گوری میں جو شہر میں ہیروئن بننے آتی ہے۔

نازنین نے سب کا پتّا کاٹ دیا۔ اس نے مال بھی خوب کھینچا اور سرفراز خاں سے خلوت میں وہ سب اگلوا لیا جو اس کے خوش حال اور محفوظ مستقبل کے لیے ضروری تھا۔ سرفراز نے کچھ نشہ٫ شراب میں اور کچھ خلوت کی بے خودی میں بہت سے اعترافات کرلیے۔

نازنین ایک ہوشیار کھلاڑی تھی۔ وہ معصوم حیرانی سے اپنی بے یقینی کا اظہار کرتی۔ ”ایسا نہیں ہوسکتا۔“

”کیوں نہیں ہوسکتا... کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“

”وہ تو پاکستان کی نمبر ون ایکٹریس ہے۔ بہت ریزرو رہتی ہے... پبلک میں اس کا امیج ایک شریف اور مہذب عورت کا ہے۔“

وہ قہقہہ لگاتا۔ ”میری بھولی ناز... امیج بنائے جاتے ہیں اور پبلک میں ایسا نظر آنا ان کی کاروباری ضرورت ہے۔ اس سے مارکیٹ بنی رہتی ہے۔ وہ کیا کہا ہے کسی شاعر صاحب نے... ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔“

”آپ ثبوت کے بغیر ایسی بات نہ کیا کریں... پھنس جائیں گے کسی روز۔“ وہ محبت سے مشورہ دیتی۔

”جانِ من... کیا میں اتنا بے وقوف لگتا ہوں تمہیں... ثبوت بھی ہیں میرے پاس... ٹیپ سناؤں؟“

”میں تو کسی کی آواز پہچانتی نہیں... اور وہ خود انکار کر دے گی کہ یہ میری آواز ہی نہیں۔“

وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔ ”پھر کیا تصویریں دکھاؤں؟“

”چھوڑیں... کیمرا ٹرک سے آپ میری تصویریں بنوا سکتے ہیں... چہرہ کسی کا... جسم کسی اور کا۔“

یہ سرفراز کی انا کے لیے ایک چیلنج بن جاتا۔ ”او کے... تم ویڈیو دیکھو... اسے تو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔“

”آپ یہ کام بھی کرتے ہیں... یا میرے اللہ...“ نازنین یہ ظاہر کرتی جیسے وہ پریشان ہوگئی ہے۔

”اُفوہ... ڈرو نہیں... مجھے کیا ضرورت ہے... لیکن دوسروں نے ایسا کیا... اپنے یار دوست ہیں... انہوں نے مجھے بھی دیکھنے کو دے دی۔“

قطعی بے نیازی بلکہ عدم دلچسپی سے اور شرم سے لال ہو کے انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے... توبہ توبہ کرتے ہوئے اور ایسی عورتوں پر لعنت بھیجتے ہوئے نازنین نے یہ ساری فلمیں آدھی ادھوری دیکھیں اور کہا۔ ”چھوڑیں... بند کریں، یہ بے شرمی کا تماشا مجھے نہیں دیکھنا۔“

”اب تو اعتبار آگیا نا کہ سرفراز خاں نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟“

نازنین نے دیکھ لیا تھا کہ سرفراز نے یہ فلمیں کہاں سے نکالی تھیں اور کہاں رکھی ہیں۔ یہ اس کے گھر کا نہیں، آفس کا وہ حصہ تھا جو صرف اس کا ذاتی عشرت کدہ تھا۔ محفلِ یاراں کے لیے اس کی کوٹھی تھی جہاں ہر قسم کے شریفانہ کاروباری اور غیر شریفانہ غیر کاروباری اجتماع ہوتے رہتے تھے۔

اگلی رات نازنین نے بسنت روڈ کے ایک قفل ساز کو ساتھ لیا اور سرفراز خاں کے آفس کی اور آفس میں ہر دراز اور الماری کے تالے کی چابی بنوالی۔ جب اس کام کے نازنین نے اسے دس ہزار روپے دیے اور کہا کہ اگر اس نے اپنا منہ بند رکھا تو اسے آمدنی کے مزید مواقع بھی حاصل رہیں گے، ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی روز اس کی بڑی بیٹی کالج جائے تو لوٹ کے گھر نہ آئے... اسے لڑکی کے نام سے کالج کے اور اس کے منگیتر تک سب کے نام معلوم تھے... یا اس کی بیوی جو فلاں کے گھر میں کام کرتی ہے، چوری کے الزام میں چند راتیں تھانے میں زیرِ تفتیش رہے... یہ تفتیش مردوں سے اس طرح ہوتی ہے... خواتین سے اس طرح۔

قفل ساز کی تو حالت غیر ہوگئی۔ اس کی کہاں مجال تھی کہ پھر وہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالتا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ شریف صورت اور معصوم سیرت نظر آنے والی عورت اسے چکر دے کر لے جا رہی ہے اور تالے کسی اور کے گھر کے کھلوا رہی ہے...

ایک رات نازنین نے اطمینان سے سارے ویڈیو کیسٹ نکالے اور ان کی کاپی بنوالی۔ اصل اپنے پاس رکھ کے ڈپلی کیٹ کاپی کو اس نے اپنی جگہ رکھ دیا اور مناسب وقت کے انتظار میں خاموش بیٹھ گئی۔ یہ وقت اب آنے ہی والا تھا۔ سرفراز کی اس میں دلچسپی کم ہو رہی تھی جو ایک فطری بات تھی۔ وہ کون سا نازنین کو اپنی شریکِ حیات بنا سکتا تھا۔ نازنین ہر روز فلمی دنیا کا طواف کرنے والی نئی پرانی تتلیوں کو سرفراز کے گرد منڈلاتا دیکھتی رہی۔

مناسب وقت پر نازنین نے اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ میری بدنامی اور اپنی نیک نامی کی قیمت ادا کردو اور محفوظ ہو جاؤ... سرفراز نے انکار کیا... پھر دھتکارا... دھمکیاں دیں اور جب ایکشن کا وقت آتا محسوس ہوا تو نازنین نے اپنی سیکیورٹی کی انشورنس پالیسی اس کے سامنے رکھ دی۔ میرا ایک وکیل ہے جو سب جانتا ہے... تم جو کچھ میرے ساتھ غیر قانونی طور پر کرو گے اس سے زیادہ تمہارے ساتھ قانونی طور پر ہوگا۔

سرفراز ڈر گیا۔ معاملہ صرف اس کی بدنامی کا نہیں تھا۔

ان ویڈیوز میں شہر کے بہت سے معزز افراد کے چہرے تھے۔ نیک نام پردہ نشین خواتین بھی بے نقاب ہوئی تھیں اور پرہیزگاری کے دعوے دار بھی تھے۔

”آل رائٹ... تم کیا چاہتی ہو؟“

”فرض کرو میں کہوں ایک کروڑ۔“ نازنین نے کہا۔

”میں دے دوں گا... لیکن تمہاری طرف سے کیا ضمانت ہوگی کہ تم پھر کبھی کوئی مطالبہ نہیں کرو گی؟“

نازنین نے کہا۔ ”میں نے بھی بہت سوچا اور اس مسئلے کا ایک آسان حل میری سمجھ میں یہ آیا کہ... ہم شادی کرلیں۔“

سرفراز بھونچکا رہ گیا۔ ”شادی... اور تم سے؟“

”ہاں، اس سے ایک شرعی اور قانونی ضرورت پوری ہوگی اور بس... حق مہر ہوگا ایک کروڑ روپے۔ تم طلاق نہیں دو گے تو کچھ نہیں... میں بیوی بن کے تمہارے گھر میں رہوں گی۔ اسی طرح جیسے گزشتہ ایک ماہ سے تمہارے ساتھ ہوں... تم خود مطمئن ہونا چاہو تو تمہاری مرضی ہے جو چاہو کرو... ورنہ میں بتا رہی ہوں اس پر یقین کرلو کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں... آج کل ڈی این اے ٹیسٹ کی وجہ سے انکار کرنا بھی ناممکن ہے۔“

سرفراز نے چلّا کے کہا۔ ”فاحشہ... میں تجھ سے شادی کرنے سے بہتر ہے تجھے قتل کردوں۔“

”کردو... اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنا چاہو تو تمہاری مرضی... پھر تمہاری فلم کا کیا ہوگا... جیل میں یہ عیاشی کہاں ہوگی جو تم کر رہے ہو... یہ پیسا ضائع ہو جائے گا جو تم دگنا چوگنا کرنا چاہتے تھے... اب ذرا ٹھنڈا پانی پیو... یا وِسکی کا ایک پیگ تاکہ تمہارا دماغ ٹھکانے آئے... پھر میری بات پر غور کرو۔“

سرفراز نے ایسا ہی کیا... نازنین کی بات نے اچانک اسے یاد دلا دیا تھا کہ یہاں وہ اپنی پانچ سال کی دن رات کی محنت اور انتہائی خطرناک حالات میں جمع کی جانے والی دس کروڑ کی دولت لے کر ایک سرمایہ کار بننے آیا تھا۔ تاجر... صنعت کار... فلمساز... امپورٹر ایکسپورٹر... ایک کروڑ وہ اڑا چکا تھا۔ دوسرا کروڑ نازنین مانگ رہی تھی اور اس کے بعد...

نازنین نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ”دیکھو... اب تک تم نے بھی شادی نہیں کی ہے... اور میں نے بھی... جو ایک سماجی ضرورت ہوتی ہے... عزت اور شرافت کی سند ہوتی ہے... تمہاری عمر شادی کی ہے اور اگر سچ پوچھو تو ہم اپنا گھر بسا کے بہتر زندگی گزار سکتے ہیں... میں گھر میں رہوں گی... گھر کی دیکھ بھال کروں گی... اور تمہارے لیے بچے بھی پیدا کروں گی... پھر انہیں پالوں گی... تمہاری باہر کی زندگی سے مجھے کوئی سروکار نہ ہوگا... نہ کبھی میں تمہیں شکایت کا موقع دوں گی اور نہ طلاق مانگوں گی... میں خود اب بھٹکتے بھٹکتے تھک گئی ہوں... مجھے بھی ایک گھر کے سکون اور تحفظ کی ضرورت ہے... تم چاہو تو دوسری شادی کرو... پھر تیسری... چوتھی... خود نکالو گے تو میں ایک کروڑ لے کر الگ ہو جاؤں گی... کوئی اور شوہر خرید لوں گی... تم سے مجھے محبت ہوگئی ہے... اس لیے میں پیسا چھوڑ رہی ہوں... تحفظ مانگ رہی ہوں... اور خود کو تمام سماجی، قانونی اور شرعی پابندیوں کے ساتھ تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔“

سرفراز مجبور تو تھا ہی... قائل بھی ہوگیا۔ نازنین اور وہ میاں بیوی بن گئے۔ اعلانیہ اور سب کے سامنے... اس تقریب میں جو شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی، شہر کے چیدہ چیدہ افراد شریک ہوئے۔ ان میں سے اکثر حیران تھے... باقی نے سکون کا سانس لیا کہ اب ان کی نیک نامی کو خطرہ لاحق نہیں رہا... مایوس اور بددل ہو جانے والی خواتین کو سرفراز نے اس اعلان سے نئی امید عطا کردی کہ اس شادی سے اس کے فلمی عزائم پر اثر نہیں پڑے گا۔

نازنین شادی کے معاملے میں سیریس تھی۔ اس نے جو کچھ سرفراز سے کہا تھا، صدقِ دل سے کہا تھا۔ واقعی اب وہ ایک گھر کا اور شوہر کا تحفظ چاہتی تھی۔ بدنامی اس نے بہت کمائی تھی اور دولت اس کے پاس اپنی ہی کم نہ تھی... مگر اپنے مستقبل کو وہ ایک عام عورت کی طرح بنانا چاہتی تھی جس پر ماضی کی پرچھائیں تک نہ ہو... وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بننا چاہتی تھی جو کسی اور طرح ممکن نہیں تھا۔

سرفراز نے شادی کے بعد خود ہی بھوربن جا کے ایک ماہ گزارنے کی بات کی تھی۔ نازنین کی خواہش تھی کہ وہ لندن، پیرس گھوم کے آئیں مگر اس نے شوہر کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ سرفراز نے اسے بتایا کہ بھوربن میں اس کے ایک دوست کی کوٹھی ہے جو انہیں بلامعاوضہ مل سکتی ہے۔ یہ دوست کراچی میں رہتا ہے اور سیزن میں خود کم آتا ہے، اس کے دوست احباب اور عزیز و اقارب اسے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس سیزن میں یہ کوٹھی خالی ہوگی۔ بور ہونے کا کوئی سوال نہیں، سامنے پی سی ہے۔ وہ نتھیا گلی، مری اور اسلام آباد آتے جاتے رہیں گے۔ لوگوں کو انوائٹ کریں گے... وہاں... ڈش کیبل بھی ہے... نوکر چاکر ہیں۔

یہاں آکے نازنین نے محسوس کیا کہ سرفراز غلط نہیں کہتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ یہ جگہ انتہائی پُرسکون تھی۔ جن شہروں میں اب تک نازنین کی زندگی گزری تھی، وہ مشینی انسانوں کے جنگل تھے۔ سیمنٹ اور فولاد اور شیشے کی عمارات کا اس قدرت کے حسن سے کیا مقابلہ جہاں سبزہ تھا... نیلے آسمان کی بے پناہ وسعت تھی... بادلوں کے کارواں تھے جو دروازے کھلے پا کے اندر گھس آتے تھے... اور چوٹی پر چمکنے والی پہاڑوں کی برف تھی۔

شادی کو ابھی صرف ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ نازنین کا شوہر غائب ہو گیا۔ وہ رات کو اس کے ساتھ تھا، صبح نہیں تھا۔ بلکہ صبح ہونے سے پہلے ہی اس کی جگہ خالی تھی۔ نہ اس نے کوئی پیغام چھوڑا تھا، نہ اطلاع دی تھی۔ اس کا فون بند تھا۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ نازنین کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ چھوڑنا ہوتا تو وہ ایک کروڑ اس کے منہ پر مارتا اور چلا جاتا... لیکن وہ نازنین سے شادی کر کے بہت مطمئن تھا، بہت خوش تھا... وہ اپنے آنے والے بچے کی باتیں بھی کرتا تھا... کہتا تھا کہ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں... جوڑے آسمانوں پر ہی بنتے ہیں... میں بھی بھٹک رہا تھا اور تم بھی... ہم دونوں مل کے صراطِ مستقیم پر چلنے لگے... ایک وقت پر یہ خود بخود کیسے ہو گیا۔

☆☆☆

شاید نازنین کی کہانی کا نصف سے زائد حصہ خود اس کی زبان سے بیاں ہوا... اس میں میرے اپنے تجربات اور مشاہدات بھی شامل ہیں۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے صائمہ کو بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ وہ حیران تھی اور غالباً اس شک میں مبتلا ہو چکی تھی کہ میں نے اپنے اور نازنین کے مراسم کی جو کہانی سنائی ہے اس میں سارا سچ نہیں تھا۔ دودھ میں کتنا پانی ہے یا پانی میں کتنا دودھ ہے، یہ اسے بعد میں مجھ سے اگلوانا پڑے گا۔

نازنین نے آنسو بھی بہت بہائے... صائمہ کے نزدیک وہ ٹسوے تھے یا گلیسرین والے آنسو تھے۔ یہ گفتگو لنچ سے شروع ہو کے چائے کے وقفے تک گئی پھر ڈنر میں جاری رہی... مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ نازنین جو بتا رہی ہے سچ ہے... ظاہر ہے صائمہ کا خیال اس کے برعکس تھا۔

رات کے کھانے کے بعد جب سردی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی، ہم ایک پُرآسائش ڈرائنگ روم میں کافی پی رہے تھے۔ اندر گیس کے ہیٹر نے بڑی آسودگی بخش حرارت کی فضا پیدا کر دی تھی۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ہیٹر میں گیس نہیں کوئلے دہک رہے ہوں لیکن یہ آتش فشاں کے سرد لاوے کے ٹکڑے تھے۔

میں نے اس پرانی کوٹھی کی آرائش کو بہت سراہا... کوٹھی کا رقبہ تو زیادہ نہیں تھا۔ ایک منزلہ عمارت کی مخروطی چھت تھی جو برف باری کی وجہ سے یہاں کی ضرورت تھی۔ اوپر جمع ہونے والی برف خود ہی نیچے پھسل جاتی تھی۔ اس میں تین بیڈ رومز تھے جن میں سے ایک باہر کی طرف گیسٹ بیڈ سمجھا جاتا تھا۔ ڈرائنگ روم بیش قیمت فرنیچر اور سامانِ آرائش... تصاویر اور نوادرات سے بھرا پڑا تھا۔ اس سے زیادہ وسیع وہ لاؤنج تھا جس میں ہم بیٹھے تھے... اس میں دو آتش دان تھے... ایک مشرقی دیوار میں دوسرا مغربی سمت میں... دونوں کے گرد نیم دائرے میں صوفے لگے ہوئے تھے... حضرات اگر چاہیں تو خواتین سے الگ اپنی محفل سجا سکتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”نازنین... اس کوٹھی کا مالک سرفراز کا دوست ہے۔ تم نے اسے بتایا... وہ ہے کہاں آج کل؟“

”کراچی میں... لیکن میں نے فون کیا تو وہ آیا تھا۔“

”اور چلا بھی گیا؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”وہ سارے کام چھوڑ کے آیا تھا... فون کرتا رہتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پولیس کو رپورٹ بھی لکھوائی ہو گی؟“

”وہ تو ایک قانونی ضرورت تھی... نہ بتاتی تو خود پھنس جاتی... میں نے صبح تک انتظار کیا... جہاں جہاں سے معلوم کر سکتی تھی... سب سے پوچھا... سب نے کہا کہ دوپہر تک دیکھو... کیا پتا وہ گھومنے پھرنے نکل گیا ہو... ایڈونچر کے لیے کسی پہاڑ کو سر کرنے چڑھ گیا ہو یا اتر گیا ہو کسی وادی میں... بس ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں... محض مجھے تسلی دینے کے لیے... میں جانتی ہوں کہ یہ سب بعید از قیاس تھیں۔ اس سرد موسم میں کون پاگل رات کے ساڑھے تین بجے بھوربن جیسی جگہ پر ایڈونچر کرنے کا سوچے گا... اور کہیں جاتا تو مجھے بتا کے نہ جاتا۔“ اس نے پھر رونے کی تیاری کی۔

میں نے کہا۔ ”نازو پلیز... رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے... پولیس نے کیا کہا؟“

”پہلے تو انہوں نے مجھے ٹال دیا کہ چوبیس گھنٹے تو گزر جانے دو... تمہارا شوہر ہے، غلام یا کوئی بچہ نہیں... بغیر بتائے بھی جہاں چاہے جا سکتا ہے... چوبیس گھنٹے بعد پرسوں صبح انہوں نے رپورٹ لکھ لی اور اس کے بعد سے مجھے پریشان کر رہے ہیں۔“

”اس شک کا اظہار کر رہے ہیں کہ خود تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہے... کسی آشنا کے ساتھ مل کر؟“

صائمہ نے موقع پا کے کہا۔ ”آشنا تو تم بھی تھے اور نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے کتنے ہوں گے۔"

"ڈاکٹر صائمہ... میرا ماضی کسی سے پوشیدہ نہیں... نہ میں نے آپ کے سامنے شرافت اور پاکیزگی کا دعویٰ کیا ہے... جو تھی سو تھی... اب شاید میں آپ سے کم گناہ گار ہوں... میں سرفراز کے ساتھ نکاح کر کے وہ زندگی گزار رہی تھی... جو آپ نے ابھی نہیں گزاری... دنیا کی پروا آپ کو نہیں تو مجھے کیوں ہو؟"

یہ بڑا زبردست جوابی حملہ تھا جس کے بعد صائمہ کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ نیند کے بہانے واک آؤٹ کر جائے۔

میں نے معذرت کی۔ "اس کی بات کا بُرا مت مانو... یہ میرے معاملے میں بہت پوزیسیو ہے... پولیس کو چھوڑو... ان سے میں نمٹ لوں گا... میرے ایک سوال کا جواب دو... یہ جو تم غائب ہونے کی اصطلاح استعمال کر رہی ہو... یہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دیکھو وہ کوئی جن بھوت نہیں تھا کہ دھواں بن کے اڑ جائے... اسے اغوا کیا جاتا تو کیسے ممکن ہے کہ تمہیں معلوم نہ ہوتا... وہ تمہارے ساتھ سویا ہوا تھا... اور تم بھی سو رہی تھیں... بے ہوش نہیں تھیں... چھ فٹ کا سالم شوہر کسی بیوی کے پہلو سے اٹھا لیا جائے اور بیوی کو احساس نہ ہو... ناممکن... ہاں، وہ کاغذ کا پرزہ ہوتا تو اور بات تھی۔"

"اسے کسی نے اغوا نہیں کیا۔" وہ بولی۔

"رائٹ... تیسرا امکان یہ ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ کے بھاگ گیا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے... وہ پہلے بھی جا سکتا تھا... تم سے جان چھڑانی ہوتی تو ایک کروڑ دے دیتا... وہ تمہارے ساتھ یہاں تک آیا۔"

"اس میں کوئی مجبوری یا زبردستی نہیں تھی، وہ خوش تھا۔ سچ مچ ہنی مون کے موڈ میں تھا۔"

"اسے بھاگنا ہوتا... تو دن میں بھاگ جاتا۔"

"میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"نہیں... تم نہیں سمجھ رہی ہو... تم نے اسے بھی بلیک میل کیا تھا۔ میں مانتا ہوں ایک اچھے مقصد کے لیے کیا تھا۔ اس کے لیے تمہارے پاس چند تصویریں یا حسینوں کے خطوط ہی نہیں... اس سے بھی زیادہ بہت کچھ تھا لیکن اس کے بہت سے حوالے ایسے تھے جن کا تعلق اس کے ماضی سے تھا... اس زندگی سے تھا جو وہ گزار چکا تھا۔ کیا اس نے خود تمہیں سب بتایا تھا... یہ کہ اس کا نام قادر بخش تھا... پھر وہ چودھری شہاب الدین ہوا... اور آخر میں سرفراز خاں... اس نے کیا فراڈ کیے... کیسے دس کروڑ جمع کیے... کس طرح اپنے خاندان کی تباہی... اپنے بھائی کے قتل اور باپ کی ذلت آمیز موت کے ذمے دار کو ٹھکانے لگایا... یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟ وہ کیا، کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی کسی کے سامنے اس طرح اعترافِ جرم کیسے کر سکتا ہے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے... تو اس کا جواب یہ ہے۔" اس نے صوفے کے کشن کو ہٹا کے ایک ڈائری نکالی۔

میں نے ڈائری لے لی۔ "یہ کیا ہے؟"

"تمہارے تمام سوالات کا جواب... واقعی اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا... جو میں نے تمہیں بتایا... اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی... لیکن یہ سب اس میں ہے... اس کی ڈائری میں... یا خودنوشت میں۔"

میں نے مجلد ضخیم ڈائری کو کھولا۔ اس کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "میں کون ہوں؟" اور نیچے لکھا تھا۔ ایک ناول... درحقیقت یہ کوئی ڈائری بھی نہیں تھی بلکہ ایک ضخیم مجلد کاپی تھی جس میں شاید تین چار سو صفحات تھے۔

میں نے اس کا ایک صفحہ سرسری انداز میں پڑھا۔ "تم سمجھتی ہو یہ اس کی خودنوشت سوانحِ حیات ہے؟"

"یہ میرا یقین ہے... اس میں نام فرضی مگر واقعات اصلی ہیں۔"

"اور یہ ہینڈ رائٹنگ کس کی ہے؟" میں نے کہا۔

"اسی کی ہو گی... سرفراز کی... جب تم اسے پڑھ لو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا... وہ سب اس میں ہے... اور اس لیے میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ نہ وہ قتل ہوا ہے... نہ اغوا... وہ پھر غائب ہو گیا ہے... شاید صرف تم اسے تلاش کر سکتے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کاپی رکھ دی۔ "دیکھو... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں یہ تین چار سو صفحات پڑھوں... اور تمہیں میرے بارے میں سخت خوش فہمی ہے... کہ میں کوئی شرلاک ہومز ثانی ہوں... یا کرنل آفریدی قسم کی چیز... میں صحافی ہوں... جاسوس نہیں... پاکستان میں کوئی اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسا ادارہ بھی نہیں۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں بہت ہیں... لیکن وہ غائب ہو جانے والے شوہروں کا سراغ نہیں لگاتیں... خود یہ کام کرتی ہیں..."

اس کے بعد وہی ہوا جو متوقع تھا... کوئی جواب دینے یا میرے مشورے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے وہ بگڑ گئی۔ "تم مذاق اڑا رہے ہو نا میرا... نہ وہ قتل ہوا ہے نہ اغوا... نہ اسے کسی ایجنسی نے اٹھایا ہے اور نہ وہ بھوت کی طرح غائب ہوا ہے... وہ ایسے غائب ہوا ہے جیسے قادر بخش غائب ہوا تھا... جیسے چودھری شہاب الدین غائب ہوا تھا... اب سرفراز خاں بھی کسی کو نہیں ملے گا... وہی شخص کسی چوتھے روپ میں کہیں موجود ہو گا۔ میں اس کی بیوی... اس کے ہونے والے بچے کی ماں... میں کیا کروں... کہاں جاؤں؟" اس نے بات کرتے کرتے رونا شروع کر دیا۔

"او کے... او کے... ذرا میں یہ ڈائری دیکھ لوں۔ میرا مطلب ہے یہ ناول جو اس کی سوانحِ حیات بھی ہے... پوری نہ سہی... کہیں کہیں سے پڑھ کے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

حسبِ توقع صائمہ نے اس بیڈ روم میں ڈیرا جما لیا تھا جو نازنین کے بیڈ روم سے ملا ہوا تھا۔ وہ وفاقی امور کی ماہر تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ میرے رومانی جذبات اس ماحول میں کیا رخ اختیار کر سکتے ہیں... میں نے آہستہ سے اس کے دروازے پر دستک دی... جواب میں مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا تو میں شبِ فراق کے لیے گیسٹ بیڈ میں لیٹ گیا۔

سونے سے پہلے کچھ پڑھنے کی عادت ایک مجبوری تھی۔ میں نے اس غیر مطبوعہ ناول کو پڑھنا شروع کیا جس کا مصنف مبینہ طور پر سرفراز خاں عرف چودھری شہاب الدین عرف قادر بخش تھا۔ نازنین نے صرف خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ہینڈ رائٹنگ اس کے لاپتا شوہر کی ہی ہو گی... اس نے کبھی سرفراز کے ہاتھ کا لکھا ہوا اردو کا مسودہ نہیں دیکھا تھا۔

جو بات سرسری مشاہدے میں نظر آئی، وہ یہ تھی کہ پورا مسودہ اوّل تا آخر ایک ہی ہینڈ رائٹنگ میں تھا لیکن یہ مسلسل نہیں لکھا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ قلم بدل جاتا تھا بلکہ تحریر کا رنگ بدل جاتا تھا۔ دس بیس صفحات سیاہ پین کے لکھے ہوئے تھے۔ پھر بال پین کا نیلا رنگ آ جاتا تھا۔ حروف کہیں موٹے اور کہیں باریک تھے۔ درمیان میں ایک جگہ مجھے سرخ حروف کی تحریر میں چودہ صفحات ملے۔ صاف ظاہر تھا کہ لکھنے والے کو جب بھی فرصت ملی، اس نے اپنی یادداشتوں کو مرتب کر لیا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ درمیانی وقفہ کتنا تھا اور جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ کتنے عرصے میں لکھا گیا تھا۔ یہ تاریخ وار ڈائری نہیں تھی۔

جب میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو جس بات نے مجھے حیران کیا، وہ تحریر کا اسلوب تھا۔ لکھنے والے کو اظہار پر عبور حاصل تھا اور اس کا مشاہدہ سطحی نہیں تھا۔ وہ حساس آدمی تھا جس کا جذباتی ردِعمل بار بار سامنے آتا تھا۔ یہ شخص قادر بخش تھا... چودھری شہاب الدین تھا یا سرفراز خاں۔ اگر وہ اور

کچھ نہ ہوتا تو ایک اچھا مصنف بھی ہوتا اور صرف مصنف ہوتا تو شاید یہ مکمل ناول ہوتا۔

میں صفحے پلٹتا گیا اور جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، میری دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ جب مسودہ ختم ہوا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ کمرے میں الیکٹرک ہیٹر جل رہا تھا چنانچہ مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ سطحِ سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر باہر مارچ میں بھی سردی کتنی شدید ہے۔

اس تحریر... روزنامچے یا ناول کے مسودے نے میرے ذہن میں کچھ حقائق کو بالکل واضح کر دیا تھا اور کچھ سوالات کو جنم دیا تھا۔ یہ بالکل طے تھا کہ نازنین نے اسے سرفراز کی خودنوشت سمجھا تھا اور بالکل ٹھیک سمجھا تھا۔ لکھنے والے نے نام بدل دیے تھے لیکن واقعات وہی تھے اور ان کی ترتیب بھی درست تھی۔ اب میرے دماغ کا کمپیوٹر آن ہو گیا اور ذہن میں آنے والے سوالوں کا جواب تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ میری ایک بُری عادت یہ تھی کہ معمول کے مطابق میں بارہ ایک بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاؤں تو کچھ دیر پڑھنے کے بعد نیند غالب آ جاتی تھی اور میں آٹھ دس گھنٹے سو سکتا تھا لیکن کسی وجہ سے یہ وقت گزر جائے تو پھر نیند غائب ہو جاتی تھی۔

اس گھر کا کچن تو میں نے دیکھا تھا کہ کہاں ہے لیکن اس میں کون سی چیز کہاں ملے گی... ملے گی بھی نہیں... یہ ایک حوصلہ شکن خیال تھا لیکن کچھ دیر بعد میں نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے باہر لاؤنج میں کھلنے والا دروازہ تھوڑا سا کھولا تو ایک چیخ سنائی دی۔ جو ظاہر ہے نہ میں نے ماری تھی نہ دروازے نے۔

صائمہ نے جھینپ کے کہا۔ "میں... دیکھنے آئی تھی کہ تم کیوں جاگ رہے ہو۔" وہ اندر آ گئی۔

"پھر... وجہ معلوم ہو گئی؟" میں نے کہا۔ "مجنوں کیوں تارے گنتا تھا؟ لیلیٰ کے عشق میں اور اس کے فراق میں۔"

"میرا مجنوں جھوٹ بولتا ہے۔ تم وہ مسودہ پڑھ رہے تھے۔"

"اچھا... آپ اس سے پہلے بھی چوری چھپے جھانک کر جا چکی ہیں... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چشمِ لیلیٰ بھی شبِ ہجراں میں بے خواب تھی۔"

"یہ عجیب سی جگہ ہے... مجھے تو ہول آ رہا تھا۔ باہر ایسی خاموشی ہے بلکہ آسیب زدہ سناٹا ہے... اور سردی بھی تھی..."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے سوچا کافی بنالوں... پھر خیال آیا کہ تم سے بھی پوچھ لوں۔"

"اس خیال پر مجھے خیال آیا ہے کہ تمہارا منہ چوم لوں۔" میں نے اسے چوم کے کہا۔ "اس کے بعد ہم سونے کی کوشش کریں گے... زور کس پر ہوا... ہم پر... جو کام ایک سے نہ ہو، وہ دومل کے کر سکتے ہیں... اتفاق میں برکت ہے۔"

وہ خود کو چھڑا کے باہر نکل گئی۔ "اگر تین ہوں تو مزید بہتر ہوگا... نازنین کو بھی بلا لوتا۔"

وہ دس منٹ بعد کافی کے دو مگ اٹھائے لوٹی۔ "میرا خیال ہے کہ یہاں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تفریح خاک بھی نہیں ہوگی۔"

"اس کا وقت بھی آئے گا... انشاء اللہ بہت جلد۔" میں نے کافی کی حرارت کو حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اپنی جان کی بازی لگانے کا حوصلہ رکھتی ہو... میری خاطر؟"

اس نے حیرانی سے کہا۔ "یہ کیسا سوال ہے؟"

"صرف ہاں یا نہ میں جواب دو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "اگر تمہارا ہونے والا مجازی خدا کہے؟"

"مجازی خدا خود اپنی جان کی بازی کیوں نہیں لگاتا... میری جان فالتو ہے کیا؟"

"دیکھونا... میری تو ایک قائم مقام یا نائب محبوبہ ہے... ڈاکٹر غزالہ... خدانخواستہ تم نہ رہیں تو وہ تمہاری کمی پوری کرے گی... میری جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے جو تمہاری زندگی کے خلا کو پُر کر سکے... بزدل صرف ایک ہے۔"

"سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے، کیا کرنا ہے مجھے؟"

"بھئی نازنین کے غائب ہو جانے والے شوہر کو واپس لانا ہے اور کیا..." میں نے شرافت سے جواب دیا۔

"کہاں سے... معلوم نہیں آج وہ کس نام اور شناخت کے ساتھ کہاں ہوگا۔ پشاور میں یا کراچی میں... جو آدمی دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کا ایسا ماہر ہو..."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بے حد رومینٹک لہجے میں کہا۔ "کیا اس خلوت اور ایسی رومانی فضا میں بھی تمہارا پتھر دل موم نہیں ہوتا... تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم یہاں ہنی مون پر آتے تو کتنا اچھا تھا۔"

"ہنی مون!" اس نے ہاتھ چھڑائے بغیر کہا۔ "اس کے لیے تم نے کچھ بھی نہیں کیا... آج میں نوٹس دے رہی ہوں تمہیں... آخری نوٹس... اس سال کے ختم ہونے سے پہلے تم نے میرا مطالبہ پورا نہیں کیا تو..."

"تو تم مجبوراً میرے کرائے کے فلیٹ میں ہی دلہن بن کے آجاؤ گی... اپنا گھر ہونے کی شرط ختم کر دو گی... مجھے یہی امید تھی۔"

"میں وزیرِ صحت سے شادی کرلوں گی... تم جانتے ہو نا اسے... وہ اسپتال کے دورے پر آیا تھا... ایم ایس کو ہٹا کے اس نے مجھے ساتھ رکھا۔ اپنا کارڈ اور پرائیویٹ فون نمبر دیا... کہہ رہا تھا کہ آپ چاہو تو میں اسی اسپتال میں آپ کو ایم ایس بنا دوں... موجودہ ایم ایس کی جگہ... اسے پھنسانا کوئی مشکل نہیں ہوگا... مجھے یقین ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا، بکواس بند کرو اور سنو تمہیں کرنا کیا ہوگا... آج رات نازنین تمہارے کمرے میں ہوگی... اور تم نازنین کی جگہ اس کے بیڈ پر۔"

"اس سے کیا ہوگا مسٹر سراغ رساں؟"

"نازنین کو اپنا شوہر مل جائے گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "خاتون! آخر ہم آئے کس لیے تھے... اس کے بعد ہم شفٹ کر جائیں گے پی سی میں... مگر ان کا اصول ہے کہ وہ صرف ڈبل بیڈ دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے... دوسرا ڈبل بیڈ میں لے لوں گی... تم نے یہ مسودہ پڑھا... کیا ہے یہ...؟"

"یہ بڑا زبردست ناول ہے۔" میں نے کہا۔ "سوچ رہا ہوں اسے اپنے نام سے شائع کرا دوں... مگر اس وزیرِ صحت کو قتل کرنے کے بعد۔"

نازنین سے ناشتے کی ٹیبل پر ملاقات ہوئی تو مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ ہوا کہ رات اس نے سونے سے زیادہ رونے میں گزاری ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے جو کہا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔ واقعی وہ بدنامی کے راستے پر چلتے چلتے تھک گئی تھی اور اس نے بڑی نیک نیتی سے اپنا گھر بسایا تھا۔ محبت کے دعوے اس نے تمام عمر مردوں سے سنے بھی ہوں گے اور کیے بھی ہوں گے لیکن اب سچ مچ ایک مرد اس کا محبوب شریکِ زندگی اور مجازی خدا بن گیا تھا۔ وہ اس کے لیے اتنی ہی پریشان تھی جتنی کوئی گھریلو مشرقی ماحول کی پروردہ لڑکی ہو سکتی ہے۔

میں نے اسے رسمی طریقے سے تسلی دی۔ "دیکھو، اللہ پر بھروسا رکھو... وہ بہت جلد آجائے گا۔"

اس نے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا تمہیں اس کا کوئی سراغ ملنے کی امید ہے؟ یا تم رسمی اخلاق کا مظاہرہ کررہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "نازنین... ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ میں کوئی سراغ رساں ہوں... نہ میں نے کبھی سراغ رساں ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ "وہ ڈائری پڑھ لی تم نے؟"

"ہاں... ساری رات جاگ کے میں نے یہی کام کیا... میں تمہارے اخذ کیے ہوئے نتائج کو غلط نہیں کہہ سکتا... مگر یہ کوئی ایسی مستند دستاویز بہرحال نہیں جو ثبوت کے طور پر کسی بھی عدالت میں پیش کی جاسکے... یہ ڈائری... یا کاپی تمہیں ملی کہاں سے؟"

"تم نے دیکھا تھا... یہ میں نے کہاں سے نکالی تھی..."

"یہ اسی صوفے کی سیٹ کے نیچے سے ملی تھی... کیسے... میرا مطلب ہے تم نے تلاشی لی تھی گھر کی... یا یہ محض اتفاق تھا؟"

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ "تلاشی تو میں نے لی تھی۔ ہر الماری کو کھول کے دیکھا تھا۔ ان میں کتابیں بھری ہوئی ہیں یا برتن ہیں... اور کچھ ذاتی استعمال کی اشیا... ڈائری اتفاق سے ملی تھی۔"

میں نے کہا۔ "یہ گھر تمہارے شوہر کے کسی دوست کا ہے۔ چابیاں اسی نے دی ہوں گی؟"

"ہاں... میرے سامنے تو نہیں دیں۔"

"کہاں ہیں وہ چابیاں؟" میں نے کہا۔ "مجھے دکھاؤ۔"

وہ گئی اور اپنے بیڈروم سے چابیاں لے آئی۔ میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ وہ ڈپلی کیٹ نہیں تھیں۔ سب اوریجنل چابیاں تھیں۔

"جب تم سرفراز کے ساتھ یہاں آئی تھیں... تو گھر کے اندر آنے کے لیے تم نے یہی چابیاں استعمال کی ہوں گی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "اس گھر کا مالک... کیا نام ہے اس کا... ہاں، یاد آیا وقار حیدر... وہ بھی تو وکیل ہے مگر وہ کراچی میں ہوتا ہے۔"

"زیادہ تر لیکن لاہور بھی آتا ہے۔"

"یہ گھر عام طور پر خالی رہتا ہے۔ مالک خود بہت کم آتا ہے۔ اس کے مہمان آجاتے ہیں کبھی کبھی... مگر یہ جو گھر کے ملازم ہیں... یہ تو سارا سال یہاں رہتے ہوں گے... دیکھ بھال کے لیے؟"

"ہاں... ایک چوکیدار ہے اور ایک مالی... مالی ہی خانساماں بھی ہے... اس کی بیوی اوپر کا سارا کام کر لیتی ہے... صفائی اور جھاڑ پونچھ۔"

"یہ سب کہاں رہتے ہیں؟"

"مالی کا گھر ہے یہاں... چوکیدار کے لیے پیچھے سرونٹ کوارٹر ہے۔ مالی روز آتا ہے اور کام کر کے میاں بیوی شام کو چلے جاتے ہیں۔"

"ان کے پاس ڈپلی کیٹ چابیاں ہوں گی... ورنہ اندر کی صفائی وہ کیسے کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ضرور ہوں گی... جب آئے تب بھی گھر بالکل صاف تھا۔"

میں نے کہا۔ "پھر تمہارے شوہر کے دوست وقار حیدر نے چابیاں کیوں دیں؟ اور کراچی سے چابیاں کون لے کر آیا؟"

نازنین نے لاجواب ہو کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "میں کیا بتاؤں... نہ مجھے خیال آیا... نہ میں نے پوچھا... مگر بات تمہاری صحیح ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم باہر لان میں آبیٹھے جہاں صبح کی دھوپ بڑی اچھی لگتی تھی۔ دوپہر تک اس کی تمازت بڑھنے لگتی تھی اور دھوپ میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ صائمہ نے میری درخواست پر نازنین کے ساتھ رقابت کے جذبات ختم کر کے دوستانہ مراسم استوار کر لیے تھے۔ غالباً اب اسے نازنین سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا تھا۔

میں نے نازنین سے پوچھا۔ "یہ سفید ٹویوٹا سرفراز خاں کی ہے... یا تمہاری؟"

"یہ میری ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ ڈائری... ایک اچھا ناول ہے... اگر تم چاہو تو اسے شائع بھی کرا سکتی ہو... ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں پایا کہ اس کا مصنف خود سرفراز خاں یا قادر بخش ہے... تو پھر اسے وہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے کے نیچے چھپا کر کیوں گیا تھا؟"

"شاید اس نے سوچا ہوگا کہ وہاں وہ محفوظ ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں اس صوفے پر جا بیٹھی... ادھر میں جاتی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا ارادہ کچھ لکھنے کا ہو... اچانک کسی کے آجانے سے اس کو موقع نہیں ملا... وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں ڈائری کو چھپا دیا... اور پھر اٹھانا یاد نہیں رہا... خیر، تم میرے ساتھ چل کے اس کی لائبریری دکھاؤ۔"

صائمہ نے کہا۔ "کیا وہ ڈائری میں بھی پڑھ سکتی ہوں جس کا حوالہ بار بار آرہا ہے... جو تم رات بھر پڑھتے رہے

تھے؟"

میں نے ڈائری اس کی طرف بڑھا دی اور خود نازنین کے ساتھ گھر کے اس کمرے میں چلا گیا جو لائبریری اور آفس سمجھا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک ایک الماری کو کھول کے دیکھا... ان میں زیادہ تر ادبی کتابیں تھیں... ایک الماری صرف قانون کی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

نازنین پُرامید نظروں سے میری ساری کارروائی کا جائزہ لے رہی تھی... جیسے میں کسی بھی وقت اچانک اعلان کر دوں گا کہ سراغ مل گیا... تمہارا گم شدہ شوہر مل گیا... مبارک ہو... لیکن دوسری طرف ابھی تک مجھے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تھی جس سے میں اندازہ کر سکتا کہ سرفراز خاں اگر اس دنیا میں ملا تو کہاں ملے گا... میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ اے میرے رب... اس بار میری عزت رہ جائے تو آئندہ میرے باپ کی توبہ جو کبھی سراغ رسانی کے لیے ہامی بھروں۔

مجھے کچھ بھروسا تھا تو اپنی عقل پر... اور عقل نے مجھے دو جمع دو چار کے فارمولے پر کوشش جاری رکھنا سکھایا تھا... میرے دماغ نے ایک سمت میں راہنمائی کی تھی... میں اسی راہ پر چل رہا تھا... لائبریری کے بعد میں نے نازنین کا بیڈ روم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

اس کے بیڈ روم میں ایک سائڈ پر اوپر تلے دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے... نسبتاً بڑا سوٹ کیس نازنین کا تھا۔ دیوار کی ایک پوری سائز وارڈروب تھی۔ درمیانی حصے میں نیچے جوتوں کے لیے شیلف تھے۔ اوپر کے سارے شیلف مختلف اشیا کے لیے تھے... کپڑوں کی ایک الماری دائیں طرف تھی۔ اس میں نازنین نے اپنے کپڑے لٹکا دیے تھے۔ میں نے سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا لیکن یہاں سے مجھے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی۔ دوسری الماری میں سرفراز خاں کے کپڑے تھے۔ ہینگرز میں تین سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ دو کوٹ اس کے علاوہ تھے۔ ایک پرنس کوٹ تھا۔ تین جرسیاں تھیں اور ایک لیدر کی جیکٹ... میں نے نازنین کی طرف دیکھا۔ "ان میں سے کتنے کپڑے سرفراز خاں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا... اور کتنے پہلے سے موجود تھے؟"

نازنین نے سوچ کے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں... اپنا سوٹ کیس اس نے خود ہی خالی کیا تھا۔"

"اچھا غور سے دیکھو۔ ان میں سے کتنے سوٹ یا کوٹ ایسے ہیں جو سرفراز نے تمہارے سامنے پہنے تھے۔"

نازنین نے ہاتھ لگا کے بتایا۔ "یہ سوٹ... ایک یہ کوٹ... اور یہ جیکٹ اس نے یہاں آتے وقت پہن رکھی تھی۔"

"ان شرٹس کو دیکھو... اور ٹائیاں۔"

اس نے چار شرٹس کی نشاندہی کی... اور چار ہی ٹائیاں بتائیں۔ "وہ اپنے سب کپڑے یہاں نہیں لایا تھا اور نہ مجھے اندازہ ہے کہ اس کے پاس کتنے کپڑے ہوں گے۔ سردی کے الگ، گرمی کے الگ... ہم ایک ہفتہ ہی تو ساتھ رہے تھے۔"

میں نے کہا۔ "مگر جانتی تو پہلے سے تھیں۔"

وہ کچھ خفیف ہوئی۔ "لاہور میں اس کا لباس مختلف تھا۔"

میں نے کہا۔ "سفید لٹھے کی کلف لگی شلوار قمیص... کالی واسکٹ اور اونچے شملے والی پگڑی... پیروں میں ملتانی کھسہ۔"

"کبھی کبھی... شلوار قمیص وہ دو گھوڑا بوسکی والی ہی پہنتا تھا... سوٹ اس نے صرف ایک بار پہنا تھا... ٹائی کے بغیر۔"

واش روم میں اس کے ذاتی استعمال کی تمام اشیا موجود تھیں۔ ٹوتھ برش... شیونگ کریم اور آفٹر شیو لوشن... میں نے اس کے سوٹ کیس کی تلاشی بھی لی... بات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی چنانچہ میں نے اسی لائن کو پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ "وہ اپنا موبائل فون تو لے گیا ہوگا؟"

"وہ بند ہے۔"

"تمہارے اپنے موبائل پر حیدر صاحب کا نمبر ہے تو ان سے کہو کہ تمہیں سرفراز خاں کی ایک ڈائری ملی ہے... کیا اسے میرے بارے میں معلوم ہے کہ تم نے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"ان سے ابھی تک اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔"

"گڈ... ان سے کہو کہ وہ فوراً آجائیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ کراچی میں ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"جب آخری بار ان سے بات ہوئی تھی... تو انہوں نے بتایا تھا۔"

"کیا میں تمہارا موبائل فون دیکھ سکتا ہوں؟"

اس نے موبائل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے گزشتہ دو روز میں موصول ہونے والی اور کی جانے والی تمام فون کالز کے نمبر دیکھے۔ بلاشبہ وقار حیدر ایڈووکیٹ کا نمبر کراچی کا تھا۔ میں نے اپنے فون سے یہ نمبر نادرا کو دیا۔ "ذرا نادرا سے تصدیق کر کے بتاؤ کہ یہ سم کس کے نام پر ہے۔ اس کا پتا کیا ہے... شناختی کارڈ نمبر کیا ہے۔"

صرف دس منٹ بعد اس کی کال آگئی۔ "نمبر کسی وقار حیدر ایڈووکیٹ کا ہے... مستقل پتا سوسائٹی کا ہے... پی ای سی ایچ ایس... عارضی پتا اس کے چیمبر کا ہے جو ایم اے جناح روڈ پر ہے... شناختی کارڈ کا نمبر لکھ لو۔"

"کیا تمہیں حیدر پر شک تھا؟"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیسا شک... تم ذرا اسے فون کرو... اور اپنے فون کو ہینڈ فری رکھو... اس کا اسپیکر آن ہوگا تو میں بھی ساری بات سن سکوں گا۔"

نازنین نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور نمبر ملایا۔ چند سیکنڈ گھنٹی بجتی رہی... پھر کسی نے بھاری آواز میں کہا۔ "ہیلو نازنین!"

"حیدر صاحب... آپ کہاں ہیں؟" وہ بولی۔

"میں نے کل بتایا تھا تمہیں... کراچی میں۔"

میں نے ایک کاغذ پر لکھا۔ "اس سے چیمبر کا نمبر پوچھو۔"

"مجھے ایک ضروری بات بتانی تھی آپ کو۔"

اس نے کہا۔ "کیا سرفراز کا سراغ مل گیا؟"

"نہیں... لیکن مجھے ایک ڈائری ملی ہے... اس کی پیلے رنگ کی جلد ہے... یہ تقریباً چار سو صفحات کی کاپی ہے... ڈائری میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے، وہ ڈائری کی طرح ہے... میرا خیال ہے کہ یہ سرفراز کی ڈائری ہے۔"

حیدر نے پوچھا۔ "اچھا... اسے پڑھا تم نے؟"

"ہاں... اور اب میں آپ کو یہ ڈائری دکھانا چاہتی تھی... جو اس میں لکھا ہے وہ فون پر نہیں بتا سکتی... کیا آپ یہاں آسکتے ہیں... فوراً؟"

"فوراً؟ دیکھو نازو... کراچی سے مری آنے میں وقت تو لگتا ہے... اگر مجھے جہاز پر اسلام آباد کی فلائٹ مل جائے... تب بھی شاید میں تین چار دن بعد ہی آؤں گا... دراصل یہاں ہائی کورٹ میں میرے کچھ کیس ہیں جو میں کسی ماتحت پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اچھا، آپ کے چیمبر کا بھی کوئی نمبر تو ہوگا... لینڈ لائن۔"

وہ بولا۔ "اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یہاں پہاڑوں میں سگنل اکثر غائب ہو جاتے ہیں۔" نازو نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ "میں صبح سے کوشش کر رہی تھی مگر آپ کا سیل نمبر مل ہی نہیں رہا تھا... کبھی ضرورت پڑے تو..."

"وہ نمبر بھی ملے گا نہیں... خراب پڑا ہے... ٹیلی فون والے کہتے ہیں کیبل فالٹ ہے... ٹائم لگے گا... بدمعاش پیسے اینٹھنا چاہتے ہیں سب سے... ہم نے بھی طے کر لیا ہے کہ ایک پیسا نہیں دیں گے... بات کریں گے جی ایم سے... تم گھبراؤ نہیں... میں یہاں اپنے تعلقات کی مدد سے پوری کوشش کر رہا ہوں کہ سرفراز کا سراغ مل جائے... اسپیشل پولیس میں میرا ایک دوست ہے اسلام آباد میں... اچھا، ایک بات سن لو میری... تم نے اس ڈائری کا کسی سے ذکر تو نہیں کیا ہے؟"

"یہاں اور کون ہے جس کو میں بتاتی؟"

"میرا مطلب تھا... پولیس بھی پوچھ گچھ تو کر رہی ہو گی؟"

"ابھی تک تو وہ مجھ پر ہی شک کر رہے ہیں... ایک سب انسپکٹر آیا تھا... اس نے الٹی سیدھی بات شروع کی تو میں نے اسے بے عزت کر کے بھگا دیا۔ میں نے ایک ڈی آئی جی کا نام لیا کہ وہ میرے سگے ماموں ہیں... نوکری سے نکلوا دوں گی... وہ بھاگ گیا... اتنی ہمت کہاں اس میں کہ تصدیق کرتا ڈی آئی جی صاحب سے کہ آپ کی کوئی بھانجی نازنین نام کی ہے یا نہیں... لیکن اس کے بعد آیا کوئی نہیں... آپ کب آئیں گے؟"

"میں نے بتایا نا... تین چار دن تو لگ جائیں گے... تم اس ڈائری کا حوالہ بھی مت دینا کہیں... اور اسے حفاظت سے رکھنا۔"

میں نے نازنین کو اشاروں کی زبان میں ایک بات سمجھانی چاہی جو اس نے سمجھ لی۔ "وہ میرے پاس ہے... رات کو بھی اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ کے سوتی ہوں... ہیلو... آپ سن رہے ہیں نا... وہ پی ٹی سی ایل کا نمبر... ہیلو... حیدر صاحب۔"

لیکن دوسری طرف سے حیدر نے فون بند کر دیا تھا۔ نازنین نے دوبارہ کال کی تو کوئی رسپانس نہیں ملا۔ "شاید سگنل نہیں ہیں... اوہ... میری تو بیٹری ہی ختم ہے... اسے چارج پر لگا دوں۔"

میں اسے اپنا فون آفر کرنا چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ حیدر سے رابطہ کرے مگر اتنی دیر میں گارڈ اندر آگیا۔ "کوئی تھانے سے آیا ہے میڈم..." اس نے نازنین سے کہا۔

"اسے بلا لو۔" میں نے کہا۔ "ذرا ہم بھی دیکھ لیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گارڈ نے میری طرف دیکھا۔ ”سر... وہ چلا گیا... اس نے کہا کہ میڈم کو انچارج صاحب نے تفتیش کے لیے تھانے بلایا ہے۔“

میں نے نازنین کا رنگ فق ہوتے دیکھا۔ ”ٹھیک ہے... تم جاؤ... تمہارا کام پیغام پہنچانا تھا۔“

نازنین نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔“

”مت جاؤ... میں اکیلا چلا جاتا ہوں... لیکن اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب تم نے کچھ بھی نہیں کیا ہے... سوائے شادی کے... یہ جرم ہے تو پھر مجرم کون نہیں۔“

اندر سے صائمہ نمودار ہوئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے وہ ڈائری نازنین کی طرف بڑھائی۔ ”اتنا دلچسپ ناول ہے کہ میں چھوڑ نہیں سکی... کس نے لکھا ہے... اور یہ نام کیا ہوا بھلا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ چچا غالب کے ایک مصرع سے لیا گیا ہے... میں کون ہوں... اے ہم نفو سوختہ جاں ہوں... خدا کے لیے اب یہ مت پوچھنا کہ جواب تو خود انہوں نے دے دیا کہ سوختہ جاں ہوں مگر یہ سوختہ جان کیا ہوتا ہے؟“

”تمہارے چچا نے... تم بتا سکتے ہو۔“ وہ بولی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”نقطہ اوپر لگا لو... وہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ سوختہ خاں ہوں... یہ کوفتہ خاں کے بڑے بھائی تھے... بھنڈی بازار میں رہتے تھے...“

چالیس پینتالیس سال کی دبلی پتلی عورت بنگالی اسٹائل میں ساڑی باندھے منہ سر لپیٹے نمودار ہوئی۔ ”امیر پوچھ رہا ہے کہ چائے میز پر لگاؤں یا آپ ادھر لیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہم غریب اسی جگہ پی لیں گے... جہاں ملے گی۔“

نازنین ہنسنے لگی۔ ”امیر اس کے میاں کا نام ہے... مالی کا۔“

نازنین نے جو پتا سمجھایا، وہ اتنا ہی کنفیوز کرنے والا تھا جتنا کہ صائمہ یا کسی اور خاتون کی راہنمائی کا نتیجہ ہوتا... گارڈ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”اللہ کسی دشمن کو ادھر نہ لے جائے... مجھ سے آپ مسجد کا پوچھو...“ بالآخر یہ نیکی پی سی کے ایک ویٹر کے حصے میں آئی۔ ان پہاڑی علاقوں میں بھی تھانوں کا علاقہ دس میل کا ایک دائرہ بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی... میرے ساتھ صائمہ نہ ہوتی تو تھانے تک کا فاصلہ طے کر کے واپس آنے میں شاید صبح ہو جاتی۔

تھانے میں بڑی رونق تھی۔ ایک عاشق صادق کی چھترول ہو رہی تھی جس پر اس کے خسر محترم دل کھول کے داد دے رہے تھے۔ یعنی وہ بزرگ جن کو وہ اس مرتبے پر فائز کرنے کا آرزومند تھا۔ عبرت پکڑنے کے لیے یہ دل خراش منظر اسے بھی دکھایا جا رہا تھا جو اس نوجوان کے جرم میں شریک تھی۔ چھترول کے لیے روایتی طریقے پر عاشق کو فرش پر ننگا کر کے الٹا لٹا دیا گیا تھا... اس کے دونوں ہاتھ آگے سے ایک قانون کے محافظ نے پکڑ رکھے تھے اور پیچھے سے دوسرے نے ٹانگیں دبالی تھیں... تیسرا چمڑے کے دو ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے ٹکڑے کو سر کی بلندی سے اوپر تک اٹھاتا اور پھر پوری قوت کے ساتھ نیچے لا کے جرمِ عشق کے مرتکب نوجوان کی کمر پر رسید کرتا تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ صائمہ کو باہر ہی یہ کہہ کے روک دیا تھا کہ میں دو منٹ میں آتا ہوں... دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تھانے کے پُرعبرت پُروحشت اور پُردہشت ماحول کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے... اگر اچانک اس کے سامنے یہ منظر آجاتا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا اور نہ جانے کب تک وہ رات کو خواب دیکھ کر ڈرتی رہتی... دوسری اچھی بات یہ تھی کہ میں نے گاڑی میں سے کیمرا اٹھا لیا تھا۔

میرے لیے بھی اس بربریت کا خاموش تماشائی بننا مشکل تھا... میں نے پوری آواز سے دہاڑ کے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میری آواز ہی نہیں، میں خود بھی غصے سے کانپ رہا تھا۔

یکلخت وہ سارا منظر یوں منجمد ہو گیا جیسے ٹی وی پر تصویر رک جاتی ہے۔ ان سب کی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر جلاد کے فرائض انجام دینے والے نے غرا کے کہا۔ ”نظر نہیں آتا... ہم تفتیش کر رہے ہیں۔“

اب دوسرا بولا۔ ”اور تو ہے کون؟“

میں نے کہا۔ ”میں بزدل ہوں۔“ اور ایک ساتھ کئی تصویریں اتار لیں۔

ماحول یکلخت بدل گیا۔ وہ سب ہنسنے لگے۔ جلاد بولا۔ ”او اتنا ہی بزدل ہے تو یہاں کیوں آیا ہے؟“

ملزم کے پیروں پر بیٹھے جوکر نے کہا۔ ”بزدل نہیں جی... ہے۔“

جو لفظ اس نے بزدل کے مترادف کے طور پر استعمال کیا تھا، وہ سمجھا جا سکتا ہے، لکھا نہیں جا سکتا... ملزم کے ہاتھ پکڑنے والے نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس سے زیادہ فحش زبان میں مجھے مطلع کیا کہ دفع نہ ہونے کی صورت

میں میرے ساتھ کیا ہوگا... اس نے جلاد کو سر کہہ کے مخاطب کیا تھا... میں نے اس کی بھی ایک تصویر ایکشن میں اتار لی۔

اب میں نے جیب میں سے اپنا پریس ایکریڈیشن کارڈ نکالا اور سر کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”میں تمہاری ساری بدمعاشی اور لاقانونیت کی رپورٹ ہر اخبار میں لگا دوں گا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ... کون ہوں؟“

ایک بار پھر وقتی سکوت آیا۔ سر کا آلۂ چھترول دائیں ہاتھ میں تھا۔ بائیں ہاتھ سے انہوں نے کارڈ کو ملاحظہ کیا۔ اس کے بعد بھی وہ میرے قدموں میں نہیں گرا۔ اس نے اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں معاونین کو کچھ اشارہ کیا... معاون فوراً ملزم کو چھوڑ کے کھڑے ہو گئے... ملزم اپنی حالت کو بھول کے بلبلاتا ہوا میری طرف لپکا ہی تھا کہ اسے پھر پکڑ لیا گیا۔

”آپ آؤ جی میرے ساتھ... آپ اخبار والے بھی شیطان کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتے ہو... اور پھر موقع محل دیکھے بغیر مذاق کرتے ہو۔“

میں نے چلا کے کہا۔ ”میرا تمہارا کون سا مذاق ہے... اور شیطان میں ہوں یا تم ہو... یہ شیطانیت کا مظاہرہ کون کر رہا تھا؟“

وہ اے ایس آئی اس تھانے کا انچارج تھا اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں یہ صورتِ حال اس کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ اپنی عزت کے معاملے کو بالائے طاق رکھ کے نوکری بچائے۔ اس نے بڑا دوستانہ، خوشامدانہ انداز اختیار کر لیا۔ ”اوسر جی... آپ تو ناراض ہو گئے۔ چلو جی غلطی معاف کر دو... چلیں کمرے میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں... اوئے سر کے لیے چائے شائے لاؤ۔“

میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ”شاید تم میرے نام سے واقف نہیں ہو... میرا کالم تمہارا آئی جی بھی روز پڑھتا ہے اور وزیرِ داخلہ بھی... تم نے مجھے نہیں، سارے صحافیوں کو سب کے سامنے گالی دی ہے... میڈیا سے ٹکر لی ہے... اب دیکھنا یہ خبر، تصویریں اور میرا کالم شائع ہوگا تو خود سپریم کورٹ سوموٹو نوٹس لے گی۔“ میں واقعی سخت طیش میں آ گیا تھا۔ ”ہاں... ایک شرط پر معافی مل سکتی ہے...“

”جناب عالی حکم فرمائیں... شرط کیسی؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے اس ملزم کو اور اس لڑکی کو بلاؤ... صاف ستھرا کر کے اور کپڑے پہنا کے... میں ان سے خود بات کروں گا... میرے ساتھ ایک ٹی وی کی اینکر پرسن بھی ہیں... وہ بھی موجود ہوں گی۔“

صورتِ حالات یکلخت بدل گئی۔ صائمہ میرے بلانے پر تھانے دار کے کمرے میں آ گئی... زیرِ تفتیش ملزم یعنی عاشقِ صادق اور اس کی محبوبہ دلنواز کو پہلے پیش کیا گیا... انہوں نے روتے دھوتے اعترافِ جرمِ محبت کیا اور مجھے بتایا کہ وہ بچپن سے منسوب تھے اور ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے مگر اب باہر بیٹھے لڑکی کے باپ نے اس کا رشتہ کسی دولت مند ٹھیکے دار سے طے کر دیا تھا۔ جنگلات کاٹنے کے غیر قانونی کاروبار میں ملوث اس ٹھیکے دار نے لڑکی کے باپ کو دو لاکھ نقد دیے تھے اور اپنے کاروبار میں دس فیصد کا پارٹنر بھی بنا لیا تھا۔

قصہ مختصر... میں نے اور صائمہ نے وہیں تھانے میں ایسی عدالت لگائی۔ وہیں ایک قاضی کو پکڑ کے لایا گیا جس نے ہمارے سامنے لڑکے اور لڑکی کا نکاح پڑھوایا... دلہن کے باپ پر دو جرم ثابت تھے۔ ایک بیٹی کے عوض دو لاکھ لینے کا یعنی بردہ فروشی... دوسرا غیر قانونی طور پر جنگلات کاٹنے کا جس میں اصل مجرم اس کا نہ ہونے والا داماد شامل تھا۔

چلتے وقت ہم نے دو دھمکیاں دینا ضروری سمجھیں۔ ایک یہ کہ دولہا دلہن کی سلامتی اور تحفظ کا ذمے دار خود تھانہ انچارج ہوگا... میں نے دولہا کو اپنا کارڈ بھی دیا کہ بعد میں کوئی اسے پریشان کرے تو براہِ راست مجھے اطلاع دے... دلہن کے باپ کا تو یہ حال تھا کہ لگتا تھا وہ ابھی سینہ پکڑے گا اور فلمی انداز میں اس پر دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

دوسری دھمکی کا تعلق نازنین سے تھا۔ کسی نے ادھر کا رخ کیا تو پھر کسی کی خیر نہیں... ہم وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں... بزدل آج بلیک میلر بن گیا تھا...

جب ہم واپس پہنچے تو نازنین سخت پریشان تھی اور میز پر کھانا رکھے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ہم نے ہنس ہنس کے ساری روداد سنائی کہ... ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ پہاڑوں میں رات بہت جلد ڈیرا ڈال لیتی ہے۔ سورج جیسے غوطہ مار کے سرِشام ہی پہاڑوں کے پیچھے روپوش ہو جاتا ہے اور اندھیرا ایک دم یلغار کرتا ہے۔ پہاڑ اور درخت سب گھپ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں اور سناٹے میں صرف ہوا کے سائیں سائیں کرنے کی صدا گونجتی ہے۔

شہر کے حساب سے ابھی رات کے دس ہی بجے تھے کہ ہم کھانے سے فارغ ہو گئے۔ میرا ذہن تھانے کے واقعات سے پھر نازنین کے مسئلے کی طرف لوٹ آیا۔ جب نازنین کافی بنانے گئی ہوئی تھی تو میں نے اپنی اسکیم صائمہ کے سامنے رکھی۔

”نورِ چشم، راحتِ جاں، لختِ جگر... ذرا ٹھنڈے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دماغ سے میرے ایک سوال کا جواب دو... آج رات میں نازو کے ساتھ اس کے کمرے میں سو جاؤں؟"

صائمہ نے چیخ کے کہا۔ "آج ہی کی بات کیوں کرتے ہو... کل، پرسوں اور اس کے بعد بھی سوتے رہو۔ آخری شوہر تو اس کا ہے نہیں... پہلے تم ہی تھے۔"

میں نے کہا۔ "تھینک یو ویری مچ... دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میرے ساتھ تم رہو۔ نازو تمہارے بیڈ روم میں چلی جائے۔"

"میں سر پھاڑ دوں گی تمہارا..." اس نے اِدھر اُدھر کسی موزوں چیز کی تلاش میں دیکھا جس سے یہ کارِ خیر ممکن ہو سکے۔

میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک انتہائی بے ضرر اور شریفانہ تجویز ہے... وہ یوں کہ تم رہو بیڈ کے اوپر... اور میں نیچے۔"

"آخر کیا بدمعاشی سوجھ رہی ہے تمہیں... کل تو تم گیسٹ بیڈ پر ہی سو گئے تھے شرافت کے ساتھ۔"

"کون شرافت... یہ تم بہتان لگا رہی ہو مجھ پر۔" میں نے کہا۔ "خیر... اس وقت میں نے غصہ کیا تو میرا دماغ کام کرنا بند کر دے گا۔ اس لیے جو میں آگے کہوں گا اس پر دھیان دو۔"

بات آسانی سے صائمہ کی سمجھ میں آگئی۔ نازو نے اصل بات سمجھے بغیر وہ بات سمجھ لی... سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا... وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتی رہی۔ اسے میری تجویز پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا... بلکہ صائمہ اعتراض نہ کرتی تو وہ میری پہلی تجویز کو بھی قبول کر سکتی تھی۔ صائمہ کے اس قول کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کہ... اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم... آخری شوہر نہ سہی پہلا تو ہے...

میرے لیے بیڈ کے نیچے سونے کا یہ تجربہ بڑا دردناک تھا۔ ایک آزار دینے والا خیال تو یہی تھا کہ مسئلہ صرف شرعی ہے ورنہ میں اوپر ہوتا... مگر وہ دن دور تھا جب صائمہ ایک منکوحہ بنے۔ نیچے دوسری تکلیف ٹھنڈے اور سخت فرش کی تھی... تیسری یہ تھی کہ میں سر اٹھا کے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چوتھی یہ کہ مچھر اور دیگر حشرات الارض میرے دل، جگر، گردے وغیرہ کھانا چاہتے تھے۔ پانچویں یہ کہ مجھے خوامخواہ اپنے مردہ اور کسی قبر میں ہونے کا خیال ڈرا رہا تھا۔ تکالیف کی ایک لمبی فہرست تھی لیکن ادائے فرض کے لیے بزدل یہ سب بہادری سے برداشت کر رہا تھا۔

اپنی پوری کوشش کے باوجود میں یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنے سے قاصر تھا کہ میرا مفروضہ غلط نہ ہو ورنہ کل پھر یہی عذاب ہوگا... شاید پرسوں بھی... اس کے بعد بھی بزدل کو کامیابی کی سند ملے گی یا وہ ناکامی کا داغِ شرمندگی لے کر لوٹ آئے گا... یہ سب غیر یقینی تھا۔

میرے دائیں ہاتھ پر میرے ساتھ ہی لوہے کا ایک پائپ لیٹا ہوا تھا جس پر میں نے اتنا کپڑا لپیٹ دیا تھا کہ اس کی ضرب قاتل نہ ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور ہم صرف سرگوشی میں باتیں کر سکتے تھے لیکن میری ہی آواز نیچے سے اوپر تک آتے آتے واضح نہیں رہتی تھی... اور صائمہ اتنی خوف زدہ تھی کہ ساری باتیں بھول گئی۔ ایک ہزار ایک سو گیارہ دفعہ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تنگ آ کے میں نے کہا کہ اچھا... پھر میں اوپر آجاتا ہوں... وہ مزید ڈر کے چپ ہوگئی۔

معلوم نہیں کیا وقت تھا جب میں نے ہلکا سا کھٹکا سنا اور میرے دل نے سینے میں قلابازی کھائی۔ میرے کان گدھے کی طرح کھڑے ہو گئے۔ کھٹکا پھر سنائی دیا۔ معلوم نہیں صائمہ کی خوف سے کیا حالت ہوگی... مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ چیخ نہ مار دے۔ میرا ہاتھ لوہے کے پائپ پر جم گیا۔ میں نے دو بار کروٹ لی اور بیڈ کے آخری کنارے تک پہنچ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق کھڑکی آہستہ سے کھلی اور میں نے صائمہ کے سرہانے کی طرف والے پردے کو ہلتا محسوس کیا۔ پردہ تھوڑا سا ہٹا اور ایک سایہ خاموشی سے حرکت کرتا اندر آگیا۔ میری ہدایات کے مطابق صائمہ نے ڈائری اپنے تکیے کے نیچے رکھی تھی مگر وہ ڈائری نہیں تھی۔ صرف اس کی جلد اصلی تھی۔ اندر کے صفحات میں نے نکال لیے تھے۔ ان کی جگہ میں نے چار کاپیوں سے بھر دی تھی۔

اندر آنے والے نے ایک ٹارچ روشن کی اور صائمہ کے چہرے پر ڈالی جو سر کے اوپر تک کمبل تانے سو رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کو تکیے کے نیچے کھسکایا... اس وقت میں نے دیکھا کہ ریوالور اس کے دائیں ہاتھ میں ہے۔

صرف ایک کروٹ کے ساتھ میں مسہری کے نیچے سے نکل آیا... پھر میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں تڑپ کے اٹھا اور میں نے وہ پائپ اجنبی کے ریوالور والے ہاتھ پر مارا... پہلے میرا خیال تھا کہ وار سر پر کروں مگر آخری وقت میں یہ خیال بدل گیا۔

اجنبی درد سے کراہا اور ایک دم پلٹا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے چلا گیا تھا۔ صائمہ کمبل پھینک کر اٹھی اور بستر سے چھلانگ مار کے اتری۔ میں نے اتنی دیر میں

"شاید میں کوئی بہت ہی خطرناک اور ہیبت ناک قسم کا انسان بنتا جا رہا ہوں۔" پریشان حال نوجوان نے اپنے ڈاکٹر سے کہا۔ "میری بیوی مجھ سے اتنی خوفزدہ رہتی ہے کہ میرے سامنے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکالتی اور میں جس کام کے لیے کہتا ہوں، فوراً بڑی وفاداری سے بجالاتی ہے... اور یہ کچھ بھی نہیں ہے ڈاکٹر! تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میری ساس جو پچھلے نو سال سے ہمارے ہاں تھی، آج صبح میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "بیٹا! میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ میں کبھی واپس نہ آنے کے لیے جا رہی ہوں۔" اور تب وہ حقیقت میں میرے گھر سے چلی گئی۔"

ڈاکٹر نے جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "دو باتیں بتاؤ، کیا کوئی دوسرا شخص بھی تمہاری طرح خطرناک اور ہیبت ناک بن سکتا ہے اور اگر کوئی تم سے خطرناک اور ہیبت ناک بننے کا طریقہ پوچھے تو تم کم سے کم کتنے ہزار میں وہ طریقہ اسے بتا دو گے؟"

کراچی سے حمیرا اقبال کی دریافت

پائپ اس اجنبی کے سر پر مار دیا تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل بیڈ پر گر گیا۔

"لائٹ صائمہ۔" میں نے چلاّ کے کہا اور نظر اس اجنبی پر رکھتے ہوئے جھک کر بیڈ کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ اجنبی جس ڈائری کی تلاش میں آیا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے گر کے بکھر گئی تھی۔ غالباً میری آواز نے نازنین کو بھی متوجہ کر لیا تھا۔ وہ دروازے سے بگولے کی طرح اندر آئی... اور ساکت ہوگئی۔

دونوں خواتین نے بڑی مہارت سے ملزم کو باندھا۔ صائمہ نے اس کے لیے چادر پھاڑی اور ملزم کو پٹیوں میں لپیٹ کر بالکل اہرامِ مصر سے برآمد ہونے والی ممی جیسا بنا دیا۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے یہ تصدیق وہ پہلے ہی کر چکی تھی کہ چوٹ خطرناک نہیں اور مریض بہت جلد ہوش میں آجائے گا۔

بیس منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول کے دیدے گھمانے شروع کیے اور متوقع سوال کیا۔ "میں کہاں ہوں؟" جو بے مقصد تھا۔

میں نے اس کی ناک دبا کے کہا۔ "تم اپنے گھر میں ہو پیارے... بہت جلد بڑے گھر پہنچ جاؤ گے... تمہارے سامنے تمہاری شریکِ حیات ہے۔"

وہ بیلنج کی طرح خیں خیں کرنے لگا۔ "تم کون ہو؟"

"میں بزدل ہوں... جس نے یہ بہادری کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا... اگر میں چاہوں تو تمہیں قتل کر کے کسی کھائی میں بھی پھینک سکتا ہوں جہاں بھیڑیے اور گیدڑ بھوکے پھر رہے ہیں... تم ان کی آوازیں سن سکتے ہو... صبح تک وہ تمہاری ہڈیاں بھی ہضم کر لیں گے۔"

صائمہ نے دور سے ڈائری کے صفحات لہرائے۔ "یہ لینے آئے تھے نا تم... افسوس... ایک بھول مہنگی پڑ گئی تمہیں۔"

"مجھے بے چینی سے تمہارا انتظار تھا حیدر صاحب... یہی ہے نا تمہارا موجودہ نام... ورنہ تم وہی قادر بخش ہو... جس نے اپنے گھر میں بیٹھ کے بقلم خود یہ ڈائری لکھی... نام بدلنے سے کچھ نہیں ہو سکتا... جب پولیس تم سے اعترافِ جرم کرائے گی تو اس کا ہر لفظ اس ڈائری کے مطابق ہی ہوگا۔"

نازنین پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ میرا شوہر ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر مجھے یقین تھا کہ حیدر صاحب کراچی سے تشریف لائیں گے... اپنی ڈائری واپس لینے... جو یہ افراتفری میں بھول گئے تھے لیکن اتنی بڑی بھول کو افورڈ نہیں کر سکتے تھے... تم نے دیکھا، اس نے کئی دن سے شیو نہیں بنائی ہے۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل اور بالوں کا رنگ بھی بدل لیا ہے۔ صرف تین مہینے بعد وقار حیدر تمہارے سامنے آتا تو خود تمہیں پہچاننا مشکل ہوتا کہ یہ تمہارا غائب ہو جانے والا شوہر سرفراز خان ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ یہ سب ایک چھوٹی سی بھول کا نتیجہ ہے... کہ میں ڈائری یہاں بھول گیا تھا۔" وہ کراہ کے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ”تم ڈائری لکھنے کو اپنی غلطی سمجھتے ہو؟“

”غلطیاں تو انسان بہت کرتا ہے اور انہی سے سیکھتا بھی ہے۔ میں تو لاعلمی میں مارا گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں میرا سامنا بزدل سے ہوگا اور نہ ہی یہ کہ بزدل اتنا بہادر بھی ہے۔ جو صرف مزاحیہ قطعات اور تہلکہ خیز کالم ہی نہیں لکھتا... جاسوسی بھی کرتا ہے۔“

میں نے غرور آمیز انکساری سے کہا۔ ”ھٰذا من فضلِ ربّی۔“

”آخر تمہیں یہ خیال آیا کیسے کہ... میں کون ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”یہ کوٹھی تمہاری ہے... نام تو اس کا وہی سب سے بہتر تھا۔ مارننگ فاریسٹ... جو بھوربن کا صحیح مفہوم ہے... مگر جب تم نے یہ کوٹھی خریدی تو خود اسے وکیل صاحب کی کوٹھی مشہور کیا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میں نے خریدی نہیں تھی۔ کسی نے میرے سجادہ نشین والد سلطان بخش کو دی تھی۔ ان کا کوئی مرید یا عقیدت مند تھا جس نے یہ کوٹھی بنوائی تھی۔ کراچی، لاہور میں بھی اس کی کوٹھیاں تھیں۔ یہاں وہ گرمیوں کے موسم میں اپنی فیملی کے ساتھ آتا تھا۔ اولاد جوان ہوئی تو اس نے وہی غلطی کی جواب بوڑھوں کو نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے ایک کوٹھی ایک بیٹے کو دے دی۔ دوسری اس سے چھوٹے کے نام کردی۔ اسی طرح دو مکان بیٹیوں کو دے دیے... خود اپنے لیے اس نے کچھ نہیں رکھا۔ اس یقین پر کہ بیٹے جوان ہیں اور اس کا بزنس سنبھال سکتے ہیں تو پھر اسے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے... لیکن بعد میں بزنس بیٹھ گیا۔ بیٹے اپنی اپنی کوٹھی بیچ کے امریکا شفٹ ہوگئے۔ کسی بیٹی کے پاس رہنا اس نے گوارا نہ کیا۔ چار سال اس نے والد کے ساتھ گزارے... پھر وہ بیمار ہوگیا... اس نے والد صاحب سے کہا کہ یہ کوٹھی لے لیں جو اس کے لیے بیکار ہے... بعد کے حالات کا تم نے ڈائری سے اندازہ کرلیا ہوگا... والد صاحب جیل میں تھے کہ ماں چل بسی... ایک بڑا بھائی غائب ہوگیا... اس کی لاش تو نہیں ملی مگر ہم جانتے تھے کہ اسے قتل کردیا گیا ہوگا... تیسرا باہر تھا... والد نے مجھے جیل میں بلایا اور کہا کہ یہ کوٹھی میں اپنے نام کرالوں۔“

میں نے کہا۔ ”یعنی میرا اندازہ ٹھیک تھا... اگر تم اوریجنل چابیاں لے کر یہاں نہ آتے اور ڈپلی کیٹ سے ملازم تمہیں اندر پہنچادیتے تو میں مان لیتا کہ کوٹھی تمہارے دوست کی ہوگی۔ مگر اصل چابیاں تمہارے ہی پاس تھیں... وقار حیدر کراچی میں نہیں تھا... اس کے پاس صرف کراچی نمبر کی ایک سم تھی... جو کسی کے پاس لاہور یا پنڈی میں بھی ہوسکتی ہے... شاید اس نام کا کراچی میں کوئی وکیل ہوگا... تم بھی تو شہاب الدین کے نام سے کراچی میں پریکٹس کرچکے ہو... اس کے چیمبر کا نمبر بھی تم نے بتادیا لیکن لینڈ لائن کا نمبر گول کر گئے۔ تم نے کہا کہ کیبل فالٹ کی وجہ سے نمبر بند ہے۔ فون ٹھیک ہو تو ایڈریس معلوم کیا جاسکتا تھا لیکن ایڈریس دے کر انکوائری سے فون نمبر پوچھنا بھی ناممکن نہیں۔ میں نے سوسائٹی کے ایڈریس کے حوالے سے پوچھا تو مجھے ایک نمبر ملا مگر وہاں کوئی وقار حیدر نہیں تھا۔ پھر میں نے چیمبر کا پتا دے کر فون نمبر پوچھا تو وہاں واقعی ایک وقار حیدر تھا۔ اس نے سرفراز خاں کے نام سے ناواقفیت کا اظہار کیا... یہ کہا کہ وہ کیا پاگل ہے کہ بھوربن میں کوٹھی بنوائے یا خریدے... اس کے پاس تو لاہور میں اپنا مکان نہیں... وہ ہر روز ساہیوال سے آتا ہے... ظاہر ہے کراچی نمبر کے موبائل فون کی سم تم نے اس وقت خریدی ہوگی جب سم بغیر تصدیق کے فٹ پاتھ پر مل جاتی تھی۔ تم نے ہمیشہ دو نمبر کام کیے۔ سم بھی کسی اور کے نام سے لی تھی۔ یہ بڑا عام سا نام ہے... شاید اسی نام کے درجن بھر لوگ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں بھی مل جائیں گے... کراچی... لاہور یا پنڈی... کہیں بھی... آخری بات جس نے مجھے شک میں ڈالا، وہ کپڑے تھے جو تمہارے تھے لیکن یہاں پہلے سے موجود تھے... نازنین نے لاہور میں تمہارا لباس کچھ اور دیکھا تھا۔ وہ صرف ایک سوٹ کو شناخت کرسکی۔ نوکر تمہارا نام نہیں جانتے... صرف وکیل صاحب کہتے ہیں... میرا خیال ہے کہ اس بنگلے کو تم روپوشی کے اس دور میں استعمال کرتے تھے جب تم ایک سے دوسری شخصیت بدلتے تھے۔ قادر بخش جب شہاب الدین بنا تو دو چار مہینے یہاں رہا... جب تک کہ اس کی داڑھی خوب گھنی نہیں ہوگئی... اس کے بعد شہاب الدین بھی یہاں اس وقت تک روپوش رہا جب تک کہ فریب خوردہ لوگ اسے بھول نہیں گئے۔ اور جب تک اس کے ہاتھوں قتل ہونے والے سکندر شاہ کا کیس داخلِ دفتر نہیں ہوا... جب نازنین مایوس ہو کے یہاں سے چلی جاتی اور یہاں کی پولیس اس کے گم شدہ شوہر کو بھول جاتی تو تم آنے والے موسم گرما میں ایک نیا روپ اختیار کرنے کے لیے پھر چند ماہ یہاں گزارتے لیکن بُرا ہو اس ڈائری کا... اس کے لیے تمہیں آنا پڑا... آخر تم جیسے شاطر آدمی نے یہ تحریر چھوڑی ہی کیوں تھی؟“

وہ کسمسایا۔ ”خدا کے لیے مجھے کھول دو۔ میرے تو ہاتھ پاؤں اکڑ گئے ہیں... میں بھاگ کے کہاں جاسکتا

ہوں۔ ریوالور تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں بتاتا ہوں۔“

نازنین اور صائمہ نے اسے بڑی احتیاط سے آزاد کیا۔ میں نے اس کی کرسی ایک دیوار کے ساتھ لگادی۔ وہ میری طرف رخ کیے بیٹھا رہا۔ اب میری ہدایات کے مطابق قادر بخش کو کرسی کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ وہ اٹھتا تو کرسی سمیت اٹھتا... لیکن اب وہ آسانی سے سانس لے سکتا تھا اور ہاتھ پاؤں ہلاسکتا تھا۔ اس نے خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

”دیکھو... پولیس تمہیں صبح سے پہلے نہیں لے جاسکتی۔ تمہارے ساتھ ہم بھی جاگنے پر مجبور ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں کسی اسٹور یا باتھ روم میں بند کردوں... اس بات کو یقینی بنا کے کہ تم بھاگو گے نہیں... پھر بھی شاید ہم میں سے کسی کے لیے بھی سونا ممکن نہ ہو... ہم باتیں کرسکتے ہیں... مجھے تمہارے معاملے میں دلچسپی ضرور ہے کہ آخر یہ سب تم نے کیوں کیا؟“

اس نے نازنین کی طرف دیکھا۔ ”کیا اپنے گھر میں مجھے اپنی بیوی کے ہاتھ سے پانی کا ایک گلاس اور چائے نہیں مل سکتی؟“

نازنین مسلسل خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی، ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”مت کہو مجھے اپنی بیوی... دھوکے باز۔“

”دھوکے باز میں دنیا کے لیے تھا... تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا میں نے۔“

وہ چلائی۔ ”یہ سب میرے ساتھ ہی تو ہوا ہے... تم پکڑے گئے ہو تو محبت جتا رہے ہو... شرم نہیں آتی تمہیں... تم میرے لیے نہیں اس ڈائری کے لیے واپس آئے تھے۔“

اس نے فریادی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”اب میں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے اس سے بلیک میل ہو کے شادی نہیں کی تھی۔ میں اس کی کسی دھمکی سے خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی بات سے قائل ہوگیا تھا کہ اب ہم دونوں کو مل کے زندگی کی ایک راہ پر چلنا چاہیے... اپنا ایک گھر بسا لینا چاہیے... وہ کیا کہا ہے علامہ اقبال نے... بھٹکا ہوا راہی تو بھٹکا ہوا راہی میں... تیرے بھی صنم فانی میرے بھی صنم فانی۔“

”تمہارا ادبی ذوق تمہاری تحریر سے عیاں ہے۔“

اس نے ایک آہ بھری۔ ”اگر یہ دنیا مجھے انتقام کی راہ پر نہ ڈالتی تو میں ایک اچھا افسانہ نگار یا ناول نویس ہوتا... وکالت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی... اپنے والد کے کہنے سے میں وکیل بن گیا تھا مگر جب ضرورت پڑی تو... میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی... میری وکالت کچھ نہیں بچا سکی... میں جب یہاں آتا تھا تو روپوشی کے دور میں لکھتا تھا... وہ سب جو میرے دل میں تھا... جو مجھ پر بیت چکا تھا... جو گزر رہا تھا... میں نے نام بدل دیے تھے لیکن آپ بیتی میری تھی... جذبات میرے تھے... میں اکثر خود سے یہی سوال کرتا تھا... میں کون ہوں... کل کیا تھا... آج کچھ اور ہوں... آنے والے دن میں کیا بنوں گا... گردشِ حالات میری شخصیت کو تراش رہی تھی... میں نے دولت کو طاقت جانا اور اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ یہی نازنین نے کیا۔ ایک وقت آیا کہ اس پیسے کی کوئی اہمیت نہ رہی... نہ میرے لیے، نہ نازنین کے لیے... اس نے مجھے احساس دلایا کہ اب مجھے ٹھہر جانا چاہیے... ایک عظیم تر مقصد کے لیے... ہم دونوں کو مل کے رہنا، گھر بنانا چاہیے... اپنے ماضی کو بھول کر اچھے پُرسکون مستقبل کی خاطر ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے... زندگی ابھی باقی ہے... آج شاید نازنین اعتبار نہ کرے... میں اپنا اعتبار پھر گنوا چکا ہوں... مگر حقیقت یہی ہے... جب اس نے کہا کہ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے... تو میں حیران رہ گیا... کیونکہ یہ تو میں نازنین سے کہنے والا تھا... مگر کہتے ہوئے ڈرتا تھا کہ یہ اعتبار کب کرے گی۔ لوگوں نے اس سے اتنی بار محبت جتائی ہوگی کہ اس کے لیے یہ لفظ اتنا ہی بے معنی بن گیا ہوگا... جتنا میرے لیے دولت کا مصرف... منفی کو منفی سے ضرب کا حاصل مثبت ہوتا ہے۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم کمینے... ذلیل۔“ نازنین نے پھوٹ پھوٹ کے روتے ہوئے ڈائری اس پر کھینچ ماری۔ ”یہ لو... اس کے لیے آئے تھے نا تم... یہ لو اور دفع ہو جاؤ... دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“

نازنین ہسٹریا کا شکار تھی۔ میں نے صائمہ سے کہا۔ ”ڈائری اٹھا کے مجھے دے دو... اور جاؤ... تم کافی بنا لاؤ... ہم سب کے لیے۔“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں نازنین منہ چھپائے مسہری پر پڑی سسکتی رہی... صائمہ نے اسے پانی پلایا اور اس کا منہ دھلایا۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ ہی کچن میں لے گئی۔ ان کے واپس آنے تک میں سوچتا رہا کہ اس شب کی سحر ہونے تک کیا ہوگا۔

یہ سوال میں نازنین کے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔ ”اگر یہ سب سچ ہے... کہ تمہیں نازنین سے واقعی محبت ہوگئی تھی اور تم نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت سوچ سمجھ کے ایک جذباتی فیصلہ کیا تھا... نازنین کے ساتھ اپنا گھر بسانے کا... تو پھر تم روپوش کیوں ہوئے؟''

اس نے سر جھکا لیا۔ ''مجھے واپس آنا ہی تھا۔ آج نہ سہی کل... میں کراچی نہیں گیا تھا۔''

''تم لاہور گئے تھے؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اس اعتماد کے باوجود... جو مجھے نازنین کی محبت پر ہے یا اسے مجھ پر... میرے دل میں ایک خوف تھا۔ آنے والے دنوں میں اس کے جذبات وہ نہ رہے جو آج ہیں... پھر کیا ہوگا؟''

''چنانچہ اس کی عدم موجودگی میں تم لاہور گئے... اس کے گھر میں داخل ہوئے... جو اب تمہارا بھی گھر ہے... تم نے وہ سب مواد تلاش کیا جس کی بنا پر نازنین تمہیں بلیک میل کرنے آئی تھی... کیا وہ سب تمہیں مل گیا؟''

''ہاں... اور میں نے وہ سب ضائع کر دیا... جلا دیا تاکہ ہمارے مستقبل کے لیے خطرے کا وجود ہی نہ رہے۔''

''تمہیں نازنین پر اعتماد نہیں تھا؟''

''اعتماد کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اپنے دفاع کی طرف سے غافل ہو جاؤ... اللہ پر بھروسا کر کے کوئی سڑک کے بیچ میں نہیں چلتا... دسویں فلور سے چھلانگ نہیں لگاتا... میں فیصلہ نازنین پر چھوڑتا ہوں... مجھے اپنے گھر لے جائے... یا پرانے گھر بھیج دے... جب وہ بھٹک رہی تھی... یا میں بھٹک رہا تھا... تب بھی ہم جی رہے تھے۔'' اس نے ایک آہ بھری اور پھر غالب کا یہ شعر پڑھا۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

☆☆☆

یہ اس کے ٹھیک نو ماہ بعد کی بات ہے جب صائمہ نے مجھے فون کیا۔ ''کیا تم نے کبھی سنو فال دیکھا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کبھی کراچی میں اتنی سردی ہوگی تو شاید دیکھنے کو ملے۔''

''لیکن مری میں سنو فال جاری ہے... سنا ہے اب کرسمس کی چھٹیوں میں جب یہاں اسکول بند ہوتے ہیں... سارے پاکستان سے ٹورسٹ یلغار کرتے ہیں... ہوٹلوں میں اتنا ہی رش ہوتا ہے جتنا گرمیوں میں... کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔''

''کون سا تل... وہ جو تمہارے رخسار پر ہے... اسے وہیں رہنے دو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''آج پھر نازنین نے مجھے فون کیا تھا۔''

''پھر؟ یعنی وہ پہلے بھی کرتی رہی ہے؟''

صائمہ ہنسی۔ ''وہ باقاعدگی سے مجھ سے مشورہ کر رہی ہے۔''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''اس بچے کے سلسلے میں... جو شاید برف باری کے موسم میں جنم لے گا... وہ اپنی ہر میڈیکل رپورٹ مجھے فون پر سناتی رہی ہے۔''

''تمہارے دل میں اس کے لیے رقابت کے کوئی جذبات نہیں... تم نے فیض کی طرح رقیب سے سمجھوتا کر لیا ہے... ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے۔''

''دیکھو... شاعری اسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی جیسے تم ڈاکٹری نہیں سمجھتے... اس نے مجھے بلایا ہے۔''

''تمہیں بلایا ہے؟ وہ کیوں؟''

''اب اسے کسی جاسوس یا صحافی کی نہیں... ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتی ہے یہ کیس میں کروں... وکیل صاحب کی کوٹھی میں... کسی لوکل ڈاکٹر نے امکان ظاہر کیا ہے کہ شاید بچے کا یوم ولادت وہی ہوگا جو دو عظیم انسانوں کا ہے... پچیس دسمبر کو حضرت عیسیٰؑ اور اس کے بعد قائداعظم پیدا ہوئے تھے۔ تم سن رہے ہو نا؟''

''ہاں... سوچ رہا ہوں... اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟''

''تم کیا بتانا چاہتے تھے؟''

''یہی... کہ سرفراز نے اور شہاب الدین نے اور قادر بخش نے... سب نے مجھے فون کیا تھا... اور... ایک غلطی ہو گئی ہے مجھ سے... میں نے اسلام آباد تک کے لیے ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ لے لیے تھے... تم سے پوچھے بغیر۔''

''یا میرے خدا... بکنگ تو میں نے بھی کرا لی تھی... خیر... ہم اسے واپسی کے لیے استعمال کر لیں گے۔''

''اور ہماری واپسی کب ہوگی؟''

''برف باری کا موسم گزر جانے کے بعد... نئے سال کا آغاز ہونے کے بعد... اور اس بچے کی ولادت کے بعد جو دو انسانوں کو زندگی کا ایک مقصد دے گا۔''

''کاش... یہ مقصد تمہیں بھی عزیز ہوتا... خیر... یار زندہ صحبت باقی... شاید اگلی برف باری کے موسم میں۔''

لیکن صائمہ نے یہ سب سننے سے پہلے ہی فون رکھ دیا تھا۔ اب مجھے توپ صاحب کو مطلع کرنا تھا کہ میں برف باری دیکھنے مری جا رہا ہوں۔

معصوم قاتل

عبدالقدیر

ہر عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں... کم عمری میں بچہ ہر نئی شے کو دیکھ کر لپکتا ہے... عمر کی کچھ اور سیڑھیاں چڑھتا ہے تو سوچنے سمجھنے اور چیزوں کو پرکھنے کی سعی و جستجو میں مشغول ہو جاتا ہے... عمر کی حساس اور نازک منزلوں سے دوچار بچوں کی سرگرمیاں جو انہیں کچھ سے کچھ بنا رہی تھیں۔

ایک پسندیدہ شخص کو خوش کرنے کے لیے کی گئی ناخوش گوار کوششیں

ہرن کے شکار کا موسم شروع ہونے سے پہلے یہ واقعات پیش آنے لگے۔ مارٹی کو ملازمت سے فارغ ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور اس کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ اس نے یہ خبر رات کے وقت ریڈیو پر سنی اور یوں لگا جیسے یہ پیغام براہِ راست اس کے لیے نشر کیا گیا ہو۔ اس کا دن بڑی بیزاری کے عالم میں گزرتا تھا اور رات میں بھی وہ بار بار اٹھ کر ریڈیو پر خبریں سنا کرتا۔ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی وہ سونے جاگنے کی کیفیت میں تھا جب اس نے نیوز کاسٹر کو خبر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سنا۔ تین لوگوں کو الگ الگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھروں میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل یا قاتلوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ تینوں وارداتیں اسی کے قصبے میں ہوئی تھیں جہاں وہ اپنی پینتیس سالہ ملازمت ختم ہونے کے بعد ایک سال پہلے ہی شفٹ ہوا تھا۔ وہ ڈیٹرائٹ فری پریس میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

نصف شب گزر چکی تھی اور نیند میں ڈوبی ہوئی نیوز کاسٹر کی فراہم کردہ معلومات اسے نامکمل محسوس ہو رہی تھیں لیکن وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی انگلیاں اس طرح ہلائیں جیسے اس کے سامنے ایک کی بورڈ رکھا ہے اور وہ اس پر یہ خبر ٹائپ کر رہا ہے۔ ماضی میں بھی وہ اس طرح کے کئی سنسنی خیز واقعات کی رپورٹنگ کر چکا تھا اور اس کی فراہم کردہ خبریں ہمیشہ مصدقہ اور قابلِ اعتماد ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اخبار کی جانب سے اہم واقعات کی رپورٹنگ اسے ہی سونپی جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ تعطیلات کے دوران میں بھی اخبار والوں نے اسے کسی اہم واقعے کی رپورٹنگ کی ذمے داری سونپ دی۔

وہ بستر سے اٹھ گیا تاکہ میز پر رکھا ہوا سیل فون اٹھا سکے۔ اس کی بیوی جینی نائٹ ڈیوٹی پر اسپتال میں تھی اس لیے کمرے کی لائٹ آن ہونے کی صورت میں کوئی ڈسٹرب نہ ہوتا البتہ اگر جینی موجود ہوتی تو وہ لائٹ آن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ روشنی ہوتے ہی جینی کی آنکھ کھل جاتی اور وہ بڑبڑانا شروع کر دیتی۔ اب مارٹی کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ ان وارداتوں کی بہترین رپورٹنگ کر سکے۔ اس وقت پورا شہر نیند میں ڈوبا ہوا تھا اس لیے کسی نے بھی یہ خبر نہیں سنی ہوگی۔ وہ اپنے اخبار کو یہ خبر دے سکتا تھا اور اس طرح ایک بار پھر اس کا نام ایک اہم واقعے کے ساتھ شائع ہو جاتا۔

اس نے اپنے اخبار فری پریس کے ایڈیٹر کا نمبر ملایا تو اسے وائس میل پر ریکارڈ شدہ پیغام سننے کو ملا۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے اس لیے ایڈیٹر سے رابطہ ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اخبار کے دفتر میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوگا لیکن ان سب کے نمبر الگ الگ تھے۔ اس لیے جب تک کسی کا نمبر معلوم نہ ہو، اس سے رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ خالی میزوں پر فون کی گھنٹیاں بجتی رہتیں لیکن کوئی فون نہیں اٹھاتا۔ جب وہ خود اخبار میں کام کرتا تھا تو اس نے بھی کسی دوسرے کا فون اٹینڈ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ فون وائس میل میں ریکارڈ ہو جائے گا۔

اس نے بھی انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایڈیٹر پانچ بجے اپنی ڈیوٹی پر آجائے گا۔ گزشتہ چالیس سال میں اس نے ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ وہ یقیناً اس کا پیغام سن کر اسے فون کرے گا اور چاہے گا کہ مارٹی ہی اس واقعے کی رپورٹنگ کرے۔ گوکہ اب وہ اخبار کا باقاعدہ ملازم نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور اس اہم واقعے کی رپورٹنگ کے لیے اسی پر انحصار کیا جائے گا۔

جب پہلی بار رضاکارانہ ریٹائرمنٹ کی اسکیم سامنے آئی تو اس نے اسے قطعی طور پر نظرانداز کر دیا حالانکہ یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اس پیشکش کو قبول نہ کرنے والے خطرے میں رہیں گے اور چھانٹی کی صورت میں ان کی ملازمت ختم ہو سکتی ہے۔ پھر چھانٹی بھی ہوئی اور وہ بچ گیا۔ اس نے بائیس سال پہلے جب یہ ملازمت شروع کی تو یوں لگا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔ اب وہ شادی کر کے ایک بہتر زندگی گزار سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی سگریٹ اور شراب کے اخراجات برداشت کرنے میں اسے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ گوکہ اس زمانے میں نیوز روم میں سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ وقفے کے دوران وہ پریس روم میں چلا جاتا جہاں اس کے ساتھی رپورٹرز بھی ہوتے لیکن ان کی تعداد نسبتاً کم تھی جبکہ زیادہ تر لوگوں کا تعلق اخبار کے دوسرے شعبوں مثلاً اشتہارات، مارکیٹنگ اور سرکولیشن وغیرہ سے تھا۔

شام کے وقت دفتر میں آنے والے لوگ بھی بدل جاتے۔ نئے آنے والوں میں ایڈیٹرز، سیکریٹری، پولیس والے اور دفتر کے دوسرے لوگ ہوتے جنہیں پورے دن اپنے کام سے فرصت نہیں ہوتی تھی اور وہ گھر جانے سے پہلے بار کا رخ ضرور کرتے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے حیران کن اور خوشگوار تجربہ تھا اور یہ سلسلہ کئی برس جاری رہا۔ رپورٹنگ کرنا، خبریں لکھنا اور کام کے بعد شراب نوشی، یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ شراب نوشی کی لت کب لگی لیکن اب یہ اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی لیکن اتنا وہ جانتا تھا کہ ملازمت کے ابتدائی دنوں میں اس کا آغاز ہو چکا تھا اور اب یہ عادت پختہ ہو چکی تھی۔

مارٹی نے واش روم میں جا کر اپنا منہ دھویا اور تولیا سے صاف کرنے کے بعد اپنا فون چیک کیا۔ اس دوران کوئی کال نہیں آئی تھی۔ سورج نکل چکا تھا لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ ان دنوں سورج ویسے ہی دیر سے نکل رہا تھا۔ مارٹی نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے جھانکا۔ جھیل کی لہریں بھی پُرسکون تھیں جیسے کسی ایک جگہ جم کر رہ گئی ہوں۔ اس خاموشی اور سناٹے کو دیکھ کر مارٹی کو لگا جیسے

وہ پاگل ہو جائے گا۔

جب وہ اور جینی ڈیٹنگ کر رہے تھے تو وہ اکثر اس کاٹیج کے بارے میں سوچا کرتا جہاں سے جھیل کی لہروں میں اٹھنے والا جھاگ ان کے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتا۔ وہ ..... ہفتے کے اختتام پر کام ختم ہونے کے بعد تین گھنٹے کی ڈرائیونگ کر کے وہاں جاتے۔ وہ بے حد خوب صورت اور... پُرفضا جگہ تھی جہاں سڑک کے دونوں اطراف چیری اور پام کے درخت سایہ فگن تھے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ سے موجود تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ کاٹیج ان کا ہوگا اور وہ جینی کے ساتھ گرمیوں کی تعطیلات وہاں گزارے گا۔

جب جینی کی ممی کا انتقال ہوا اور اس کے چند ماہ بعد ڈیڈی بھی چل بسے تو وہ کاٹیج انہیں مل گیا تو اس جگہ کے بارے میں اس کے احساسات بھی بدل گئے۔ یہ کاٹیج بھی دور سے دیکھنے میں اچھا لگتا تھا لیکن جب وہاں رہنا پڑا تو یوں لگا جیسے کسی نے اسے صحرا کے بیچ میں لا کر ڈال دیا ہو۔ وہ وہاں سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ موسمِ گرما ختم ہو چکا تھا۔ خزاں رخصت ہونے والا تھا اور سردیاں شروع ہونے والی تھیں۔

اسے اپنے بیٹے ریان کے کمرے سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ریان اس کے تینوں بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا اور انہی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ مارٹی اور جینی کو یہی اندیشہ تھا کہ اس چھوٹی سی جگہ پر اس کے لیے اپنی تعلیم مکمل کرنا مشکل ہو جائے گا کیونکہ بڑے شہروں کی نسبت یہاں تفریح کے مواقع کم تھے لیکن ریان نے بہت کم وقت میں کئی دوست بنا لیے تھے جنہوں نے اسے اجنبی سمجھنے کے بجائے کسی فلم اسٹار کی طرح اس کا استقبال کیا اور اپنی تمام سرگرمیوں میں شامل کر لیا۔ ریان نے بڑی ذہانت سے اس تبدیلی کو قبول کر لیا اور کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ اس چھوٹی سی جگہ میں اس کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے، یا یہ کہ سب سے قریبی سینما گھر بھی قصبے سے باہر پینتالیس منٹ کی مسافت پر ہے۔ ریان نے مارٹی کو بتا رکھا تھا کہ پندرہ نومبر اس کے دوستوں کے لیے ایک اہم دن ہوگا۔ اس روز ہرن کے شکار کا موسم شروع ہوتا ہے اور اسے امید تھی کہ اس سال انہیں شکار کرنے کا موقع مل جائے گا۔

"میرے سب دوست شکار پر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لڑکیاں بھی۔" ریان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ان میں ایک لڑکی ایلی تو شکار کے معاملے میں اتنی جنونی ہے کہ اکتوبر شروع ہوتے ہی شکاریوں والا لباس پہن لیتی ہے۔ وہ میری ٹیم کے ایک ساتھی بریڈ ولسن کے لیے یہ سب کچھ کرتی ہے۔ ڈیڈی! کیا ہم شکار پر جا سکتے ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ آپ بھی جوانی میں ہرن کا شکار کیا کرتے تھے۔"

مارٹی کا کہنا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا لیکن اس کے لیے یہ محض ایک پکنک تھی۔ اس طرح انہیں جنگل میں آزادانہ طور پر ڈرنک کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ پوری ٹیم میں ایک یا دو لڑکے ہی سنجیدگی سے شکار کی تلاش میں رہتے جبکہ بقیہ لوگوں کے لیے یہ ایک تفریحی دورہ ہوتا تھا۔ اس نے کبھی شکار میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے تو کبھی بھری ہوئی بندوق کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

قصبے کے ہائی اسکول کی عمارت بہت چھوٹی تھی البتہ اس سے ملحقہ گراؤنڈ فٹ بال کھیلنے کے لیے کافی تھا۔ ریان بہت اچھا کھلاڑی تھا اور مارٹی خزاں رسیدہ شام میں گراؤنڈ کے کنارے بیٹھ کر اپنے بیٹے کو حیرت سے دیکھا کرتا۔ شہر کے اسکول میں کم عمر ہونے کی وجہ سے اسے ٹیم میں شامل نہیں کیا جاتا تھا اور وہ زیادہ وقت گراؤنڈ سے باہر بیٹھ کر گزارتا تھا مگر یہاں اسے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا اور جب وہ بڑی مہارت اور پھرتی سے گیند کو لے کر آگے بڑھتا تو مارٹی کے پورے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس کے بعد وہ پیزا یا برگر کھانے قریبی فوڈ شاپ تک جاتے جہاں بیئر نہیں ملتی تھی اور یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ آپ دوڑ ختم ہونے کے بعد کسی دیوار سے ٹکرا جائیں۔

"ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔" مارٹی نے ریان کے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ریان نے اپنا سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور اپنا سیل فون نکال کر پیغامات دیکھنے لگا۔

"ڈیڈی! میرا خیال ہے کہ آج اسکول کی چھٹی ہو گی۔" اس نے کہا۔ "کیا آپ نے قتل کی وارداتوں کے بارے میں نہیں سنا؟"

مارٹی کو ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ نوجوان نسل پیغامات کے ذریعے کتنی تیزی سے معلومات کا تبادلہ کرتی ہے۔ اس نے خود بھی یہ مشق کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کبھی بھی پورا پیغام ٹائپ نہ کر سکا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی اور وہ جھنجلا کر پیغام رسانی کا ارادہ ملتوی کر دیتا۔

"ان وارداتوں کا اسکول بند ہونے سے کیا تعلق ہے؟" مارٹی نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جنہیں قتل کیا گیا ہے، وہ سب استاد تھے۔'' ریان نے کہا اور دوبارہ اپنا سر تکیے میں چھپا لیا جیسے سونے کی کوشش کر رہا ہو۔

مارٹی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پورے جسم میں برقی رو دوڑ رہی ہو۔ اس نے فون کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ایڈیٹر نے اسے فون نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس کا نمبر ملایا۔ اس بار جواب موصول ہو گیا لیکن وہ ایڈیٹر نہیں کوئی اور تھا۔

''فری پریس نیوز روم۔ میں کیلی مونڈی بول رہی ہوں۔''

مارٹی اس کی آواز سن کر سوچ میں پڑ گیا جو اس کے لیے اجنبی تھی۔ شاید کوئی نئی لڑکی ہو گی۔ اسے حیرت ہوئی کہ ایک طرف تو پرانے لوگوں کو فارغ کیا جا رہا تھا تو دوسری جانب نئے لوگوں کی بھرتی بھی ہو رہی تھی۔

''مجھے مائنک سے بات کرنی ہے۔'' مارٹی نے کہا۔

''وہ بیماری کی چھٹی پر ہے۔'' کیلی نے کہا۔ ''اور میں اس کی جگہ کام کر رہی ہوں۔''

''مائنک بیمار ہے..... کیا ہوا اسے؟''

''مجھے افسوس ہے۔ یہ میں نہیں بتا سکتی۔ تم جانتے ہو کہ یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔''

''اوہ اچھا، سمجھ گیا۔'' مارٹی نے کہا۔ ''میرا نام مارٹی فلپس ہے اور میں مائنک کے لیے برسوں سے کام کر رہا ہوں لیکن تمہیں نہیں جانتا۔ کیا تم نئی آئی ہو؟''

''ہاں، مجھے یہاں آئے دو مہینے ہوئے ہیں۔'' اس کی آواز کافی شوخ اور زندگی سے بھرپور تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی ہے۔ مارٹی نے سوچا کہ یہ مائنک کی جگہ کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟

''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' کیلی نے پوچھا۔

''کیا جیکولسن یا اسٹیفنی اینڈرسن سے بات ہو سکتی ہے؟'' مارٹی نے دوسرے دو ایڈیٹرز کے نام لیے جنہیں وہ جانتا تھا۔

''مجھے افسوس ہے۔ اس وقت میرے علاوہ کوئی اور ایڈیٹر موجود نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' مارٹی نے کہا۔ ''میں اس اخبار کے لیے کام کرتا تھا اور اب ریٹائر ہونے کے بعد شمالی علاقے میں رہائش پذیر ہوں۔ کیا تم نے قتل کی وارداتوں کے بارے میں کچھ سنا؟ تین افراد مختلف گھروں میں مار دیے گئے ہیں اسی لیے مائنک کو فون کر رہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو میں مقامی پولیس سے رابطہ کر کے تمہیں تفصیلی خبر بھیج دوں۔''

''ہاں، میں نے بھی کیبل پر یہ خبر دیکھی ہے۔'' کیلی نے کہا۔ ''ہم ایجنسی کی خبر کا انتظار کر رہے ہیں۔''

مارٹی نے سوچا کہ لڑکی ابھی ناتجربہ کار ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس طرح کے اہم واقعات کے لیے فری پریس والے اپنے رپورٹر کو بھیجتے ہیں۔

''ایجنسی کی خبر میں کوئی نئی بات نہیں ہو گی جبکہ میں اس سے پہلے تمہیں تازہ ترین اسٹوری دے سکتا ہوں۔''

''بے شک۔'' کیلی نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے کر سکو گے لیکن میرے پاس فری لانس کو ادائیگی کا اختیار نہیں ہے۔''

''مجھے پیسوں کی پروا نہیں، میں صرف اپنا فرض پورا کرنا چاہتا ہوں۔'' مارٹی نے کہا۔

''میں تم سے بلا معاوضہ کام کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتی۔ یہ خلافِ قانون ہو گا۔''

''جانتا ہوں۔'' مارٹی نے کہا۔ ''لیکن یہ بہت بڑی خبر ہے۔ جو لوگ مارے گئے، وہ سب ہائی اسکول ٹیچرز تھے۔''

''واقعی؟ ابھی تک یہ بات کیبل پر نہیں بتائی گئی۔''

''میں جانتا ہوں کیونکہ یہ ایک چھوٹا قصبہ ہے اور اس واقعے کے بارے میں ان کے پاس نصف معلومات بھی نہیں ہوں گی حالانکہ میں ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلا لیکن میرے پاس ان سے زیادہ معلومات ہیں۔ یہ بتاؤ کہ جیک کب تک آ جائے گا؟''

''شاید دس بجے تک۔''

مارٹی نے اس سے جیک کا فون نمبر پوچھا اور کہا کہ وہ اسے بعد میں فون کرے گا۔

مارٹی نے کاٹیج میں آنے سے پہلے اپنا ذاتی مکان اور دونوں گاڑیاں فروخت کر دی تھیں اور اب ان کے پاس صرف ایک سیارو کار تھی۔ مارٹی صبح ریان کو اسکول چھوڑنے جاتا اور واپسی میں جینی کو اسپتال سے لے کر آتا جو گھر آتے ہی لمبی تان کر سو جاتی اور اس کی آنکھ سہ پہر سے پہلے نہ کھلتی۔ اس دوران میں وہ اپنے لیے کوئی کام تلاش کر سکتا تھا۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے اور چار پیسے کمانے کے لیے وہ کوئی بھی کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ چاہے وہ کسی اسٹور میں سامان باندھنے یا گھر کے پائپوں کی مرمت سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر اس کے ذہن میں کوئی اچھوتا خیال آ جائے تو وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر اپنا ناول بھی لکھ سکتا تھا لیکن فی الوقت اس کے پاس ایسا کوئی کام نہ تھا اور اسے شدت سے کسی مصروفیت کی تلاش تھی۔

وہ جینی کو اسپتال سے لانے کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

''میں ابھی نہیں آ سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں ہنگامی صورتِ حال ہے۔ سب لوگوں کو روک لیا گیا ہے۔''

''یقیناً، یہ بات مجھے پہلے ہی جان لینی چاہیے تھی۔''

''کیا خبروں میں کچھ بتایا ہے؟''

''تھوڑا بہت۔'' مارٹی نے کہا۔ ''میں نیوز روم سے رابطے میں ہوں تاکہ انہیں تفصیلی خبر دے سکوں۔''

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی اور مارٹی کو یوں لگا جیسے سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔

''جینی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں، میں سن رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''خبروں میں مرنے والوں کی تعداد کتنی بتائی ہے؟''

''تین۔''

''اب ان کی تعداد چار ہو گئی ہے۔ وہ ابھی ابھی مسٹر جانسن کو لے کر آئے ہیں جو ریان کے حساب کے ٹیچر تھے۔''

''کیا تم مجھے ڈرا رہی ہو؟''

''وہ اپنے گھر کا کوڑا پھینکنے گھر سے باہر نکلے تھے۔ ان سب لوگوں کو گھر کی راہداری یا پورچ میں فاصلے سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے دو گزشتہ شب مارے گئے جو کانفرنس سے واپس آ رہے تھے۔ مسز میک کو نصف شب کے قریب گولی ماری گئی جب وہ اپنے کتے کو ٹہلانے کے لیے گھر سے باہر نکلی تھیں اور اب مسٹر جانسن کی خبر آ گئی۔''

مارٹی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دماغ پر زور دے کر سوچنے لگا کہ کاٹیج میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں اس نے کبھی شراب کی کوئی بوتل چھپا کر رکھی ہو لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ جینی کی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ یہاں کتنی دیر تک رکنا پڑے گا۔ کیا تم میرا فون چارجر لا سکتے ہو؟ اس کی بیٹری ڈاؤن ہو رہی ہے۔''

مارٹی نے ہامی بھر لی۔ جینی کے لیے اس طرح کے چھوٹے موٹے کام کر کے اسے خوشی ہوتی تھی۔ جب سے وہ ریٹائر ہوا تھا اسے یہی فکر ستائے جاتی کہ وہ جینی کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ اسی لیے وہ منتظر رہتا کہ وہ اس سے کسی کام کے لیے کہے۔ گو کہ بدلے میں وہ اس کا شکریہ ادا کرتی اور نہ ہی احسان مانتی اور اگر وہ اپنے طور پر اس کے لیے کچھ کرتا، تب بھی وہ کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہیں کرتی تھی۔ ایسے کئی کام تھے جس کے لیے اسے مارٹی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً جب وہ دوپہر کو سو کر اٹھتی تو وہ اس کے لیے کھانے کا انتظام کرتا۔ اس کے کپڑے لانڈری میں لے کر جاتا، اس کے لیے پھولوں کا گلدستہ تیار کرتا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جینی کو ان باتوں پر دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ پوری تن دہی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہی تھی اور اسے یہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ سردیوں سے پہلے گھر کا ہیٹنگ سسٹم ٹھیک کروا لیا جائے جو اس کے والدین نے بیمار ہونے سے پہلے لگوایا تھا اور ابھی تک اس کو چلا کر نہیں دیکھا گیا تھا۔ اسی مصروفیت کی وجہ سے اسے مارٹی کے پاس بیٹھنے اور گھر کے معاملات کے بارے میں گفتگو کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

جب وہ چارجر لے کر اسپتال پہنچا تو وہاں مقامی ٹی وی کی وین پہلے سے موجود تھی۔ مقامی رپورٹرز کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کیونکہ دور دراز علاقہ ہونے کی وجہ سے نیشنل نیوز کو بھی انہی رپورٹرز کی خبروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اس نے ایک لمبے بالوں والی نوجوان لڑکی کو دیکھا جو اپنی نوٹ بک میں جلدی جلدی کچھ لکھ رہی تھی جبکہ اس کے ساتھ آنے والے کیمرا مینوں اور ہنرمندوں کو کوئی جلدی نہیں تھی اور وہ بڑے سکون و اطمینان سے اپنا کام کر رہے تھے..... جیسے کسی حادثے کی نہیں بلکہ مقامی کونسل کے اجلاس کی کارروائی ریکارڈ کرنے کے لیے آئے ہوں۔

وہ یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ جینی آ گئی۔ اس نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے کار کی کھڑکی کے شیشے پر ہلکے سے دستک دی۔ مارٹی نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا لیکن وہ فون چارجر لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے فوراً ہی واپس جانا ہے۔ یہاں سب لوگ خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ نہیں معلوم کہ یہ سلسلہ رک گیا ہے یا مزید لاشیں آئیں گی۔''

''میں نے نیوز روم فون کیا تھا۔'' مارٹی نے کہا۔ ''مائنک چھٹی پر ہے اور جیک دس بجے تک ڈیوٹی پر آئے گا۔''

''مارٹی!'' جینی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' وہ اس کے بدلے ہوئے رویّے پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''تم وہاں کام نہیں کرو گے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن.....'' اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو ٹی وی..... وین کی طرف دیکھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ "تم وہاں کام نہیں کرو گے اور نہ ہی وہ ایسا چاہتے ہیں۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے۔ مجھ سے اچھی اس واقعے کی رپورٹنگ کوئی اور نہیں کر سکتا۔"

"اگر انہیں تمہاری ضرورت ہوتی تو اب تک تم سے رابطہ کر چکے ہوتے۔" جینی منہ بناتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی مائنک کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ مجھے اس کی بیوی نے فون پر بتایا تھا۔"

مارٹی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ یہی بات جاننا چاہ رہا تھا لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جینی نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔

"ریان کہاں ہے؟" جینی نے پوچھا۔

"گھر پر سو رہا ہے۔" مارٹی نے کہا۔ "آج اسکول میں چھٹی ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔" جینی اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں نے رات کو سنا تھا کہ پولیس اسکول میں جا کر دیکھے گی کہ کون کون غیر حاضر ہے۔ کیسی احمقانہ بات ہے۔"

"شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ یہ کام کسی طالبِ علم کا ہے۔" مارٹی نے کہا۔

"ان کا خیال ہے کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔" جینی نے کہا۔ "میں نے سپاہیوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ انہیں مسز میک کے گھر کے باہر جنگل میں لپ اسٹک کا ایک خول ملا ہے۔ ٹھیک ہے، اب میں چلتی ہوں۔ تمہیں بعد میں فون کروں گی۔ تم گھر پر ہی ریان کے پاس رہنا۔"

یہ کہہ کر وہ مڑی اور ایمرجنسی روم کی طرف چل دی۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اپنی شناخت کروائی۔ ان میں سے ایک نے اس سے کچھ کہا جس پر وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ مارٹی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آج کتنے عرصے بعد اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ اسے یاد آیا کہ کبھی ان کا گھر بھی قہقہوں سے گونجا کرتا تھا لیکن حالیہ چند مہینوں سے اس میں کمی واقع ہو گئی تھی اور اب گھر میں کسی قہقہے کی گونج نہیں سنائی دیتی تھی۔

مارٹی نے جینی کی باتوں پر غور کیا تو اس میں سچائی نظر آئی۔ اب وہ اس اخبار کے لیے کام نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی انہیں اس کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے شاندار کیریئر میں جرائم اور اسکینڈل پر مبنی کئی سنسنی خیز خبریں دی تھیں لیکن آخری دنوں میں اسے جرائم سے ہٹا کر مضافات کی رپورٹنگ پر لگا دیا گیا تھا اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ ادارے کی تنظیمِ نو کی جا رہی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مضافات کی خبروں کا معیار بہتر بنایا جائے اور اس سلسلے میں اس سے زیادہ مناسب شخص کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے لیے یہ ایک انتہائی اکتا دینے والا کام تھا۔ کونسل کے اجلاس کی رپورٹنگ کر کے اسے کبھی تسلی نہیں ہوئی اور وہاں سے ملنے والی خبریں بھی انتہائی غیر دلچسپ ہوتیں۔ وہ پورے ہفتے میں بمشکل چار پانچ خبریں ہی دے پاتا جنہیں اخبار کے پچھلے صفحے پر جگہ ملتی اور شاید ہی کوئی انہیں دیکھ پاتا ہو۔ پھر جبری ریٹائرمنٹ کی اسکیم متعارف ہوئی تو اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ اسے قبول کر لے..... انداز ایسا تھا جیسے کہا جا رہا ہو کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

اس نے گھڑی دیکھی اور سوچنے لگا کہ دس بجے جیک کو فون کر کے اس سے اس اسٹوری کے بارے میں بات کرے یا جینی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آرام سے گھر جا کر بیٹھ جائے۔ پارکنگ لاٹ میں پولیس اور ٹی وی ٹیم کی کارروائی سست رفتاری سے جاری تھی اور وہ چاہ رہا تھا کہ مزید کچھ دیر رک کر ان سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسے صرف سپاہیوں کے پاس جا کر باتوں باتوں میں اس واقعے کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کرنا تھیں اور وہ اس کام میں ماہر تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کا رخ کرنا ہے جو وہاں سے بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔ اس دوران میں اگر جینی نے فون کر لیا اور وہ گھر پر موجود نہ ہوا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔

اس نے اپنے بیٹے سے بات کرنے کے لیے نمبر ملایا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ اسکول کی چھٹی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں شہر کے وسط میں واقع چھوٹے سے بار میں برگر کھانے کے لیے آ سکتے ہیں۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی جہاں وہ اکثر شام کے وقت آیا کرتا تھا۔ اتنی دیر میں اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے ریان بول رہا تھا۔ "ڈیڈی! میں دوسرے نمبر پر مصروف ہوں۔ آپ کو تھوڑی دیر میں فون کرتا ہوں۔"

مارٹی کو اپنے بیٹے کی آواز سن کر کافی سکون محسوس ہوا۔ ریڈیو پر واقعے کے بارے میں تازہ ترین معلومات نشر کی جا رہی تھیں۔ خبروں کے مطابق مرنے والوں میں کم از کم دو ہائی اسکول ٹیچر تھے لیکن ریڈیو پر ابھی تک تین آدمیوں کے مرنے کی خبر ہی چل رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب وہ گھر پہنچا تو ریان کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیکن ٹائپنگ میں مصروف رہا۔ اس واقعے کے بعد فیس بک پر چیٹنگ اور پیغامات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ریان کے ایک کلاس فیلو نے جسے اعداد و شمار میں مہارت حاصل تھی، ہر مرنے والے ٹیچر کے شاگردوں کی ایک فہرست تیار کی پھر اس نے ان کا موازنہ کر کے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کون کون سے طالبِ علم ان کلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ ٹیچر حساب، انگریزی اور ہسپانوی زبان پڑھاتے تھے لیکن مسز میک کے پاس ایک اختیاری مضمون مینٹل آرٹس تھا۔

ریان نے وہ فہرست مارٹی کو دکھائی تو وہ بولا۔ "زبردست...... تم لوگوں نے تو پہلے ہی ساری معلومات اکٹھی کر لیں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" ریان بولا۔

"کیا ان میں کوئی ایسا طالبِ علم بھی ہے جس کا نام ان سب فہرستوں میں موجود ہو؟"

"ہاں، ایک ہے۔" ریان بولا۔ "فٹ بال ٹیم کا کھلاڑی بریڈ ولسن..... کیونکہ عام طور پر حساب پڑھنے والے طالبِ علم مینٹل آرٹس نہیں پڑھتے۔"

باتوں باتوں میں ریان نے بریڈ ولسن کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ وہ دو ہفتوں سے شکایت کر رہا تھا کہ ہرن کے شکار کا سیزن اس روز شروع ہو گا جب اسکول کھلے ہوں گے اور انہیں شکار پر جانے کے لیے ہفتے کے اختتام کا انتظار کرنا ہو گا۔

مارٹی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے شراب چھوڑ کر کتنی عقل مندی کی ہے۔ اب وہ ایک معقول شخص کے طور پر صاف ذہن کے ساتھ بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ اس نے غور سے ریان کو دیکھا اور بولا۔ "کیا وہ کسی دوسرے ٹیچر سے بھی پڑھتا ہے؟"

"مجھے اس بارے میں معلوم نہیں۔ وہ کل اپنے والدین کے ساتھ کیمپس دیکھنے آیا تھا اور وہ لوگ رات کو وہیں رک گئے تھے۔"

"وہ یقیناً کسی اور ٹیچر سے بھی پڑھتا ہو گا۔"

"ممکن ہے۔" ریان نے کہا۔ "میں چیک کرتا ہوں۔" پھر اس نے ایک پیغام ٹائپ کیا اور مارٹی سے بولا۔ "مسٹر موترو..... وہ معدنیات پڑھاتے ہیں۔"

مارٹی نے جینی کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ "پولیس والوں سے کہو کہ وہ معدنیات کے استاد مسٹر موترو پر نظر رکھیں۔ وہ اگلا نشانہ ہو سکتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا مارٹی؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"بچوں نے کچھ فہرستیں تیار کی ہیں۔ انہی سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ میں نائن الیون کو بھی فون کر سکتا تھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس وقت وہ سب گھبراہٹ کے عالم میں ہیں۔ شاید میری بات پر توجہ نہ دیں اس لیے میں نے سوچا کہ تم بہتر طور پر پولیس تک رسائی حاصل کر سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" جینی نے کہا۔ "میں کچھ کرتی ہوں۔"

"آپ واقعی زبردست آدمی ہیں ڈیڈ۔" ریان نے کہا جو ٹائپنگ چھوڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ مارٹی نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت بتا رہی تھی کہ وہ ابھی تک کسی بھی بری عادت سے دور ہے جبکہ مارٹی نے جب پہلی بار شراب پی تو اس وقت وہ ریان سے بھی چھوٹا تھا۔ مارٹی کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا۔ آج نہیں تو کل ریان کو یہ بری لت لگ سکتی ہے۔ اس روز پہلی بار مارٹی کو احساس ہوا کہ اسے بچوں کے سامنے شراب نوشی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ وہ خود ایک غلط مثال قائم کر چکا تھا اور بچے اپنے بڑوں کو جو کچھ کرتا ہوا دیکھتے ہیں، خود بھی وہی کرنے لگتے ہیں۔ بہر حال مارٹی کے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ اس کا بیٹا ابھی تک اس بری عادت سے محفوظ ہے۔ فی الحال وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے تعریفی جذبات دیکھ رہا تھا کہ اس نے کس طرح اس بحرانی کیفیت میں اپنی ذمے داری پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ مارٹی سوچ رہا تھا کہ اگر اسے اس واقعے کی رپورٹنگ کا موقع مل جاتا تو ریان کی نظروں میں اس کا قد اور بڑھ سکتا تھا۔

اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ پولیس کا ایک ہیلی کاپٹر جھیل پر سے ہوتا ہوا قصبے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت وہ نشے میں ہوتا تو شاید اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہوتا اور نہ ہی آنے والی سردیوں کے بارے میں کچھ سوچ سکتا جب انہیں عملاً اس ایک کمرے تک محدود ہونا پڑے گا جس میں آتش دان نصب تھا کیونکہ وہ اور جینی مل کر بھی کاٹیج کا ہیٹنگ سسٹم ٹھیک نہیں کروا سکتے تھے۔ ساری سردیاں جینی اسے الزام دیتی رہتی اور اس کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔

دوپہر کو انہوں نے ریفریجریٹر میں رکھے ہوئے گوشت پر گزارہ کیا۔ اس کے بعد خبریں دیکھنے بیٹھ گئے۔ اس وقت تک واقعے کی پوری تفصیل سامنے آ چکی تھی اور مقامی

خبروں کے علاوہ نیشنل نیوز پر بھی ایک ہی اسٹوری چل رہی تھی۔ سپاہیوں نے اس کی اطلاع پر اسکول ٹیچر مونرو کے گھر کی نگرانی شروع کی تو انہیں سامنے والی سڑک پر کھڑی ہوئی پک اپ میں ایک نوعمر لڑکی سوتی ہوئی ملی جو غالباً انتظار کر رہی تھی کہ مونرو اخبار اٹھانے کب پورچ میں آتا ہے لیکن مسٹر جانسن کے قتل کے بعد تمام ٹیچرز کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ گھروں کے اندر ہی رہیں۔ اس لڑکی کو غالباً یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس لیے وہ مونرو کا انتظار کرتے کرتے سو گئی۔ اس لڑکی کا نام ایلی پارمر تھا اور اس کے گھٹنوں پر ہرن شکار کرنے والی ایک طاقتور رائفل رکھی ہوئی تھی۔ اس نے شکاریوں والا حلیہ بنا رکھا تھا۔

''کیا یہ اس کی گرل فرینڈ ہے؟'' مارٹی نے پوچھا۔

''اوہ میرے خدا! یہ لڑکی تو اس کے لیے پاگل ہو چکی ہے۔'' ریان بولا۔ ''اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اسکول کی وجہ سے بریڈ سیزن کے پہلے روز شکار پر نہیں جاسکتا جبکہ یہ اس کی شدید خواہش تھی۔ لہٰذا اس نے ایسا انتظام کردیا کہ اسکول میں چھٹی ہوجائے۔ غالباً وہ اس کے تمام ٹیچرز کو قتل کرنا چاہ رہی تھی تاکہ فخریہ کہہ سکے..... کیا اب بھی تم مجھے پسند نہیں کرتے؟ تم یہی چاہتے تھے ناکہ آج اسکول بند ہوجائے؟''

تھوڑی دیر بعد جینی کا فون آیا کہ وہ کام سے فارغ ہوچکی ہے اور اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ گھر آرہی ہے۔ جب وہ گھر پہنچی تو مطلع ابر آلود ہوچکا تھا اور لگ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں موسلادھار بارش ہونے والی ہے۔ اس نے دیکھا کہ دونوں باپ بیٹے کھانے سے فارغ ہوکر اطمینان سے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں اور کافی کی میز پر ٹماٹو ساس کی خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ریان اپنی جگہ سے اٹھا اور خالی بوتل لے جاکر کچن میں رکھ دی ورنہ جینی اچھا خاصا ہنگامہ کردیتی پھر اس نے ماں کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

''مما! آپ کچھ کھانا پسند کریں گی؟''

''اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔'' اس نے بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے بیڈ روم میں لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے ٹی شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی اور اپنی عمر سے کافی کم لگ رہی تھی۔ مارٹی نے اس کی جانب پسندیدگی سے دیکھا اور اگر ریان موجود نہ ہوتا تو شاید وہ کوئی تعریفی جملہ بھی کہہ دیتا لیکن جینی نے اسے بالکل ہی نظر انداز کردیا اور ریان سے کھانے کی پلیٹ لے کر کھانے میں مصروف ہوگئی۔ وہ اس وقت اس طرح کھا رہی تھی جیسے واقعی بہت بھوکی ہو۔ مارٹی نے اسے کئی مہینوں بعد اتنے شوق سے کچھ کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کھانا ختم کرکے اس نے پلیٹ میز پر رکھی اور مطمئن انداز میں بولی۔

''مزہ آگیا۔ تم لوگوں نے واقعی اچھا انتظام کر رکھا تھا۔''

مارٹی اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ اس تعریف میں وہ بھی شامل ہے۔ اس نے شکریہ ادا کرنے کے انداز میں سر کو ہلکا سا خم دیا۔ جینی نے اسے گھورا اور ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔

وہ تازہ ترین خبروں کی تلاش میں چینل بدلتے رہے۔ انہوں نے ایلی کو ہتھکڑیاں لگتے اور جیل جاتے دیکھا۔ وہ حد درجہ معصوم اور خوب صورت تھی اور اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سے قتل جیسا سنگین جرم سرزد ہوسکتا ہے لیکن وہ اپنی معصومیت میں یہی سمجھ رہی تھی کہ شکار اسی وقت ہوسکتا ہے، جب اسکول بند ہوجائے چنانچہ اس نے بریڈ ولسن کے تمام ٹیچرز کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ وہ سیزن کے پہلے روز ہرن کے شکار پر جاسکے۔ اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لیے وہ یہی کچھ کرسکتی تھی۔

جینی وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ اس لمحے مارٹی کو اس پر بہت پیار آیا۔ اگر وہ اسے فری پریس کے لیے کام کرنے سے منع نہ کرتی اور وہ گھر آنے کے بجائے خبر کی تفصیل جاننے کے لیے پولیس والوں کے آگے پیچھے پھر رہا ہوتا تو اسے ریان کے کلاس فیلو کی بنائی ہوئی فہرستوں کے بارے میں بھی پتا نہ چلتا.... جن کی مدد سے وہ بریڈ ولسن اور اس کے ٹیچرز کے بارے میں جاننے میں کامیاب ہوسکا اور پھر اس نے جینی کو اسکول ٹیچر مونرو کے بارے میں مطلع کیا جو قاتل کا اگلا نشانہ ہوسکتا تھا اور اس طرح پولیس ایلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکی۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد مارٹی کو یوں لگا جیسے اس کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر چکا ہے۔ اس لمحے اس نے اپنے آپ کو بے حد پرسکون محسوس کیا اور ان مسائل کے بارے میں سوچنے لگا جو ابھی حل ہونا باقی تھے۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اپنے کمپیوٹر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دماغ میں ایک نئے ناول کا آئیڈیا پروان چڑھ چکا تھا۔ اخبار کے لیے فری لانسنگ کرنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرکے چار پیسے کمائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردی... گرمی... خزاں بہار کے موسموں کے ساتھ ساتھ پانچواں چھٹیوں کا موسم ہوتا ہے جو ہر شخص کی زندگی میں نہیں آتا... ایک ایسے ہی نوجوان کی دلچسپ کتھا... جس کی زندگی میں کسی فرمائش و حجت کے چھٹیوں کا موسم آگیا... وہ ہر صورت ان تفریحی دنوں کو اپنے لیے یادگار بنالینا چاہتا تھا....!

چھٹیوں کا تحفہ

سیریناراض

مغربی باشندوں کی ایک اور خوبی... جو زندگی کے سب رنگ دیکھ لینا چاہتے ہیں

جب میڈم سلینا نے کہا کہ لگتا ہے ہمیں آرام کے لیے تفریحی چھٹیوں کی ضرورت ہے تو یہ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ ان کی بات سن کر مجھے ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔

میڈم سلینا یتیم خانے کی انچارج تھیں۔ وہ اسے مخیر حضرات کے چندے سے چلا رہی تھیں۔ یتیم خانے کے ساتھ ہی فارم تھا جس پر کام کی ذمے داری یتیم خانے کے ذرا بڑے بچوں کے سپرد تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ چھوٹے بچے کچھ نہیں کرتے تھے۔ وہ بھی کام کرتے تھے مگر زرعی فارم پر کام

ذرا سخت ہوتا ہے، اس لیے انہیں یہاں نہیں بھیجا جاتا تھا۔ ویسے میں کئی برس سے میڈم کے فارم اور گھر پر کام کر رہا تھا۔ اپنے گھر پر ہی انہوں نے رہنے کے لیے چھوٹا سا ڈربا نما کمرا مجھے دے رکھا تھا۔ ویسے سچ کہوں تو میڈم مجھے اور میں انہیں پسند کرتے تھے۔ مجھ سے وہ نہایت اچھا رویہ رکھتی تھیں۔

میں نے میڈم کے یتیم خانے میں ہی ہوش سنبھالا تھا اور پچھلے دو سال سے فارم پر کام کر رہا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اکثر مجھے لگتا تھا کہ اب اس فارم سے تو مر کر ہی جان چھوٹے گی۔ جیتے جی تو کہیں جانا ممکن نہیں تھا۔ رہا یتیم خانہ تو وہاں پر بھی چھٹی کا کوئی تصور نہ تھا۔

ہمارے برعکس میڈم سلینا ہر اتوار کو چھٹی کرتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ چھٹی کے روز وہ نیوپورٹ جاتیں اور وہیں اپنا سارا دن گزارتی تھیں۔ ان کا یہ دورہ آدھا تو تفریح کے لیے مخصوص ہوتا تھا، باقی آدھا دن وہ یتیم خانے کے لیے چندہ مہم میں گزارتی تھیں۔ اب جب کام کے مارے مجھ بے چارے نے میڈم کی زبان سے تفریحی چھٹیوں کا سنا تو حیرت کے مارے میری زبان ہی گنگ رہ گئی۔ میری وہ مثال تھی جیسے بلی زبان کھا گئی ہو۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ سامنے کھڑی میڈم کی پیشکش کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' جب کافی دیر تک میں حیرت میں ڈوبا رہا تو انہوں نے خود ہی خاموشی توڑی اور استفساریہ نظروں سے مجھے گھورا۔ ''کیا خیال ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ ہمیں آرام کے لیے تفریحی چھٹیوں کی واقعی سخت ضرورت ہے۔'' انہوں نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی اور مجھے گہری نظروں سے سر سے پاؤں تک گھورا۔

''میں نے کبھی تفریحی چھٹیاں نہیں گزاری ہیں۔'' خود کو حیرت کے سمندر سے نکالنے کی کوشش میں اٹکتے ہوئے اُن کی پیشکش کا جواب دیا۔

''تو اب کرلو۔'' انہوں نے بڑے سکون سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''نئی نئی چیزیں دیکھنے، نئے لوگوں سے ملنے اور نئے علاقوں کی سیر سے دماغ کو راحت پہنچتی ہے۔ انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے، ہم کل صبح اپنی تفریحی چھٹی گزارنے جارہے ہیں۔'' میڈم نے ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہوں کہ میں نے فیصلہ کرلیا۔ ''ہم کل صبح پہلی مسافر بردار کشتی سے نکلیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے میڈم سلینا کا لہجہ حتمی تھا۔ سب کچھ بہت جلدی میں طے ہوگیا تھا۔ ''ٹکٹ تیار ہیں۔ تم ہفتہ، دس دن کے حساب سے تیاری کرلو۔''

دوسرے دن سفر کی تیاری میڈم کے فیصلے کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے جوتے پالش کیے اور برش پھیر پھیر کر انہیں خوب چمکایا۔ خوب جما جما کر کپڑے استری کیے اور سوٹ کیس بڑی احتیاط سے تیار کیا۔ جب میں اپنی تیاریوں سے فارغ ہوا تو میڈی کی طرف رخ کیا۔ وہ بے چاری میڈم کا سامان پیک کرنے میں جتی تھی۔ جب میں نے مدد کی پیشکش کی تو اس نے مسکراتے ہوئے فوراً سر ہلا دیا۔ میں میڈم کا سامان پیک کرنے لگا اور وہ دھم سے کرسی پر ڈھے گئی۔

''میری تو کمر اکڑ کر رہ گئی۔'' میڈی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ تمہارا ورنہ جانے کب تک میں یہ کام ختم کرپاتی۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے سر لگا کر چھت کو گھورنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے بظاہر خوش دلی سے جواب دیا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اسے کام میں ہاتھ بٹانے کی پیشکش کی تھی مگر وہ سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال کر خود آرام کرنے لگی۔

کشتی سے سفر تک کا تو مجھے پتا تھا مگر اس کے بعد ہم کیسے سفر کریں گے، کہاں جائیں گے، یہ نہ تو میڈم نے بتایا اور نہ میں نے پوچھا تھا۔ ویسے تو ہمیں کشتی سے سفر کرنا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ یہ تفریحی چھٹیاں اور زیادہ مزیدار ہوجاتیں اگر زمینی سفر کیا جاتا۔ میں حیران تھا کہ میڈم نے تفریح کے لیے دریائی سفر کا انتخاب کیوں کیا؟ تفریح ہی کرنا تھی تو پھر ہمیں سڑک یا ریل کے راستے سفر طے کرنا چاہیے تھا۔ میں یہ بات سوچ تو رہا تھا مگر میڈی سمیت کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ ویسے میڈی سے کیا خاک بات کرتا۔ وہ تو اپنی بلا میرے سر لاد کر کرسی پر بیٹھی، آنکھیں موندے اونگھ رہی تھی۔

میڈم سلینا کا عجب مزاج تھا۔ وہ اکثر تیوری پر بل ڈالے کسی نہ کسی تشویش میں مبتلا ادھر اُدھر چلتی پھرتی رہتی تھیں۔ ضروری نہیں کہ ان کی تشویش کا کوئی سبب ہو۔ وہ بے بات بھی پریشان ہوجانے والی خاتون تھیں۔ ویسے وہ نارمل عورت تھیں اگر آپ ان کے نخ پن سے قریب ہوتے سر کو نظر انداز کردیں تو۔ ویسے یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ جس کی بنا پر کسی کو نارمل انسان نہ سمجھا جائے۔ ویسے بھی وہ عمر کے جس حصے میں تھیں، اُس میں ایسی چھوٹی موٹی تبدیلیاں تو انسانی

شخصیت کے ساتھ چپک کر رہ جاتی ہیں۔ ویسے وہ پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ اخبار، خصوصاً شام کے اخبار کو خود سے دور رکھتی تھیں کہ مبادا کوئی خبر ان کے سکون میں خلل نہ ڈال دے۔

میڈم یتیم خانہ چلانے کے فلاحی کام کے ساتھ ساتھ دست شناسی، ٹیرو کارڈ، ہپناٹزم، روحوں کو بلانے جیسے پراسرار علوم کے حوالے سے بھی بہت مشہور تھیں۔ اکثر اُن کے گاہک دور دور سے آتے رہتے۔ میں نے کبھی میڈم کو کسی گاہک سے کچھ مانگتے نہیں سنا البتہ لوگ جاتے ہوئے خود ہی اچھی خاصی رقم انہیں دے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر میڈم کی زندگی پرسکون اور مالی لحاظ سے اطمینان بخش گزر رہی تھی۔

ہمارے ٹکٹ مسز ہیرم بیکر اسٹف اور ان کے بھتیجے ٹپ ٹام کے نام سے بک کیے گئے تھے۔ ویسے میں ان ناموں والے دونوں افراد کو جانتا تھا۔ ایک بار مجھے اُن دونوں کو لانے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر فی الحال میں خود ٹپ ٹام تھا اور میڈم سلینا مسز ہیرم۔ یہ اور بات ہے کہ حقیقت بالکل برعکس تھی۔ کم از کم میں نہ تو مسز ہیرم کا بھتیجا تھا اور نہ ہی میڈم سلینا میری آنٹی یا مسز ہیرم۔ اس کے باوجود ہمارے ٹکٹ اسی نام سے تھے اس لیے فیری پر سفر کے دوران ہماری پہچان یہی نام تھے۔ مجھے ناموں اور رشتوں کی اس تبدیلی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں خوش تھا اور وجہ یہ تھی کہ کم از کم ہفتہ بھر کی تفریحی چھٹی پر جارہا ہوں اور وہ بھی اُن کے ساتھ، جن سے اس طرح کی پیشکش کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے لیے تو وہ دن کرسمس جیسا تھا۔

خیر اُس چمکدار صبح ہم نے دریائے ہڈسن پر بذریعہ کشتی اپنا سفر شروع کیا۔ مجھے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کوئلے کے انجن والی بڑی شاندار مسافر کشتی تھی۔ سفر شروع ہوا تو میں کشتی کے پالش شدہ عرشے پر ریلنگ کے ساتھ کھڑا دریا کے کناروں پر بنے گھروں، جنگل، پرندوں اور اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ ایک انوکھا دن تھا اور اس کے ہر لمحے سے حاصل شدہ لطف کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل و دماغ میں بسا لینا چاہتا تھا۔ اگرچہ میں تفریح کر رہا تھا مگر پھر بھی ایک خیال بار بار میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔ آخر مجھ سے صبر نہ ہوا اور میں نے ریلنگ کے برابر بینچ پر بیٹھی میڈم سے پوچھ ہی لیا۔ ''ہم کہاں کہاں جائیں گے؟''

''تمہیں اس بات کی کیا پریشانی ہے؟'' میڈم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ البتہ ان کے چہرے کے تاثرات کے برعکس، لہجہ خاصا نرم تھا۔ ''تم سفر انجوائے کرو۔'' انہوں نے کچھ بتانے کے بجائے الٹا نصیحت کی۔ ''وہ دیکھو...'' میڈم نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''کتنی شفاف صبح ہے۔ نیلا آسمان کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔''

''ہاں...'' میں نے اوپر دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو فضول چیزوں کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو پریشان کرنے کے بجائے سفر کا مزہ لو۔'' ایک بار پھر میڈم نے نصیحت کی۔

''بس... ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' میں نے منمنا کر وضاحت پیش کی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میڈم نے پیار سے کہا۔ ''ویسے ہم جہاں جارہے ہیں، وہاں میرا ایک بہت پرانا دوست جارج رہتا ہے۔ اس کا ریستوران بہت مشہور ہے۔ ہم وہاں پر ضرور کئی بار لنچ کریں گے۔ گھڑدوڑ دیکھنے ریس کورس بھی جائیں گے۔ ریس کورس کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر دوڑ شروع ہونے سے پہلے کی میوزک بینڈ پریڈ بھی دیکھیں گے۔'' یہ کہہ کر میڈم خاموش ہوگئیں اور مجھے دیکھنے لگیں۔

''بڑا مزہ آئے گا۔'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''جانتی ہوں۔'' میڈم مسکرائیں۔ میڈم کا لہجہ بہت نرم تھا۔ خلاف معمول اُس وقت نہ تو ان کی پیشانی پر بل تھے، نہ ہی چہرے پر تشویش بھرے تاثرات بلکہ سکون ہی سکون بکھرا ہوا تھا... ماحول پر بھی اور میڈم کے چہرے پر بھی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میڈم سلینا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ان کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی۔ ان کی مسکراہٹ میں شاہانہ تمکنت تھی۔ وہ جب بھی مسکراتیں میرے تصور میں آرلیوس کا چہرہ آجاتا تھا۔ مارکس آرلیوس رومی شہنشاہ تھا اور میں نے اس کا مجسمہ بہت سال پہلے میڈم کے ساتھ میوزیم کی سیر میں دیکھا تھا۔ وہ مارکس آرلیوس کے دور کا بنا ہوا مجسمہ تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر پتھرائی ہوئی مسکراہٹ تھی لیکن وہ مسکراہٹ بہت جیتی جاگتی تھی۔ میڈم اور اس مجسمے کی مسکراہٹ نہ صرف بہت غضب کی تھیں بلکہ ان میں بڑی حد تک مماثلت تھی۔ میڈم کو مسکراتا دیکھ کر میں خود کو بہت خوش قسمت تصور کرتا تھا۔ مجھے اپنی تقدیر پہ ناز محسوس ہوتا کہ میں ان کا اسسٹنٹ ہوں۔ میرے لیے یہ قابل فخر عہدہ تھا۔

میڈم کے دوست جارج کے ریستوران کا قصہ میں کئی بار سن چکا تھا۔ اسی لیے جانتا تھا کہ ریستوران کا کھانا جارج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی بیوی ہلڈا تیار کرتی ہے اور اس کے بنائے ہوئے کھانوں کی تعریف میڈم نے کئی بار میرے سامنے کی تھی۔

یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میڈم مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ اس کی ایک وجہ میری شکر صبر کی عادت تھی۔ میڈم نے مجھے رہنے کے لیے جو جگہ دی تھی، وہ ڈربے جیسی تھی مگر میں نے کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ میری تابع داری دیکھ کر میڈم پہلے ہی دن مجھ سے متاثر ہوگئی تھیں۔

ویسے میڈم سے میرا تعلق بہت پرانا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایک دن مجھے لگا کہ یہ ساتھ چھوٹنے والا ہے۔ اُس دن میں بہت پریشان تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اصلی والی مسز ہیرم بیکر اسٹف ایک بار پھر یتیم خانے کے دورے پر آئی تھیں۔ انہیں ایک ایسے 'تابع دار لڑکے' کی تلاش تھی جس کا قد پانچ فٹ تک ہو، اس سے زیادہ لمبا لڑکا ہوتا تو وہ ان کے معیار پر ہرگز پورا نہ اترتا۔ مسز ہیرم کی شکل میں ٹوٹنے والی آفت سے بچنے کے لیے اُس روز میں نے سارے کام نہایت محنت اور دلجمعی سے کیے۔ میں چاہتا تھا کہ اگر ان کی نظرِ کرم مجھ پر پڑے تو میڈم خود ہی مجھے بھیجنے سے انکار کردیں۔ اس دن میں نے میڈم کے پورے گھر کو چمکایا، فارم ہاؤس پر اپنا کام بہت اچھی طرح نمٹایا۔ اس کے باوجود بھی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں مسز ہیرم مجھے ہی پسند نہ کرلیں اور رہی میڈم کی بات تو کہیں وہ لحاظ میں ان کے سامنے انکار کی جرأت نہ کرسکیں۔ اُس دن میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، میں اُن کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اگر جانے کے لیے مجھ پر زور زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی تو صاف کہہ دوں گا کہ مجھے یتیم خانے سے نکال دیا جائے۔ میں اس شہر میں خود ہی اپنے جینے کا سامان کرلوں گا۔ خوش قسمتی سے یہ قیامت میرے بجائے کسی اور کے سر پر ٹوٹی۔

"وہ دیکھو..." میڈم سلینا نے ذرا جوش سے کہا تو میں اپنے تصورات سے باہر نکل آیا۔ میڈم ریلنگ کے ساتھ کھڑی سامنے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجھے متوجہ پا کر انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "وہ ایک اور کشتی آرہی ہے۔"

"کیا خیال ہے، ہماری کشتی کو اس کے ساتھ ریس لگانی چاہیے؟" میں نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ اچانک دکھ بھرے ماضی کی تمام یادیں میرے ذہن سے محو ہوچکی تھیں۔ اب پوری توجہ سامنے والی کشتی پر اور دھیان ریس میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چوڑے دریا میں دو مسافر بردار کشتیوں کے درمیان ریس ہو تو کیا منظر ہوگا۔

"دل تو میرا ابھی یہی کہتا ہے مگر امید نہیں۔" وہ ایک بار پھر مسکرائیں۔ "ویسے مسافر بردار کشتیوں کا یوں کھلے دریا میں ریس لگانا خلاف قانون ہوگا۔ مجھے نہیں لگتا کہ کپتان ایسا کرے گا۔" میڈم کی باتوں سے لگا کہ وہ بھی کھلے دریا میں ریس کا لطف لینے کی خواہش مند ہیں مگر انہیں اپنی معصوم خواہش پورا ہونے کی امید نہ تھی۔

"ویسے اگر ریس لگے تو بڑا مزہ آئے گا۔"

"کیا مطلب؟" میڈم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"جانتے ہو اس وقت کشتی پر کتنے سارے مسافر سوار ہیں۔ یہ اسٹیم انجن سے چلتی ہے اور وہ بھی دریائے ہڈسن میں۔" انہوں نے ہاتھ سے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے ہی دریا منہ زور ہورہا ہے۔ اوپر سے کھولتے پانی سے لبالب بوائلر... مسافروں کو اگر بھنک بھی پڑگئی کہ کشتیوں کے کپتان ریس لگا رہے ہیں تو کئی مسافر خوف کے مارے دریا میں کود جائیں گے۔"

میڈم لیکچر دیے جارہی تھیں۔ میں نہایت تابع داری سے ان کا لیکچر سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ ریس لگانے کی بات کررہی تھیں۔ اب خود ہی اس کے خلاف بیان دے رہی تھیں۔

"چلو... یونہی سفر کرتے ہوئے لطف لیتے ہیں۔" میں نے کچھ توقف کے بعد مفاہمانہ لہجے میں کہا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" میری تجویز میڈم کو پسند آئی اور وہ ایک بار پھر مسکرادیں۔

کچھ روز پہلے کی بات ہے کہ میڈم سلینا نے کسی عورت کو میرے سامنے فون کیا تھا۔ سیرتِس نسلاً رومن تھی۔ وہ نوجوان عورت تھی۔ وہ ہپناٹزم کی ماہر تھی اور میڈم یہ جاننے کی خواہش مند تھیں کہ اس کا نسلاً کس قوم سے تعلق تھا۔ ویسے وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ وہ قدیم رومن شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

خیر... تو میں بتا رہا تھا کہ سیرتِس آئی اور جب سیشن شروع ہونے لگا تو میڈم نے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا مگر میں بھی کائیاں تھا۔ پہلے ہی انتظام کرچکا تھا کہ ایسی صورت میں کس طرح ساری باتیں جان پاؤں گا۔ اس لیے کمرے سے تو نکل گیا لیکن پیچھے سے ہوتا ہوا اس کمرے کی کھڑکی تک پہنچ گیا، جہاں ایک سوراخ بنا تھا اور اس سے ہپناٹزم کا سارا منظر دیکھا اور میڈم کی باتیں بھی سنی جاسکتی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں آرلیوس مارکس کی نسل سے ہوں اور میرے اندر آرلیوس مارکس کی روح حلول کرگئی ہے۔" وہ

سیرتِس کو اپنی کیفیت بتا رہی تھیں۔ "کبھی کبھی تو لگتا ہے جیسے میں نہیں، میرے منہ سے کوئی اور حکم دیتا ہے۔ اسی لیے چاہتی ہوں کہ تم کچھ پتا چلاؤ۔"

"سب کچھ پتا چل جائے گا۔" اس نے تسلی دی۔ "بس تم لیٹو اور جیسا میں کہتی ہوں، ویسا کرو۔" سیرتِس نے کہا۔

اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔ سیرتِس نے میڈم کو پوری طرح اپنے ٹرانس میں لے لیا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مکمل طور پر سیرتِس کے ٹرانس میں ہونے کے باوجود مجھے میڈم سے متعلق کوئی خاص بات پتا نہیں چل سکی۔ ویسے بھی سیشن کے بعد جو کچھ سیرتِس نے میڈم سے کہا، وہ میرے پلّے نہیں پڑا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ حقیقت کیا ہے مگر ایک بات پر یقین مزید پختہ ہوگیا تھا۔ میڈم سلینا اور آرلیوس میں کوئی مافوق الفطرت رشتہ یا غیبی تعلق ضرور تھا۔ اس کی ٹھوس وجہ دونوں کی مسکراہٹ تھی اس لیے جب میڈم نے مجھے تفریحی چھٹیوں کی خوشخبری دی تو میں سمجھا کہ شاید یہ آئیڈیا بھی میڈم کے ذہن میں نہیں بلکہ آنجہانی آرلیوس کی روح کو آیا ہوگا۔ میڈم کی تو زبان تھی، الفاظ آرلیوس کے ہوں گے۔ ویسے بھی میرے لیے تو یہ بہت بڑی مہربانی تھی۔ مجھے میڈم سے تو کبھی ایسی فیاضی کی توقع نہ تھی مگر یہ یقین ہوگیا کہ آرلیوس کو مجھ پر رحم آگیا ہے۔ ویسے وہ تو جانتا ہی ہوگا کہ میں اس کی مسکراہٹ کا کتنا بڑا پرستار ہوں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم جب کشتی سے شینک ٹیڈی بندرگاہ کے کنارے اُترے تو سورج خاصا اوپر ہوچکا تھا مگر پھر بھی یہ خزاں کی خوبصورت صبح تھی۔ یہاں سے ہم نے اسٹیشن کا رخ کیا۔ ریل گاڑی پکڑی اور پُر فضا اسپرنگ قصبے کے لیے چل پڑے۔ اگرچہ کم عمر ہونے کے باوجود میں شہروں میں چلنے والی اومنی بسوں، ٹراموں اور ٹیکسیوں میں سفر سے تو آگاہ تھا مگر ٹرین کی بات کچھ اور تھی۔ اس میں سفر کا لطف ان سے منفرد تھا۔

انجن کی سیٹی، پٹریوں پر دوڑتی ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ، تیزی سے بھاگتے مناظر، چلتی ٹرین سے دیکھو تو ٹیلی فون کے ساتھ ساتھ دوڑتے کھمبے... بھلا نظارے کا جو لطف ٹرین سے آتا ہے، وہ بات سڑک پہ دوڑتی گاڑیوں میں کہاں۔ سچ پوچھیں تو جب میڈم نے فیری سے اترتے ہوئے کہا کہ اب ہم اسٹیشن جا کر ٹرین پکڑیں گے اور اس میں بیٹھ کر آگے جائیں گے تو میں جھوم اٹھا تھا۔ ٹرین میں سفر کا موقع کافی طویل عرصے کے بعد مل رہا تھا۔ ٹرین کا سفر اور تفریحی چھٹیاں... اُس وقت میرا دل اچھل اچھل کر گانا گانے کا کررہا تھا مگر میڈم ساتھ تھیں۔ اُس وقت شرم اور مہذب بننے کے چکر میں، میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل کی بات کو رد کیا۔

میں میڈم سلینا کے پیچھے پیچھے ڈبے میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ وہ مہنگے ٹکٹ والا ڈبا تھا جس کی مسافر سیٹوں پر سبز اور سرخ رنگ کی مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ کھڑکی پر خوبصورت پردے پڑے تھے۔ سیٹ کے ساتھ ہی بہت نفاست سے کھانے کی ٹرے تھی جسے استعمال کے بعد دوبارہ بند کرکے سیٹ کے ہتھے کی جانب اندر کو دھکیل کر بند کیا جاسکتا تھا۔

"کیسا لگا؟" میڈم نے سامان کے لیے بنے ریک میں بیگ ٹھونس کر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ "سفر کا مزہ آجائے گا۔" انہوں نے دونوں ہاتھ سے فوم کی بنی نہایت دبیز اور نرم سیٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں..." میں نے بڑی مشکل سے خود کو خوشی کے مارے چلّا کر جواب دینے سے روکا۔ میرا لہجہ مہذبانہ تھا۔ "کھڑکی سے نظارہ خوب دیکھنے کو ملے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کھڑکی پر پڑا پردہ کھینچا۔ سامنے ریلوے پلیٹ فارم تھا۔ چند لمحوں تک پلیٹ فارم کو دلچسپی سے دیکھنے کے بعد میں نے میڈم کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر اردگرد نظر ڈالی۔ ڈبے میں خاصا سکون تھا۔ چند مسافر ہی پورے ڈبے میں موجود تھے اور جس جگہ ہم بیٹھے تھے، وہاں تو قریب میں کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ جب گاڑی چلے گی تو میں کسی کی مداخلت کے بغیر نظاروں سے لطف اندوز ہوسکوں گا۔

کافی دیر تک ٹرین بہت دھیمی رفتار سے چلتی رہی۔ میں کھڑکی کھولے نظاروں میں محو تھا۔ باہر کی ہر چیز ساتھ ساتھ دوڑتی محسوس ہورہی تھی۔ کئی میل دور جا کر کوئلے سے چلنے والے بھاپ کے انجن نے رفتار پکڑی تو یوں لگا جیسے ساتھ ساتھ دوڑنے والے کھمبے پیچھے کو بھاگ رہے ہوں۔ میں کھڑکی سے سر باہر نکالے بیٹھا تھا۔ یہ اور بات کہ میڈم کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ انجن سے نکلنے والا دھواں اندر آرہا ہے مگر میں نے سنی اَن سنی کردی۔ آخر کو یہ سفر تھا۔ سفر میں تو ایسا ہوتا ہے۔ اس سفر کو انمول یادوں میں بدل دینے میں محو تھا۔

مجھے یقین ہے کہ ٹرین سے لے کر تین منزلہ یونین ہوٹل تک پہنچنے کے سفر کی داستان تفصیل سے بیان کی تو یقیناً آپ مجھ پر رشک کریں گے مگر پھر بھی بات مختصر۔ تو ہوا یہ کہ ریل گاڑی کا سفر ختم ہوا۔ ہم اسپرنگ قصبے کے اسٹیشن پر اترے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہماری نئی منزل یونین ہوٹل تھا۔ یہ بہت وسیع و عریض تھا۔ ہوٹل کے احاطے میں بہت بڑا باغ تھا جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ کئی فوارے لگے تھے جن سے اُچھل کر نکلتا پانی بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ ہوٹل کا ڈائننگ ہال بہت خوبصورت اور میرے اندازے سے بھی کہیں بڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں بیک وقت ہزار، پندرہ سو لوگ کھانا کھا سکتے تھے۔ ڈائننگ ہال میں ہر طرف سفید قمیص، سیاہ سوٹ اور نک ٹائی لگائے بیرے ہاتھوں میں کھانوں کی ٹرے اٹھائے اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ اُس وقت میرا دل چاہا کہ میڈم سلینا کے ہاتھوں کو چوم کر اُن کا شکریہ ادا کروں۔ انہی کی وجہ سے تو میں پہلی بار اتنے بڑے ہوٹل میں رہنے آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ میں بھی میڈم کے ساتھ یہاں کھانے کے لیے آؤں گا اور یہ باوردی بیرے مجھے بھی کھانے پینے کی چیزیں اسی طرح پیش کریں گے جیسے دوسروں کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ چھٹیوں کے دن بہت پُرلطف تھے۔ میں نے میڈم کے ساتھ اُس پہاڑی قصبے کی پگڈنڈیوں پر سیر کی۔ ہم بازاروں میں گھومے۔ دُکانوں میں گئے اور ہر روز ہوٹل کے موسیقی گروپ کی بجائی جانے والی دلفریب موسیقی سے لطف لیا۔ موسیقی بینڈ ہر دوپہر لنچ اور رات میں ڈنر کے بعد اپنا پروگرام پیش کرتا تھا۔

اسی دوران اتفاق سے میں نے ہوٹل کا بل بھی دیکھ لیا۔ بل دیکھ کر تو میرا سر چکرا گیا۔ میں اتنی رقم خرچ کر کے چھٹیاں گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تو کیا، اچھا بھلا کھاتا پیتا آدمی بھی اس عیاشی کا متحمل نہیں ہوتا جو میں میڈم کے توسط سے کر رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میڈم کو اس فضول خرچی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ انہیں دیکھ کر ایسا بالکل نہیں لگتا تھا کہ ہوٹل میں کرائے اور دیگر اخراجات کی مد میں اتنی بڑی رقم خرچ کرنے پر انہیں رتی بھر بھی ..... افسوس ہو۔ مجھے یقین ہوگیا کہ کسی جنم میں میڈم ضرور سچ مچ آرلیوس کے شاہی خاندان کی شہزادی رہی ہوں گی، ورنہ یوں شاہی چھٹیاں بسر کرنا ہر کسی کے بس کی بات کہاں ہوتی ہے۔ بس جب میڈم پریشان نہیں تو میں کیوں فکر کرتا۔ کون سا میرے پلّے سے کچھ جا رہا تھا، سو بے فکری سے چھٹیوں کے مزے لوٹتا رہا۔ ویسے سچ کہوں تو یہ بات کچھ درست نہیں۔ اکثر مجھے احساس ہوتا کہ ہم نے چھٹیوں پر بے تحاشا فضول خرچی کر دی۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ جہاں میں ہر شے کی فکر کرتا تھا، وہیں ایک ایسی چیز بھی تھی جس کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ البتہ میڈم کے بارے میں جذباتی تھیں اور وہ چیز تھی میٹھے اور شفاف پانی کا قدرتی چشمہ۔ اسی وجہ سے اس پُرفضا قصبے کا نام اسپرنگ پڑا تھا۔

"چشمے کا قدرتی پانی جگر کے لیے بہت مفید ہے۔" چشمے کی پہلی بار سیاحت کے موقع پر میڈم نے مجھ سے فخریہ آمیز لہجے میں کہا۔

چشمہ ہوٹل کے قریب تھا اس لیے جس دن ہم یونین ہوٹل میں رہائش پذیر ہوئے، اسی شام سے میڈم مجھے چشمے پر لے گئی تھیں۔ پہلے دن تو وہ مجھے اچھا لگا مگر پھر میں نے اس طرف سے بے پروائی برتنا شروع کر دی۔

ہر روز میڈم کے دن کی شروعات اس چشمے سے ہوتی تھی۔ ناشتا کرتے ہی وہ مجھے ساتھ لے کر چشمے کی طرف چل دیتیں۔ وہاں پہنچتے ہی دو گلاس تازہ تازہ پانی پی کر، وہیں پر بیٹھ کر چشمے کو پیار بھری نظروں سے تکتی رہتی تھیں۔ ساتھ میں مجھے یہ بھی باور کراتی رہتیں کہ معدنیات سے بھرپور چشمے کا پانی انسانی صحت بالخصوص جگر کو درست رکھنے کے لیے شافی علاج ہے۔

اگرچہ میڈم کے کہنے پر مجھے بھی مجبوراً یہ پانی پینا پڑتا مگر سچ کہوں کہ میری زبان پانی کے جس ذائقے سے آشنا تھی، وہ اس سے کچھ مختلف تھا۔ اُس دن صبح میں نے چشمے پر ایک لڑکی کو دیکھا۔ اُس کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا۔ وہ میری ہم عمر ہوگی مگر میرے مقابلے میں اس کی صحت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ بہت دُبلی پتلی تھی۔ سچ کہوں تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہی تھی۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں باہر کو اُبھری ہوئی تھیں اور رنگ ایسا زرد ہو رہا تھا جیسے جسم میں خون کی بوند بھی نہ ہو۔ البتہ اُس کے گالوں پر عجیب سے سرخ دھبے تھے جیسے کسی نے آگ لگا رکھا ہو۔ ویسے اُس نے بہت دلکش لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چشمے کے پانی سے بھرا گلاس تھا اور وہ اسے ناک کے قریب کیے سونگھ رہی تھی۔ پانی سونگھتے ہوئے اس کی پتلی لمبی ناک پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں جس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے پانی سے بو آرہی تھی۔ اس کی جھریاں پڑی سکڑی ناک بتا رہی تھی کہ اُسے پانی بالکل پسند نہیں آیا، ورنہ وہ سوچ بچار کے بجائے کب کا گلاس غٹاغٹ اپنے حلق میں اُنڈیل چکی ہوتی۔

وہ تقریباً ہر روز چشمے پر آتی تھی۔ ایک دن میں نے ہمت کر کے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ میں نے اسے کچھ کہتے سنا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے آہستہ سے ہیلو کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگا۔ میں اُس کے قریب جانا چاہ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ اس تک پہنچتا، ایک بوڑھا جوڑا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ اسے بازو سے تھام کر ایک طرف لے گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ضرور اس کے سرپرست ہوں گے۔

"یہ اس لڑکی کے انکل آنٹی ہیں۔" میڈم نے مجھے اس کی طرف ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا تھا اس لیے اسے جاتا دیکھ کر کہنے لگیں۔

میڈم ہر وقت مجھ پر نظر رکھتی تھیں کہ کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جاؤں۔ اُن کا خیال تھا کہ میں بہت چھوٹا ہوں اور بہ آسانی کسی کے بھی ورغلانے میں آسکتا ہوں۔

"ویسے میں ان سے مل چکی ہوں۔" میڈم نے اُنگلی سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جدھر وہ لڑکی بوڑھے جوڑے کے ساتھ گئی تھی۔

یہ سن کر میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔

"اچھا... تو آپ انہیں جانتی ہیں؟" میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہاں..." میڈم نے آہستہ سے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ "اس لڑکی کا نام ایڈتھ وین بورڈ ہے اور وہ دونوں اس کے انکل آنٹی ہیں۔" میڈم نے بتانا شروع کیا۔ "بے چاری بچپن سے ہی بیمار ہے۔ اُس کے انکل آنٹی آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اُسے یہاں لائے ہیں۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ چشمے کا پانی قدرتی شفا کی تاثیر رکھتا ہے۔ اسی لیے یہاں روز لاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میڈم نے ایک بار پھر بڑے پیار سے چشمے کو دیکھا۔

میڈم نہایت شاہانہ طریقے سے چھٹیاں گزار رہی تھیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ مجھ جیسا یتیم خانے میں پلنے والا بے سہارا لڑکا کسی بھی لحاظ سے اُن کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا حق دار نہیں تھا۔ اب تک کی ساری زندگی میں نے یتیم خانے میں بسر کی تھی۔ میرے لیے میڈم کے ساتھ شاندار انداز میں چھٹیاں گزارنے کا یہ موقع بہت قیمتی تھا مگر وہ چشمے کا پانی... اُس سے مجھے شدید نفرت تھی۔ مجھے اس کا ذائقہ بہت برا لگتا تھا مگر میڈم ہر صبح مجھے مجبور کرتیں کہ اس کے کئی گلاس بھر کر ویسے ہی غٹاغٹ چڑھالوں جیسا کہ وہ خود کرتی تھیں۔ بس! وہی ایسا وقت ہوتا تھا جب مجھے یہ چھٹیاں زہر لگنے لگتی تھیں مگر بعد میں سوچتا تو اعتراف کرتا کہ جو عیاشی کر رہا تھا، اُس کے لیے چند گلاس پانی پینے کی شکل میں قیمت ادا کرنا کوئی مہنگا سودا نہ تھا۔

اسپرنگ کے پُرفضا قصبے میں میڈم کے کئی شناسا تھے۔ وہ یہاں بھی لوگوں کو قسمت کا حال بتاتی تھیں، اُن کے ہاتھ دیکھتی تھیں اور صحت کے مفید ٹوٹکے آزمانے کا مشورہ دیتی تھیں۔ فلاحی ادارے کی چھتری تلے یتیم خانہ چلانے کے بعد یہ ان کا سائڈ بزنس تھا اور چھٹیوں میں بھی سائڈ بزنس زور و شور سے جاری تھا۔

وہ برسوں سے یہاں آرہی تھیں۔ لوگ انہیں اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ہوٹل میں بھی اکثر لوگ قسمت کا حال جاننے کے لیے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ جن میں سے مال دار لوگوں کو وہ اپنے یتیم خانے کے بارے میں چندہ دینے کی نیکی پر بھی ابھارتی تھیں۔ جو ایسا کرتا، میڈم اس کی اچھی خاصی آؤ بھگت کرتیں ورنہ فیس کھری کر کے باہر کا راستہ دکھا دیتی تھیں۔ میڈم کے عقیدت مندوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اکثر مجھے آنے والوں کو یہ کہہ کر ٹالنا پڑتا کہ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں یا وہ آرام کر رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب میں یہ کہہ رہا ہوتا تھا، تب وہ اندر بیٹھی کسی کی قسمت کا حال بتا رہی ہوتی تھیں۔

اُس رات ہم میڈم کے پرانے دوست جارج کے ریستوران میں مدعو تھے۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت میڈم نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اُس وقت میڈم نے کہا تھا کہ ہم اسپرنگ پہنچنے کے فوراً بعد لنچ وہیں کریں گے مگر کئی روز بعد اُس ریستوران میں کھانے کا موقع ملا تھا۔

جارج بھی میڈم کا پرستار تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ہلڈا نے جس طرح ہمیں خوش آمدید کہا، اس سے یہ سمجھنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ دل کی کتنی گہرائیوں سے میڈم سلینا کا احترام کرتے ہیں۔ ہمیں ہوٹل سے لینے کے لیے جارج اپنی بیوی کے ہمراہ کار میں آیا تھا۔ اس کا ریستوران قصبے سے کافی دور، چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے ساتھ واقع تھا۔

آدھ گھنٹے کا وہ سفر بہت دلچسپ تھا۔ میڈم کی وجہ سے اُن میاں بیوی نے میری بھی خوب دل جوئی کی۔ راستے میں ایک اسٹور پر رک کر جارج میرے لیے چاکلیٹ کا بڑا پیکٹ بھی لے کر آیا۔ یہ میرے لیے نہایت خوشی کا موقع تھا ورنہ یتیم خانے میں پلنے اور نوکر کی طرح میڈم کے فارم پر کام کرنے والے لڑکے کی اس طرح عزت کون کرتا ہے۔

"کہاں سے شروع کروں؟" میں نے آہستہ سے خود کلامی کی۔ میرے سامنے میز پر رکھی بڑی پلیٹ میں خاصا صحت مند سالم کیکڑا بھنا ہوا رکھا تھا۔ سچ پوچھیں تو یہاں آنے کے لیے میری خوشی کا ایک بڑا سبب مزے مزے کے کھانے کھانا تھا۔ میز پر ٹماٹر کا سوپ، ڈبل روٹی کے چند سلائس،

کیچپ اور دیگر چیزیں سجی تھیں اور پوری میز صرف میرے لیے مخصوص تھی۔ میں نے گلے میں نیپکن اڑستے ہوئے کن انکھیوں سے دوسری طرف دیکھا۔ میڈم میز پر مخصوص چھوٹا سا بورڈ سجائے اس پر پانسہ پھینک رہی تھیں۔ جارج اور اس کی بیوی مشتاق نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر نظریں اپنی میز پر رکھے بھنے ہوئے کیکڑے کی طرف گھمائیں۔ اس سے بڑی اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ میں چھری کانٹا سنبھالے، دشمن پر کاری وار کرنے والے سپاہی کی طرح کیکڑے کو دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے اس کے کس حصے کو کاٹ کر کھاؤں۔ تب مجھے یاد آیا کہ ایک بار میڈم نے کہا تھا کہ کیکڑے کا سب سے لذیذ حصہ اس کے درمیان کا ہوتا ہے۔ سو میں نے چھری کا بھرپور وار کیا اور اس کے بعد کافی دیر چھری کانٹے چلتے رہے اور میرا خالی پیٹ بھرتا چلا گیا۔

”واقعی... یہ تو بہت شاندار تھا۔“ نیپکن سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے میں نے پلیٹ کو دیکھ کر خود کلامی کی جہاں کیکڑے کی صرف باقیات موجود تھیں۔

میں کھانے میں اتنا محو تھا کہ کسی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ کون آیا... کون گیا؟ مجھے کچھ علم نہ تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد میں نے نظر گھما کر دیکھا تو جارج اور اس کی بیوی کے بجائے ایڈتھ، اپنے انکل آنٹی کے ساتھ میڈم کی میز پر بیٹھی تھی۔ ایڈتھ کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اسی دوران ایڈتھ کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں مسکرایا۔ جواب میں وہ بھی شرماتے ہوئے آہستہ سے مسکرادی۔ اس کا یوں میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانا اچھا لگا تھا۔

اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ شاید وہ اس لیے میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی کہ میں میڈم کے ساتھ ہوں۔ شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ میرا گھر تو یتیم خانہ ہے۔ اگر یہ اس کے علم میں ہوتا تو... یہ خیال آتے ہی میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں نے سارے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میڈم کی طرف متوجہ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایڈتھ کو اپنے اتنے قریب دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوری توجہ اس پر مرکوز کردی۔ نہ جانے کیوں آج .... مجھے اس کے چہرے کی زردی بھی کم محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہا تھا۔ ناک کی وہ ناگوار جھریاں بھی غائب تھیں جو چشمے کا پانی دیکھ کر پڑتی تھیں۔ ویسے دن کی روشنی میں تو اس کے سر کے لمبے گھنے بال بہت موٹے اور روکھے دکھائی دیتے تھے مگر نہ جانے کیوں اس وقت وہ مجھے ریشمی دکھائی دے رہے تھے۔ شاید مزیدار کھانے سے پیٹ ہی نہیں بھرا تھا عقل پہ بھی غنودگی طاری ہوگئی تھی۔

اسی دوران میں وہ اپنے انکل اور آنٹی کے ساتھ دوسری میز کے گرد رکھی کرسیوں پر بیٹھ چکی تھی۔ ذرا ہی دیر میں ویٹر اُن کی میز پر کچن سے بھاپ اڑاتے نکلنے والے گرما گرم کھانے چُن رہا تھا۔ میں نے غور سے ایڈتھ کو دیکھا۔ گرما گرم ذائقے دار کھانے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ یہ دیکھ کر میں بھی خوش ہوا کہ چلو چشمے کے عجیب سے ذائقے والا پانی پی کر صحت بنانے کے بجائے وہ مزیدار کھانوں کی طرف پلٹی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اچھا کھانا کھانے سے بھی انسان کی بیماریاں اور جسمانی کمزوری دور ہوتی ہے۔ ویسے ایڈتھ کی جسمانی حالت دیکھتے ہوئے میں پہلے ہی یہ سوچ رہا تھا کہ اسے چشمے کے معدنی پانی کی نہیں، تین وقت ڈٹ کر کھانے کی ضرورت ہے۔

بغور جائزہ لینے پر محسوس ہوا کہ اس کے انکل آنٹی کے ہاتھ میں پانی کی ایک بوتل تھی اور ایڈتھ جس بوتل سے گلاس میں پانی اُنڈیل رہی تھی، وہ بھی ریستوران کی باقی بوتلوں سے مختلف تھی۔ مجھے یقین آگیا کہ وہ لوگ پانی کی بوتلیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہو نہ ہو، اُن بوتلوں میں اُسی چشمے کا پانی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ پانی پیتے وقت اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو چکے تھے البتہ انکل آنٹی اسے بڑی پیار بھری نظروں سے پانی پیتا دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ انہی کے مجبور کرنے پر ایسا کر رہی ہے مگر افسوس کہ چاہنے کے باوجود میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود چشمے کے پانی سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس لیے اُس وقت ایڈتھ کے جذبات اور اس کے اندرونی کرب کو بہت اچھی طرح محسوس کر رہا تھا مگر افسوس...

کچھ ہی دیر بعد اُن کا کھانا ختم ہوا اور میٹھے کی باری آئی۔ میری میز پر بھی لذیذ فیرنی اور پائن ایپل کیک پہنچا۔ میں نے ایڈتھ کی میز کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ ویٹر وہاں بھی میٹھے کی ڈش رکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں غیر متوقع بات ہوئی۔

ایڈتھ غصے سے کھڑی ہوئی اور جھٹکے سے پانی کی بوتل پر آڑا ہاتھ مارا اور گلاس اٹھا کر دور پھینکا۔ گلاس اور بوتل میری کرسی کے قریب آکر گرے۔ اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا اور انکل آنٹی ہکا بکا اُس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ میں بنا کچھ سوچے سمجھے برق رفتاری سے اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف دوڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ میں نے اس کا بازو تھام کر پیار سے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا؟“ میری نظریں بدستور اس پر گڑی تھیں۔ وہ کانپ رہی تھی۔ غصے کے مارے اس کا چہرہ تنا ہوا اور جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ غصے سے دانت کچکچا رہی تھی۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب دیا نہ ہی انکل آنٹی کچھ بولے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُن دونوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

میں نے پہلے میز اور پھر اس کے لباس کو دیکھا۔ کپڑے سے بنا میز پوش گیلا ہو رہا تھا۔ گلاس اور بوتل گرنے کے باعث اچھا خاصا پانی اس پر بھی گرا تھا۔ اس کا بلاؤز اور اسکرٹ جگہ جگہ سے بھیگ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے رومال نکالا اور اس کے بھیگے کپڑوں کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر اسی دوران انکل آنٹی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھے۔ انکل نے بٹوا نکال کر کچھ نوٹ نکالے... پلیٹ کے نیچے دبائے اور پھر وہ دونوں ایڈتھ کے بازو کو سختی سے تھام کر اسے کھینچتے ہوئے ریستوران سے نکل گئے۔

اس وقت میرے ہاتھ میں اپنا سفید رومال تھا۔ سامنے میز پر ایڈتھ کا گلابی اور پانی سے تر رومال پڑا ہوا تھا جس پر بڑا سا گلاب پرنٹ تھا..... اسی دوران میڈم سلینا میرے سر پر پہنچ گئیں۔ اس وقت میرے ہاتھ میں اپنا اور ایڈتھ کا وہ گلابی رومال تھا جسے اسی لمحے میں نے میز پر سے اٹھایا تھا جب میڈم میرے سر پر پہنچی تھیں۔ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑا اور کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا۔ پھر میرے ہاتھ سے دونوں رومال جھپٹے اور بڑے غصے سے انہیں اپنے دستی بیگ میں اڑسا۔ پھر انہوں نے میرا بازو پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے ریستوران سے باہر لائیں۔ ان کے پیچھے پیچھے جارج بھی پہنچ گیا۔ دو منٹ بعد ہم ریستوران سے واپس ہوٹل جا رہے تھے۔

جارج گاڑی چلا رہا تھا۔ ہم دونوں پیچھے بیٹھے تھے۔ جاتے ہوئے میں جتنا خوش تھا، واپسی پر اتنا ہی اداس... جس کی ایک ہی وجہ تھی... ایڈتھ۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے سفر میں پورے راستے ہم تینوں خاموش رہے۔ میں نے جان بوجھ کر میڈم کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ میں جانتا تھا کہ ریستوران میں جو کچھ ہوا، میڈم کے لیے وہ بہت معیوب بات ہوگی۔ میں خود بھی ذرا سا شرمندہ تھا تاہم جو کچھ ہوا، وہ بہت جلدی میں ہوا تھا۔ اب مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میرے اندر کیسے اتنی ہمت آگئی تھی کہ لپک کر اس کی طرف دوڑا، اسے بازو سے تھاما، اس کے بھیگے کپڑے خشک کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کس اندرونی جذبے کے تحت میں نے بے ساختہ میز پر سے اس کا رومال اٹھایا تھا۔ اس وقت مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش میڈم میرے ہاتھ سے اُس کا گلابی رومال نہ چھینتیں۔ کاش... وہ میرے پاس ہی رہتا۔

ہمارا معمول تھا کہ ناشتے کے بعد چشمے کا چکر ضرور لگاتے تھے مگر ریستوران والے واقعے کی اگلی صبح ناشتے کے بعد میڈم نے مجھے ساتھ لیا اور سیدھے کیمسٹ کی دکان پر پہنچیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ چشمے پر جانے کے بجائے یہاں کیوں آئی تھیں۔

میں دکان سے چند قدم دور ہی رک گیا تھا۔ انہوں نے کیمسٹ سے کچھ بات کی، پھر بیگ سے کاغذ میں لپٹی کچھ شے اسے نکال کر دی جسے لے کر وہ دکان کے اندر چلا گیا۔ کئی منٹ بعد وہ لوٹا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد کیمسٹ نے خاکی کاغذ کے ایک تھیلے میں کچھ رکھ کر انہیں تھما دیا جسے انہوں نے فوراً اپنے بڑے سے دستی بیگ میں رکھ لیا۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ انہوں نے کیا خریدا تھا۔

کیمسٹ کی دکان سے وہ سیدھی ہوٹل آگئیں۔ میں اب بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہونے سے لے کر کمرے میں پہنچنے تک، میں سارے راستے اِدھر اُدھر دیکھتا آیا مگر نہ مجھے ایڈتھ نظر آئی اور نہ ہی اس کے انکل آنٹی۔ کمرے میں پہنچ کر میڈم نے ہوٹل اسٹیشنری میں شامل نیک خواہشات پر مبنی ایک کارڈ اٹھایا۔ اس پر کچھ لکھا اور میری طرف بڑھایا۔

”اسے ایڈتھ کے انکل آنٹی تک پہنچادو، اُن کے کمرے میں جاکر۔“

یہ سنتے ہی میرا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا مگر میں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ نظریں نیچی کیے میں نے میڈم کے ہاتھ سے کارڈ لیا۔ ”ابھی دے کر آتا ہوں۔“ میں نے کارڈ تھاما اور اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ ”ایڈتھ کی صحت کے لیے نیک خواہشات۔“ نیچے میڈم کے دستخط تھے۔

”کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔“ میں باہر جانے کے لیے پلٹا تو انہوں نے نصیحت کی۔ ”ویسے بھی کل رات والی بات ابھی پرانی نہیں ہوئی ہے۔“

”جی بہتر...“ میں نے شرمندہ لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ”سیکنڈ فلور، روم نمبر 212۔“ انہوں نے پیچھے سے پکارا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر نکلا اور تیز تیز چلتا ہوا کوریڈور سے اس طرف بڑھا جہاں سے سیڑھیاں دوسرے فلور پر جا رہی تھیں۔ ویسے بھی میرے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ صبح سے وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ میں پریشان تھا کہ رات والے واقعے کے بعد نہ جانے اُس پر کیا گزری ہوگی۔ جس طرح غصے میں انکل آنٹی اسے لے کر ریستوران سے نکلے تھے، اس سے تو لگتا تھا کہ بے چاری کی شامت آئی ہوگی۔

میں ان کے کمرے پر پہنچا۔ پہلے ایک بیل دی مگر کافی دیر کے انتظار کے بعد بھی جواب نہ ملا۔ مزید دو بار بیل بجائی مگر پھر بھی خاموشی رہی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد یہ سوچ کر ہاتھ سے دستک دی کہ ممکن ہے بیل خراب ہو یا انہوں نے بند کر رکھی ہو مگر پھر بھی دروازہ نہ کھلا۔

میں واپس اپنے کمرے میں جانے کے لیے فرسٹ فلور پر پہنچا تو کوریڈور میں ہی ریستوران والا میڈم کا دوست جارج نظر آ گیا۔ وہ میڈم سے ہی ملنے آیا تھے۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ ”خیریت تو ہے؟“ جب تک میں نے اُن کے قریب پہنچ کر پوچھا، تب تک ہم کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔

جارج نے میری طرف دیکھا مگر کچھ کہنے کے بجائے دروازے پر دستک دی۔ ”اندر آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔“ میڈم کی آواز آئی۔

جارج کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ بڑے سے لیمپ کے برابر رکھی براؤن چمڑے کے کشن والی کرسی پر میڈم بیٹھی تھیں۔ ”خیریت ہے؟“ لمحہ بھر میں انہوں نے جارج کے تاثرات بھانپ لیے اور بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”آؤ، یہاں بیٹھو۔“ انہوں نے کھلی کھڑکی کے ساتھ، اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شکریہ...“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”بڑی پریشانی میں ہوں، اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

یہ سن کر میں نے سوچا کہ شاید اسے بھی میڈم کی طرح گھما پھرا کر کہنے کے بجائے براہِ راست بات کرنا زیادہ پسند ہے۔

”ہوا کیا؟“ میڈم نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”مسٹر ڈین بورڈ نے مجھے بدنام کرنا شروع کر دیا ہے۔ پورے قصبے میں میرے خلاف باتیں ہو رہی ہیں۔“

”کیا...؟“ میڈم نے قطع کلامی کی۔ ”مگر کیوں... کس لیے؟“

”اس نے الزام لگایا ہے کہ میں نے سڑا ہوا کیکڑا پکا کر انہیں پیش کیا جس کے کھانے سے ان کی بھتیجی کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔“

”اوہ...“

”ان کا الزام ہے کہ کیکڑا زہر آلود تھا۔“ جارج نے بات مکمل کی۔

”کیکڑے تو ہم نے بھی کھائے تھے۔“ انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے کہ وہ بالکل عمدہ حالت میں تھے۔ انہیں پکایا بھی اچھی طرح تھا۔“

”بالکل ٹھیک کہا۔“ جارج نے تیزی سے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں مگر کل رات جو واقعہ پیش آیا، اس کے بعد مسٹر ڈین بورڈ نے پورے قصبے میں یہ افواہ پھیلا دی ہے۔“

”تم نے یہ افواہ کہاں کہاں سنی؟“ میڈم نے سوال کیا۔

”صبح چشمے پر گیا تو وہاں بھی یہ بات سننے کو ملی تھی۔“

”اُس کے علاوہ...؟“

”ہوٹل پہنچا تو لابی میں چیف شیف مل گیا، گیسٹ منیجر بھی یہی بات مجھ سے پوچھ رہا تھا۔“ جارج نے پریشان لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ ”یہ افواہ تو میرا کاروبار تباہ کر دے گی۔“ اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”میرے ریستوران کی ایک ساکھ ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ نام بنایا ہے مگر یہ افواہ...“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا۔ ”ریستوران میری عمر بھر کی کمائی ہے مگر مسٹر ڈین بورڈ کی یہ افواہ میرا ریستوران ہی نہیں، میرے خاندان کی زندگیاں بھی تباہ کر ڈالے گی۔“ بات مکمل کر کے اس نے گہری سانس لی اور چھت کی طرف دیکھا۔

”احمقانہ کوشش...“ میڈم نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بہت ہی احمقانہ اور خطرناک حرکت ہے۔“ میڈم کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور لہجے سے افسوس عیاں تھا۔

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے؟“ جارج نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”بتاؤ...“ میڈم نے اپنائیت سے کہا۔ ”میں تمہارے لیے ایسا کیا کر سکتی ہوں کہ جس سے تمہارے ریستوران کی ساکھ بچ جائے؟“

”یہ دنیا روحوں سے بھری ہوئی ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی غیبی طاقت سے کسی روح کو بلاؤ جو مجھے تباہ ہونے سے بچا سکے اور لوگوں کو سچ بتا سکے ورنہ...

ورنہ تو یہ افواہ میری زندگی برباد کر دے گی۔“

یہ سن کر میڈم اپنی کرسی سے اٹھیں اور آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر تائید میں سر ہلایا اور پھر واپس اپنی کرسی کی طرف پلٹ گئیں۔

”تم کسی ایسی روح کو میری مدد کے لیے بلا سکتی ہو جو سب کے سامنے حقیقت بیان کر دے؟“ جارج نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اچھا منصوبہ ہے۔“ میڈم نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”مگر فی الحال میں تمہاری اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔“ یہ کہنے کے بعد میڈم کچھ دیر تک جارج کو غور سے دیکھتی رہیں اور پھر کہنا شروع کیا۔ ”ہم دونوں حقیقت جانتے ہیں مگر اسے ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی روحانی قوت تمہاری مدد کر پائے گی۔“

یہ سن کر بوڑھے جارج نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر سخت پریشانی جھلک رہی تھی۔

”میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، میڈم نے کہنا شروع کیا۔ ”میں کچھ دیر بعد تمہیں ایک پیغام بھیجوں گی اور اگر تم وہ پیغام سمجھ گئے تو اُس کے بعد...“

”اُس کے بعد کیا؟“ جارج نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کہیں، آج رات... جہاں پر تمام افواہیں زندہ ہیں اور پھیل رہی ہیں۔“ اس نے مبہم انداز میں کہا۔ ”کہیں ان کا خاتمہ ہو جائے گا؟“

میڈم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اُس کے بعد روز سیلون، ہمیں وہاں ہر حال میں پہنچنا ہوگا۔ وہاں اُس وقت بڑی تعداد میں لوگ ہوں گے۔“

”جو تم کہہ رہی ہو، وہی ٹھیک ہوگا۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”اب تمہیں چلنا چاہیے۔“ میڈم نے کہا۔ ”جاؤ اور جا کر میرے پیغام کا انتظار کرو۔“

جارج کے جانے کے بعد میڈم کچھ سوچتی رہیں اور پھر انہوں نے آہستگی سے تالی بجا کر مجھے بلایا۔ رائٹنگ پیڈ اور قلم منگوا کر کچھ لکھا اور وہ کاغذ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹیلی گراف آفس جا کر یہ ٹیلی گرام بھیج دو۔“

میں ٹیلی گراف آفس پہنچا تو وہاں خاصا رش تھا۔ میں بھی لائن میں لگ گیا۔ آخر آدھ گھنٹے بعد میری باری آ گئی۔ میں نے کاؤنٹر کلرک کو پیغام دیا اور پیسے ادا کر کے رسید لی۔ جب ہوٹل پہنچا تو اُن کا کمرا خالی تھا۔ میڈم کہیں جا چکی تھیں۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ بھی کھلا چھوڑ گئی تھیں۔ سامنے کارنس پر ایک چٹ لگی تھی۔ ”پیارے لڑکے! میں کہیں جا رہی ہوں، فی الحال کچھ کام نمٹانا ہے۔“ میں سمجھ گیا کہ ضرور یہ کام جارج کی پریشانی سے متعلق ہی ہوگا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کافی دیر بعد یہ دیکھنے کے لیے نکلا کہ وہ لوٹیں یا نہیں۔ جیسے ہی باہر نکلا، وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتی نظر آ گئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ کارنس کے ساتھ کھڑی، اپنے سرخ رنگ کے بڑے سے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکال رہی تھیں۔ اُن کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک لفافہ دبا ہوا تھا۔ زرد رنگ کے اس لفافے کو میں پہچان گیا۔ یہ ٹیلی گراف آفس کا وہ مخصوص لفافہ تھا جس میں وہ آنے والے پیغام کو رکھ کر بھجواتے ہیں۔ کچھ دیر تک وہ لفافہ ہاتھ میں لیے سوچتی رہیں اور پھر بنا کچھ کہے اسے واپس پرس میں رکھ دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

”آج رات نو بجے ہمیں روز سیلون پہنچنا ہوگا۔“ میڈم نے کافی دیر بعد مجھ پر توجہ دیتے ہوئے بتایا۔ ”جارج کو پیغام بھیج دیا ہے۔ وہ، اس کی بیوی اور دوسرے لوگ بھی ساتھ ہوں گے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئیں اور پھر کہنے لگیں۔ ”ان سب لوگوں کو روز سیلون تک لے جانے کے لیے تمہیں کرائے کی کسی کار کا بندوبست کرنا ہوگا۔ آج رات حقیقت میں آرلیوس کی روح کا شو ہوگا۔“

”کیا...؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”مگر وہ عظیم رومن بادشاہ تو کب کا مر چکا۔ یہ ہزاروں برس پرانی بات ہے، وہ روز سیلون میں کیسے...“ اگرچہ میں بھی اس رومی بادشاہ کی شجاعت بھری داستانوں کو پسند کرتا تھا، اس کا اصلی مجسمہ بھی میوزیم میں دیکھ چکا تھا مگر میڈم کی بات سن کر میں بہت حیران تھا۔

”روح کبھی نہیں مرتی، یہ امر ہے۔“ میڈم نے پُراسرار انداز میں کہا۔

اگرچہ میں جانتا تھا کہ میڈم پراسرار علوم اور روحانی طاقتوں کی عامل ہیں مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عظیم رومن بادشاہ کی روح کو بھی بلا سکتی ہیں۔ اگرچہ کسی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ آرلیوس مجھے پسند ہے مگر پھر بھی اس کے بارے میں ہمیشہ سے میری متضاد رائے رہی ہے۔ کبھی میں اس کو سچا،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحم دل، بہادر اور ایمان دار بادشاہ سمجھتا تھا اور کبھی کبھار اس کے قصے پڑھ کر جھوٹا، مکار، فریبی، بے رحم اور ظالم بادشاہ گردانتا تھا۔

''ایک زندگی داؤ پر لگی ہے۔'' میڈم نے کہنا شروع کیا۔ ''اب اسے بچانے کے لیے اس کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''اب آرلیوس کی روح سے مدد لینے کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔''

یہ سن کر مجھے لگا کہ کہیں میڈم نے آرلیوس سے متعلق میرے خیالات کو تو نہیں بھانپ لیا، ورنہ وضاحت کرنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ''اب مجھے کیا کرنا ہے؟'' کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولیں تو میں نے خود پوچھ لیا۔

''تم جاؤ اور باہر جاکر کسی کار کا بندوبست کرو اور اسے سمجھادو کہ رات ٹھیک نو بجے ہمیں کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچانا ہوگا۔''

''کار کا انتظام تو ہوٹل اسٹاف کو کہہ کر بھی کیا جاسکتا ہے۔''

''نہیں۔'' میڈم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے۔ ''یہ انتظام تم کرو گے۔ کار ہوٹل والوں کی نہیں ہونی چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا، ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے سر ہلا کر تابع داری سے کہا۔

میں ہوٹل سے نکل کر سیدھا بازار گیا اور پھر ایک بوڑھے سے معاملات طے ہوگئے۔ وہ سیاحوں کو کرائے پر کاریں فراہم کرنے والی کمپنی چلا رہا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ یونین ہوٹل سے روز سیلون تک کا راستہ پندرہ منٹ سے بھی کم ہے۔ اگر ہم ٹھیک پونے نو بجے ہوٹل سے چلے تو بڑے آرام سے نو بجنے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ کار ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل کے باہر پہنچ جائے گی۔ میں نے میڈم کی ہدایت کے مطابق اس سے کہا کہ جو بھی سواری آئے، اس کے ڈرائیور سے کہہ دینا کہ وہ ہوٹل کے باہر مرکزی گیٹ سے ذرا ہٹ کر ہمارا انتظار کرے۔ اس کام سے فارغ ہوکر میں ہوٹل پہنچا تو میڈم نچ پر جانے کے لیے منتظر تھیں۔

رات کے پونے نو بجنے والے تھے۔ میں میڈم کے ساتھ نیچے لابی میں پہنچا۔ جارج، اس کی بیوی ہلڈا اور دو دیگر مہمان ہمارے منتظر تھے۔ میڈم ان پر نظر ڈالے بنا آگے بڑھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی باہر آگئے۔ کچھ دیر بعد ہم کار میں بیٹھے روز سیلون کی طرف جارہے تھے۔

جب ہم روز سیلون پہنچے تو ٹھیک نو بج رہے تھے۔ باہر سے ہی نظر آرہا تھا کہ اندر خاصی گہما گہمی ہے۔ اندر داخل ہوئے تو میں سخت حیران ہوا۔ میڈم کے روحانی شو کی اطلاع کے بعد پورا ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی بار میں دیکھ رہا تھا کہ میڈم کو کتنے لوگ جانتے اور ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو لوگ تیزی سے میڈم کی طرف بڑھے۔ وہ بڑے شاہانہ انداز سے اُن سے علیک سلیک کررہی تھیں۔ وہ لوگ میڈم کو اپنے جھرمٹ میں ساتھ لیے ایک کمرے کی طرف بڑھے۔ جارج، اس کی بیوی اور مجھے میڈم نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ ہم ہال میں سب سے آگے بیٹھیں گے۔ ہم لوگوں کے لیے وہاں جگہ مخصوص ہے۔ مجھے بڑی حیرت تھی کہ میڈم کے ساتھ جو دو اور مہمان پہنچے تھے، وہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ گاڑی سے اترتے وقت جب ہم اندر داخل ہوئے تھے، تب بھی وہ روز سیلون ہوٹل کے داخلی دروازے پر ہی مشکوک انداز میں ٹھہر گئے تھے۔ یہ بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ لاکھ سوچنے پر بھی یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

ہال کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ بے تابی سے سامنے اسٹیج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ہوٹل کا ڈانس فلور تھا مگر میڈم کے شو کے لیے اسے اسٹیج بنادیا گیا تھا۔ میں اگلی صف میں، عین اسٹیج کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اسٹیج کے عقبی دروازے سے میڈم اسٹیج پر آئیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کا شاندار استقبال کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح شاہانہ تمکنت سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے چھوٹی سی گول میز رکھی تھی جس پر دھرے شمع دان میں بڑی سی موم بتی روشن تھی۔ کچھ دیر بعد جب خیر مقدمی تالیاں تھمیں اور ہال میں بیٹھے لوگ بالکل خاموش ہوکر میڈم کے بولنے کے منتظر ہوئے تو انہوں نے نہایت شان سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ان کی نظریں گھومتی گھومتی مجھ پر آکر رک گئیں۔ انہوں نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میں سمجھ گیا۔ یہ میڈم کا مخصوص اشارہ تھا۔ جب کافی لوگ ہوتے تو وہ میرا نام لینے کے بجائے اسی اشارے سے بلاتی تھیں۔ میں نے بھی سر ہلا کر جواب دیا اور اٹھ کر اسٹیج کی طرف بڑھا اور ان کے قریب پہنچ کر جھکا۔

''تم دروازے پر جاکر کھڑے ہوجاؤ اور جو دو آدمی ہمارے ساتھ آئے ہیں، جب وہ تمہیں لے کر ایڈتھ کے کمرے میں جائیں تو ساتھ ساتھ رہنا اور ایڈتھ کو تلاش کرنا۔'' میڈم نے سرگوشی میں ہدایت دی۔ ''کمرا نمبر تو تمہیں

یاد ہے نا؟'' انہوں نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اسٹیج سے اتر آیا۔ اس وقت ہال میں موجود لوگوں کی نظریں یا تو مجھ پر تھیں یا پھر میڈم پر۔ مجھے بہت خوشی ہورہی تھی کہ وہ لوگ جو میڈم کے پرستار تھے، مجھے اُن کے اتنا قریب پاکر یقیناً رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے۔

میں اسٹیج سے اتر ہی رہا تھا کہ ہال کی روشنیاں بند کردی گئیں۔ اب دو چار ہلکی پیلی روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ ہال نیم تاریک تھا۔ صرف اسٹیج پر روشنی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میڈم ایک بار پھر پوری توجہ موم بتی پر مرکوز کیے بیٹھی تھیں۔ یہ میڈم کا خاص انداز تھا۔ جب بھی وہ ہپناٹزم یا کوئی اور عمل کرتی تھیں، اُن کا یہی انداز ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں سامنے دھری موم بتی کو دیکھ رہی تھیں۔

میڈم خاموش تھیں۔ عورتوں کی سرگوشیوں سے ہونے والی بھن بھن اور مردوں کے جوتوں کے فرش پر کھٹکھٹانے کی آواز کے سوا، ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ یہ دونوں آوازیں ہال میں موجود لوگوں کی بے چینی ظاہر کررہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد میڈم کا روحانی شو شروع ہونے کے منتظر تھے۔ میں انہی آوازوں اور لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ہال کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میڈم کی بھرائی ہوئی بھاری آواز گونجی۔ ایسا لگا جیسے میڈم نیند میں بول رہی ہیں۔

''ہمارے ساتھ کوئی ایسا ہے جو کچھ جاننا چاہتا ہے۔''

میں لمحہ بھر کے لیے رک گیا اور پلٹ کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔

جواب میں بالکل خاموشی رہی۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہمارے ساتھ کوئی ہے جو کچھ جاننا چاہتا ہے۔'' ایک بار پھر میڈم کی نیند بھری آواز ہال میں گونجی۔ ''عظیم آرلیوس بادشاہ کی عظیم روح تمہارے سامنے موجود ہے۔ جو پوچھنا چاہتے ہو، جو جاننا چاہتے ہو، جان لو۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے تمہاری دنیا کے لیے۔''

اس وقت میں دل ہی دل میں ہنسا کہ ہزاروں برس پہلے عالمِ بالا روانہ ہونے والے آرلیوس کی روح بھی کیا وہاں اتنی تھک گئی کہ میری طرح اُسے بھی میڈم کے ساتھ تفریحی چھٹیوں کی ضرورت پڑی جو اسپرنگ کے پہاڑی قصبے میں چلا آیا۔

ہال میں بدستور خاموشی تھی۔ میں نے بمشکل ہنسی روک

چھٹیوں کا تحفہ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

نومبر 2012ء کا شمارہ...... موسم سرما کی خوشگوار نوید کے ساتھ

ممنوعہ

کمزور رشتوں کی ڈھول میں ممنوعہ حدوں کو پار کرنے والوں کے درمیان پھیلی ایک فکرانگیز داستان...... محی الدین نواب کے قلم سے آخری صفحات کی سوغات

فاتح

جب نحوست کے باوجود صلاح الدین ایوبی صلیبی جنگوں کا ہیرو بنا تو بالآخر اس کے باپ کو توہم پرستی کے نظریے کے خلاف سوچنا پڑا... ڈاکٹر ساجد امجد کی عرق ریزی

کشکول

لحہ بہ لحہ دلوں کی دھڑکن تیز کرتی ایک سنسنی خیز داستان...... انوار صدیقی کا سحرانگیز بیان

مسافر

کبھی قربتوں میں تشنگی، کبھی طویل مسافتوں کی تکان...... عجیب رتوں، بے ثمر رتجگوں کا دلگداز احوال...... ناصر ملک کے قلم کی روانی

انوکھا ملاپ

انسان کی ترجیحات، ضرورتوں اور خواہشوں کے درمیان پلنے والے فرق کو نمایاں کرتی ایک پرفکر تحریر...... طاہر جاوید مغل کا دلربا انداز

اس کے علاوہ

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی روداد حیات مرزا امجد بیگ کی جوہر شناسی محفل شعروسخن اور آپ کے خط

مزید

کاشف زبیر، ناہید سلطانہ اختر، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی تنویر ریاض اور ثمر عباس کی پرکشش کہانیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر اسٹیج پر دیکھا۔ میڈم بڑے ہی روحانی انداز میں روشن موم بتی پر توجہ مرکوز کیے بیٹھی تھیں۔ اچانک ہال میں پاٹ دار آواز گونجی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔

''میں ہوں جارج لیولون...'' وہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ ''سوہاک کے عظیم راجا سوچم کے پڑپوتے کا لکڑپوتا۔'' وہ بہت ہی بلند آواز میں عظیم آرلیوس کی روح سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ ''مجھے اپنے ریستوران میں آنے والے ایک مہمان کو زہر آلود خوراک کھلانے کے الزام میں خواہ مخواہ ملوث کیا جارہا ہے۔ مجھ پر الزام لگایا جارہا ہے کہ میں نے ایڈتھ وین بورڈ کو زہریلا کیکڑا کھلایا۔ یہ میرے ریستوران کی سب سے پسند کی جانے والی ڈش ہے۔ کل کئی مہمانوں نے یہ ڈش کھائی تھی مگر کسی نے کچھ نہیں کہا، ماسوائے ایک گاہک کے جو مسز وین بورڈ ہیں۔''

''جو اُس لڑکی کے قریب ہیں، وہ چشمے کے صحت بخش پانی کی آڑ میں اسے زہر آلود پانی پلا کر، اس کی موت کا سبب بننے والے ہیں۔'' ہال میں میڈم، معاف کیجیے... میڈم کی غنودہ آواز میں عظیم آرلیوس کی روح نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی ہال میں موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ عظیم آرلیوس کی شاہی روح نے یہ اعلان کر کے سب کو ڈرا دیا ہے۔

''اے! راجا سوچم کی اولادوں کی اولاد... زہر تیرے ریستوران کے کیکڑے میں نہیں، پانی کی اُس بوتل میں ہے جنہیں وہ اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں اور اس بے چاری، موت کے قریب ہوتی لڑکی کو وہ پانی پلا کر موت کے اور نزدیک کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر عظیم آرلیوس کی روح کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔

وہاں پر سناٹا طاری تھا۔ جارج بدستور کھڑا تھا۔

''موت کیکڑے میں نہیں تھی۔'' ایک بار پھر عظیم رومن بادشاہ آرلیوس نے میڈم کی زبان سے بولنا شروع کیا۔ ''موت اس سبز رنگ کے جار میں ہے جو اس لڑکی کے گھر کی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہے... بے چاری بچی کی ممکنہ بے وقت موت۔'' آواز میں بھرّاہٹ صاف محسوس ہورہی تھی۔

اسی دوران دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور چلاّتے ہوئے ہال کے سارے بلب روشن کرنے کو کہا۔ لمحہ بھر میں پورا ہال روشن ہوچکا تھا۔ سب کی نظریں اسٹیج پر گڑی تھیں۔ میڈم کرسی پر نیم بے ہوش حالت میں ڈھے چکی تھیں۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر تھے۔ سر کرسی کے ہتھے پر ڈھلک گیا تھا۔

روشنی ہوئی تو میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ یہ وہی تھے جو ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں آئے تھے اور جنہیں میڈم نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھیں۔ وہ دونوں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ہال سے باہر لے آئے۔ وہ دونوں میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ ہم اس وقت روز سیلون ہوٹل کے کوریڈور میں تھے۔ وہ ہوٹل کا رہائشی حصہ تھا جس میں دو رویہ قطار میں کمرے تھے اور ان کے دروازوں پر پیتل کے بڑے بڑے تراشیدہ ہندسے نصب تھے۔ وہ دروازوں پر لگے نمبروں پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک دروازے پر پہنچ کر وہ رکے تو میں بھی اُن کی دیکھا دیکھی رُک گیا۔

جیسے ہی اُن دونوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، پیچھے سے کسی مرد کی آواز آئی۔ ''رک جاؤ رک جاؤ... تم اندر نہیں جاسکتے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا، وہ ایڈتھ کے انکل تھے۔

''روبرٹ! انہیں روکو... پلیز انہیں اندر جانے سے روکو۔'' اُن کی بیوی نے چلاّ کر کہا۔ وہ کوریڈور میں لگ بھگ دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

اُن دونوں کی چیخ پکار کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تب تک ماسٹر چابی کی مدد سے دروازہ کھول لیا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ہم تینوں اندر داخل ہوئے۔ وہ ہوٹل کا ایک سوئٹ تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے۔ کمرے میں بہت مدھم روشنی تھی۔ ایک نے ہاتھ بڑھا کر لائٹس روشن کردیں۔ دوسرا شخص سیدھا ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ وہاں واقعی سبز رنگ کا شیشے کا ایک چھوٹا سا مرتبان رکھا تھا جس میں کوئی سفوف بھرا ہوا تھا۔

یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ میڈم کو کیسے پتا چلا کہ ڈریسنگ ٹیبل پر سبز رنگ کے شیشے کا مرتبان رکھا ہے۔ ایک دم میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں واقعی میڈم کی آواز میں عظیم آرلیوس کی روح تو نہیں بول رہی تھی؟ میں سہم گیا اور فوراً اس گستاخی کی دل ہی دل میں عظیم شہنشاہ سے معافیاں مانگنا شروع کردیں جو میں نے اس کی ذات سے متعلق اپنے دل میں کی تھیں۔

''شیرف...!'' ڈریسنگ ٹیبل کے قریب مرتبان ہاتھ میں لیے شخص نے دوسرے کو پکارا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو پہچان لیا۔ مرتبان پکڑنے والا شخص وہی کیمسٹ تھا جس کی دکان پر آج صبح میڈم گئی تھیں۔

''میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سنکھیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیمسٹ مرتبان کھول کر، اندر رکھے سفوف کے بارے میں اس شخص کو بتا رہا تھا جسے اس نے شیرف کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

یہ سنتے ہی میں چلاّیا۔ ''ایڈتھ... کہاں ہو تم؟'' اس کے ساتھ ہی میں سوئٹ کے ایک کمرے کی طرف دوڑا مگر وہ اس کمرے میں نہیں تھی۔ وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ شاید وہ ایڈتھ کی نرس یا اس کے انکل آنٹی کی خادمہ تھی۔ میں وہاں سے نکل کر دوسرے کمرے کی طرف دوڑا۔ خوش قسمتی سے اس کمرے میں وہ مجھے نظر آگئی۔

ایڈتھ بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے گردن تک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ ''ایڈتھ... پلیز ایڈتھ! آنکھیں کھولو۔'' میں نے نرم لہجے میں اسے پکارا تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں مگر مجھے دیکھتے ہی وہ خوف زدہ ہوگئی۔

''ڈرو مت۔'' میں نے پیار سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''تم ٹھیک تو ہونا؟''

میری آواز سن کر اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بالکل پریشان مت ہو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اب تم محفوظ ہاتھوں میں ہو۔''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے صرف ایک لفظ کہا۔ ''واقعی؟'' اس کا لہجہ اور نگاہیں سوالیہ تھیں۔

''سو فیصد۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نے مجھے پہچانا؟''

''تم وہی ہونا جو کل رات ریستوران میں تھے؟'' اس نے کمبل سے ہاتھ باہر نکال کر انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔

''بالکل ٹھیک پہچانا۔ میں ہی تمہاری مدد کے لیے آگے بڑھا تھا۔''

اس نے گہری سانس لی اور ایک بار پھر دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا۔ تیوری پر سے تشویش کے وہ بل بھی ختم ہوگئے تھے جو مجھے دیکھ کر پڑے تھے۔

یہاں میں اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ آپ کو اس ''سنکھیا اسکینڈل'' کا پورا قصہ تفصیل سے سناؤں۔ زہر خورانی کی یہ کہانی اُس دور کے اخبارات اور رسائل میں بڑی تفصیل سے بیان ہوچکی تھی۔ طویل عرصے تک یہ اسپرنگ قصبے کے عام و خاص کے علاوہ وہاں آنے والے سیاحوں میں بھی گپ شپ کا دلچسپ موضوع بنی رہی تھی۔ میڈم سلینا کو بھی اخبارات اور قصبے کی انتظامیہ نے بہت سراہا۔ انہی کے فوری ایکشن کی وجہ سے ایک قیمتی جان قتل ہونے سے بچ گئی اور مجرم سزا تک پہنچے تھے۔ کئی اخباروں میں نپ ٹام کا بھی ذکر ہوا تھا۔ دو تین جگہ میری بھی چھوٹی سی تصویر شائع ہوئی تھی۔

میں...... اس کی جزئیات بیان کرنے میں نہیں الجھنا چاہتا۔ بڑا لمبا قصہ تھا یتیم ایڈتھ، اس کے انکل اور سنکھیا کا۔ بیچ میں اس بے چاری یتیم لڑکی کی جائداد تھی اور وہ تنہا رشتے دار۔ انکل آنٹی ہی اس کے بعد ساری جائداد کے حق دار ہوتے۔ اس لیے چشمے کے پانی میں سنکھیا ملا کر اسے سست رو موت دی جارہی تھی مگر ایک غلطی انکل کر بیٹھے۔ نہ ریستوران پر الزام لگتا، نہ میڈم قصبے میں ہوتیں اور نہ ہی وہ پکڑے جاتے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے ہماری چھٹیاں، جارج کے ریستوران پر جانا، میڈم کا چشمے کے صاف صحت مند خالص معدنی پانی سے پیار اور زہر کا قصہ... قدرت نے..... یہ سب چکر ایڈتھ کی جان بچانے کے لیے تو نہیں کیا تھا۔

ہاں تو جب سب کچھ ہوگیا تو اس کے تین چار روز بعد میڈم نے چھٹیاں ختم ہونے کا اعلان کیا۔ میں نے رات کو کئی گھنٹے لگا کر سامان پیک کیا۔ دوسری صبح جب ہوٹل سے نکل رہے تھے تو میڈم نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولیں۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ ان چھٹیوں سے تمہاری صحت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اوپر سے نیچے تک بغور میرا جائزہ لیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ان چھٹیوں میں تمہارا قد کم از کم ایک دو انچ تو ضرور بڑھ گیا ہوگا۔'' اُن کا یہ کہنا میرے لیے خوش گوار ہرگز نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے ایک بار پھر میری کامیابی ناکامی میں بدل گئی ہو اور وہ سب مصیبتیں مجھ پر دوبارہ ٹوٹ پڑی ہوں جن سے میں پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ یا کم از کم اتنے دنوں تک وہ مجھ سے ضرور دور رہی تھیں، جب تک میں میڈم کے ساتھ اسپرنگ میں رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم کبھی نہ کبھی یتیم خانے کا چکر لگانے ضرور آؤ گے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ تمہارا قد بڑھ رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا ہاتھ اب کچن کیبنٹ تک بہ آسانی پہنچ جائے گا۔''

''مگر اس سے کیا تعلق...''

''تعلق ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''تم تیزی سے بڑے ہورہے ہو۔ اب تمہیں یتیم خانے میں رکھنا ممکن نہیں۔''

''مگر وہ فارم...''

''جب تک ہم پہنچیں گے، تمہاری جگہ لینے کے لیے دوسرا لڑکا موجود ہوگا۔ وہ تمہاری جگہ کام سنبھال لے گا۔''

''مگر میں آپ کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''تو جانے کا میں بھی تم سے نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''تو پھر یہ باتیں کیوں...؟''

اسی دوران میں ہم اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ میں اور میڈم گاڑی سے اترے۔ ''تمہارے سوال کا جواب پلیٹ فارم پر چل کر دیتی ہوں۔'' انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ قلی سامان اٹھائے میرے برابر برابر چل رہا تھا۔ میں ابھی پلیٹ فارم پر پہنچا تھا کہ میڈم ویٹنگ روم میں گھس گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئیں تو ایڈتھ ان کے ساتھ تھی۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میرے قدم جہاں تھے، وہیں زمین میں گڑ گئے۔

میڈم میری طرف بڑھیں۔ ''یہ ہے تمہارے اس سوال کا جواب جو گاڑی سے اترتے وقت تم نے کیا تھا۔''

میں مسکرا دیا۔ ایڈتھ بھی ہنس پڑی۔ اس رات کے بعد میں پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی طبیعت کافی بہتر لگ رہی تھی۔ چہرے پر چھائی زردی ماند پڑ چکی تھی۔

''اب تم دونوں اس وقت تک میرے گھر میں رہو گے جب تک تمہاری عمر اٹھارہ سال نہیں ہو جاتی۔''

''اور اس کے بعد؟'' میں نے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

''تم دونوں شادی کرو گے۔'' انہوں نے باری باری ہم دونوں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''پھر دل چاہے تو میرے ساتھ رہنا یا جہاں تم دونوں چاہو...''

''اٹھارہ سال کی عمر ہونے تک ہم اچھی طرح سوچ لیں گے۔'' پہلی بار ایڈتھ نے کچھ کہا۔ وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

''اٹارنی نے ایڈتھ کو قانونی طور پر میری سرپرستی میں دیا ہے۔'' میڈم نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے اور تمہارا حال تو میں جانتی ہوں۔'' ان کا انداز معنی خیز تھا۔

میں تیرہ سال کا لڑکا، ان کی بات سن کر شرما گیا۔ اسی دوران میں پلیٹ فارم پر گاڑی آنے کی گھنٹی بجی اور کچھ منٹ بعد ہم گاڑی میں بیٹھے تھے۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ ایڈتھ کو پانی میں سنکھیا دیا جا رہا ہے؟'' سفر شروع ہوا تو میں نے پہلی بار میڈم سے اس معاملے پر کوئی سوال کیا۔

''تمہارے اور ایڈتھ کے اس رومال کے کیمیائی تجزیے سے۔'' میڈم نے خوش گوار موڈ میں جواب دیا۔

''مگر کیسے؟''

''میں نے رومال لے لیے تھے اور جب دوسرے دن کیمسٹ کو اس کا تجزیہ کرنے کو دیا تو اس نے تصدیق کر دی کہ پانی میں سنکھیا ملا ہے۔''

''لیکن آپ کو یہ شک کیسے ہوا تھا؟''

''ایڈتھ کے چہرے پر بلش آن جیسے نشانات دیکھ کر۔ اس رات جب یہ میرے سامنے بیٹھی تو میں سمجھ گئی کہ اسے سست روز زہر دیا جا رہا ہے اور چہرے پر سرخ دھبے اسی کی وجہ سے پڑے تھے۔''

''اوہ...'' میں نے حیرت سے کہا۔

''پولیس سے رابطہ کیا تو وہ فوراً مدد کے لیے تیار ہو گئی اور معاملہ پکڑا گیا۔''

''مگر وہ سبز شیشے کا مرتبان؟''

''وہ تو بطور ثبوت میں نے خود کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ پولیس کو ثبوت بھی چاہیے تھا نا۔''

''مگر کس وقت؟''

''جب ہم روز سیلون میں داخل ہوئے تھے، تب میرے ایک آدمی نے یہ کام کیا۔ وہ ہوٹل کا چیف ویٹر ہے۔''

''مگر یہ تو...''

''جعلسازی ہے۔'' انہوں نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی جملہ مکمل کر دیا۔ ''کبھی کبھی کسی کی زندگی بچانے کے لیے کچھ غلط کرنا پڑتا ہے مگر مقصد نیک ہونا چاہیے۔''

''تو آرلیوس کی روح...؟''

''مجھے روح سے ایسے کام لینا پسند نہیں مگر جب سوال کسی کی زندگی اور جارج جیسے دوست کے کاروبار کا ہو تو پھر بلانا ہی پڑتا ہے آرلیوس کی روح کو مدد کے لیے۔'' انہوں نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے بے تکلفی سے کہا تو میں سب سمجھ گیا۔

میں نے باہر نظر ڈالی۔ گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ فون اور بجلی کے کھمبے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ میڈم نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر دیکھنے لگیں۔

یہاں آتے ہوئے کھلی کھڑکی سے نظارہ دیکھنے میں میری پوری دلچسپی تھی مگر واپسی کے اس سفر میں مجھے ان بھاگتے دوڑتے نظاروں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اردگرد دوڑتے بھاگتے نظاروں کے بجائے ایڈتھ کو اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ البتہ اس بار میڈم کا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔ وہ باہر کے نظاروں میں کھوئی ہوئی تھیں یا جبری طور پر کھو جانے کی کوشش کر رہی تھیں یہ کہنا ذرا مشکل تھا۔

بھروسا

تنویر ریاض

شاطر اور زیرک افراد کو اپنی صلاحیتوں پر بڑا مان ہوتا ہے... جو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے کہ وہ کبھی ناکام نہیں ہوں گے... مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کے عزائم... جن کا دائرہ کار کہیں محدود نہیں ہو رہا تھا...

بے اعتبار و بے اعتماد فضاؤں میں سانس لیتی ایک سنسنی خیز کہانی

انشورنس کمپنی کی تحقیقاتی افسر مینڈی لوہن سینٹرل پارک کے ایک الگ تھلگ گوشے میں جس شخص سے مصروف گفتگو تھی، اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی چمڑے کی جیکٹ کو جھاڑا اور اطمینان کر لیا کہ جیکٹ کے پیچھے اس کا آٹومیٹک ریوالور موجود ہے۔ اس کے سامنے ایک چھوٹے قد کا شخص چشمہ لگائے الو کی طرح دیدے گھما گھما کر بول رہا تھا۔ اپنے انداز سے وہ بظاہر بے ضرر نظر آ رہا تھا لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ جانتی تھی کہ ایسے ہی لوگ بعد میں سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ جب تک وہ اسے پوری طرح نہ جان جاتی، اس پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔

چھوٹے قد والا مسکرایا اور اپنے چشمے کی اوٹ سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم ایک شکاری ہو اور اپنے شکار کے تعاقب میں ہو۔ لیکن یقین کرو کہ میری مدد کے بغیر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔“

مینڈی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ اس وقت ڈرامائی مکالمے سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ویسے بھی اس شخص کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ایرانی انتہائی مجبوری میں انگریزی بول رہا ہو اور اسے سمجھنے کے لیے ترجمان کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”شاید ایسا ہی ہو تاہم تم نے ابھی تک مجھے اس کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں بتائی جو میں پہلے سے نہ جانتی ہوں۔“

اس شخص نے ٹیلی فون پر اپنا نام سائمن بتایا تھا لیکن لوگ اسے برادر سائمن کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ انٹرپول کا ریٹائرڈ ایجنٹ تھا اور ان دنوں لندن، روم اور پیرس میں واقع کئی عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں کے لیے سیکیورٹی کے ماہر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نامی گرامی ہیروں کے چور جیک موسارٹ کا پتا چلانے کے لیے ان دونوں کی فوری ملاقات بہت ضروری ہے۔

جیک موسارٹ، ایک آنکھ والی بلی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ حال ہی میں اسپین کی ایک جیل سے فرار ہوا تھا اور کم و بیش بارہ ملکوں میں اس کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ مینڈی گزشتہ دس برسوں سے اس انشورنس کمپنی میں تحقیقاتی افسر کے طور پر کام کر رہی تھی اور جب بھی وہ کسی سے ٹیلی فون پر کام کے سلسلے میں بات کرتی تو دوسری جانب سے اسے انتہائی ضروری قرار دیا جاتا۔ کبھی کبھی وہ کام واقعی فوری نوعیت کا ہوتا اور بعض اوقات اس میں سے کچھ بھی نہ برآمد ہوتا لیکن اس کے پیشے کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی ٹیلی فون کال یا اطلاع کو نظرانداز نہ کرے۔ ویسے بھی اسے ایک آنکھ والی بلی سے خصوصی دلچسپی تھی کیونکہ اس نے انتہائی قیمتی ڈائمنڈ چرایا تھا جس کی تلاش میں وہ ماری ماری پھر رہی تھی۔

چھوٹے قد والے آدمی نے سڑک پار واقع ایک کیفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اس خوب صورت عورت کو دیکھ رہی ہو جو تنہا بیٹھی مشروب کے گھونٹ لے رہی ہے؟ اس کا نام ڈیلیا ہے اور حال ہی میں اس کی جیک موسارٹ سے آشنائی ہوئی ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں اس معاملے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میں تمہیں اس طرح کی مزید معلومات فراہم کر سکتا ہوں۔“

”اب تم نے میری توجہ حاصل کر لی ہے مسٹر سائمن۔“ مینڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”برادر سائمن۔“ اس نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”سب لوگ مجھے اسی نام سے بلاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے برادر سائمن۔“ اس نے ریستوران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ یہ عورت کسی کا انتظار کر رہی ہے۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ وہ اپنے شوہر آسٹن کا انتظار کر رہی ہے جو خود بھی جیک موسارٹ کا بہترین دوست اور شریکِ جرم ہے۔“

یہ ایک اہم اطلاع تھی جس پر مینڈی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور وہ پُرجوش انداز میں بولی۔ ”اب تم نے واقعی مکمل طور پر میری توجہ حاصل کر لی ہے۔“

ایک درمیانے قد کا زرد رو شخص لیدر جیکٹ پہنے ہوٹل میں داخل ہوا اور ڈیلیا کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور زور سے ہاتھ چلاتے ہوئے کچھ بول رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر تھپکی دی تاکہ وہ خاموش ہو جائے۔ مینڈی نے سڑک ... پار سے یہ منظر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو یہ ہے اس کا شوہر؟“

برادر سائمن نے سر ہلایا اور بولا۔ ”ہاں، یہی آسٹن ہے۔ بے چارہ، کمزور اور افسردہ آسٹن۔ اسی کی وجہ سے موسارٹ اسپین کی جیل سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ آسٹن جانتا تھا کہ اس کا دوست جیل کی سختی برداشت نہیں کر سکے گا چنانچہ اس نے اسے فرار کروا دیا اور خود اس کی جگہ لے لی۔ یہ اس کی جانب سے غیر معمولی جذبے کا اظہار ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتیں؟“

مینڈی اس سے زیادہ نہ سن سکی۔ اس نے اپنے عقب میں ہونے والی ہلچل کی آواز سن کر سر گھمایا۔ اس کی نظریں قریب میں واقع گھڑسواری کے راستے پر تھیں جہاں ایک شخص گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس شخص نے اس کے عقب میں واقع ہوٹل کی جانب دیکھا۔ اچانک ہی اس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا اور اس نے اپنے دونوں پاؤں اوپر اٹھا لیے۔ اس شخص نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے قابو کرنے کی کوشش کی۔

مینڈی حیران تھی کہ گھوڑے کو اچانک کیا ہوا ہے پھر

اچانک ہی برادر سائمن نے اس کی آستین پکڑ کر فرانسیسی زبان میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ مینڈی نے گھوم کر دیکھا تو وجہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ آسٹن اپنی کرسی سے گرا اور ہوٹل کے فرش پر ڈھیر ہو گیا جبکہ ایک دوسرا شخص اس پر بے آواز پستول سے فائر کر رہا تھا۔

ہوٹل میں موجود دوسرے گاہک گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھے اور جان بچانے کے لیے ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں لیکن ڈیلیا اپنی جگہ سے نہیں اٹھی اور نہ ہی اس نے کوئی آواز نکالی۔ بس وہ ساکت کھڑی یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ مینڈی نے اپنا پستول نکالا اور حملہ آور کا نشانہ لے کر اس پر فائر کر دیا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ آسٹن کی لاش کے قریب ہی فرش پر گر پڑا۔ مینڈی سے غیر اختیاری طور پر یہ فعل سرزد ہوا تھا۔ حملہ آور کو زمین پر گرتا دیکھ کر اسے جھرجھری آگئی اور اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا۔ گو کہ وہ جانتی تھی کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے لیکن اس سے پہلے اس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ اسے اس بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ دوسرے ہی لمحے اسے ایک زوردار آواز سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ حملہ آور کا دوسرا ساتھی اس کی جانب ریوالور کا نشانہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اپنا ریوالور نیچے پھینک دو۔“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، حملہ آور کے ساتھی کا گھوڑا اچانک ہی بدک گیا اور اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھالیں اور اس کا پستول زمین پر گر پڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ برادر سائمن گھوڑے کے عقب میں ایک چھڑی ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑا ہے۔ مینڈی نے ایک گہری سانس لی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کس طرح وہاں تک پہنچا اور اس کے پاس چھڑی کہاں سے آگئی؟ لیکن اسے سائمن کی حاضر دماغی پر خوشی ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی گھوڑا دوبارہ اپنے قدم زمین پر جما چکا تھا اور اس نے دلکی چال سے ..... آگے بڑھنا شروع کر دیا لیکن مینڈی اپنے شکار کو اتنی آسانی سے چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ اپنا پستول سیدھا کیا اور گھڑسوار کا نشانہ لے کر فائر کرنا چاہتی ہی تھی کہ برادر سائمن نے چلاتے ہوئے کہا۔

”گولی مت چلانا۔ ہم اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔“

مینڈی نے اپنا پستول نیچے کر لیا اور حیرت سے سائمن کو دیکھنے لگی جو دوسرے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھ کر کسی تجربہ کار گھڑسوار کی طرح اس کی باگیں سنبھالیں اور حملہ آور کے ساتھی کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ مینڈی سکتے کے عالم میں اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا پھر اس کے کانوں میں پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی اور وہ آنے والے لمحات کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

اس کے بعد کی کارروائی انتہائی خشک اور بیزار کن تھی۔ مینڈی کو چند گھنٹے پولیس اسٹیشن میں گزارنا پڑے لیکن موقع پر موجود گواہوں کے بیانات اور حملہ آور کے ساتھی کی گرفتاری کے بعد اسے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ مینڈی جانتی تھی کہ اب اسے ایک طویل قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اس کے وکیل نے یقین دلایا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس نے اپنے دفاع میں ایک قاتل پر گولی چلائی جسے قتل کے زمرے میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ سہ پہر کے وقت اپنے باس چپ پارکر کے ساتھ دفتر میں میٹنگ میں مصروف تھی کہ اچانک اس کا دھیان گزشتہ روز پیش آنے والے واقعے کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی برادر سائمن کی تصویر اس کے ذہن میں ابھرنے لگی۔ اس نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ ہلایا جیسے کسی مچھر یا مکھی کو بھگا رہی ہو۔ پارکر کی تیز نظروں سے اس کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی اور وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“

مینڈی نے سر ہلایا اور اس رپورٹ کی جانب اشارہ کرنے لگی جو اس نے لکھی تھی اور پارکر اس کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ جتنی دیر تک وہ اسے پڑھتا رہا، اس کے لبوں پر کوئی جنبش نہ ہوئی پھر مینڈی نے اس سے پوچھا۔

”اب تمہارا کیا خیال ہے؟“

پارکر نے رپورٹ پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس ہیرے کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں ہر قیمت پر جیک موسارٹ کا کھوج لگانا ہوگا۔ تم اپنی کوشش جاری رکھو۔ وہ کبھی نہ کبھی تو سامنے آئے گا۔“

”اب تک کی اطلاع یہی ہے کہ اس نے اس ہیرے کو بیچنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے نہ تو اپنے قریبی دوستوں کو ہیرا دکھایا اور نہ ہی مارکیٹ میں کوئی گاہک تلاش کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ گزشتہ پانچ سالوں سے اس ہیرے کو اس طرح دبائے بیٹھا ہے جیسے مرغی انڈوں پر بیٹھتی ہے۔“

”ہاں اور ایسا انڈا جس کی قیمت ساٹھ لاکھ ڈالرز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس ہیرے کا انشورنس اتنی ہی مالیت کا ہے؟"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پارکر نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کمپنی کا قانونی مشیر بول رہا تھا۔ پارکر نے کہا۔

"ہاں ہاں، میں اسی سے بات کررہا ہوں۔" پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"وکیل کا فون ہے۔" پھر دوبارہ وکیل سے بات کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں، میں نے اخبار میں سب پڑھ لیا ہے۔"

مینڈی نے گہری سانس لی۔ وہ بھی اخبار پڑھ چکی تھی اور رات بھر ٹی وی..... پر یہی اسٹوری چلتی رہی تھی۔ برادر سائمن دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بن گیا تھا۔ اس واقعے کی ویڈیو بھی بن چکی تھی جس میں برادر سائمن کو حملہ آور کے ساتھی کا تعاقب کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس ویڈیو کا سب سے سنسنی خیز حصہ وہ تھا جس میں برادر سائمن اپنا گھوڑا، حملہ آور کے ساتھی کے گھوڑے کے برابر لا کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ دونوں زمین پر گر جاتے ہیں لیکن برادر سائمن اسے اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک پولیس نہیں آجاتی۔

برادر سائمن کے اس ایڈونچر کی وجہ سے مینڈی کا کردار پس پشت چلا گیا اور اسے میڈیا نے زیادہ نہیں اچھالا اور پولیس نے بھی یہ تسلیم کرلیا تھا کہ اس نے اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود دوسرے لوگوں کو حملہ آور کی گولی کا نشانہ بننے سے بچانے کے لیے یہ کارروائی کی تھی۔ البتہ اسے اس مقدمے کی سماعت کے دوران میں عدالت میں موجود رہنا تھا اور شاید وکیل نے بھی اسی سلسلے میں فون کیا ہوگا پھر اس نے پارکر کو فون پر کہتے ہوئے سنا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔"

مینڈی کے کانوں میں وکیل کی ہلکی سی آواز آئی۔

"اس لڑکی سے کہو کہ اپنی زبان بند رکھے۔"

پارکر نے فون رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی بات سن لی ہوگی۔"

مینڈی اپنا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "آخر وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے؟ کیا میں لوگوں کو یہ نہ بتاؤں کہ یہ واقعہ کیوں اور کیسے پیش آیا؟"

"زیادہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتی ہو کہ وکیل عموماً ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔" پھر اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "برادر سائمن کے بارے میں کیا کہو گی؟ کیا تم اس پر بھروسا کرسکتی ہو؟"

"نہیں، گو کہ اس نے کل میرا بہت ساتھ دیا لیکن فی الحال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"اچھا۔" پارکر بولا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ پارکر نے فون اٹھایا اور بولا۔

"شیطان کے بارے میں سوچو اور وہ حاضر۔ تمہارے بوائے فرینڈ کا فون ہے۔ وہ نیچے لابی میں تمہارا انتظار کررہا ہے۔ کہتا ہے کہ ضروری کام ہے۔"

☆☆☆

"آج کی رات بہت اہم ہے۔" برادر سائمن نے مینڈی سے کہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہاٹ ڈاگ تھا اور وہ دوسرے ہاتھ سے نیپکن پر دستخط کررہا تھا۔ وہ دونوں عمارت کے باہر ہاٹ ڈاگ کے کیبن پر کھڑے تھے۔ دکان دار نے برادر سائمن کو پہچان لیا تھا اور اس سے آٹوگراف کی فرمائش کی تھی اور برادر سائمن ایک ہی رات میں ملنے والی شہرت سے پوری طرح لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس کا اندازہ مینڈی کو اس وقت ہوا جب وہ لفٹ سے باہر آئی اور اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ برادر سائمن کے گرد جمع ہیں اور کیمرافون سے اس کی تصویریں اتار رہے ہیں۔ جب وہ دونوں عمارت سے نکل کر باہر گلی میں جارہے تھے تو برادر سائمن نے اسے گزشتہ روز گرفتار ہونے والے شخص کے بارے میں بتایا۔

"اس کا نام آئیوان دورنوف ہے اور وہ اس روسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو اس ہیرے کی تلاش میں ہے۔ تاہم اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرنے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ اس کا ساتھی ڈبلیا سے ہیرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا پھر نہ جانے اس نے گولی کیوں چلادی۔"

مینڈی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور بولی۔ "وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو اس کے ساتھی نے آسٹن پر حملہ کیوں کیا؟"

"ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آئیوان کو اس بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ وہ برا آدمی نہیں لیکن راستے سے بھٹک گیا ہے۔"

"اور میں ڈبلیا سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس کے سامنے شوہر کا قتل ہوگیا لیکن وہ بالکل بھی پریشان نہیں ہوئی۔ میں نے اتنے ٹھنڈے مزاج کی عورت کبھی نہیں دیکھی۔"

برادر سائمن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "وہ

برف سے بنی ہوئی ہے۔"

"لگتا ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔"

"میرے اپنے ذرائع ہیں۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسی طرح تمہارے بھی کچھ ذرائع ہوں گے۔ اگر ہم دونوں مل کر کام کریں تو بہتر نتائج مل سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہمارے درمیان بھروسے کا رشتہ قائم ہونا چاہیے۔ مجھے تو تم پر اعتماد ہے لیکن جانتا ہوں کہ تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، برادر سائمن نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی لیکن کسی پر اتنی آسانی سے بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور مجھے امید ہے کہ آج کی رات ختم ہونے سے پہلے میں تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

"کیوں؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "آج رات کیا ہونے والا ہے؟"

☆☆☆

دکان دار نے برادر سائمن کے دستخط شدہ نیپکن کو دیکھا اور خوشی سے مسکرا دیا۔ مینڈی نے اپنے حصے کا ہاٹ ڈاگ ختم کیا اور برادر سائمن سے بولی۔ "تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

برادر سائمن نے دکان دار کی طرف دیکھا اور محتاط انداز میں وہاں سے پلٹتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر مینڈی کو پکڑا دیا۔ وہ مشہور مصنف ٹوٹ ماریو کی جانب سے کسی تقریب کا دعوت نامہ تھا جو شان دار پارٹیاں دینے کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ دعوت نامہ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا؟ لوگ تو اس کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار نظر آتے ہیں۔"

برادر سائمن نے کہا۔ "یہ دعوت نامہ ہم دونوں کے لیے ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں میرے ساتھ اس پارٹی میں شرکت کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

مینڈی نے دعوت نامے کو غور سے دیکھا اور اپنا نام پڑھتے ہوئے بولی۔ "میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"میری اطلاع کے مطابق جیک موسارٹ بھی اس تقریب میں شرکت کرے گا اور ہمارے لیے اسے گھیرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔"

☆☆☆

ففتھ ایونیو پر واقع ٹوٹ ماریو کی رہائش گاہ کے باہر لیموزین کاروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ پولیس اور پرائیویٹ سیکیورٹی کے اہلکار ان گاڑیوں کے لیے راستہ بنانے میں مصروف تھے اور ان کی کوشش تھی کہ معزز مہمانوں کو اخباری نمائندوں اور فوٹوگرافرز... کی یلغار سے محفوظ رکھتے ہوئے اس بڑے ہال تک پہنچا دیں جہاں ٹوٹ ماریو خود ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔

ایک شاندار سیاہ رنگ کی لیموزین کی پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی مینڈی نے بہترین سوٹ میں ملبوس اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ یہ ساری مشق ایک جنگلی گلہری کا تعاقب کرنے سے زیادہ کچھ ہے۔"

برادر سائمن نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "شاید... شاید نہیں۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن اگر ہم اپنے مقصد میں ناکام رہے تب بھی تم کم از کم یہ تو کہہ سکو گی کہ ٹوٹ ماریو کی تقریب میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔"

"ہاں اور اس کے لیے میرے تین گھنٹے ضائع ہوئے۔ لباس، جوتوں اور بیوٹی پارلر کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔"

"معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں تیاری کے لیے بہت کم وقت ملا۔ اگر تم میری بات کا بُرا نہ مناؤ تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ آج تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"شکریہ۔" مینڈی نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ اسے یہ تعریف اچھی لگی تھی لیکن وہ سائمن کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے محتاط انداز میں گفتگو کا رخ دوسری جانب موڑ دیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ موسارٹ اس تقریب میں ضرور آئے گا؟"

"ہاں، میرے ذرائع نے یہی اطلاع دی ہے۔ تاہم اس کا ارادہ کچھ چرانے کا نہیں ہے۔"

مینڈی نے چونک کر اسے دیکھا۔ یوں لگا کہ اسے شاید سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہو۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"پھر وہ یہاں کس لیے آرہا ہے؟"

"اس قیمتی ہیرے کا سودا کرنے جس کی کھوج میں تم یہاں تک آئی ہو۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ جیک موسارٹ اس بھری محفل میں ہیرے کا گاہک تلاش کرنے یا اسے بیچنے کے لیے آرہا ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" برادر سائمن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

”اس نے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟“ مینڈی نے براور سائمن کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت دوسرے مہمانوں کے ساتھ لابی میں کھڑے اوپر جانے کے لیے لفٹ کا انتظار کر رہے تھے۔

”دیکھونا، یہاں قدم قدم پر پولیس والے اور سیکیورٹی گارڈز موجود ہیں اور ہم سب ابھی ایک میٹل ڈیٹیکٹر سے گزر کر اندر آئے ہیں۔ وہ پاگل تو نہیں ہے جو اتنا قیمتی ہیرا لے کر یہاں آ رہا ہے۔“

براور سائمن نے بھی جواب میں اس کے کان میں سرگوشی کی اور بولا۔ ”نہیں مینڈی! وہ پاگل نہیں ہے۔ یہ جگہ پورے نیویارک میں سب سے محفوظ ہے۔ یہاں اس جیسا واقعہ نہیں ہو سکتا جو گزشتہ روز پارک میں پیش آیا تھا اور کوئی روسی لٹیرا یہاں گھات لگائے نہیں بیٹھا ہے۔“

مینڈی اب بھی قائل نہیں ہوئی اور بولی۔ ”مجھے تو یہ ایک فضول سا خیال لگ رہا ہے۔“

جب وہ دونوں لفٹ کے ذریعے اوپر جا رہے تھے تو مینڈی نے ایک بار پھر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم کبھی موسارٹ سے ملے ہو؟“

”نہیں، وہ ہمیشہ مجھ سے ایک قدم آگے رہتا ہے۔ آخری بار میں نے اس کی جھلک اس وقت دیکھی تھی جب وہ پیرس کے ایک ہوٹل میں اپنے سوئٹ کی بالکنی میں کھڑا ہوا تھا۔“

مینڈی نے اس کی جانب دیکھا اور بولی۔ ”کیا اس ہجوم میں تم اسے پہچان لو گے؟“

براور سائمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج تو سبھی مہمان ایک جیسے لگ رہے ہیں۔ لیکن اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ آنکھوں پر ایک پٹی چڑھائے رکھتا ہے۔“

”ہاں، میں نے اسپین کی جیل میں لی گئی اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ معمولی شکل وصورت کا بندہ ہے۔ اس کی تصویر دیکھ کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی جبکہ میرے ذہن میں ایک شاندار پرسنالٹی والے برطانوی چور کا تصور تھا جیسا کہ ہم فلموں میں دیکھتے ہیں۔“

لفٹ مخصوص منزل پر جا کر رک گئی اور مہمانوں نے ایک ایک کر کے باہر آنا شروع کیا۔ وہاں مہذب ملازمین موجود تھے جو انہیں سرخ قالین پر سے گزارتے ہوئے ہال روم تک لے گئے۔ پورا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ عین اس وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس پر کوئی چیز رکھ دی ہے۔ مینڈی نے حیرت سے دیکھا۔ وہ سلک کی ایک پٹی تھی جس میں لاسٹک کا بینڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے برابر میں کھڑے ہوئے براور سائمن کی جانب دیکھا۔ ملازم اسے بھی ایک سیاہ رنگ کی پٹی دے رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ براور سائمن نے پوچھا۔

”آج مسٹر ماریو کی نئی کتاب کا افتتاح ہے اس لیے تمام مہمان اپنی آنکھوں پر یہ ماسک چڑھائیں گے۔“

مینڈی اور سائمن نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر اس کی نظر دوسرے مہمانوں پر پڑ گئی۔ تقریباً سبھی نے اپنی آنکھوں پر وہ پٹی چڑھالی تھی۔ مینڈی نے سر ہلایا اور بولی۔

”یہ اچھا مذاق ہے۔“

اس دوران براور سائمن بھی اپنی آنکھوں پر وہ نقاب چڑھا چکا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ”تم نے وہ مثل نہیں سنی جب روم میں ہو تو روم والوں جیسے بن جاؤ۔“

☆☆☆

جب وہ دونوں استقبالیہ قطار کے نزدیک پہنچے جس کی سربراہی ٹوٹ ماریو کر رہا تھا تو اناؤنسر نے تعارف کرواتے ہوئے ان کا نام بہ آوازِ بلند پکارا۔ ٹوٹ ماریو کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی اور وہ دیکھنے میں اداکار برٹ لنکاسٹر جیسا نظر آتا تھا۔ ماریو کے برابر میں اس کی موجودہ بیوی رشی کھڑی ہوئی تھی جو عمر میں اس سے کئی برس چھوٹی تھی اور اس کے برابر میں جو عورت تھی، اسے دیکھ کر مینڈی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ ڈیلیا تھی۔

ٹوٹ ماریو اور اس کی بیوی سے مصافحہ اور رسمی جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد مینڈی ایک قدم آگے بڑھی اور غور سے ڈیلیا کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ کیا ڈیلیا جانتی تھی کہ چوبیس گھنٹے پہلے مینڈی نے ہی اس شخص پر گولی چلائی تھی جو اس کے شوہر کی موت کا ذمے دار تھا؟ لیکن ڈیلیا کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ اس کے بجائے اس نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور مسکرا دی۔

مینڈی آگے بڑھ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ڈیلیا نے براور سائمن کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ براور سائمن مسکرایا اور جواب میں اس نے بھی کچھ کہا۔ یہ منظر دیکھ کر مینڈی حیران رہ گئی اور سوچنے لگی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو کس طرح جانتے ہیں اور اس وقت ان کے بیچ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

جب وہ کھانے کی میز پر پہنچی تو اس نے براور سائمن سے پوچھا۔ ”لگتا ہے کہ تم اور ڈیلیا ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو۔“

”کیوں نہیں۔“ براور سائمن نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کو کئی سالوں سے جانتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میری واقفیت اس کے باپ مونٹی ولنگم سے بھی تھی۔ وہ بہت دولت مند اور انسانیت کی خدمت کرنے والا شخص تھا۔“

”لگتا ہی نہیں کہ یہ عورت چوبیس گھنٹے پہلے بیوہ ہوئی ہے۔ حالانکہ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا ہے۔“

براور سائمن نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”وہ یہاں موجود ہے۔“

مینڈی نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا لیکن جب تک وہ بوفے کی میز کی جانب بڑھ چکا تھا اور ساکت کھڑا سلاد کے اس ڈھیر کی جانب دیکھ رہا تھا جو ابلے ہوئے انڈوں سے بنائی گئی تھی اور اس کے سرے پر ایک بجھا ہوا سگریٹ یوں ایستادہ تھا جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی پر جھنڈا گاڑ دیا جائے۔ یہ دیکھ کر مینڈی کو بہت تعجب ہوا اور وہ بولی۔

”یہ حرکت کس نے کی ہے؟ انڈوں کی سلاد پر سگریٹ رکھ دیا۔“

”موسارٹ۔“ سائمن نے آہستہ سے کہا۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتا ہے؟“

”کیونکہ اسے انڈے پسند نہیں ہیں۔“

پہلے تو مینڈی سمجھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے لیکن وہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ہاتھ میں لیا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ اسی برانڈ کے سگریٹ پیتا ہے اور یہ ترکش برانڈ بہت نایاب ہے۔“

اتنی دیر میں دوسرے مہمان بھی کھانے کی میز کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے مینڈی اور براور سائمن محتاط انداز میں وہاں سے ہٹ گئے۔ پارٹی زوروں پر تھی اور آرکسٹرا کی دھن پر جوڑوں نے رقص شروع کر دیا تھا جبکہ بقیہ مہمان پوری دلچسپی سے انہیں رقص کرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ باوردی مستعد ویٹرز شیمپئن کے گلاسوں سے بھری ٹرے تھامے ان مہمانوں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور ہال روم کے ماحول میں کافی گرمی آ گئی تھی۔

مینڈی ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کی نظریں براور سائمن کو کھوج رہی تھیں۔ سگریٹ والے واقعے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ جیک موسارٹ ہال روم میں ہی ہے اور ان معزز مہمانوں میں سے ہی کوئی ایک اس کا گاہک ہو سکتا ہے۔ اسے براور سائمن سے ملنے کی جلدی تھی اور اسی افراتفری میں وہ اس دروازے تک جا پہنچی جو گارڈن ٹیرس میں کھلتا تھا اور اس پر ایک چھوٹی سی تختی جھول رہی تھی جس پر لکھا ہوا تھا ’داخلہ ممنوع ہے‘۔

پھر اس نے براور سائمن کو وہ دروازہ کھولتے ہوئے دیکھا۔ سائمن نے سر گھما کر پیچھے دیکھا اور بولا۔

”مینڈی! کیا تم تیار ہو؟“

مینڈی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے دفتر میں ہے اور فخریہ انداز میں باس کو وہ ہیرا پیش کر رہی ہے۔ پھر اس نے اپنی ترقی اور بونس کا تصور کیا اور یہ کہ کمپنی کا بوڑھا چیف بذاتِ خود مصافحہ کر کے اسے مبارکباد دے رہا ہے۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ براور سائمن نے دروازہ کھولا اور تیزی سے گارڈن ٹیرس میں چلا گیا۔ مینڈی نے بھی اس کی تقلید کی۔ کھلی فضا میں آتے ہی اسے خنکی کا احساس ہونے لگا۔ وہ باغ بہت بڑا اور خوب صورت تھا۔ اس میں جگہ جگہ محرابیں اور پھولوں کے کنج بنے ہوئے تھے۔ اس نے براور سائمن کو دیکھا جو اس سے تھوڑا سا آگے تھا اور پورے چاند کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مینڈی کی نظریں بھی بے اختیار اس جانب اٹھ گئیں۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں ایسا چاند نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے اتنا قریب محسوس ہوا جیسے وہ اسے چھو سکتی ہو۔

اسے یوں لگا جیسے ہر چیز اپنی جگہ پر رک گئی ہو۔ وہ اس مسحور کن ماحول میں کھو کر رہ گئی اور اس کے دل میں ایک خواہش شدت سے ابھری کہ کاش وہ بھی کسی سے محبت کرتی۔

”چاند بھی ایک چور ہے جو سورج سے روشنی چراتا ہے۔“

برنارڈ شا کے یہ الفاظ اسے اپنے عقب سے سنائی دیے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سوٹ میں ملبوس ایک طویل قامت شخص ایک محراب کے سائے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں شیمپئن کے دو گلاس تھے۔ وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”معاف کرنا۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔“

”نہیں، تم نے مجھے بالکل پریشان نہیں کیا۔“ مینڈی نے جھوٹ بولا حالانکہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

طویل قامت شخص مسکرایا اور اس نے شیمپئن کا ایک گلاس مینڈی کو تھما دیا۔ مینڈی نے چاند کی روشنی میں اسے غور سے دیکھا۔ وہ بالکل اس انگریز چور کی طرح لگ رہا تھا جو وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

[illegible]
ساگڑھا، سلیقے سے جمے ہوئے سیاہ بال اور آنکھوں پر چڑھا ہوا نقاب۔ مینڈی نے سوچا کہ اسپین کی جیل میں اس کی جو تصویر اتاری گئی تھی، وہ ادھوری تھی۔

اس خیال کے آتے ہی اسے برادر سائمن یاد آ گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑا اسی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس جوڑے کی تنہائی میں مخل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ آگے بڑھا اور اجنبی شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"موسارٹ! بالآخر ہماری ملاقات ہو ہی گئی۔"

طویل قامت شخص نے جواب دینے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا شیمپین کا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور اس کا ایک طویل گھونٹ لینے لگا۔ شاید وہ جواب دینے میں جان بوجھ کر تاخیر کر رہا تھا اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے اپنی شناخت ظاہر کرنی چاہیے یا نہیں؟

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، سناٹے میں ایک زوردار آواز گونجی۔ "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ پارٹی اندر ہو رہی ہے؟"

مینڈی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹوٹ ماریو اسی طرف آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک درمیانے سائز کا بیگ تھا۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ "میں کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتا لیکن یہ باغ فی الحال بند ہے۔ میں یہاں کچھ کام کروا رہا ہوں اور نہیں چاہتا کہ اس کے مکمل ہونے سے پہلے کوئی اسے دیکھے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے مینڈی اور سائمن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم لوگ اندر جا کر پارٹی سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتے؟"

برادر سائمن نے غور سے ٹوٹ ماریو کی جانب دیکھا اور بولا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ کیا موسارٹ بھی ہمارے ساتھ ہی اندر جائیں گے یا تم لوگوں کا کوئی اور پروگرام ہے؟"

"اوہ، تمہارا اشارہ اس شخص کی جانب ہے۔ اس کا نام موسارٹ نہیں بلکہ جیک ایلن ہے اور یہ باغبانی کا ماہر ہے۔"

"نہیں، یہ جیک موسارٹ ہے اور اس کے قبضے میں ہی وہ قیمتی ہیرا ہے جس کی تلاش کی جا رہی ہے۔" برادر سائمن نے غور سے ماریو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ کو دیکھا اور بولا۔ "بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جو اس ہیرے کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"

ماریو کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟"

"نہیں، میں پولیس والا نہیں لیکن تمہیں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ چوری شدہ اشیا خریدنا بھی ایک سنگین جرم ہے اور تم جیسے معزز شخص کو اس میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اپنے آپ کو اس جرم کا مرتکب ہونے سے بچا سکتے ہو۔"

ماریو کا دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں گیا اور وہ پستول نکالتے ہوئے بولا۔ "میں نے زندگی میں کبھی پسپائی اختیار نہیں کی اور یہ کھیل میرے لیے نیا نہیں ہے۔"

موسارٹ نے اپنا گلاس ایک جانب اچھال دیا اور ماریو کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "احمق نہ بنو۔ اس سے پہلے کہ کوئی حادثہ ہو جائے، یہ پستول اپنی جیب میں رکھ لو۔"

"مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ ہیرا فوراً میرے حوالے کر دو۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ اس دوران میں مینڈی نے غیر محسوس طریقے سے اپنی ران پر ہاتھ پھیرا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ کپڑوں کے نیچے موزے کے اندر حفاظتی ہتھیار موجود ہے۔

"میں بار بار اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔" ماریو تیز آواز میں بولا۔ "ہیرا فوراً میرے حوالے کر دو۔"

"مجھے ایسے لوگ پسند نہیں جو مجھ پر پستول تان لیں۔ یہ میرا طریقہ کار نہیں ہے۔" موسارٹ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"کیا تم چاہو گے کہ تمہارے سر میں گولی اتار دی جائے؟"

"دو گواہوں کی موجودگی میں شاید تمہارے لیے یہ ممکن نہ ہو۔" موسارٹ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اس ریوالور میں کئی گولیاں ہیں۔ تمہارے بعد یہ لوگ بھی گواہی دینے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔"

"رک جاؤ، مجھے یہ پاگل پن دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

یہ کہہ کر موسارٹ نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹی سی سیاہ ڈبیا نکالی۔ اس میں چاندی کے چھوٹے سکے کے برابر ایک ہیرا رکھا ہوا تھا، چاند کی روشنی میں اس کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

"اسے دیکھ کر تمہاری سانسیں کیوں رک گئیں؟" اس نے مینڈی اور برادر سائمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ایک صدی پہلے ہندوستان میں اسے سورج کا آنسو

کہا جاتا تھا لیکن اب ہم اسے سن برسٹ ڈائمنڈ کے نام سے جانتے ہیں۔"

مینڈی اور برادر سائمن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس دوران میں ٹوٹ ماریو نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا اور ہاتھ بڑھا کر ہیرے کی ڈبیا پکڑتے ہوئے بولا۔ "تم اسے جو بھی نام دو لیکن یہ اب میرا ہے۔"

ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ تیزی سے گرا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سر اور کندھے مٹی اور گھاس میں لتھڑ گئے۔ مینڈی اور برادر سائمن نے اس کی جانب حیرت سے دیکھا۔ ایک گملا ٹوٹے ہوئے تارے کے مانند اس کے سر سے ٹکرایا تھا۔

موسارٹ نے جھک کر ہیرے کی ڈبیا اٹھائی اور اس کا ڈھکنا بند کر کے دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے ماریو کا بیگ اور ریوالور بھی زمین سے اٹھا لیا اور اب وہ غور سے برادر سائمن کو دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر قدموں کی آواز پر انہوں نے سر گھما کر دیکھا۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک ٹیرس کے فرش سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ پھر جھاڑیوں کے عقب سے ڈبلیا اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے نمودار ہوئی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے باغبانی کر کے آ رہی ہو۔

وہ قریب آئی تو موسارٹ نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر بوسہ دیا اور وہ بیگ اسے پکڑا دیا۔ جواب میں وہ اس سے لپٹ گئی اور اس کے کانوں میں کچھ کہا جو مینڈی اور برادر سائمن کوشش کے باوجود نہ سن سکے۔ اس کے بعد وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتی ہوئی بیگ سمیت وہاں سے چلی گئی۔

موسارٹ نے مینڈی اور برادر سائمن کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میرے جانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ریوالور جیب میں رکھا اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میری سواری کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔"

مینڈی کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے قریب پہنچی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھا جو کسی بھی مرد کو گھائل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ موسارٹ بھی ان نگاہوں کی تپش کی تاب نہ لا سکا اور سرخوشی کے عالم میں بولا۔ "مجھے بہادر اور بے خوف لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

مینڈی جواب میں مسکرائی۔ اب اسے صرف اتنا کرنا

خدارا ● خدارا
شوگر کے مریض
ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787
آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ جھک کر موزے میں سے اپنی اسپرے گن نکالتی اور موسارٹ کو بے ہوش کر دیتی۔ لیکن اس کے بجائے وہ اس کے چہرے پر جھک گئی اور بولی۔ ”واقعی... تم دل سے یہ بات کہہ رہے ہو؟“

موسارٹ پوری طرح اس کے سحر میں جکڑ چکا تھا۔ مینڈی نے اس جذباتی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی جیکٹ کی جیب میں ڈالا اور ہیرے کی ڈبیا نکال لی۔ اچانک ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی گردن کو پیچھے سے جکڑ لیا ہے پھر اس کے کانوں میں ایک پھنکارتی ہوئی آواز آئی۔

”اپنی جگہ سے مت ہلنا۔ ورنہ تمہاری گردن توڑ دوں گا۔“

مینڈی نے اس دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکیلا اور اس کے ساتھ ہی اپنے جوتے کی ایڑی حملہ آور کے پاؤں پر مضبوطی سے جما دی۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی اور مینڈی کی گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ تیزی سے پلٹی اور موزے سے اپنا ہتھیار نکال کر ماریو کے چہرے پر تین دفعہ اسپرے کر دیا۔ ماریو بے ہوش ہو کر دوبارہ زمین پر گر گیا۔

”بہت خوب۔“ موسارٹ تحسین آمیز انداز میں بولا۔ ”تم صرف خوب صورت نہیں بلکہ خطرناک بھی ہو۔“

”اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس لیے میری بات غور سے سنو۔“

ابھی اس کی بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک ہیلی کاپٹر کی گرج دار آواز سنائی دی جو اسی جانب آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے شور میں مینڈی کو موسارٹ کی آواز سنائی دی جو چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

مینڈی اس پیشکش پر حیران رہ گئی لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی پھر اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ برادر سائمن کہیں نظر نہیں آ رہا اور مینڈی نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں چلا گیا۔ کیا وہ ڈبلیا کے تعاقب میں گیا تھا؟ کیا وہ دونوں مل کر کام کر رہے تھے اور کیا ڈبلیا ہی اسے معلومات فراہم کرتی تھی؟

ہیلی کاپٹر اب عین ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا اور اس کے گھومتے ہوئے پروں کی وجہ سے ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ مینڈی نے ایک ہاتھ سر پر رکھ کر اڑتے ہوئے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی پھر اس نے دیکھا کہ ہیلی کاپٹر سے ایک رسّی کی سیڑھی نیچے لٹکائی گئی۔ موسارٹ اس کی جانب بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام کر چلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ چلو... میں تمہیں دکھاؤں گا کہ دنیا کتنی خوب صورت ہے۔“

”ڈبلیا کا کیا بنے گا؟“ مینڈی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”وہ قصہ تو کب کا ختم ہو چکا۔“

”پھر اس نے اپنے شوہر کو کیوں مروایا؟“

”ویسے تو تم بڑی تیز ہو لیکن اس معاملے میں تمہارا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ اس نے آسٹن پر حملہ نہیں کروایا بلکہ وہ ان لوگوں سے دشمنی کی وجہ سے مارا گیا۔ ویسے بھی وہ دل کا مریض تھا۔ اب اسے اس تکلیف سے نجات مل گئی ہوگی۔“

ہیلی کاپٹر میں سے کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم ساری رات یہاں نہیں گزار سکتے۔ چلنا ہے تو چلو ورنہ...“

موسارٹ نے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد مینڈی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم میرے ساتھ چلتیں تو معلوم ہو جاتا کہ زندگی کتنی حسین ہے۔“

”وہ بیگ تو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا پھر تم نے اسے ڈبلیا کو کیوں لے جانے دیا؟“

”اسے میری طرف سے الوداعی تحفہ سمجھ لو اور ویسے بھی وہ ہیرا تو میرے پاس ہی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”واقعی تم بہت تیز ہو۔“

مینڈی بھی جواب میں مسکرا دی اور اسے دور سے ہی وہ ڈبیا دکھائی جو اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ اسی لمحے ہیلی کاپٹر سے دوبارہ آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی سیڑھی اوپر ہونے لگی۔ موسارٹ نے لپک کر سیڑھی پر قدم رکھا اور نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔“

جیسے ہی وہ اوپر پہنچا... ہیلی کاپٹر نے بھی فضا میں بلند ہونا شروع کر دیا اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد مینڈی سوچنے لگی کہ اگر وہ زندگی میں ایک بار دماغ کے بجائے دل کی بات مان لیتی تو کیا ہو جاتا۔ اس سے پہلے کہ پچھتاوے کا احساس اسے گھیر لیتا، اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔

”تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا مینڈی!“

اس نے مڑ کر دیکھا۔ برادر سائمن اس کے عقب میں کھڑا ہوا تھا۔

”تم کب سے یہاں کھڑے ہو؟“ مینڈی نے پوچھا۔

”اگر تم بروقت صحیح فیصلہ نہ کرتیں تو کہانی مختلف ہو جاتی۔“ برادر سائمن نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”جب میں نے دیکھا کہ تم نے صورتِ حال کو کنٹرول کر لیا ہے تو مجھے اعلیٰ حکام کو خبردار کرنے کا موقع مل گیا اور کچھ باتیں ڈبلیا سے بھی ہو گئیں۔“

”کس بارے میں؟ اسے تو نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ مل گیا۔“

”اس بیگ میں نوٹ کم اور ردّی اخبار کے ٹکڑے زیادہ تھے۔“

”گویا ماریو انہیں بھی ڈبل کراس کر رہا تھا۔“ مینڈی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں، یا کم از کم ایک شوقیہ کھلاڑی کی طرح اس کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنی کتابوں تک ہی محدود رہنا چاہیے۔“ برادر سائمن نے بے ہوش ماریو پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

مینڈی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈبیا کھولی اور اس میں سے ہیرا نکالتے ہوئے بولی۔ ”اس کے بارے میں کیا کہوں؟“

”یقیناً تم بھی جان گئی ہو گی کہ یہ نقلی ہے۔“

”ہاں، مجھے کچھ شک تو ہوا تھا۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی۔“

”ہوشیار لوگ عام طور پر ہیروں کی نقل بھی ساتھ رکھتے ہیں تاکہ کسی ناخوشگوار صورتِ حال میں اسے استعمال کر سکیں۔ یہ بہت پرانا ہتھکنڈا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ماریو نے اس پر ریوالور تانا تو موسارٹ نے بھی اصلی کے بجائے نقلی ہیرا نکال کر اس کے سامنے کر دیا؟“

”بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔“

”گویا اصلی ہیرا ابھی اس کے پاس تھا؟“ مینڈی نے تصدیق کرنا چاہی۔

”ہاں، میرا یہی خیال ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم اس ہیرے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔“

مینڈی نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اس کے گھٹنوں کو چھو رہی ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ ٹوٹ ماریو کو ہوش آ گیا تھا اور وہ بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں چمکتے ہوئے ہیرے پر بھی تھیں۔ وہ حریصانہ انداز میں چلایا۔ ”یہ میرا ہے۔ یہ مجھے دے دو۔“

مینڈی نے وہ ہیرا ڈبیا میں رکھا اور اسے بند کر کے بوڑھے ماریو کی ٹانگ کے پاس زمین پر پھینک دیا۔ پھر اس نے برادر سائمن کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی آنکھوں پر سے نقاب اتار چکا تھا چنانچہ اس نے بھی ایسا ہی کیا پھر برادر سائمن مسکراتے ہوئے بولا۔

”شاید میں ہی غلطی پر تھا۔ یہ کافی نہیں کہ ہم کیا دیکھتے ہیں بلکہ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ کیسے دیکھتے ہیں۔“

مینڈی نے لمحہ بھر توقف کیا اور اپنی آنکھیں ملنے لگی پھر اس نے چاند کی طرف دیکھا جو پہلے کی نسبت چھوٹا اور دور ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں تو سوچ رہی تھی کہ ہم آج کی رات کو تاریخی بنا دیں گے۔“

”گویا تمہیں مجھ سے مایوسی ہوئی؟“

”نہیں، مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے۔ مجھے اسی وقت اسے بے ہوش کر دینا چاہیے تھا جب یہ موقع ہاتھ آیا تھا۔ نہ جانے اس وقت میں کیا سوچ رہی تھی۔“

”اپنے ذہن پر اتنا زور مت دو۔ یقیناً اس میں کوئی ایسی خوبی ہو گی جس کی وجہ سے تم اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔“

اس کی آواز مدھم ہوتی گئی پھر انہوں نے ایک دوسرے کو چاند کی روشنی میں دیکھا۔ دونوں کی دھڑکن پر ایک ہی ساز بج رہا تھا پھر برادر سائمن سنبھلتے ہوئے بولا۔

”میں نے پورا انتظام کر دیا ہے۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس پورے علاقے میں تمام ہیلی کاپٹروں کی نگرانی ہو رہی ہے۔“

”اگر وہ کسی ہیلی پیڈ پر نہیں اترا تو پھر کیا ہو گا؟“ مینڈی نے پوچھا۔

”پھر یہ تلاش جاری رہے گی۔“

”کم از کم آج کی رات نہیں۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔ ”اب میں گھر جا رہی ہوں۔“

”لیکن رات بہت ہو چکی ہے۔“ وہ تھوڑا سا جھجکتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے اجازت دو گی کہ تمہیں گھر تک چھوڑ سکوں؟“

مینڈی مسکرائی اور اس کا کندھا پکڑتے ہوئے بولی۔

”کیوں نہیں... مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان عاشق پروانوں کا ماجرا جو خاص جولاکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

تینتیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر... ایک للکار ہے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا.... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور جل پانی۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جیکی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین ہندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی بستی میں جا پہنچے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سا بر کا چیلنج کر ڈالا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ ہم بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفا خانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلادی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک آفتاب پر فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور مارا گیا۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور آباد پہنچ گئے مگر وہاں ہمیں پکڑ کر اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعد ازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ پھر میں نصرت سے ملا۔ نصرت نے مجھے ثروت کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ میں نے ثروت سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی نصرت کی بیماری کا پتا چلا۔ ہم نے اس کے علاج کا بندوبست بیرونِ ملک کر دیا۔ پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو کریدنے کی کوشش کی۔ عمران کی جانوروں میں دلچسپی کے باعث وہ جلالی صاحب کے تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ جلالی صاحب نے 23 مارچ کی چھٹی پر نہر کنارے باربی کیو کا اہتمام کیا۔ واپسی پر ہم جب فارم ہاؤس پہنچے تو پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے وہاں دھاوا بول کر سب کچھ تہس نہس کر ڈالا ہے۔ ایک گارڈ مارا گیا اور کئی ملازمین زخمی ہوئے۔ دو ملازماؤں کی آبرو ریزی کی گئی۔ پھر عمران نے اس واقعے کی چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور ہم جاوا کے گرگے سلطان کے اڈے پر پہنچ گئے۔ وہاں کافی لڑائی ہوئی اور عمران نے نادر ٹی کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہم نے وہاں پیش آنے والے واقعات کی ویڈیو بنائی تھی۔ ہم واپس فارم ہاؤس پہنچ گئے اور جلالی کو ویڈیو دکھائی۔ ایرانی بلی کے بچے کی خوش خبری بھی سنائی۔ اب یہاں ہماری حیثیت خاص اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے باغیچے میں فتح محمد کو کسی سے رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے چار پانچ آدمیوں کو شدید زخمی کر دیا مگر انہوں نے مجھے قابو کر لیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا بعد ازاں ان لوگوں نے فتح کو مار ڈالا۔ جلالی کے سیکریٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ پھر وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں عمران کو فون کر کے بلاؤں اور اسے شک نہ ہو۔ میں جاوا کے گارڈ کی رائفل کی زد پر تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ میں نے اس کے کہے پر عمل نہ کیا تو میری موت یقینی ہے۔ میں نے عمران کا نمبر ملا کر اسے حقیقت بتانے کی کوشش کی۔ اس جرم کی پاداش میں مجھ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔ پھر عمران مجھ تک پہنچ گیا۔ عمران اور راجا بھی بہت تپاک سے ملے۔ راجا کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران فارم ہاؤس آئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا، وہ کوما میں چلے گئے تھے۔ جلالی صاحب کے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مجسمہ بھی غائب تھا۔ پولیس پہنچ گئی تھی اور تفتیش کر رہی تھی۔ میں اور عمران اسپتال میں داخل مہناز کی والدہ کو لینے گئے، ان کی جان کو خطرہ تھا۔ ہم مہناز کی والدہ کو لے کر ڈیفنس والی کوٹھی پر آ گئے۔ ہم راجا کے پاس ہوٹل پہنچے تو پتا چلا کہ وہ سیکریٹری ندیم کو اٹھا لایا ہے۔ ہم نے اس پر تشدد کیا اور اس سے جاوا کے بارے میں پوچھا۔ میری ملاقات ثروت کے شوہر یوسف سے ہوئی۔ اس نے ہمیں ثروت اور نصرت کے پاکستان آنے پر پارٹی میں مدعو کیا۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے تھوڑا سا سراغ ملا۔ وہ جس جگہ ٹھہری تھی اور جس کے ہاں ٹھہری تھی، وہ شخص پولیس کی تحویل میں تھا۔ ایک دن جیلانی کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ یوسف کسی چکر میں ہے۔ وہ بازارِ حسن میں ایک کوٹھے پر موجود تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ ہم راجا کے پاس ہوٹل میں موجود تھے کہ ہمیں جاوا کے لوگوں نے گھیر لیا۔ ہم ہوٹل سے نکل کر باہر بھاگے۔ یہ رش والی جگہ تھی، یہاں دکانیں تھیں اور چہل پہل تھی۔ ہم ایک دو منزلہ عمارت میں گھس گئے۔ ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔ دکانوں کے شٹر تیزی سے گر رہے تھے۔ وہاں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ یہ لاہور کی ایک سنگین رات تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عمران نے سگریٹ سلگایا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ میں اور راجا بھی اس کام میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ جاوا کے لوگوں نے زبردست منصوبہ بندی کے ساتھ ہمیں گھیرا تھا۔ کم از کم دو گاڑیاں سامنے سڑک پر نظر آ رہی تھیں۔ ایک ایک دائیں بائیں موجود تھی۔ اس کے علاوہ درجنوں افراد تھے جنہوں نے یہاں وہاں پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ عقبی جانب بھی ایک دو گاڑیاں موجود ہوں گی۔ ہم جس عمارت میں تھے، یہ بمشکل دو ڈھائی مرلے میں ہو گی۔ تاہم اس کی تین منزلیں تھیں، ہم دوسری منزل پر موجود تھے۔ تیسری منزل کا پتا ہمیں ابھی چلا تھا۔

میری نظر جاوا گروپ کی ایک کوسٹر ٹائپ گاڑی پر پڑی۔ اس کی چھت پر کوئی چیز نصب تھی، جیسے کوئی بڑی گن وغیرہ ہو۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ ایک مووی کیمرا ہے۔

''وہ دیکھو، اس گاڑی کی سائڈ پر کیا لکھا ہے؟'' عمران نے کہا۔

میں نے پڑھا۔ یہ ''ایس ایم گل فلمز لمیٹڈ'' کے الفاظ تھے۔ نیچے ملتان روڈ لاہور کا پتا درج تھا۔

''یہ تو کوئی شوٹنگ والوں کی گاڑی لگتی ہے۔'' میں نے کہا۔

ابھی مشکل سے میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ اس گاڑی کے عقب سے ہم پر رائفل کے تین چار فائر ہوئے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہم جس کمرے میں موجود تھے، اس کے سامنے والے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ ایک گولی راجا کے سر کے پاس سے گزری، وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔

''یہ لوگ آج ہمارے جنازے تیار کرنے کا پورا ارادہ رکھتے ہیں۔'' عمران نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''اور اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک پستول اور پانچ گولیاں ہیں۔'' میں نے عمران کا فقرہ مکمل کیا۔

''پانچ نہیں دو۔'' عمران نے مغموم انداز میں کہا۔ ''ایک ایک گولی تو ہمیں بھی چاہیے ہو گی، آخر میں خودکشی فرمانے کے لیے۔''

راجا نے کہا۔ ''یار! ایک دم کنڈم کام ہوا ہے۔ ہر وقت بیچ بیچ کلو کے پستول ساتھ لیے پھرتے ہیں اور آج لوڑ پڑی ہے تو تین بندوں کے پاس صرف ایک پستول ہے۔''

یکایک پھر فائر ہوئے۔ یہ آٹومیٹک رائفل کے فائر تھے۔ چھ سات گولی کا برسٹ تھا۔ ہماری دائیں جانب والی دیوار کا بہت سا پلاستر اکھڑ کر نیچے جا گرا۔ المونیم کی ایک سیڑھی اچھل کر دیوار سے ٹکرائی اور پھر راجا کے سر میں لگی۔ اس نے سیڑھی اور سیڑھی گرانے والوں کو گالیاں دیں۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے تین چار سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ ان لائٹس نے اس چھوٹی سی بلڈنگ کو بقعۂ نور بنا دیا۔ ہم جہاں موجود تھے، یہ قریباً پندرہ ضرب تیس فٹ کا ایک ہال نما کمرا تھا۔ یہاں دواؤں کے خالی کارٹن پڑے تھے۔ دو آہنی الماریاں تھیں۔ دو تین المونیم کی کرسیاں تھیں۔

ہم آہنی الماریوں کے پیچھے پناہ لے سکتے تھے یا پھر دیوار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا جو ہمیں سامنے سے تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔ یکایک اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں مینہ کی طرح ہمارے اردگرد برسیں۔ یوں لگا کہ حملہ آور ہمارے سمیت اس پورے کمرے کو چھلنی کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ڈھائی تین فٹ چوڑی دیوار کے عقب میں دبک گئے اور ہال کمرے کا کباڑا ہوتے دیکھتے رہے۔

تین چار منٹ کی زوردار فائرنگ کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہوئے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے پورا ہال کمرا شیشے کی کرچیوں، پلاستر کے ٹکڑوں اور لکڑی کے پرخچوں سے بھر گیا۔ خاموشی ہوئی تو ہمیں لوگوں کی پکارتی ہوئی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی سائرن سنائی دیا۔ شدید فائرنگ کی آواز نے پولیس کو متوجہ کر لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے دیکھا کہ دو موٹر سائیکلوں پر سوار چار پولیس والے سامنے سڑک پر نظر آئے۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے انہیں گنجے سر والے ایک موٹے شخص سے باتیں کرتے بھی دیکھا۔ ان کے قریب سلطان چٹا کی جھلک بھی نظر آئی۔ ہمیں یوں لگا کہ پولیس والے صورتِ حال کی سنگینی کو شدت سے محسوس نہیں کر رہے۔ ان کی موجودگی میں ہی ہماری طرف آٹھ دس فائر مزید ہوئے۔ وہ ایک طرف کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ اسی دوران میں میری نظر ایک مووی کیمرے پر پڑی۔ سڑک کے پار وہ کیمرا ایک برآمدے کے ستون کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ کیمرا مین غالباً دکان کے چوکور ستون کی اوٹ میں تھا۔ اچانک میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! لگتا ہے یہاں ہمارے ساتھ وہی ڈراما ہو رہا ہے جو ہم نے کچھ دن پہلے مال روڈ پر سلطان چٹے کے ساتھ کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''وہاں ہم شوٹنگ کی آڑ میں سرِعام سلطان چٹے کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر، گن پوائنٹ پر گاڑی میں لے آئے تھے۔ شاید اب یہاں شوٹنگ میں ہمارا کام تمام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

اسی دوران میں عمران کی نظر بھی مارکیٹ کے ستون کے ساتھ موجود مووی کیمرے پر پڑ گئی۔ اس نے تشویش ناک انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ یہ ایک زبردست چال تھی... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سلطان چٹا نے عمران ہی کی ایک زبردست چال کو اس پر الٹ دیا تھا۔ اس بھرے پُرے بازار میں ہم پر اندھا دھند فائرنگ کی جا رہی تھی اور بیشتر لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ شوٹنگ ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے کیمرے، سرچ لائٹس، اسٹوڈیو کی گاڑیاں، یہ سب کچھ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے کافی تھا لیکن ایک بات حیرت کی بھی تھی۔ پولیس والے بھی دھوکے میں آ گئے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''یہ کیا چکر ہے بھئی... کیا پولیس والوں کو پتا نہیں چل رہا کہ فائرنگ اصلی ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ ہماری پولیس ہے۔ نقلی پولیس مقابلے کر کر کے یہ اصلی نقلی کی پہچان کھو چکی ہے۔" عمران نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی چکر ہی لگ رہا ہے۔" راجا نے ایک الماری کے پیچھے دبکے دبکے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ پہلے سے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔"

اس وقت تو ہم نے راجا کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن بعدازاں راجا کی بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔ چند مقامی اہلکاروں نے رشوت کھائی تھی اور جان بوجھ کر موقع سے دور رہے تھے۔

سرچ لائٹس کے زاویے درست ہوئے اور ایک بار پھر ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ اب فائرنگ کا زاویہ بدل گیا تھا۔ بائیں طرف سے جو تڑتڑا فائر آ رہا تھا، وہ ہم سے ڈھائی فٹ چوڑی دیوار والی پناہ گاہ بھی چھین رہا تھا۔ گولیاں سرسراتی ہوئی ہمارے پہلو سے گزر رہی تھیں۔ فائرنگ کا یہ دورانیہ قریباً چار منٹ کا تھا۔ لوہے کی الماریوں میں درجنوں سوراخ ہو چکے تھے اور ان میں سے چھ سوراخ آر پار بھی تھے۔ اس بار جب فائرنگ تھمی تو پولیس اہلکار موقع سے اوجھل نظر آئے۔ وہ اس "دلچسپ ترین" شوٹنگ کو اس کے حال پر چھوڑ کر کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

"موبائل ہے تمہارے پاس؟" عمران نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے موبائل نکالا۔ اس کی چارجنگ آخری اسٹیج پر تھی۔ عمران نے جلدی جلدی.... ایس پی حمزہ صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ ابھی تین چار بار بیل ہی ہوئی تھی کہ چارجنگ ختم ہو گئی اور موبائل خاموش ہو گیا۔ "اوہ شٹ!" عمران نے موبائل میری طرف پھینکا جسے میں نے دبوچ لیا۔

"تمہارا موبائل کہاں ہے؟" عمران نے راجا سے پوچھا۔

راجا نے شلوار کی جیب میں سے اپنا رنگ دار پھنچر موبائل نکالا۔ عمران نے اس پر نمبر پریس کیے اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "تم سے یہی امید تھی بھا راجا۔"

"کیا ہوا؟"

"وہی تمہاری کنجوسی اور غربت کا اشتہار چل رہا ہے۔ کال ملانے سے پہلے اپنا اکاؤنٹ ری چارج کر لیجیے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے بھا راجا۔"

عمران کی تشویش درست تھی۔ اس وقت فوری ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم کسی طرح باہر رابطہ کریں اور اپنے لیے مدد طلب کریں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے ٹیلی فون کا موٹا کالا تار الماریوں کے عقب میں جاتا نظر آیا۔ میں نے اس تار کا تعاقب کیا اور سیڑھیوں کے قریب ایک سائڈ بورڈ میں رکھے ہوئے فون سیٹ تک پہنچ گیا۔ فون کو تالے میں رکھا گیا تھا۔ عمران نے پستول کے دستے کی پے در پے ضربوں سے تالا توڑ دیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا، بار بار کریڈل کو دبایا لیکن فون بالکل بے جان تھا۔ اندازہ ہوا کہ اس کا تار شاید باہر سے کاٹ دیا گیا ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

"ہاں بھئی، یہ تو باندھ کر مار رہے ہیں۔" عمران نے پُرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

سائڈ ٹیبل کے پیچھے سے چوں چوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ہم نے دیکھا، یہ رنگین طوطوں والا ایک درمیانے سائز کا پنجرہ تھا۔ معصوم پرندے صورتِ حال کی سنگینی سے بالکل بے خبر اپنی خوش الحانی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یکایک میں چونک گیا۔ یہ خوش الحانی نہیں، نوحہ تھا شاید.... پنجرے کے قریب خون کی ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو کئی طوطے مرے پڑے تھے اور ایک زخمی حالت میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ یہ خون ریزی اس اندھا دھند فائرنگ کا نتیجہ تھی جو کچھ دیر پہلے تک ہم پر جاری رکھی گئی تھی۔

ٹیلی فون تک پہنچنے کی کوشش میں ہم اس آڑ سے آگے نکل آئے تھے جو ہمیں تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ دفعتاً پھر فائرنگ ہوئی۔ عمران کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹیلی فون سیٹ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرایا اور کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک گولی راجا کو لگی۔ وہ بازو پکڑ کر دُہرا ہوا اور پھر فرش پر لیٹ گیا۔ ہم فرش پر رینگتے ہوئے پھر اس سامنے والی دیوار کے پاس پہنچ گئے جس کی ڈھائی فٹ چوڑائی ابھی تک ہماری زندگی کی ضمانت بنی ہوئی تھی۔

عمران نے کہا۔ "کچھ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو مارے جائیں گے۔"

میں نے پلٹ کر راجا کا بازو دیکھا۔ وہ لہولہان تھا۔ گولی اس کی کہنی کے پاس سے گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے اس کا خون بند کرنے کے لیے کس کر رومال باندھ دیا۔

"کتے کے بچے، چور.... نقال۔" عمران غصے سے بڑبڑایا۔

"کون چور؟" راجا نے پوچھا۔

"یار! یہی جاوا اور سلطان چنا۔ یہ نقالی اور چربہ سازی نہیں تو اور کیا ہے۔ انھوں نے ہماری اجازت کے بغیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارا طریقہ استعمال کیا ہے اور ہم پر ہی استعمال کیا ہے۔ یہ کاپی رائٹس کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں تو اس بارے میں شور مچاؤں گا اپنے چینل پر۔ ان پر کیس کروں گا۔ دیکھو کیسی دیدہ دلیری ہے۔ وہی کیمرے، وہی شوٹنگ کا بہانہ، وہی سب کچھ۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے بھی کچھ اصول ہوا کرتے تھے لیکن اب تو زمانہ ہی خراب آگیا ہے۔"

"یہ طنز و مزاح کا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ بولا۔

ہم دونوں فرش پر تقریباً رینگتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر دوسری منزل کی چھت پر آ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ اس مختصر بلڈنگ کی تیسری منزل بھی ہے۔ وہاں تک لوہے کی سیڑھی جاتی تھی۔ اوپر منڈیر وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ بس پانی کی ٹنکی رکھی تھی۔ ہم دونوں بڑی احتیاط سے چھت پر پہنچے۔ اوندھے منہ لیٹے لیٹے ہم نے اطراف کا جائزہ لیا۔ آس پاس ایسی کوئی چھت نہیں تھی جس پر کود کر اس جان لیوا گھیرے سے نکلا جا سکے۔ قریب ترین چھت کا فاصلہ بھی پچیس فٹ سے کم نہیں تھا۔ درمیان میں ایک سڑک تھی۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی یہ چاہتا کہ چھلانگ لگا کر اس خلا کو عبور کر لے تو یہ ممکن نہیں تھا۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں تھا۔ شاید میں اس کا دو تہائی فاصلہ بھی عبور نہ کر سکتا۔ عمران سرکس کا منجھا ہوا فن کار تھا اور ایک پروفیشنل بازی گر بھی لیکن میرے اندازے کے مطابق اس کے لیے بھی یہ کام ممکن نہیں تھا۔ چھت پر بھاگ کر چھلانگ لگانے اور پھر نا کام رہ جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ بھاگنے والا پینتیس چھتیس فٹ نیچے پختہ سڑک نما گلی میں گرتا۔ شدید زخمی ہوتا اور پھر جاوا کے غنڈوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔

عمران نے نگاہوں نگاہوں میں فاصلے کو بھانپا، اپنے جسم کو تولا مگر کوئی عملی قدم اٹھانے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ وہ دلیر تھا مگر بے وقوف نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ہم میں سے کم از کم کوئی ایک ساتھ والی بلڈنگ تک پہنچ جائے اور وہاں سے بذریعہ فون یا موبائل فون حمزہ صاحب سے رابطہ کرے۔ انھیں بتائے کہ یہاں مزنگ چونگی کے قریب کیسا سنگین ڈراما ہو رہا ہے۔

اسی دوران میں ایک بار پھر میڈیکل اسٹور والی بلڈنگ کی دوسری منزل کو اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ دیکھے بغیر گولیاں چلا رہے ہیں اور بلڈنگ سمیت ہر شے کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر نیچے والی چھت پر آ گئے۔ نیچے سے راجا کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "اوئے عمو! لگتا ہے کہ ہمارا آخری ویلا آ گیا ہے۔ بڑا ٹیٹ کام ہو گیا ہے۔ وہ ذلیل ہور پاس آ گئے ہیں۔ پورے کمرے وچ فائر آ رہا ہے۔"

"تم چھت پر آ جاؤ۔" عمران نے پکار کر کہا۔

جواب میں راجا نے کچھ کہا لیکن اس کی آواز ایک خوفناک دھماکے میں دب کر رہ گئی۔ یوں لگا کہ بلڈنگ کی ساری دیواریں ہل گئی ہیں۔ "یہ دستی بم تھا۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راجا کو آوازیں دینے لگا۔ "راجا... راجا! کہاں ہو؟"

دوسری طرف خاموشی رہی... پھر چند سیکنڈ بعد راجا کی کھانستی ہوئی آواز آئی... وہ جاوے کی ماں، بہن ایک کر رہا تھا اور دھوئیں میں سے راستہ بناتا ہوا چھت کی طرف آ رہا تھا۔ ایک لحاظ سے اس نے عمران کی ہدایت پر کمرا چھوڑ کر ٹھیک ہی کیا تھا۔ اب وہ پورا کمرا گولیوں کی زد میں تھا۔ میں نے ایک زخمی طوطے کو دیکھا جو اڑنے کی کوشش میں چھت پر چلا آیا تھا اور اب جان کنی کے عالم میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"چھلانگ لگانی پڑے گی۔" عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر زیرِ لب کہا۔

"لیکن کیسے؟"

"ایسے۔" اس نے ایک چھتری پکڑ لی۔ "جیمز بانڈ کی طرح اسے کھول کر نیچے کود جاتا ہوں۔"

"بکواس نہ کرو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی۔ اس نے مجھ سے اپنا پستول لیا اور پھر اس کے ذریعے اپنی نشانے بازی کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اس کی چلائی ہوئی دو گولیوں نے دو سرچ لائٹس کو چھناکوں کے ساتھ تاریک کر دیا۔ یہی لائٹس تھیں جو بالائی چھت کو روشن کر رہی تھیں۔ جونہی چھت تاریک ہوئی، عمران چھتری سمیت بالائی چھت پر پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ اب اسے روکنا فضول ہے۔ چھتری ابھی تک بند تھی۔ عمران نے اسے الٹا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھت پر دوڑتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ایک بار پھر اسی عمران کی جھلک نظر آئی جو اسٹار سرکس میں پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر کسی حفاظتی جال کے خطرناک آئٹم کرتا تھا اور لوگوں کی سانسیں سینوں میں اٹک جاتی تھیں۔ اس نے

بھرپور چھلانگ لگائی۔ اس کے سامنے بجلی کے تین عدد مین تار تھے۔ اس نے چھتری کا مڑا ہوا دستہ سب سے نیچے والے تار میں اٹکا دیا اور ایک ہی حرکت میں اپنے جسم کو جھلاتا ہوا دوسری چھت پر پہنچ گیا۔ اس کی یہ برق رفتار موومنٹ بالکل اسی جست کی طرح تھی جو وہ سرکس میں لگاتا تھا۔ ایک جھولے سے چھلانگ لگا کر دوسرے جھولے کو پکڑتا اور پھر اپنے جسم کو جھلا کر تیسرے جھولے پر پہنچ جاتا۔ پچاس فٹ کی بلندی پر دکھائے جانے والے اس کرتب کے دوران میں اس کے نیچے کوئی حفاظتی جال بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے کچھ ایسی ہی مہارت دکھائی تھی۔ اس چھلانگ کی خوب صورتی کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ اس نیم تاریک چھت پر اس کی یہ ''موومنٹ'' بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

میں اور راجا اب چھت پر تھے۔ اس طرف فائرنگ کا زور کم تھا مگر اسے بتدریج بڑھنا تھا۔ ہم کسی جانب سے کود بھی نہیں سکتے تھے۔ دستی بم کے دھماکے کے سبب راجا کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا اور اس کے کان بند ہو گئے تھے۔ مجھے اس سے چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا زخمی بازو بھی مسلسل خون اگل رہا تھا۔ وہ کراہا۔ ''ہمارے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں۔ وہ اوپر آ گئے تو ہمیں سیدھا سیدھا ذبح ہونا پڑے گا۔''

''گھبراؤ نہیں یار! تمہارا عمو ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔''

اور واقعی اس نے کیا اور اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ مشکل سے چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ ہمیں فائرنگ کے شور کے بیچ میں کافی فاصلے پر ایک بار پھر سائرن کی آواز سنائی دی۔ ہم بجا طور پر توقع کر سکتے تھے کہ یہ پولیس گاڑیوں کے سائرن ہوں گے۔ نیچے فائرنگ میں بہت شدت آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ حملہ آور دہشت میں ہر شے کو اڑا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دستی بم کا ایک اور دھماکا ہوا اور اوپر والا ہال گرد اور دھوئیں سے بھر گیا۔ کسی گوشے میں آگ بھی بھڑک اٹھی تھی۔

آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب حملہ آور سیڑھیوں کے بالکل پاس پہنچ گئے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اوپر آنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ میں نے خود کو مارا ماری کے لیے تیار کر لیا۔ بدن میں عجیب سی ترنگ جاگ اٹھی۔ اب ایسی صورتِ حال مجھے لرزہ براندام کرنے کے بجائے جوش سے بھر دیتی تھی۔ بہرحال، اس کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائرن کی آوازیں قریب آ گئیں۔ اندازہ ہوا کہ تین چار پولیس موبائلز آس پاس پہنچ گئی ہیں۔ یکایک فائرنگ تھم گئی۔ میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلتا ہوا چھت کے سامنے والے حصے کی طرف گیا اور احتیاط سے نیچے جھانکا۔ سڑک پر افراتفری تھی۔ دو سرچ لائٹس تو عمران نے توڑ دی تھیں، باقی بھی بجھ گئی تھیں۔ ایس ایم فلمز والی گاڑی تیزی سے یوٹرن لے کر مین روڈ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ حملہ آوروں کی دیگر گاڑیاں بھی حرکت میں تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد دو پولیس موبائلز شور مچاتی ہوئی موقع پر پہنچ گئیں۔ پولیس اہلکار چھلانگیں لگا کر نیچے اترنے لگے۔ میں اور راجا نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ اس حملے کا ڈراپ سین تھا۔

درحقیقت یہ عمران کی ایمرجنسی فون کال ہی تھی جس پر حمزہ صاحب فوراً حرکت میں آئے اور انہوں نے وائرلیس پر ہنگامی پیغام چلوایا۔ اس کے فوراً بعد علاقے میں موجود گاڑیاں ''خونی شوٹنگ'' کو ختم کرانے کے لیے موقع واردات کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ہم نے سب سے پہلے راجا کے بازو کی مرہم پٹی ایک پرائیویٹ کلینک سے کروائی۔ اس کے بعد عمران کے اندرونِ شہر والے گھر میں پہنچ گئے۔ اس گنجان بازار میں عمران کے بہت سے پرستار تھے جو اس کی آمد پر خوشی سے کھل اٹھتے تھے۔ وہ ان سب کا ہیرو بھائی تھا۔ بڑی عمر کے لوگ اسے ہیرو پتر یا عمران بیٹا کہہ کر پکارتے تھے لیکن جس وقت ہم محلے میں پہنچے، ہُو کا عالم تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سب سو چکے تھے۔

میری یاد دہانی پر عمران نے سب سے پہلے اقبال کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ اور امتیاز، جاوا کے ساتھیوں کی نظر میں آ چکے ہیں، لہٰذا اپنے کسی بھی ٹھکانے سے دور رہیں... خاص طور سے ڈیفنس والے گھر تو بالکل بھی نہیں جائیں۔ میں نے ڈیفنس میں جیلانی کو فون کر کے یہی ہدایات دے دیں اور کوٹھی کی سیکیورٹی مزید سخت کرنے کے لیے بھی کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ میں نے ناشتے کے بعد عمران سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو راجا کے یار اشفاق رانا کی خبر لینی ہے۔ سنا ہے کہ صبح سویرے اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہوٹل میں گولی چلی ہے۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ایک تو ممکن ہے کہ راہی عدم ہو جائے۔''

''اچھا... اس کے بعد؟''

''اس کے بعد سیدھا سیدھا چلتے ہیں شاربہ بائی کے پاس۔ اس کو دو لاکھ روپیا دیتے ہیں اور ''چندو'' جی کے لیے اپنی بکنگ پکی کر لیتے ہیں۔ یار سچی بات ہے، کبھی کبھی تو میرے دل میں آتا ہے کہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا ہی لوں۔ سلور اسکرین کے ایسے جگمگاتے ستارے کے ساتھ شب بسری کا موقع مل رہا ہے۔ اسے اپنی حماقت سے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یار! کیا رقص کرتی ہے وہ، لگتا ہے کہ کسی شعلے کو برف کے کپڑے پہنا دیے گئے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے کہا۔

''یار! جب شعلے کو برف کے کپڑے پہنائیں گے تو وہ کم ہوتے جائیں گے نا۔ یہی کچھ ہماری اس ہیروئن کے رقص میں ہوتا ہے۔ ادھر کپڑے پگھلتے ہیں، ادھر لوگ پگھلتے ہیں۔ ایک دو بار تو ٹی وی پر اس کا جلوہ دیکھ کر میں نے بھی آہیں بھری ہیں۔''

''لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے تجزیے کے مطابق شاربہ بائی جس ''ہیروئن'' کی بکنگ کرے گی، وہ اصلی نہیں ہو گی۔ کرشمہ کپور اور ایشوریا رائے کی طرح ڈمی ہو گی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

عمران نے مغموم چہرہ بنا لیا۔ ''ہاں، یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''لیکن یار! کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی دفعہ نقل، اصل سے بھی بڑھ جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم صرف مسخری کر رہے ہو۔ اب تم شاربہ بائی کی طرف نہیں جا سکتے، نہ ہی میں یا اقبال جا سکتے ہیں۔ شاربہ بائی کے کوٹھے سے ہی تو یہ لوگ ہمارے پیچھے لگے تھے۔''

''لیکن جگر! اگر ہم وہاں نہیں جائیں گے تو تمہارے رقیبِ روسیاہ یوسف ثانی کے بارے میں ثبوت کیسے ملیں گے؟ اور جب ثبوت نہیں ملیں گے تو تم ثروت کا ذہن کیسے بدلو گے اور اگر تم اس کا ذہن نہیں بدلو گے تو وہ اپنی ''شوہر پرستی'' کے گھیرے سے کیسے نکلے گی؟ اور اگر وہ گھیرے سے نہیں نکلے گی تو تمہاری بانہوں کے گھیرے میں کیسے آئے گی... اور اگر وہ تمہاری بانہوں کے گھیرے میں نہیں آئے گی تو... تو مجھے ٹھنڈ کیسے پڑے گی...''

''تمہیں ٹھنڈ پڑے نہ پڑے پھنڈ ضرور پڑ جائے گی۔'' میں نے اس کی طرف مکا تانا۔ وہ سہم جانے کی اداکاری کرتا ہوا چپ ہو گیا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے۔ وہ یقیناً شاربہ بائی، یوسف اور فلمی ہیروئن کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور اس اَنوکھی ڈیل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک دن پہلے شاربہ بائی اور یوسف کے درمیان ہوئی تھی۔

... ایس پی حمزہ صاحب بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن ڈاکٹر مہناز اور ڈاکٹر رسام کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ نہ ہی ابھی تک ڈاکٹر مہناز نے اپنی والدہ یعنی آنٹی جمیلہ سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ آنٹی ابھی تک ہماری حفاظتی تحویل میں تھیں۔ جیلانی رکشا ڈرائیور گلو کی نگرانی بھی کر رہا تھا کہ شاید اسی کی طرف سے مہناز کا کوئی سراغ لگ جائے... یقیناً مہناز شدید خطرے میں تھی۔ یہ بات اب کوئی بھید نہیں رہی تھی کہ وہ جلالی صاحب کے گھر سے بدھا کی مورتی آرا کوئے لے کر اوجھل ہو گئی ہے۔ اب درجنوں لوگ اور گروہ آرا کوئے کے پیچھے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کے ہتھے بھی چڑھ سکتی تھی۔ وہ اپنی ذات میں عجیب لڑکی تھی۔ اس نے ایک بوڑھے کی مسیحائی کی اور اس مسیحائی میں اتنا آگے چلی گئی کہ اس جاں بلب شخص کی بیوی تک بننا پسند کر لیا۔

جلالی صاحب بدستور کومے کی حالت میں تھے۔ حمزہ صاحب نے ان کی حفاظت کے لیے اسپتال میں خصوصی گارڈ مہیا کر دیے تھے۔ عمران کو بھی اس بات کا شبہ تھا کہ جلالی صاحب کے اردگرد پُراسرار سرگرمیاں جاری ہیں۔

عمران کی ہدایت کے مطابق جیلانی بدستور یوسف کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسی رات نو بجے کے قریب ہمیں جیلانی کی طرف سے ایک اہم کال موصول ہوئی۔ اس نے عمران کو بتایا کہ اس کے اندازے کے مطابق آج کی رات کافی اہم ہے۔ لگتا ہے کہ آج یوسف مشہور فلمی ہیروئن کے ہاں جائے گا اور شاید رات گئے تک وہاں رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ بتا رہا تھا کہ یوسف اور شاربہ بائی میں جو ڈیل ہوئی تھی، وہ آج پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''چلو بھئی تیار ہو جاؤ۔''

''کس لیے؟''

''اپنے رقیبِ روسیاہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے۔''

''نہیں عمران! میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس کی وجہ سے ثروت مجھ سے مزید بدظن ہو جائے۔ اگر یوسف غلط کاریاں کر رہا ہے تو وہ خود ہی ایکسپوز ہو جائے گا۔''

''یار! پھر وہی ہندی فلموں والے ڈائیلاگ... نہیں کرشنا! میں کوئی ایسا کرتے نہیں کروں گا جس کے کارن رادھا کے من میں میری طرف سے میل آ جائے۔ میں اپنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیون تیاگ دوں گا لیکن یہ ہر دل بھر شاٹ مجھ سے نہیں ہو گا۔ خدا کے لیے یار... خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ حقیقت کو دیکھو۔ ہم ثروت کے شوہر پر کوئی جھوٹا سچا الزام تو نہیں لگا رہے، صرف اصلیت جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"لیکن اگر..."

"کچھ نہیں ہوگا یار! ہم جو کچھ کریں گے، ایک فاصلے پر رہ کر کریں گے۔ بڑے محتاط طریقے سے۔"

دس بجے کے فوراً بعد ہم جیلانی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ گلبرگ کے نزدیک ایک پوش کالونی میں ایک کنال کی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد درختوں کی بہتات تھی۔ جیلانی اپنی موٹر سائیکل پر یوسف کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ جونہی ہماری مہران گاڑی سڑک کے کنارے ایک سنسان نرسری کے قریب رکی، ایک جانب تاریکی میں سے جیلانی برآمد ہوا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔

عمران اسے بے تکلفی سے شیخ یا... "یا شیخ" کہتا تھا، وہ بولا۔ "یا شیخ! کیا رپورٹ ہے؟"

جیلانی بولا۔ "میرا اندازہ درست تھا۔ یوسف وہیں پر پہنچا ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر غیاث احمد جیونا کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہوگا۔ شاربہ بائی بھی اپنے نام کے ساتھ غیاث کا نام استعمال کرتی ہے۔ یہ یقیناً اس کا کوئی عاشق یا سابقہ شوہر وغیرہ ہے۔"

"یوسف اکیلا ہی آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی، کافی بنا ٹھنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فلمی ہیروئن سے ملاقات ہے۔ اس کے پہنچتے ہی گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ گاڑی سیدھی پورچ میں لے گیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ہم تینوں چونک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار کوٹھی کے قریب پہنچ کر آہستہ ہوئی اور گیٹ کی طرف مڑ گئی۔ کار کی پچھلی کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ پھر بھی سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کی روشنی کار کے اندر گئی تو ایک سیکنڈ کے لیے ہمیں اندرونی جھلک نظر آئی۔ پچھلی نشست پر کوئی جھلملاتی ہوئی حسینہ موجود تھی۔ ہم اس کے خدوخال نہیں دیکھ سکے۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ ایک خوبرو چہرہ وہاں موجود ہے۔

کار کے پہنچتے ہی باوردی گارڈ نے گیٹ کھول دیا اور کار کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ بند کر دیا۔ چاروں طرف ایک بار پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ یہ خالص رہائشی علاقہ تھا۔ اس اندرونی سڑک پر بس کبھی کبھار ہی کسی گاڑی کی روشنی چمکتی تھی۔ ہماری بائیں جانب واقع نرسری میں سے ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی لیکن یہ خوشبو بھی تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی۔ کوٹھیوں کے دروازے بند تھے اور چار دیواریاں خاموش تھیں۔ یہ چار دیواریاں ہی جانتی تھیں کہ ان کے اندر کیا ہو رہا ہے یا شاید یہ چار دیواریاں بھی نہیں جانتی تھیں۔ ان کی حیثیت ان گارڈز اور دربانوں جیسی تھی جو پرشکوہ کوٹھیوں محلات کے گرد موجود ہوتے ہیں۔ اندر آنے اور باہر جانے والوں کو دیکھتے ہیں۔ مختلف اندازے لگاتے ہیں لیکن ان کی اصل مصروفیات کے بارے میں جان نہیں سکتے۔ بالکل ہم تینوں اندازے تو لگا رہے تھے اور شاید ٹھیک اندازے لگا رہے تھے لیکن چشم دید گواہ نہیں تھے۔

ہم جانتے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک پری چہرہ اندر داخل ہوئی ہے اور اس سے بھی تھوڑی دیر پہلے اس کا خریدار اندر داخل ہوا تھا۔ اب وہ دونوں کسی پرتعیش کمرے میں موجود تھے۔ کسی نے اپنا "وقت" بیچنا تھا اور کسی نے اپنی ادائیگی کی قیمت وصول کرنا تھی۔

عمران نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ اچھا موقع ہے کہ ہم جان سکیں کہ ہیروئن اصلی ہے یا نقلی۔"

"کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

عمران نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر پریس کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوا تو اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ ہم بھی گفتگو سن سکیں۔ دوسری طرف اسٹار سرکس کے مالک اور عمران کے پرانے محسن جان محمد صاحب تھے۔ علیک سلیک کے بعد عمران نے کہا۔ "جان انکل! میں نے پرسوں ایک کام کہا تھا آپ سے۔"

"کون سا؟"

"وہی ہیروئن صاحبہ والا۔ ایک بار اس کی آواز سن لوں تو دل کو تسلی ہو۔ آج کل بڑا دل آیا ہوا ہے اس پر۔ اپنی نئی ٹی وی سیریل میں تو اس نے مجھ جیسے کنواروں کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔"

"تم بہت بڑے بدمعاش ہو۔ میں جانتا ہوں یہ کوئی اور چکر ہے۔" جان صاحب نے کہا پھر ذرا توقف سے بولے۔ "کل میں نے رابطہ کیا تھا چندو سے۔ کسی میٹنگ میں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے سرکس کا سپر اسٹار عمران دانش تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ تھوڑا بہت جانتی ہے تمہارے بارے میں۔ کم از کم نام تو سنا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ عمران آج کل زبردست "اسٹنٹ" کر رہا ہے۔ تمہاری اگلی فلم کے لیے شاندار کام کر سکتا ہے۔ وہ بات کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے راضی تھی۔ یہ اس کا نمبر نوٹ کر لو۔"

اس کے بعد جان صاحب نے عمران کو ایک موبائل اور ایک پی ٹی سی ایل نمبر نوٹ کرایا۔ عمران نے شکریہ کہہ کر جان صاحب سے بات ختم کر دی اور پی ٹی سی ایل نمبر پر کال کی۔ کئی دفعہ کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ بس بیل جا رہی تھی۔ عمران نے موبائل نمبر ڈائل کیا۔ ہیروئن کی کسی سیکریٹری نے فون اٹھایا۔ سیکریٹری کی آواز کے ساتھ بہت سا شور و غل بھی سنائی دے رہا تھا۔ عمران نے اپنا تعارف کرایا تو کچھ دیر بعد معروف ہیروئن خود لائن پر آ گئی۔ اس کی آواز ہم سب کے لیے جانی پہچانی تھی۔ آواز کے پس منظر میں اسپورٹس کاروں اور موٹر بائکس وغیرہ کا بہت سا شور سنائی دے رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ کوئی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست نکلا۔ ہیروئن نے بتایا کہ وہ شوٹنگ پر ہے اور اس کا اگلا شاٹ تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "جان صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا... اس وقت تو میں مصروف ہوں۔ کسی دن شام کے وقت فون کر کے اسٹوڈیو آ جائیں، آپ سے بات ہوگی۔"

"بہت مہربانی، بہت شکریہ۔" عمران نے ریشہ خطمی ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ضرور حاضر ہوں گا۔ اپنے اسٹنٹس کی ویڈیو بھی لاؤں گا۔"

"اوکے۔" ہیروئن صاحبہ نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نہ عمران کو وہاں جانا تھا، نہ اسے جانے کی ضرورت تھی۔ وہ فلمی نہیں اصلی ہیرو تھا۔ سلور اسکرین کے ہیرو، ہیروئن اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ہم جو جاننا چاہتے تھے، ہم نے جان لیا تھا۔ معروف فلمی ہیروئن اس کوٹھی میں نہیں کسی فلم کی لوکیشن پر تھی۔ یہاں یوسف فاروقی کے پاس دو نمبر مال تھا۔ پرتعیش بیڈ روم کی ریشمی نیم تیرگی میں غالباً، نشے میں ڈوب کر یوسف جن پسندیدہ خدوخال پر اپنی بے تابیاں نچھاور کر رہا تھا، وہ اصلی نہیں تھے... یقیناً یہ کوئی زبردست قسم کی مشابہت ہوگی، جس سے گھاگ ترین گاہکوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہوگا۔ مجھے کرشمہ کپور اور ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی لڑکیاں یاد آ گئیں۔ خاص طور سے سوہنی نامی لڑکی کی فلم اسٹار ایشوریا رائے سے مشابہت تو حیرت انگیز تھی۔ راجا اس کا قرب حاصل کرنے کے بعد اس کا دیوانہ سا ہو رہا تھا۔

ہماری مہران ایک درخت تلے گرین بیلٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی ساتھ والی کوٹھی میں بطور مہمان آئے ہیں۔ خواتین شاید اندر گئی ہیں اور ہم باہر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دو تین بار گارڈ ہمارے قریب سے گزرا لیکن اس نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ یوسف کو کوٹھی کے اندر گئے اب قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہونے والا تھا۔ ابھی اس کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہم نے جیلانی کو وہیں چھوڑا اور خود لبرٹی مارکیٹ آ گئے۔ اگلے روز ایک تہواری چھٹی تھی، لہٰذا ویک اینڈ کا سا ماحول تھا۔ رات کا ایک بج چکا تھا مگر مارکیٹ میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ ٹی وی کے کسی غیر ملکی چینل پر فٹ بال کا ایک زبردست میچ جرمنی اور اسپین کے درمیان دکھایا جا رہا تھا۔ ہم چائے پیتے رہے اور دلچسپی سے میچ دیکھتے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا کب تین بج گئے۔ سیل فون پر جیلانی کی کال موصول ہوئی۔ اس نے عمران کو بتایا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ یہ لوگ اب یہاں سے جانے والے ہیں۔"

"کیسے اندازہ ہوا؟" عمران نے پوچھا۔

"بس پورچ میں تھوڑی سی ہلچل نظر آ رہی ہے۔ ایک دو کمروں کی لائٹس بھی روشن ہوئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر ہمارے پہنچنے سے پہلے لڑکی روانہ ہو جائے تو تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے۔" عمران نے جیلانی کو ہدایت دی۔

ہم فوراً ریسٹورنٹ سے روانہ ہو گئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہم صرف پانچ منٹ کی ڈرائیونگ کر کے موقع پر پہنچ گئے۔ عین اس وقت کوٹھی کے پورچ میں کسی گاڑی کی روشنیاں آن ہوئیں۔ جیلانی درست ہی کہہ رہا تھا کہ اب یہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ جیلانی تاریکی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا۔ اسی دوران میں کوٹھی کا مین گیٹ کھل گیا۔ ایک گاڑی مین گیٹ کی طرف آئی۔ ہمارا خیال تھا کہ پہلے شاید "ڈمی ہیروئن" نکلے گی لیکن یہ یوسف فاروقی تھا۔ اس کی شاندار ٹویوٹا گاڑی گیٹ کی طرف آئی پھر تیزی سے موڑ کاٹ کر سڑک پر پہنچی لیکن موڑ کاٹتے ہوئے یوسف سے تھوڑی سی غفلت ہوئی۔ اس نے اپنی دائیں جانب ٹھیک سے نہیں دیکھا۔ ادھر سے ایک نیلی پجارو آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ رات کے سناٹے میں پجارو کے بریک زور سے چرچرائے اور دور تک آواز گئی۔ پجارو والے نے کافی کوشش کی پھر بھی اس کی گاڑی لہراتی ہوئی یوسف کی گاڑی کی دائیں سائڈ سے ٹکرائی۔ دونوں گاڑیاں ڈگمگاتی ہوئی رک گئیں۔ پجارو کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔ یقیناً بائیں سائڈ کا بھی نقصان ہوا تھا۔ غلطی یقیناً یوسف ہی کی تھی۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ نشے میں بھی تھا۔ پجارو میں سے تین چار لڑکے نکل آئے۔ دوسری طرف یوسف بھی گاڑی میں سے نکل آیا۔ تو تکرار شروع ہوئی۔ قریبی کوٹھیوں کے دو تین چوکیدار بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم اپنی جگہ موجود رہے۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا، پجارو سے نکلنے والے نوجوان یوسف پر پل پڑے۔ وہ امیر گھرانوں کے بگڑے لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک تو خاصا گرانڈیل تھا۔ شاریہ بائی کی کوٹھی سے نکلنے والے دو چوکیداروں نے لڑکوں کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے ان کو بھی پیٹ ڈالا۔ یوسف نیچے گر پڑا تھا اور دو لڑکے اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے... عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لو بھئی، تمہارا کام نکلا ہے۔ ذرا اپنی کوالٹی دکھاؤ ان لونڈوں کو۔''

واقعی لگ رہا تھا کہ اگر ہم نہ پہنچے تو یہ بپھرے ہوئے نوجوان... یوسف صاحب کی ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔ میں آگے بڑھا۔ پہلے میں نے یوسف کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب میرے منہ پر بھی ایک زوردار گھونسا پڑ گیا تو پھر میں نے جوابی کارروائی کی اور یہ کافی سخت کارروائی تھی۔ لڑکوں کو ایسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ایک لڑکے کے چہرے پر ٹکر رسید کی، وہ تیورا کر گرین بیلٹ پر جا گرا۔ ان کے گرانڈیل ساتھی نے عقب سے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ کافی سخت ہاتھ تھا۔ آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ میں نے سنبھل کر اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی اور ٹھوڑی پر گھونسا جڑا۔ وہ ڈگمگایا ضرور لیکن گرا نہیں۔ میں نے ایک اور گھونسا مارا، وہ پشت کے بل اپنی پجارو کے بونٹ سے ٹکرایا اور اس کا سائڈ مرر توڑ دیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا لیکن ابھی اس کی گرفت مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ میری کہنی کی ضرب نے اس کے پہلو کو مہلک بوسہ دیا۔ میں نے اس کی پسلی چٹخنے کی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی اس کی کراہ بھی۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ گرانڈیل لڑکے کے اوپر جا گرا۔ میری شدید مزاحمت نے یقیناً بپھرے ہوئے لڑکوں کو ہلا دیا تھا۔ وہ یوسف سے توجہ ہٹا کر میری جانب آ گئے۔ یوسف سے بس ایک لڑکا برسرپیکار رہ گیا... میرا خیال تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر عمران بھی لپکتا ہوا پہنچ جائے گا لیکن وہ ابھی تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ شاید میرا ٹیسٹ لے رہا تھا۔

مار دھاڑ کی وجہ سے اردگرد کی بیشتر کوٹھیوں کے مکین جاگ گئے تھے، کئی کھڑکیاں روشن نظر آنے لگی تھیں۔ ایک لڑکے نے گاڑی کے جیک کے ساتھ میرے سر پر زوردار وار کیا، میں نے خود کو بمشکل بچایا اور پھر اسے اپنے کیے کی طاقت کی پہچان کرائی۔ یہی وقت تھا جب ایک اور گاڑی موقع پر پہنچی۔ یہ ہنڈا سوک تھی۔ اس کے بریک چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی ہمارے بالکل سامنے رک گئی۔ اس میں سے چار پانچ مزید لڑکے جارحانہ انداز میں اترے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پجارو والوں کے ساتھی تھے۔ انہیں دیکھ کر پہلے سے برسرپیکار لڑکوں کا جوش دگنا ہو گیا۔ انہوں نے للکارے مارے اور گالیاں دیں۔ ان کا نشانہ سب سے پہلے میرا ساتھ دینے والا ایک پٹھان چوکیدار بنا۔ وہ کالی بھڑوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔ دو تین میری طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں کند آلات نظر آ رہے تھے۔ اب عمران کی شرکت فرمائی ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ دائیں طرف سے آ رہا تھا۔ اس کی دید ہمیشہ میرے حوصلوں کو مہمیز کرتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔

اگلے تین چار منٹ میں رہائشی علاقے کی اس نیم تاریک سڑک پر گھمسان کا رن پڑا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور لڑائی بھڑائی بھی جانتے تھے لیکن ان کا واسطہ اس میدان کے آزمودہ کھلاڑیوں سے پڑا تھا۔ پہلے ڈیڑھ دو منٹ کے اندر ہی پانسا پلٹ گیا۔ بپھرے ہوئے لڑکے جارحیت کے بجائے دفاع پر آ گئے۔ ان میں سے دو تین شدید زخمی ہو کر ''ریٹائرڈ ہرٹ'' ہو گئے۔ ان میں پجارو سے نکلنے والا گرانڈیل نوجوان بھی تھا۔ عمران نے اس کا بازو کندھے پر سے توڑ ڈالا تھا اور وہ زمین پر پڑا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر کوٹھیوں کے چوکیداروں نے بھی ہمت کی اور اس دست بدست لڑائی میں شریک ہو گئے۔ ان میں پٹھان چوکیدار پیش پیش تھا۔ میں نے دیکھا، جیلانی زخمی یوسف کو سہارا دیتا ہوا نرسری کی طرف لے جا رہا تھا۔ یوسف کا لباس تار تار تھا... اور وہ بری طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میری کہنی کی ضرب سے جس دراز قد لڑکے کی پسلی ٹوٹی تھی، وہ جا کر ہنڈا سوک کی پچھلی نشست پر گر گیا تھا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دو لڑکوں کو میں نے مکوں اور ٹھڈوں پر رکھا ہوا تھا، ایک کو عمران نے۔ عمران کی ہدایت پر جیلانی اس کارِ خیر میں شریک نہیں ہوا تھا اور زخمی یوسف کے قریب موجود تھا۔ یہی وقت تھا جب سو ڈیڑھ سو میٹر کی دوری پر پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ پولیس تیزی سے موقع کی طرف آ رہی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے، تین چار لڑکے تو فوراً ہنڈا سوک میں بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے، باقی وہیں پر رہے۔ ان میں ٹوٹے ہوئے بازو اور لہولہان چہرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والا گرانڈیل لڑکا بھی تھا۔ وہ خود کو ایک بڑے سرکاری افسر کا بیٹا بتا رہا تھا اور عمران کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یوسف زیادہ زخمی ہے، تم اسے لے کر نکل جاؤ۔ میں اور جیلانی یہاں کا معاملہ سنبھال لیں گے۔ یہ لو چابی۔'' اس نے گاڑی کی چابی میری طرف اچھالی۔

پٹھان چوکیدار اور دیگر گارڈز بھی یہاں موجود تھے، میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔ میں جب عمران کی ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا، دور سڑک کے موڑ پر پولیس موبائل کی نیلی بتی نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ یوسف کو جیلانی میری ساتھ والی سیٹ پر بٹھا چکا تھا۔ یوسف نے اپنی ران دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی اور تکلیف میں نظر آتا تھا۔ لڑائی کے دوران میں ہی اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس حوالے سے اس کے چہرے پر خاصی حیرانی تھی۔

''ہیلو یوسف صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی نکیلی چیز لگی ہے یہاں گھٹنے سے اوپر... گوشت پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ اس کی ڈینم کی نیلی پتلون ران پر سے لہولہان ہو رہی تھی۔

''کیا خیال ہے، کسی پرائیویٹ کلینک چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے کہا۔ اس کی ناک سے بھی خون رس رہا تھا۔ وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ''یہ تو بڑا اچھا اتفاق ہوا ہے کہ آپ یہاں آ گئے، ورنہ ان خبیثوں نے تو میرا بھرتہ بنا دینا تھا۔ آپ نے... مجھے دیکھا تھا، یا ویسے ہی رک گئے تھے؟''

''ہم آگے نکل گئے تھے مگر جب گاڑیوں کے بریک زور سے لگے اور پھر ٹکر کی آواز آئی تو ہم ٹھہر گئے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ تین چار بندے ایک بندے کو گرا کر پیٹ رہے ہیں تو ہم گاڑی سے نکل آئے۔ اس وقت تک ہمیں بالکل پتا نہیں تھا کہ یہ آپ ہیں۔''

''لیکن اس وقت آپ یہاں سے کیسے گزر رہے تھے؟''

''ہم تو ایک شادی میں شرکت کے بعد آئے ہیں۔ گھر کے اندر ہونے والا یہ فنکشن ڈھائی تین بجے تک جاری رہا ہے۔ اور آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہاں دو چار دوستوں کی کمپنی میں تھا، بس وہاں دیر ہو گئی۔'' یوسف نے مبہم جواب دیا۔

ہم تیزی سے فیروز پور روڈ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں پہنچ گئے۔ ران پر سے یوسف کی پتلون چر گئی تھی اور اس کا خون کسی طرح بند ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ مارا ماری میں گاڑی کا کوئی تیز دھار کنارہ یا کوئی ایسی ہی چیز لگی ہے جس نے گہرا گھاؤ ڈالا ہے۔ اندر کی نسیں کٹ گئی تھیں اور مسلز بھی متاثر ہوئے تھے۔ اسپتال کی ایمرجنسی میں یوسف کو ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ اس کا خون بند کیا گیا اور انجکشن وغیرہ لگائے گئے... اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ ابھی اسے اسپتال میں ہی رہنا پڑے گا۔ صبح جب سینئر ڈاکٹر اسے دیکھے گا تو پھر ہی ٹانکے وغیرہ لگانے کا فیصلہ ہو گا۔

یوسف میرا بہت شکر گزار نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے دونوں ساتھیوں کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ معاملے کو سنبھالنے کے لیے موقع پر ہی موجود ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ عمران کے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ صورتِ حال کو اچھی طرح ہینڈل کر لے گا۔

یوسف کے منہ سے الکحل کی ہلکی سی بُو اب بھی اٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ایکسیڈنٹ سے پہلے ایک پُرنشاط شب گزاری ہے۔

اس کے سیل فون پر بیل ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھا اور قدرے متفکر نظر آنے لگا۔ بہرحال، اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو یوسف نے مجھ سے کہا۔ ''گھر سے ثروت کا فون ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ دو ڈھائی بجے تک آ جاؤں گا لیکن اب پانچ بجنے والے ہیں۔ وہ پریشان ہو رہی ہے۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ثروت کا نمبر پریس کیا اور اس سے بات کی۔ اس کے لب و لہجے میں ناراضی اور روکھے پن کی جھلک تھی۔ وہ بولا۔ ''ہیلو... یہاں ایک تھوڑا سا مسئلہ ہو گیا ہے... نہیں نہیں... ویسے میں ٹھیک ہوں... بس گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا... بعد میں جھگڑا ہو گیا۔ ٹانگ پر تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔'' دوسری طرف سے کچھ کہا گیا، جواب میں یوسف بولا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں فیروز پور روڈ پر ایک دوست ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کی طرف آیا ہوا ہوں... دو چار اسٹیچ لگنے ہیں۔ اس کے بعد گھر آ جاؤں گا... نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں... اور اچھی

بات یہ ہے کہ تمہارے فرسٹ کزن صاحب میرے پاس ہیں... بھئی اپنے تابش صاحب اور کون؟ بلکہ انہوں نے بڑی مدد کی ہے میری۔ اس وقت بھی میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرشتہ سیرت بندے ہیں بھئی۔“

یوسف فاروقی کے لہجے میں بظاہر تشکر تھا مگر لہجے کی تہ میں کہیں کاٹ اور چبھن بھی چھپی ہوئی تھی۔

دوسری طرف سے ثروت نے غالباً پوچھا کہ وہ رات اتنی دیر تک کہاں تھا۔ جواب میں یوسف سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”تمہیں بتایا تو تھا ایک چیریٹی شو ہے۔ شو سے نکلے تو دو تین پرانے دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ انہیں کچھ وقت دینا پڑا۔ ان سے رخصت ہوا تو یہ جھگڑا ہوگیا۔“

وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے امپورٹڈ وھسکی پی کر جس مہنگے ”چیریٹی شو“ میں شرکت کی تھی، اس کا صلہ اس نے آخرت کے بجائے یہیں وصول کرلیا تھا اور مطمئن تھا کہ یہ معاملہ یہیں پر ختم ہوگیا ہے... مگر ابھی قدرت کے کھاتوں میں حساب کتاب ہونا باقی تھا۔

کچھ دیر بات کرنے کے بعد یوسف نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے فون پر عمران سے بات کی اور اس سے صورتِ حال پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ پولیس اسٹیشن میں ہے۔ دونوں گاڑیاں بھی پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ معاملہ طے ہورہا ہے، کچھ دیر میں کام نمٹ جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ عمران ایسے کاموں میں ماسٹر ہے۔ اس کی مقناطیسی شخصیت کام کرتی تھی اور وہ بہت جلد ایسی گتھیاں سلجھالیتا تھا۔ نہ صرف سلجھالیتا تھا بلکہ نئے دوست بھی پیدا کرلیتا تھا۔

سویرے دس بجے کے قریب دو سینئر سرجنز نے یوسف کے زخم کا معائنہ کیا اور ماتحت ڈاکٹرز کو اسٹیچنگ اور مرہم پٹی وغیرہ کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ ان ہدایات میں ایک دونسوں کو جوڑنے کا کام بھی شامل تھا۔ اسی دوران میں یوسف نے دو تین جگہ فون پر بھی بات کی۔ ان میں سے ایک کال وسیم احمد کے فون پر بھی تھی۔ یہ وسیم احمد وہی فلم ایڈیٹر تھا جس کے ذریعے شاربہ بائی کے بالاخانے پر ”شب بسری“ کا سودا ہوا تھا۔ وسیم سے گفتگو کے دوران میں یوسف مبہم زبان استعمال کررہا تھا، لہٰذا اسے ”پرائیویسی“ فراہم کرنے کے لیے میں کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ بہرحال دور کھڑے ہوکر بھی میں یوسف کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی ”شب بسری“ سے مطمئن ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا اسے شک تو نہیں ہوا کہ اسے منہ مانگے داموں کے عوض دو نمبر مال فراہم کیا گیا۔

بغور جائزہ لینے کے باوجود میں یوسف کے تاثرات سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ یوسف بات ختم کرکے فون بند کررہا تھا جب میں بُری طرح چونک گیا۔ مجھے ایمرجنسی وارڈ کے دروازے پر ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ یہ خود شاربہ بائی تھی لیکن اب وہ ایسے حلیے میں تھی کہ کوئی اس کے اصل پیشے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اونچے گھرانے کی بیگمات کی طرح اس نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ ایک قیمتی شال نے نہ صرف اس کا سراپا چھپا رکھا تھا بلکہ نصف چہرہ بھی اوجھل کررکھا تھا۔ اس کے کندھے پر قیمتی بیگ تھا۔ میں پہلے ہی یوسف سے کافی فاصلے پر تھا، مزید احتیاط کے لیے ایک ستون کی اوٹ میں ہوگیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ شاربہ بائی یوں اپنے گاہک کی عیادت کے لیے اس پرائیویٹ اسپتال میں چلی آئے گی۔ شاربہ کے ساتھ ایک ڈرائیور نما شخص تھا۔ دوسرا موٹی موٹی آنکھوں والا ایک پہلوان نما بندہ تھا۔ اس نے پتلون اور دھاری دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ شاربہ بائی کی طرح یہ بھی کوئی ”اچھی شخصیت“ نہیں۔ خاص طور سے اس کی آنکھوں میں ایک مجرمانہ سی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ تھوڑی دیر یوسف کے بستر کے پاس کھڑے ہوکر باتیں کرتے رہے۔ وہ اس سے رات کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں میری نظر کئی بار دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف اٹھی۔ وہ مسلسل بڑے دھیان سے یوسف کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیسے نگاہوں نگاہوں میں اسے تول رہا ہو۔ یوسف پہلے اِدھر اُدھر نگاہ گھما کر مجھے ڈھونڈتا رہا۔ پھر اس نے سیل فون کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اس کے سامنے آکر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ شاربہ بائی مجھے فوراً پہچان لیتی۔ وہ اپنے بالاخانے پر مجھے ”چودھری عمران“ کے ساتھ اس کے ہمراہ دوست کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی۔ یہ بڑی گڑبڑ ہوجاتی۔ کچھ دیر بعد شاربہ بائی اور اس کے دونوں ساتھی یوسف کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے پہلے کھڑکیوں میں سے جھانک کر یہ تسلی کی کہ وہ گاڑی پر بیٹھ کر رخصت ہوگئے ہیں، اس کے بعد یوسف کے پاس چلا گیا۔

سہ پہر کے وقت عمران اسپتال آکر یوسف کی عیادت کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے فون پر منع کردیا۔ میں نے اسے بتایا کہ شاربہ بائی یہاں آئی تھی، عین ممکن ہے کہ اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی ساتھی یا ملازم اب بھی اسپتال میں موجود ہو، لہٰذا وہ فون پر ہی یوسف کی خیریت دریافت کر لے۔ عمران نے ایسا ہی کیا۔ اس کے علاوہ اس نے یوسف کو بتا دیا کہ جھگڑے والا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا ہے۔ دونوں طرف کے افراد کو چوٹیں لگی ہیں اور دونوں گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچا ہے... لہٰذا مخالف پارٹی قانونی کارروائی کے بجائے مک مکا پر تیار ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ کل تک راضی نامہ تحریر ہو جائے گا۔ یوسف کی گاڑی بھی واپس اس کے گھر پہنچ چکی تھی۔

اس زبردست تعاون پر یوسف نے عمران کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اسی دوران میں یوسف کا دوست فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی پہنچ گیا۔ اس کے آنے کے بعد میرے لیے گنجائش پیدا ہو گئی کہ میں گھر واپس جا سکوں اور کپڑے وغیرہ بدل سکوں۔ میں نے یوسف سے شام تک واپسی کا وعدہ کیا اور عمران کے اندرونِ شہر والے گھر واپس آ گیا۔ عمران اور جیلانی بھی وہیں موجود تھے۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی صورتِ حال پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ معروف فلمی اداکاراؤں کے ہم شکل ڈھونڈنے اور انہیں استعمال کرنے کا کام بڑے منظم طریقے سے کیا جا رہا ہے۔ یہ کام جاوا اور اس کے گروپ کے لوگ کر رہے تھے۔ اگر لاچچ کی تھیوری پر عمل کرتے ہوئے جاوا آراکوئے والے معاملے میں ہاتھ نہ ڈالتا اور یوں ہم اس کے مال روڈ والے ٹھکانے پر نہ پہنچتے تو ہمیں کبھی ان ڈمی اداکاراؤں والے معاملے کا پتا نہ چلتا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹھاگ قسم کے لوگ ''ٹیلنٹ ہنٹ'' طرز کی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اشتہار بازی اور دیگر ذرائع سے معروف چہروں کے ہم شکل چہرے تلاش کرتے ہیں۔ ان کی چھانٹی وغیرہ کی جاتی ہے اور آخر میں کچھ چہرے منتخب کر کے اگلے مرحلے میں پہنچا دیے جاتے ہیں۔

میں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ خوب بھوک لگ رہی تھی۔ عمران نے قریبی بازار سے گرم نان، مرغ چنے اور بریانی پر مشتمل ریڈی میڈ کھانا منگوایا۔ سویٹ ڈش کے طور پر لاہوری فالودہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں برتن سمیٹ رہا تھا جب میرے سیل فون پر نصرت کی کال آئی۔ ''ہیلو نصرت گڑیا! کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں بھائی جان! لیکن یہ آپ نے کیا چکر چلایا ہے۔ باجی بتا رہی ہیں کہ یوسف کا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے اور چوٹ آئی ہے اسے... کیا واقعی؟''

''ہاں، ایسا ہوا تو ہے۔ اس کی گاڑی کی ٹکر ہو گئی تھی جس کے بعد جھگڑا ہوا۔''

''گاڑی تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بندے گیراج میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ ایک طرف سے پچکی ہوئی ہے لیکن... لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ وہاں کیسے پہنچے؟ کیا یہ اتفاق تھا یا آپ کو پہلے سے کچھ معلوم تھا؟''

''بس اتفاق ہی سمجھو۔''

''یعنی آپ کو تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ یوسف فلاں وقت پر فلاں جگہ موجود ہو گا۔ کہیں آپ کا کوئی دوست اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟''

''اس بارے میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گا پیاری بہن۔ ابھی ایک دو اور ضروری کام کرنے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا صرف ایک بات بتا دیجیے تابش بھائی! کیا یوسف واقعی کوئی چیریٹی شو دیکھنے گیا ہوا تھا؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''مجھے تو اس سے ہرگز کسی اچھے کام کی توقع نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی اور چکر میں ہو گا۔''

''کم از کم مجھے اس چکر کا پتا نہیں۔ میں وہی جانتا ہوں جو یوسف صاحب نے مجھے بتایا ہے۔''

''اس کا نام اتنی عزت سے مت لیں تابش بھائی! مجھے نفرت ہو گئی ہے اس بندے سے۔ باجی اس کے لیے انسان نہیں ایک اثاثے کی طرح ہیں... اور وہ اپنے اس اثاثے سے ہر قسم کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور... اور مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی مجھ سے بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست اس کا پیچھا کر رہے تھے تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ رات کے اس پہر چیریٹی شو دیکھ کر آ رہا تھا یا کوئی اور کام دکھا رہا تھا۔''

''میں سچ کہتا ہوں نصرت! مجھے ابھی اتنا ہی معلوم ہے جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔'' میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔

میں نے نصرت سے بمشکل پیچھا چھڑایا۔

مجھے اسپتال سے آئے ہوئے اب تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ یوسف کو فون کر کے صورتِ حال دریافت کروں۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ بیل ہوتی رہی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ فون ہی بند ملا۔ میں وقفے وقفے سے قریباً آدھ گھنٹے تک فون کرتا رہا لیکن فون آف تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وسیم احمد، یوسف کے پاس ہی ہو گا مگر مجھے اس کا فون نمبر

معلوم نہیں تھا۔

اس دوران میں عمران نے اسپتال کا نمبر معلوم کر لیا۔ میں نے اس نمبر کے ذریعے ایمرجنسی وارڈ میں رابطہ کیا۔ موقع پر موجود نرس نے بتایا کہ بیڈ نمبر 6 پر کوئی مریض موجود نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ''انہوں نے روم میں شفٹ ہونا تھا۔ آپ دیکھیں، وہ روم میں تو نہیں ہیں۔''

کاغذ کے الٹ پلٹ ہونے کی آوازیں آتی رہیں، پھر نرس نے بتایا۔ ''نہیں، وہ کسی روم میں شفٹ نہیں ہوئے۔''

''تو کہاں جا سکتے ہیں وہ؟ واش روم وغیرہ میں تو نہیں گئے؟''

نرس کے بجائے ڈیوٹی ڈاکٹر کی مردانہ آواز سنائی دی۔ ''آپ بیڈ نمبر 6 کے یوسف فاروقی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ان کے کیا لگتے ہیں؟''

''میں ان کا دوست ہوں۔ میں ہی انہیں لے کر آیا تھا۔''

ڈیوٹی ڈاکٹر نے کہا۔ ''یوسف صاحب کچھ بھی بتائے بغیر چلے گئے ہیں اور ابھی واپس نہیں آئے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تو ہمیں معلوم نہیں جی۔ ان کے دو ساتھی آئے تھے۔ وہ انہیں وھیل چیئر پر باہر لے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اس حالت میں؟ کہنے لگے سامنے گاڑی تک جا رہا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں آ جاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ان کو اس حالت میں جانا نہیں چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مجبوری ہے۔ اب دو گھنٹے ہو گئے ہیں، ان کا کچھ پتا نہیں۔''

میں نے فون بند کیا اور عمران سے کہا۔ ''یہاں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یوسف اسپتال سے کہیں چلا گیا ہے۔''

''کہاں جا سکتا ہے؟'' عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

جیلانی بولا۔ ''بعض لوگ اسپتال تبدیل کرتے وقت بھی بتاتے نہیں اور بہانے سے نکل جاتے ہیں۔ یہ بھی تو یہی کیس نہیں؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اس معاملے میں شاربہ بائی کا عمل دخل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے یوسف کو کوئی مشورہ دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو دو بندے آئے، وہ بھی اسی کے بھیجے ہوئے ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اس میں ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ لوگ ڈاکٹر سے سیدھے سیدھے کہہ سکتے تھے کہ ہم ڈسچارج ہونا چاہتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

میں اور عمران فوراً اسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ عمران نے اپنی مہران کار اسپتال سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی۔ میں اندر چلا گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر تیس بتیس سال کا سنجیدہ سا شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک مریض کا کچھ پتا نہیں۔ نہ ہی کوئی فون وغیرہ آیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کو ان کی حالت کا پتا تھا۔ آپ نے انہیں اس طرح جانے کیوں دیا؟''

وہ بولا۔ ''محترم! ہم کسی کو زبردستی روک نہیں سکتے۔ آپ جانتے ہی ہیں، یہاں مریض کے داخل ہوتے ہی کچھ رقم ایڈوانس میں جمع کر لی جاتی ہے۔ اس ایڈوانس کے ہوتے ہوئے ہمارے پاس کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی مریض کو نقل و حرکت سے روکیں۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! مریض کی جسمانی حالت بھی تو ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں ابھی ان کے زخم کی اسٹچنگ بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''نہیں اسٹچنگ تو ہو چکی ہے۔ یہ دیکھیے... یہ سب کچھ لکھا ہے فائل میں۔ اس کے باوجود میں نے انہیں باہر جانے سے منع کیا تھا۔''

اسی دوران میں مجھے اسپتال کے مین دروازے پر یوسف کے دوست وسیم احمد کی صورت دکھائی دی۔ وہ حواس باختہ تھا اور اس کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ''کچھ پتا چلا یوسف کا؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے پاس تو تم تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں صرف آدھ گھنٹے کے لیے گیا تھا۔ مجھے اپنے بھتیجے کو کالج سے لے کر گھر چھوڑنا تھا۔ واپس آیا تو یوسف نہیں تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کوئی اور کہانی سنا رہے ہیں۔ یوسف کا فون بھی مسلسل بند جا رہا ہے۔''

''اب تم کہاں سے آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پاس ہی دو تین اور پرائیویٹ کلینکس بھی ہیں۔ دیکھ کر آیا ہوں کہ شاید وہ وہاں شفٹ ہوا ہو۔ اسٹچنگ کے باوجود اس کا خون رس رہا تھا اور وہ پاؤں کو سن محسوس کر رہا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر وسیم احمد نے مجھے اشارے سے ایک طرف بلایا۔ ہم کچھ دور کوریڈور میں چلے گئے۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”کہیں یہ وہی کل رات کے پھڈے والا معاملہ تو نہیں۔ جن لوگوں سے یوسف کا جھگڑا ہوا تھا، وہ اسے ڈرا دھمکا کر یا بہلا پھسلا کر لے گئے ہوں؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے چونک کر دیکھا لیکن یہ یوسف کا نہیں ثروت کا نمبر تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ثروت نے پریشان آواز میں کہا۔ ”کیا بات ہے، یوسف فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے؟ پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کر رہی ہوں۔“

”وہ دراصل پین محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پین کا انجکشن لگایا ہے اور ٹرنکولائز کر دیا ہے۔ وہ سو گیا ہے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”اسپتال میں ہی ہوں۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”میں پریشان ہوں۔ کہیں... آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے۔ آخر... آپ بتاتے کیوں نہیں کہ کس اسپتال میں ہیں؟ اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے؟“

”چھپانے والی تو کوئی بات نہیں۔ یوسف کا خیال تھا کہ دو چار گھنٹوں میں اسے گھر چلے ہی جانا ہے پھر تم لوگوں کو تکلیف دینے کا فائدہ۔ ابھی وہ جاگتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ تمہیں فون کر لے۔“

”ٹھیک ہے... میں... میں انتظار کر رہی ہوں۔“

”اوکے...“ میں نے کہا۔

بات ختم ہو گئی تھی لیکن فون بند ہونے کی آواز نہیں آئی۔ میں نے فون کان سے لگائے رکھا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز ابھری۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ ”تابش...“

”ہاں۔“

”مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں۔“

”یہ دکھ مجھے ہر سکھ سے زیادہ عزیز ہیں ثروت۔“

چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ دل گیر آواز میں بولی۔ ”میری ایک بات مان لیں تابش... آپ شادی کر لیں۔ میں نے آپ کے لیے بڑی دعائیں مانگی ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ کو بڑی اچھی لڑکی ملے گی۔ وہ آپ کے ہر دکھ کو سکھ میں بدل دے گی۔ مجھے یقین ہے تابش!“

”مجھے میرے حال پر رہنے دو ثروت! میں بالکل ٹھیک ہوں... اور نصرت کی باتوں پر نہ جایا کرو۔ وہ جو کچھ کہتی ہے، وہ اس کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ جب تم پر کوئی دباؤ ڈالتی ہے تو خود مجھے بھی برا لگتا ہے۔“

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”اگر آپ بالکل ٹھیک ہیں تو مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ کیوں میرا دل ہر وقت مجھے ملامت کرتا ہے۔ کیوں میں خود کو زنجیروں میں جکڑا محسوس کرتی ہوں۔ پلیز تابش... پلیز... مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آزاد کر دیں اور میں تب ہی آزاد ہوں گی، جب آپ ٹھیک ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر اپنے ارد گرد میری موجودگی تمہیں پریشان کرتی ہے تو میں دور چلا جاتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں دکھائی نہ دوں۔“

اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس اس کے سسکنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے فون بند کر دیا۔

میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ثروت بے چینی سے یوسف کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یوسف سے رابطہ کراتا ہوں۔ لیکن یوسف کہیں نہیں تھا۔ وہ اسپتال سے غائب ہو چکا تھا۔

وسیم احمد اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ میں جب فون پر عمران سے بات کر رہا تھا، وہ کہیں کھسک گیا۔ شاید اس نے جان لیا تھا کہ اب یہ معاملہ پولیس تک جانے والا ہے۔ وہ اس پھڈے سے بچنا چاہتا تھا۔ یقیناً اسے یہ ڈر بھی رہا ہوگا کہ یوسف کا بھید کھل جائے گا اور پتا چل جائے گا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔

میں عمران کے پاس گاڑی میں پہنچا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“

”یار! میں اس سارے معاملے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ ثروت کو پتا ہے کہ یوسف کے زخمی ہونے کے بعد اس کے ساتھ میں تھا۔ میں ہی اسے اسپتال لے کر گیا تھا۔ اب وہ یوسف کے بارے میں ہر بات مجھ سے پوچھ رہی ہے۔“

”تو کوئی بات نہیں جگر! ڈھونڈ لیتے ہیں اسے۔ امید ہے کہ مل جائے گا اور اگر نہ بھی ملا تو تمہارے لیے تو اچھا ہی ہے۔“

”اسی بات سے تو ڈر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کہیں

ثروت کے ذہن میں کوئی الٹی سیدھی بات نہ آجائے۔“

میں اور عمران اسپتال کے سامنے سے یوسف کی تلاش میں روانہ ہوئے... اگلے قریباً چار گھنٹے ہم نے شہر کی سڑکیں ناپتے ہوئے گزارے۔ مختلف اسپتالوں میں گئے۔ تھانوں وغیرہ میں پتا کرایا۔ قریباً وہ سب جگہیں دیکھیں جہاں یوسف کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وسیم احمد تو کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ہم نے یوسف کی ملازمہ حمیدن کے تعاون سے یوسف کے ایک اور دوست ابوبکر کا پتا چلایا اور پھر ابوبکر کے ذریعے ہم نے اور کئی ایسے ٹھکانے دیکھے جہاں یوسف کی موجودگی کا امکان تھا۔ اس ساری بھاگ دوڑ کے دوران میں ہمیں اپنی طرف سے بھی محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ صرف دو دن پہلے یہیں لاہور کی سڑکوں پر جاوا کے غنڈوں سے ہمارا بھرپور ٹاکرا ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اب بھی آس پاس موجود ہو سکتے تھے۔ بہرحال، اس وقت ہم بھی غافل نہیں تھے۔ مہران گاڑی کے خفیہ خانے میں ٹرپل ٹو رائفل اور ماؤزر موجود تھا۔ کافی ایمونیشن بھی تھا۔ ذہنی طور پر بھی ہم پوری طرح تیار تھے۔

حیران کن طور پر یوسف کا کوئی کھوج لگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا... اس دوران میں تین چار بار ثروت اور نصرت کی کالز میرے سیل فون پر آچکی تھیں لیکن میں نے انہیں اٹینڈ نہیں کیا۔ میری یہ خاموشی میری پوزیشن کو مزید خراب کر رہی تھی۔ میرا دھیان بار بار شاربہ بائی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ہمارا جانا خطرے سے خالی تو نہیں تھا مگر اب یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ شاربہ بائی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے میں نے ثروت کو کال کر دینا ضروری سمجھا۔ رابطہ ہوا تو وہ پریشان آواز میں بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیوں ہماری جان نکال رہے ہیں؟ آپ یوسف سے رابطہ کیوں نہیں کراتے؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ثروت! میں تمہیں یوسف کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ وہ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“ ایک مشرقی بیوی کی حیثیت سے ثروت کے لہجے میں سیکڑوں اندیشے سمٹ آئے۔

”وہ اسپتال میں نہیں ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے کپڑے وغیرہ بدلنے گیا تھا۔ واپس آیا تو وہ جا چکا تھا۔“

”جا چکا تھا؟ آپ خود کہتے ہیں کہ وہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔“ ثروت نے قریباً چلا کر کہا۔

”ڈیوٹی ڈاکٹر بتا رہا ہے کہ دو بندے آئے تھے۔ وہ پہلے یوسف سے باتیں کرتے رہے۔ پھر یوسف ان کے ساتھ وہیل چیئر پر مین دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ابھی پانچ منٹ میں بیڈ پر واپس آ رہا ہے لیکن وہ آیا نہیں۔“

”اوہ گاڈ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ یہ تو بتائیں کہ آپ ہیں کہاں؟ کس اسپتال سے بات کر رہے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ثروت سے فون کسی اور نے لے لیا۔ یہ ایک بھرائی ہوئی سی مردانہ آواز تھی۔ پتا چلا کہ یہ یوسف کے والد فاروقی صاحب ہیں۔ وہ دمے کے مریض تھے اور آج کل شدید بیمار تھے۔ انہوں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں مجھ سے صورتِ حال دریافت کی۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس سے پہلے ثروت کو بتایا تھا۔ انہوں نے اسپتال کا نام پوچھا۔ میں نے اسپتال کا نام بھی بتا دیا۔ وہ بولے۔ ”ہم پندرہ بیس منٹ میں اسپتال پہنچ رہے ہیں۔“

میں نے انہیں بتایا کہ میں اسپتال میں نہیں ہوں۔ یوسف کے ایک دوست کے ساتھ ہی اس کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر انہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔

ثروت کے گھر والوں کو اسپتال کا بتا کر، میں نے خود کو قدرے ہلکا محسوس کیا۔ میرا دھیان بار بار شاربہ بائی کی طرف ہی جا رہا تھا۔ وہ یوسف کے لاپتا ہونے سے صرف دو ڈھائی گھنٹے پہلے اس سے ملنے اسپتال آئی تھی۔ بظاہر وہ تیمارداری کے لیے آئی تھی لیکن یہ بات دل کو کچھ لگتی نہیں تھی۔ شاربہ اور یوسف کے درمیان صرف گاہک اور نائکا کا رشتہ تھا اور یہ رشتہ بھی فقط دو چار دن پہلے وسیم احمد کے ذریعے ہی استوار ہوا تھا۔ پھر مجھے بار بار وہ چمکیلی آنکھوں والا شخص بھی یاد آ رہا تھا جو شاربہ بائی کے ساتھ یوسف کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یوسف کے لیے غیر معمولی توجہ اور دلچسپی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کیا۔

وہ بولا۔ ”بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ شاربہ بائی جیسے لوگ خوش شکل لڑکیوں کو تو غائب کر سکتے ہیں لیکن یوسف فاروقی جیسے چھبیس ستائیس سالہ بندے سے انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ بظاہر یہ کوئی اغوا اور تاوان والا معاملہ بھی نہیں لگ رہا۔ بس ایک ہی بات کی طرف دھیان جاتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہو سکتا ہے کہ کل رات شاربہ کی کوٹھی میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد یوسف کو معلوم ہو گیا ہو کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ جو لڑکی اس کو دی گئی ہے، وہ فلمی ہیروئن نہیں بلکہ اس کی نقل ہے۔ ظاہر ہے کہ یوسف نے دس لاکھ روپیا نقل کے لیے خرچ نہیں کیا تھا۔ اسی بات پر خریدار اور دکاندار میں جھگڑا ہوا ہو۔ دکاندار یعنی شاربہ نے اس خوف سے کہ راز طشت از بام ہو جائے گا اور دوسرے گاہک بھی متاثر ہوں گے، خریدار کو غائب کرا دیا ہو۔''

''تمہاری بات خارج از امکان نہیں عمران... لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ایسا نہیں لگتا۔ اسپتال پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد یوسف نے فون پر اپنے ہم راز وسیم احمد سے فون پر بات کی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ میں بڑے غور سے یوسف کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بھی شک تھا کہ شاید وہ وسیم سے شاربہ بائی کی دھوکا دہی کے بارے میں کوئی بات کرے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہو۔''

میری اور عمران کی گفتگو کے بعد یہ ضروری محسوس ہوا کہ ہم ایک بار شاربہ بائی سے بات کریں اور اس واقعے کے بارے میں اس کا ردِعمل معلوم کریں۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم سیدھے شاربہ بائی کے کوٹھے پر پہنچ جاتے لیکن پچھلی بار شاربہ بائی کے کوٹھے پر پہنچنا ہمارے لیے ایک لحاظ سے خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہاں جاوا کا کوئی گرگا موجود تھا اور اس نے ہمیں پہچان لیا تھا۔ وہیں سے لوگ ہمارے پیچھے لگے تھے جس کا نتیجہ ہوٹل لالہ زار کی زوردار لڑائی کی صورت میں نکلا تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ہم خود بازارِ حسن میں جانے کے بجائے بذریعہ فون شاربہ بائی سے رابطہ کریں اور اس معاملے کی ٹوہ لیں۔ عمران کے پاس شاربہ بائی کے بالاخانے کا نمبر موجود تھا۔ وہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے کال ملانے کی کوشش کی۔ پہلے دو تین بار تو کسی نے فون اٹھایا ہی نہیں پھر کسی دلال ٹائپ شخص نے کال اٹینڈ کی۔ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بول رہا تھا۔ عمران نے اس سے گاہک کی حیثیت سے بات کی اور اسے کہا کہ وہ شاربہ بائی کو لائن پر بلائے... اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور پھر روکھے پھیکے لہجے میں بولا کہ وہ دوا کھا کر سو رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ عمران کسی طرح کی ''آرگومینٹ'' کرتا، فون کھٹاک سے بند کر دیا گیا۔

عمران نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی تین چار منٹ بعد کال اٹینڈ ہوئی۔ بولنے والا پھر وہی غصیلا ایجنٹ تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی سے بولا اور فون بند کر دیا...

عمران نے اسے غائبانہ دو تین صلوٰتیں سنائیں، پھر علاقے کے انسپکٹر سے رابطہ کیا... یہ وہاں کا ایس ایچ او بھی تھا۔ عمران کے ساتھ اس کا تعارف راجا والے جھگڑے کے دوران میں ہوا تھا۔ عمران نے شوکت نامی اس انسپکٹر کو فون پر ہی ساری صورتِ حال بتائی اور اسے کہا کہ وہ شاربہ بائی کے کوٹھے پر جائے اور اندازہ لگانے کی کوشش کرے کہ شاربہ بائی کا ہاتھ یوسف کی گمشدگی والے معاملے میں ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کہاں تک ہے۔ انسپکٹر شوکت ذہین بندہ لگتا تھا اور خاصا معاملہ فہم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ فیصل ٹاؤن سے ایک بندے کو گرفتار کرنے جا رہا تھا لیکن اب یہ کام ملتوی کر کے سیدھا ہیرا منڈی پہنچتا ہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں رپورٹ دیتا ہے۔

ہم اندرونِ شہر والے گھر واپس آ گئے اور بے قراری سے انسپکٹر کے فون کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں ایک بار ثروت کی کال بھی آئی لیکن مجھے سننے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں قصوروار نہیں تھا... لیکن پتا نہیں کیوں پھر بھی خود کو قصوروار محسوس کر رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد انسپکٹر شوکت نے عمران کے موبائل پر کال کی۔ عمران نے اسپیکر آن کر دیا تاکہ میں بھی انسپکٹر کے ساتھ ہونے والی گفتگو سن سکوں۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''عمران صاحب! شاربہ بائی واقعی دوا کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے مشکل سے جگایا۔ اسے اس بات کا افسوس ہے کہ اس کی گلبرگ والی کوٹھی کے عین سامنے کچھ لوگوں نے اس کے گاہک پر حملہ کر کے اسے زخمی کیا ہے۔ اسی لیے وہ یوسف فاروقی کی عیادت کے لیے اسپتال بھی گئی تھی... بہرحال وہ تو اس بات سے بالکل انکاری ہے کہ یوسف کے گم ہونے میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہی کہیں گیا ہے... وہ یہاں اپنے علاج سے مطمئن نہیں تھا، ہو سکتا ہے کہ کسی اور اسپتال میں داخل ہو گیا ہو۔ اسے امید ہے کہ دو چار گھنٹوں میں اس کی طرف سے کوئی فون وغیرہ آ جائے گا۔''

عمران نے پوچھا۔ ''وہ بندہ کون تھا جو عیادت کے وقت اس کے ساتھ تھا؟''

''اس کا نام بشیر احمد ہے۔ وہ بازار ہی کا بندہ ہے۔ اس نے ایک پلازا ٹھیکے پر لیا ہوا ہے۔ میں اس سے بھی ملا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو یونہی شاربہ بائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔''

''تمہارا اپنا اندازہ کیا ہے شاربہ بائی کے بارے میں؟'' عمران نے پوچھا۔

انسپکٹر شوکت بولا۔ ''میں اس عورت کو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ اپنے پیشے میں تو ایک دم ماسٹر ہے۔ بازار میں کافی ساکھ ہے اس کی۔ تھوڑا بہت تعلق فلم والوں سے بھی ہے اس کا۔ میرے اندازے کے مطابق تو یہ اپنے ہاتھ صاف رکھتی ہے۔ کسی پھڈے والے کام میں نہیں پڑتی۔ مجھے اس تھانے میں ڈیڑھ دو سال ہو گئے ہیں۔ بس دو تین بار ہی ایسا ہوا ہے کہ اس کی کوئی لڑکی تھانے آئی ہے۔ اس سے پہلے کا ریکارڈ بھی تقریباً صاف ہی ہے۔''

انسپکٹر شوکت سے عمران نے پندرہ بیس منٹ گفتگو کی۔ انسپکٹر کی گفتگو تو شاربہ بائی کے حق میں ہی تھی۔ عمران بولا۔ ''یا تو بائی واقعی اس معاملے میں ملوث نہیں یا پھر انسپکٹر نے حرام زدگی کی ہے۔ تھوڑا بہت مال کھا لیا ہے بائی سے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ فرما رہا ہے کہ شاربہ بائی اپنے ہاتھ صاف رکھتی ہے اور کسی پھڈے والے کام میں نہیں پڑتی لیکن یہاں تو یہ پھڈے والا کام کر رہی ہے۔ جاوے اور سلطان چٹے وغیرہ کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔ اصلی ڈبے میں نقلی مال بیچ رہی ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' عمران نے سر ہلایا... اور ایک بار پھر بذریعہ فون شاربہ بائی سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک بار پھر اسی زہریلے دلال سے واسطہ پڑا۔ عمران کی آواز پہچانتے ہی اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے کہا۔ ''کیوں نہ ایک بار بائی جی سے ملنے کا رسک لے ہی لیا جائے۔''

''تو ٹھیک ہے جگر! رسک کے لیے تو ہم بروقت تیار ہیں۔ رسک لینے کی ہمت اور جرأت ہمارے خاندان میں نوپی سے آئی ہے۔''

''نوپی؟ یہ کون تھا؟''

''یار وہی اپنا نپولین بونا پارٹ۔ دادا جی کا لنگوٹیا یار تھا وہ۔ دونوں نے اکٹھے ہی میٹرک کیا تھا پھر نپولین تو فوج میں چلا گیا، فرانس کو آزاد شزاد کرنے کے لیے اور دادا جی نے بادامی باغ میں اسپیئر پارٹس کی دکان کھول لی۔ لیکن دونوں کی دوستی برقرار رہی۔ جب بھی موقع ملتا تھا، وہ پیرس یا لاہور میں ملتے رہتے تھے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نپولین نے جاپان پر ایٹم بم گرانے کا جو خطرناک فیصلہ کیا تھا، وہ دادا جی کے مشورے سے ہی کیا تھا۔''

''جاپان پر بم نپولین نے نہیں، امریکا نے گرایا تھا اور اس وقت روزویلٹ امریکا کا صدر تھا۔''

''یہی تو وہ تاریخی غلطی ہے جو اب تک تاریخ دان کرتے رہے ہیں۔ میں عنقریب اپنے ''فساد پلس'' پر اس سلسلے میں ایک لمبا چوڑا شوشا... مم میرا مطلب ہے، پروگرام چھوڑنے والا ہوں۔ اس کو ''ڈی بیٹ'' کراتا کہتے ہیں۔ دیکھنا، یہ تاریخ کو بدل دے گا اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں جگر! تمہارا یہ خادم اس سے پہلے بھی تاریخ بدل چکا ہے۔'' میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ جانِ من! میں واقعی تاریخ بدل چکا ہوں۔ نصرت نویں کا امتحان دے رہی تھی۔ اس کا تاریخ کا پرچہ تھا۔ اس کی تاریخ کی کتاب اسٹڈی میں پڑی تھی۔ میں نے تاریخ بدل دی اور اس کی جگہ ایف اے کی تاریخ رکھ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس میں سر کھپاتی رہی اور بڑے اچھے نمبروں سے فیل ہو گئی۔''

''چینل والے اپنے اردگرد والوں کی مدد اسی طرح کرتے ہیں۔'' میں نے تائید کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بولنا شروع ہو گیا تھا اور اب یہی حل تھا سمع خراشی سے بچنے کا۔

...اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ یہ ایک اور ویک اینڈ کی رات تھی۔ خوش گوار اور بارونق۔ میں اور عمران جیلانی کی لائی ہوئی ایک سوئفٹ میں بیٹھے اور شاربہ بائی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم پورے انتظام کے ساتھ جا رہے تھے۔ گاڑی کے خفیہ خانے میں ٹرپل ٹو رائفل اور اس کا وافر ایمونیشن موجود تھا۔ ہم دونوں کے پاس بھرے ہوئے پسٹل بھی تھے۔ میرے پاس وہی کولٹ پسٹل تھا جو چند روز پہلے ہم نے سیکریٹری ندیم سے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور اہم ہتھیار تھا اور اس ہتھیار کو حاصل کرنے کے بعد میرے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ یہ وہی چاقو تھا جسے راجا خنجر کا نام دیتا تھا۔ یہ چاقو وہ ندیم سے حاصل کر چکا تھا لیکن اس نے ہمیں ابھی تک اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔ وہ اس چاقو کے حوالے سے کچھ رقم کھری کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے یہ رقم کھری کر دی تھی۔ عمران نے تین ہزار تو اسے پہلے دیے تھے۔ مزید چار ہزار بھی دے دیے تھے اور راجا نے چاقو لالہ زار ہوٹل کے کمرے سے نکال کر ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بالکل وکھری ٹائپ کا بندہ ثابت ہو رہا تھا۔ آج کل وہ اچھرہ کے قریب ایک اور ہوٹل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں رہائش پذیر تھا اور ایشوریا رائے ثانی کا نام لے لے کر آہیں بھر رہا تھا۔

بازارِ حسن ایک بار پھر جوبن پر تھا۔ جگمگاتی روشنیاں، کھڑکیوں میں لہراتے آنچل۔ سرخی پاؤڈر سے لتھڑے ہوئے نئے اور سیکنڈ ہینڈ چہرے، گھنگروؤں کی چھنا چھن، پکوانوں کی مہک، دلالوں کی آوازیں، ہیجڑوں کے ٹھمکے اور ان سب کے اندر موتیے کی پاکیزہ خوشبو... جیسے گندی نالی میں کوئی ہیرا جگمگا رہا ہو۔

بازار کے اندر رش تھا۔ بغلی گلیوں میں تو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہم نے اپنی گاڑی شاربہ بائی کے پلازا نما بالاخانے سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی۔ کہیں پاس کے کوٹھے پر فلم امراؤ جان کا گیت گونج رہا تھا... جو بچا تھا وہ لٹانے کے لیے آئے ہیں۔

ابھی ہم گاڑی سے اترنے اور شاربہ بائی کے ٹھکانے کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شاربہ کے پلازا نما بالاخانے کی طرف سے ایک نوخیز لڑکی تیزی کے ساتھ آئی۔ اس نے خود کو ایک لمبی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ بلکہ حواس باختہ دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی پیچھے لگا ہوا ہو... لیکن بظاہر کوئی اس کے پیچھے بھی نہیں تھا۔ وہ ایک خوش پوش ہیجڑے سے ٹکرائی۔ ہیجڑے نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ لڑکی کی نگاہ ہماری کار پر پڑی۔ وہ کار کی طرف آئی۔ اس نے عقبی دروازہ کھولا اور غڑاپ سے اندر بیٹھ گئی۔ نہ صرف بیٹھ گئی بلکہ اس نے خود کو پچھلی نشست پر نیم دراز کر دیا۔ نیم تاریکی میں وہ ہمیں اچھی طرح دیکھ سکی تھی نہ ہم۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ”پلیز! میری مدد کریں۔ وہ غنڈے میرے پیچھے ہیں... پلیز۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے وہ کچھ اور بھی نیچے ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نشست پر دراز ہو گئی ہے۔ پرفیوم کی خوشبو ساری گاڑی میں بھر گئی تھی۔ ایک کھڑکی سے آنے والی روشنی سیدھی لڑکی کے چہرے اور گردن پر پڑ رہی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے قریب ہو گی۔ نقوش اچھے تھے۔ کانوں میں طلائی جھمکے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔

”کون لوگ ہیں؟“ عمران نے پوچھا۔

”بازار کے ہی ہیں۔ مم... مجھے زبردستی لے جانا چاہتے ہیں۔“

”کہاں؟“

”اپنے مالک کے پاس۔ بہت برا بندہ ہے۔ مم... میں اسے جانتی ہوں۔“

لڑکی کے لب و لہجے اور کسی حد تک حلیے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی بازار کی چیز ہے... ایک نوجوان طوائف جو کسی ڈر سے یہاں آ چھپی ہے لیکن پھر بھی یہ بازارِ حسن تھا۔ یہاں ہر طرف گھاتیں لگی ہوئی تھیں اور پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ کیا کہا جا سکتا تھا کہ یہ اس لڑکی کی کوئی چال ہی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے پھاڑ کر شور مچا دے کہ اسے اغوا کیا جا رہا ہے... یا دھمکی دے دے کہ وہ ایسا کرنے جا رہی ہے۔

اچانک کچھ لوگ نظر آئے اور کم از کم اس بات کی تو تصدیق ہو گئی کہ لڑکی کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ یہ تین چار بندے تھے۔ ان کے حلیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی بازار کی کمائی سے پروان چڑھے ہیں۔ وہ ہم سے چالیس پچاس قدم کی دوری پر تھے اور کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لڑکی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور نشست پر کچھ اور دبک گئی۔ اس نے اپنی ٹانگیں موڑ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لیے تھے اور بالکل سکڑ گئی تھی۔ عمران نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اتفاقاً گاڑی کا غلاف دونوں نشستوں کے درمیانی خلا میں پڑا تھا۔ عمران نے تیزی سے یہ غلاف لڑکی کے اوپر پھیلا دیا۔ تلاش کرنے والے افراد ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ دکانوں کے اندر جھانک رہے تھے۔ انہوں نے کچھ دور کھڑی ایک کار کی کھڑکیوں سے آنکھیں لگا کر بھی دیکھا۔ انہیں جیسے یقین تھا کہ لڑکی آس پاس ہی کہیں ہے۔ تب میری نگاہ شاربہ کے بالاخانے کی طرف اٹھی۔ میں نے دیکھا، وہاں بالکونی میں بھی ایک مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ بھی متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے۔

لڑکی غلاف کے نیچے سے بولی۔ ”گاڑی چلا دو پلیز! مجھے یہاں سے آگے لے جاؤ۔“

”آگے کہاں لے جائیں؟ رستہ ہی نہیں ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اور ابھی پیچھے بھی نہیں ہے۔“ میں نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم بس چپکی لیٹی رہو۔“ عمران نے اسے ہدایت کی۔

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ تلاش کرنے والے ہمارے دائیں بائیں گھوم رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا قریبی گلی میں چلا گیا۔ دو باتیں کرتے ہوئے ہماری گاڑی کی طرف آئے۔ ایک نے بازاری لہجے میں کہا۔ ”زیادہ دور نہیں گئی ہو گی حرامزادی۔ یہیں کہیں گھس کے بیٹھی ہو گی۔“

”پر نظر آئے تو پھر ہے نا۔“ دوسرے نے دانت پیسے۔

ایک نے بلا تکلف ہماری گاڑی کی کھڑکی سے چہرہ لگایا اور آنکھیں سکیڑ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

عمران نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر فوراً اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”کی گل اے پہلوان! کیا جھاتیاں مار رہے ہو؟“

”کوئی کڑی تو نہیں دیکھی تم نے؟“ پہلوان نما شخص نے کہا۔

”کڑیاں ہی تو دیکھ رہے ہیں اور یہاں ہے کیا؟ پر تم کس کڑی کی بات کر رہے ہو؟“

”لال پھولوں والی چادر لی ہوئی ہے اس نے۔ نیلی شلوار قمیص ہے۔ ابھی اس سامنے والے پلازے سے اتری ہے۔“

”ہاں ہاں، دیکھی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کہاں؟“

”یہیں پر ہے یار۔ گاڑی کو غور سے دیکھو۔“ عمران بولا۔

”کیا مطلب؟“

”گاڑی کے نیچے گھسی ہے یار۔“ عمران نے سرگوشی کی۔

پہلوان نے پہلے غیر یقینی نظروں سے عمران کو دیکھا پھر جھک کر گاڑی کے نیچے دیکھا۔ مزید تسلی کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔

عمران نے نشیلے انداز میں قہقہہ لگایا۔ پہلوان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔

لڑکی پچھلی نشست پر دم بخت پڑی تھی۔

اسی دوران میں سامنے سڑک پر پھنسے ہوئے ایک تانگے کو راستہ مل گیا اور سڑک پر رش کچھ کم ہو گیا۔ عمران نے کار اسٹارٹ کر دی اور اسے دھیمی رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔ گاڑی انچ انچ سرکتی ہوئی کچھ آگے نکل گئی تو راستہ کچھ کشادہ ہو گیا۔ عمران نے چابک دستی سے ڈرائیونگ کی اور دو چار منٹ کے اندر گاڑی کو شاربہ بائی والے پلازا سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور لے آیا۔ یہ جگہ بھی بازارِ حسن کا حصہ ہی تھی۔ تاہم یہاں بھیڑ کچھ کم تھی۔ زیادہ تر نچلے درجے کی طوائفیں تھیں۔ وہ کہیں کہیں دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی اپنی بوسیدہ چمڑی کے لیے خریدار ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہاں ایک بڑا سا چائے خانہ بھی تھا جہاں لکڑی کی بینچوں پر مزدور ٹائپ افراد بیٹھے وی سی آر پر انڈین ناچ گانا دیکھ رہے تھے۔ اپنے جسم کھجا رہے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔

عمران نے گاڑی ایک بغلی سڑک پر موڑی اور دو بند دکانوں کے سامنے کھڑی کر دی۔ یہاں روشنی بھی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے نوخیز طوائف کے اوپر سے غلاف ہٹایا اور اس سے کہا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ جائے، اب خطرہ نہیں ہے۔

اس نے پہلے غلاف میں سے اپنا ڈرا ہوا چہرہ نکالا پھر ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ صراحی دار گردن میں نسیں دھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

اس نے پہلی بار غور سے عمران کو اور مجھے دیکھا۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں میں شناسائی کے آثار نظر آئے۔ وہ قدرے حیرانی سے بولی۔ ”آپ تو وہی ہیں جو کچھ دن پہلے ہمارے کوٹھے پر آئے تھے۔ آ... آپ کا نام عمران صاحب ہے نا؟“

عمران نے کہا۔ ”تو تم شاربہ کے پاس ہوتی ہو؟“

”جی ہاں، شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اس دن آپ کے سامنے بھی آئی تھی۔“

”ہاں، اب کچھ کچھ لگ تو رہا ہے کہ تمہیں دیکھا تھا۔“ عمران نے بات بنائی۔

”اب کیا معاملہ ہے تمہارے ساتھ؟ تم چھپ کیوں رہی ہو؟“

اس کا چہرہ ایک بار پھر زرد نظر آنے لگا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”وہ ایک گاہک ہے ہمارا... بڑا خبیث بندہ ہے۔ اس نے مجھے بلوایا ہے۔ میں اس کے پاس جانا نہیں چاہتی۔“

عمران نے کہا۔ ”تم لوگوں کے گاہک تو ہوتے ہی خبیث ہیں۔ نیک شریف بندے کا اس بازار سے کیا تعلق؟“

”وہ پکا شرابی ہے۔ شراب میں پتا نہیں کیا کیا گولیاں گھول کر پیتا ہے۔ ایک دم جانور ہے۔ میں پہلے دو بار جا چکی ہوں اس کے پاس۔ یہ دیکھیں... یہ دیکھیں۔“ اس نے اپنی کھلی آستینیں کندھوں تک چڑھا کر دکھائیں۔ کئی جگہ پرانے نیل سے نظر آ رہے تھے۔ لڑکی کے چہرے پر نفرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو تم نے شاربہ بائی سے کہنا تھا کہ تم جانا نہیں چاہتی ہو۔“

”لیکن وہ مجھے ہی بلا رہا ہے اور بڑی باجی (شاربہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے انکار کرسکیں۔ شاید کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں۔ وہ جینا حرام کر دیتا ہے دوسروں کا۔" طوائف زادی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"وہ ہے کون؟" میں نے پوچھا۔

"مم... مجھے نام کا تو ٹھیک سے پتا نہیں۔ اسے بھائی بھائی کہتے ہیں۔ بڑے بڑے کتے پال رکھے ہیں اس نے۔ یہیں صدر کے علاقے میں کئی کنال کی کوٹھی ہے اس کی۔"

"تو تم اس کے ڈر سے بھاگ آئی ہو لیکن آج کی رات تم بچ بھی گئیں تو کل پھر تمہارے لیے مصیبت آجائے گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔" اس نے مری مری آواز میں جواب دیا۔ "اس کے لیے تو ہر ایک گھڑے کی مچھلی کی طرح ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔"

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اس کا کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس؟"

لڑکی نے انکار میں سر ہلایا پھر کچھ دیر تک سوچ کر بولی۔ "آپ کیا کرو گے؟"

"تم دیکھتی رہو کیا کرتے ہیں۔" عمران نے کش لے کر کہا۔

"لل... لیکن وہ بہت خطرناک ہے۔ آپ لوگوں کے اندازے سے زیادہ... بڑی باجی... یا کوئی بھی باجی اس سے دشمنی مول نہیں لے سکتی۔ سارا بازار ڈرتا ہے۔ آپ تو بس... اتنا کریں... کہ مجھے ان گلیوں سے باہر نکال دیں۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر میں کوئی ٹیکسی رکشا لے لوں گی۔"

"پھر کیا کرو گی؟" عمران نے پوچھا۔

اس کا کاجل پھیل رہا تھا۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "اور کچھ نہ ہوا تو... تو..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"تو کیا؟"

"تو کوئی زہریلی چیز کھا لوں گی۔ جان چھوٹ جائے گی... یا کم از کم کچھ دنوں کے لیے اسپتال تو پہنچ جاؤں گی۔" وہ باقاعدہ رو دی۔

عمران نے کہا۔ "دیکھو، تم ہماری پناہ میں آئی ہو۔ تم نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ جس کا ساتھ دیتے ہیں، اس کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ تم اس بندے کا اتا پتا بتاؤ۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تمہارا کوئی نقصان نہیں ہونے دیں گے۔ اگر کچھ ہوگا تو فائدہ ہی ہوگا..."

وہ تذبذب میں تھی مگر وہ عمران ہی کیا جو کسی کے تذبذب کو اپنی جادو بیانی سے دور نہ کر دے۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دو تین منٹ بعد وہ نیم رضامند نظر آنے لگی۔ اس دوران میں اس نے اپنا نام نیلم بتایا۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔ آسمان شفاف تھا۔ ایک مست ہوا چل رہی تھی۔ یہ دوسرا پہر تھا لیکن ان گلی کوچوں کی رونق سرِ شام جیسی تھی۔ دور ایک کھڑکی کے ریشمی پردے کے پیچھے بار بار ایک رقاصہ کے لہراتے بازو نظر آتے تھے اور طبلے کی دھنا دھن سنائی دے رہی تھی۔ رقاصہ ایک جانے پہچانے انڈین گانے پر "لپ سنگ" کر رہی تھی۔ موسم بے عاشقانہ... ایسے میں اے دل کہیں سے ان کو ڈھونڈ لانا۔

ہماری گاڑی میں بیٹھی نوخیز طوائف نے اپنے چمکیلے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا خوب صورت فون انڈیکس نکال لیا۔ اس میں ایک نمبر ڈھونڈ کر اس نے عمران کو دکھایا۔ "یہ ایک نمبر ہے جی اس کا۔" وہ بولی۔

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے سیل فون پر نمبر پریس کیا۔ دوسری طرف سے ایک کرخت آواز ابھری۔ "کون ہے؟"

عمران نے کہا۔ "شاربہ جی کے اڈے سے بول رہا ہوں۔ بھائی سے بات کراؤ۔"

"سلطان بھائی سے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"ہاں... ہاں۔" عمران نے کہا۔

سلطان کے نام پر میرے ساتھ ساتھ عمران بھی قدرے چونکا۔

قریباً ایک منٹ بعد ایک بھاری دبنگ آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔ سخت کڑوے لہجے میں پوچھا گیا۔ "کون ہے؟"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ سلطان چیتے کی ہی آواز تھی۔ مال روڈ والی کوٹھی میں عمران نے اس کی لو میں اپنی گولی سے سوراخ کر دیا تھا اور ایسا منظر نامہ ترتیب دیا تھا کہ ہم اس کی "کچھار" سے بچ کر صاف نکل آئے تھے۔ وہ اب تک سخت بھنایا پھرتا تھا۔

ایک بار پھر اس کی کرخت آواز فون پر ابھری۔ "بولتا کیوں نہیں... کون ہے؟"

عمران نے اطمینان سے کہا۔ "میں تمہارا قریبی رشتے دار ہوں۔ تمہاری والدہ کا خصم... یعنی تمہارا باپ... عمران دانش۔"

دوسری طرف چند لمحے سناٹا رہا۔ اس وقفے کے بعد سلطان چیتا بولا تو اس کی آواز میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ "لگتا ہے عمران تیرا دانہ پانی اب پورا ہو چکا ہے۔ اب تجھے مرنا ہے۔ لیکن یہ میرا وعدہ ہے، تیرے کفن میں لاش نہیں ہو گی۔ بس کچھ ٹکڑے ہوں گے جن کے بارے میں ڈی این اے ٹیسٹ والے بتائیں گے کہ یہ فلاں حرامزادے کے اسپیئر پارٹس ہیں۔"

"چلو اس کا فیصلہ وقت کر دے گا۔ ابھی تو یہ سب کچھ چلتے ہی رہتا ہے پیارے۔ فی الحال میں تم سے ایک اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک گزارش کرنی ہے تم سے۔" عمران نے کہا۔

"میں تمہارے مسخرے پن پر ایک سو ایک بار لعنت بھیجتا ہوں۔ نادر کے قتل کے بعد تم نے کھلی جنگ چھیڑی ہے۔ اس کا فیصلہ تمہاری موت پر ہونا ہے کتے۔ پرسوں رات تو نے اور تیرے دونوں یاروں نے لالہ زار ہوٹل سے بھاگ کر جان بچائی ہے۔ لیکن تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے اور گھسیٹ گھسیٹ کر تمہاری کھال اتاریں گے۔"

"یار! میں نے کہا ہے کہ اس کا فیصلہ وقت آنے پر ہو جائے گا۔ فی الحال تم سے ایک بات کہنی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم یہ بات مان جاؤ۔"

"کیا بکنا چاہتے ہو؟" سلطان نے زہر کا گھونٹ پی کر کہا۔

"ایک لڑکی ہے نیلم۔ وہ یہاں میرے پاس بیٹھی ہے۔ بے چاری بہت پریشان ہے اس وقت۔"

"نیلم... کون نیلم؟" سلطان کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"یار! وہی نیلم جس کے بازوؤں پر تم نے نیل ڈالے ہوئے ہیں... نیلو نیلم کیا ہوا ہے۔ شاربہ کے کوٹھے پر ہوتی ہے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سلطان پھنکارا۔ "وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"اس بات کو چھوڑو۔ جو میں کہہ رہا ہوں اس پر تھوڑا سا غور کر لو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اس کو معاف کر دو یار! وہ بہت ڈری ہوئی ہے تم سے۔ کسی اور سے گزارہ کر لو۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ کیا لگتی ہے وہ تمہاری؟" سلطان چیتے کا لہجہ سخت چبھتا ہوا تھا۔

"کچھ لگنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسانیت بھی ایک رشتہ ہے۔" عمران بولا۔

"اچھا تو انسان صاحب! زبان بھی کوئی چیز ہے۔ جب سودا ہو جاتا ہے، پوری رقم گن کر وصول کر لی جاتی ہے تو پھر بیچی ہوئی چیز دینی پڑتی ہے۔ شاربہ بائی نے بھی دس راتوں کے پورے پانچ لاکھ وصول کیے ہوئے ہیں اس حرامزادی کے۔ اسے تو اب آنا ہی پڑے گا۔"

عمران نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔ "رقم واپس کرا دیتا ہوں تمہیں بلکہ اگر کوئی جرمانہ شرمانہ بھی ڈالنا چاہو تو ڈال لینا۔"

"تم بیچ میں دلال مت بنو۔ اگر وہ... کتیا تمہارے پاس ہے تو اس سے بات کراؤ میری۔"

عمران کا چہرہ متغیر ہوا۔ ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سلطانے! ضد نہ کر۔ یہ لڑکی نہیں جائے گی۔ شاربہ کے پاس اور بھی بہت سا بکاؤ مال ہے۔ کسی اور سے منہ کالا کر لے آج کی رات۔"

"تو... تو بات کو بڑھا رہا ہے ہیرو!"

"بات بڑھ چکی ہے سلطانے... اگر تو نے ضد نہ چھوڑی تو تیری آج کی رات ہی نہیں، آنے والی بہت سی راتیں برباد ہو جائیں گی۔ بہت پچھتائے گا تو۔ تیرا بیڑا غرق کر دوں گا۔" عمران کا پارا چڑھ چکا تھا۔

"کیا کر لے گا تو؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں کروں گا۔ تیرا کلیجا پھاڑ دوں گا، خون تھوکتا پھرے گا لاہور کی سڑکوں پر۔" عمران کی آواز میں دل ہلا دینے والی گھن گرج تھی۔ وہ ایک "بڑے بدمعاش" سے، بڑے بدمعاش کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ نیلم تھر تھر کانپنے لگی۔ میں بھی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

"ہوش سے بات کر ہیرو۔" سلطان چیتے کی آواز قدرے دھیمی پڑ گئی۔

"ہوش سے بات کر رہا ہوں اور تیرے ہوش بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔" عمران دہاڑا۔ "کسی اور کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن مجھے پتا ہے کہ تیری ایک پہلی شادی بھی تھی۔ اس میں سے دو بیٹیاں ہیں تیری۔ ایک شہناز جو یہاں موہنی روڈ کے ایک گھر میں اپنی پھوپی کے پاس رہتی ہے۔ دوسری عافیہ جو دبئی میں ہے اور وہیں کالج میں پڑھتی ہے۔ یہ جو شہناز ہے نا، اس کے پاس تو میرے بندے بس چار پانچ منٹ کے اندر پہنچ جائیں گے اور وہ جس کو تو نے دبئی بھیجا ہوا ہے، اسے ڈھونڈنے میں بھی مجھے دو تین دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ اب خود سوچ لے تجھے کیا کرنا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ چند سیکنڈ بعد سلطان چٹے کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”دیکھ ہیرو! تُو اس لڑائی کو گھر کی عورتوں تک پہنچا رہا ہے۔ یہ کسی کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“

”فی الحال تو یہ تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ تو جو کچھ اس نیلم کے ساتھ کرے گا نا، وہی کچھ میں شہناز کے ساتھ کروا دوں گا... یا پھر عافیہ کے ساتھ کروا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔ اور تُو اچھی طرح جانتا ہے، میں جو کہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔“

”عمرانے... عمرانے! زبان سنبھال کر بات کر۔“ سلطان زخمی درندے کی طرح بلبلایا۔

”تو بھی دماغ سنبھال کر بات کر۔ یہ لڑکی میری پناہ میں آئی ہے... اور میں تجھے بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے پناہ دی ہے۔“

بھڑکے ہوئے سلطان چٹے نے فون بند کر دیا۔

عمران نے خود کو پُرسکون کرنے کے لیے طویل کش لیا اور دھواں کھڑکی سے باہر پھینکا۔ میں اور نیلم گم صم اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نیلم تو باقاعدہ لرز رہی تھی۔ ایک شرابی لڑکھڑاتا اور گنگناتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔

میں نے کہا۔ ”اب کیا کرنا ہے عمران؟“

”کچھ نہیں۔ اس سور کے فون کا انتظار کرنا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”ابھی یہ دوبارہ فون کرے گا۔“ عمران نے فون سیٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔

واقعی قریباً دو منٹ بعد فون کی بیل ہونے لگی۔ عمران نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ہیلو!“ اس نے کہا۔

دوسری طرف سے آواز ابھری۔ ”ہیلو! سلطان بول رہا ہوں۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے۔“ سلطان کے لہجے کی اکڑفوں ختم ہو چکی تھی۔

”اچھا ہے یا بُرا تمہارے سامنے ہے۔“

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد سلطان نے کہا۔ ”جو رقم میں نے شاربہ بائی کو دی ہے، وہ کل شام تک واپس مل جانی چاہیے۔“

”کل... تو بینک بند ہے بھائی جان... ہاں پرسوں شام تک مل جائے گی۔ اور اگر نہ ملے گی تو میں اپنی جیب سے دوں گا۔“

”بہت جلد ملاقات ہوگی۔“ سلطان چٹے نے معنی خیز لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

عمران کا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے دو کش لے کر سگریٹ باہر پھینکا اور لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”لے تیرا کام ہو گیا ہے۔ اب کم از کم یہ بھیڑیا تو تجھے پنجہ نہیں مارے گا۔“

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے روایتی فقرہ بولا۔ ”میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”اگر کوئی دوسرا منہ نہیں ہے تو اسی سے کر دو۔“ عمران نے کہا۔

”مم... میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ وہ بڑی لجاجت سے بولی۔

عمران نے اسے سرتاپا دیکھا اور کھوپڑی سہلائی۔ پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ”اگر تم چاہو تو تھوڑا بہت کر بھی سکتی ہو۔“

وہ پتا نہیں کیا سمجھی۔ پلکیں جھکا کر بولی۔ ”آپ جو کہیں۔“

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نیلم سے پوچھا۔ ”تم کب سے ہو شاربہ بائی کے پاس؟“

”کوئی ایک سال تو ہو گیا ہے۔“

”رات دن وہیں رہتی ہو؟“

”ہاں جی، میرا ایک ماموں بھی پانچ چھ سال سے بڑی باجی کے پاس ملازم ہے۔ سارنگی بجاتا ہے۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”نیلم! ہم جمعرات کے روز تمہارے پاس کوٹھے پر آئے تھے۔ اس روز ہم سے تھوڑی دیر پہلے دو اور بندے آئے تھے۔ ان میں سے ایک فلم اسٹوڈیو کا بندہ وسیم احمد تھا۔ دوسرا کھڑی ناک اور گورے چٹے رنگ والا یوسف فاروقی تھا۔ ان کے بارے میں کچھ جانتی ہو تم؟“

وہ بولی۔ ”بس اتنا ہی جی کہ انہوں نے بڑی باجی سے کسی فلمی لڑکی کی بات کی تھی اور ایڈوانس وغیرہ بھی دیا تھا۔“

”تمہیں پتا نہیں کہ وہ فلمی لڑکی کون تھی؟“

”نہیں جی۔ میں بالکل نہیں جانتی۔ ایسی باتیں بڑی باجی ہم لڑکیوں کو نہیں بتاتی اور اگر کوئی سن گن لینے کی کوشش کرے تو سخت غصے ہوتی ہے۔“

”اچھا، تمہیں پتا ہے کہ کل رات وہ یوسف فاروقی نام کا بندہ ایک جھگڑے میں زخمی ہو گیا تھا؟“

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولی۔ ”ہاں جی، اتنا تو مجھے پتا ہے۔ گلبرگ میں اس کی گاڑی کا کسی دوسری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کے بعد جھگڑا ہوا اور وہ زخمی ہو گیا۔“

”تمہیں پتا ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”نہیں جی، بالکل نہیں۔ بڑی باجی سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے۔“

”وہ اب اسپتال میں نہیں ہے۔ اسے کسی نے وہاں سے اٹھا لیا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ اس بارے میں تمہاری بڑی باجی (شاربہ بائی) کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔“

”مم... مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں جی۔“

عمران نے غور سے نیلم کو دیکھا۔ نیلم کی کاجل لگی پلکیں بے ساختہ تھرا گئیں۔ عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم تم پر زور نہیں دیں گے نیلم۔ بس اتنا کہیں گے کہ اس سلسلے میں اگر تم ہماری تھوڑی بہت مدد کر سکتی ہو تو کر دو۔ ہمارا یہ وعدہ ہے کہ اس ”مدد“ کی وجہ سے تم پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔“

نیلم کچھ دیر تک کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے پاؤں کو گھورتی رہی۔ اس نے زرتی برق چپل پہن رکھی تھی۔ ناخنوں پر شوخ رنگ کی نیل پالش تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے گہری سانس لی اور بولی۔ ”کوٹھے کے اندر کی بات باہر بتانے پر بڑی باجی سخت ناراض ہوتی ہے۔ پورے بازار میں حقہ پانی بند کرا دیتی ہے۔ کچھ لڑکیوں کو تو تھانہ کچہری بھی بھگتنا پڑا ہے۔ لل... لیکن... آج رات آپ نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔ مم... مجھے جو کچھ پتا ہے میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ لیکن... یہاں مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ بھائی کے بندے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ وہ یہاں بھی آسکتے ہیں۔ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”بھائی خبیث کی طرف سے اب تم بالکل تسلی رکھو۔ اس سے تمہاری جان چھوٹ چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنے بندے بھی واپس بلا لیے ہوں گے۔ تم جو کچھ بتانا چاہتی ہو، پورے اطمینان سے بتاؤ۔ یہاں تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔“

عمران کے لب و لہجے نے واقعی نیلم کی بے وجہ بے چینی دور کر دی۔ میں نے تھرماس سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ بعد ازاں نیلم نے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔ یوسف کے زخمی ہونے کی اطلاع شاربہ بائی کو کوٹھی کے ملازموں سے ملی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔ دن چڑھنے کے بعد دھاری دار شرٹ والا ایک شخص کوٹھے پر آیا تھا۔ اس شخص کو کوٹھے کی لڑکیوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی باتوں میں ایک دو ہندی لفظ بھی بولے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انڈین ہے۔ وہ شاربہ بائی کی گاڑی میں سوار ہو کر شاربہ بائی کے ساتھ یوسف کی عیادت کے لیے گیا۔ بعد میں جب شاربہ بائی واپس آئی تو کچھ بے چین سی تھی۔ کچھ دیر بعد اتفاقاً اس کی ایک فون کال نیلم نے سن لی۔ شاربہ اپنے سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے یوسف کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شور مچا سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے کوئی دوا پلا کر کچھ دیر کے لیے سلا دیا جائے۔ یہ الفاظ نیلم کے دماغ میں اٹک کر رہ گئے اور اسے احساس ہوا کہ یوسف نامی اس بندے کے بارے میں ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ بہرحال، اس نے اس بات کا ذکر کسی دوسری لڑکی سے نہیں کیا۔ اپنے ماموں کو بھی نہیں بتایا کیونکہ نشے کی حالت میں کوئی بات اس کے پیٹ میں نہیں رہتی اور وہ بک دیتا ہے۔

اس گاڑی کے اندر بیٹھ کر اپنے لرزتے کانپتے لہجے میں نیلم نے ہمیں جو بات بتائی، وہ خاصی اہم تھی۔ ہمیں ہمدردی کا صلہ ملا تھا اور ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ شاربہ بائی کے بارے میں ہمارے شکوک درست ثابت ہو رہے تھے۔ اب اس پر اعتماد کے ساتھ ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔

عمران نے ایک بار پھر نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اس حوالے سے اس پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آئے گی۔

وہ بولی۔ ”لیکن میں اب بڑی باجی کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلی جاؤں۔ فیصل آباد یا پھر ملتان کی طرف۔“

عمران نے کہا۔ ”تمہاری یہ سوچ مناسب نہیں۔ اس طرح تم خوامخواہ خود کو مشکوک بنا لوگی۔ ابھی تم پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں ہے۔ تم سلطان کے بندوں سے ڈر کر بھاگیں اور اتفاقاً ہماری گاڑی میں گھس آئیں۔ یہ بات تم صاف صاف شاربہ بائی کو بتا دینا۔ وہ جہاندیدہ عورت ہے، سمجھ جائے گی کہ تم سچ بول رہی ہو۔ باقی سلطان کی طرف سے ہم تمہیں ایک بار پھر تسلی دیتے ہیں۔ وہ اب اپنے ہاتھ تم سے دور رکھے گا۔“

عمران کے سمجھانے بجھانے پر نیلم واپس جانے پر رضامند ہو گئی۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ کم از کم آج کی رات بازار سے باہر اپنی ایک سہیلی کے پاس گزارنا چاہتی ہے۔ اس کی سہیلی بھاٹی دروازے کی طرف رہتی تھی۔

اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ہم نیلم کو بھاٹی دروازے چھوڑ آئے۔ عمران نے کسی بھی ایمرجنسی کے لیے اسے اپنا فون نمبر دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک بار شاربہ بائی کو فون کر کے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کر دے۔

”ہاں، اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب بائی جی سے دو دو ہاتھ کرتے ہیں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سوچ لو۔ بڑے زور والی عورت ہے۔"

"زور نکال دیتے ہیں اس کا۔" وہ اطمینان سے بولا اور.... ایس پی حمزہ صاحب کے نمبر پریس کرنے لگا۔ اس نے انہیں شاربہ بائی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا ہے۔

"کب؟" حمزہ صاحب نے پوچھا۔

"ابھی بلکہ اسی وقت جناب۔ یوسف فاروقی کی زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ ہم اس کام کو لیٹ نہیں کر سکتے۔"

حمزہ صاحب نے غنودہ آواز میں کہا۔ "دیکھ لو عمران! ٹیڑھی عورت ہے۔ ہاتھ پاؤں مارے گی۔ فون شون کرے گی۔"

"ہمارے پاس ثبوت ہیں سر! کچا ہاتھ نہیں ڈال رہے۔ وہ ملوث ہے یوسف کی گمشدگی میں۔"

"کیا ثبوت ہیں؟"

"سوری سر! میں آپ کو بتا نہیں سکتا لیکن یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ گلٹی ہے۔ آپ کو شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔"

"کتنی نفری ہونی چاہیے؟" حمزہ صاحب نے پوچھا۔

"ایک انسپکٹر کے ساتھ پانچ چھ بندے بھیج دیں لیکن کچھ اہلکار آس پاس بھی رہیں تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو سنبھال سکیں۔"

تھوڑی دیر میں عمران اور حمزہ صاحب کے درمیان ساری بات طے ہوگئی۔ حمزہ صاحب نے کہا کہ پندرہ منٹ میں پولیس پہنچ رہی ہے۔

عمران نے کہا۔ "سر! انسپکٹر شوکت سے کہیں کہ چھاپے کے وقت اپنی پاکٹ میں موبائل فون آن کر کے رکھے تاکہ ہمیں اندر کی صورت حال کا پتا چلتا رہے۔ ہم آس پاس ہی موجود ہیں۔"

ہم نے گاڑی واپس موڑی۔ رات کے اس پہر لاہور کا یہ گنجان علاقہ بھی تقریباً سنسان ہی تھا۔ صرف داتا دربار کے گرد تھوڑی بہت رونق نظر آتی تھی۔ ہم قریباً دس منٹ میں واپس وہیں پہنچ گئے جہاں نیلم نامی وہ طوائف ہانپتی کانپتی ہوئی ہماری گاڑی میں گھس آئی تھی۔ بازار کی رونق میں بس انیس بیس کا ہی فرق پڑا تھا۔ مختلف کھڑکیوں میں سے موسیقی کی تانیں نکل کر پھیل رہی تھیں۔ بے فکروں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ سامنے ساتھ ساتھ بنی ہوئی دو پان کی دکانوں پر اچھا خاصا رش تھا۔ ہم نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

اس کام میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ پانچ دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پولیس موبائل کی نیلی بتی نظر آئی اور سائرن سنائی دیا۔ چار پانچ ہیجوے جو بیچ بازار میں کھڑے اپنی پھٹی ہوئی آوازوں میں جھگڑا کر رہے تھے، بغلی گلیوں میں تتر بتر ہو گئے۔ پولیس موبائل شاربہ بائی والے پلازا کے عین سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اسی دوران میں عمران کے سیل فون پر انسپکٹر شوکت کی کال آگئی۔ اس نے کہا۔ "عمران صاحب! ہم ریڈ کرنے جا رہے ہیں۔ میں فون آن کر کے اپنی چیسٹ پاکٹ میں ڈال رہا ہوں۔"

"او کے، ہم بھی آس پاس ہی ہیں۔" عمران نے کہا۔

پولیس پلازا نما عمارت میں داخل ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد عمران کے سیل فون پر اندر کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ موسیقی تھی اور گھنگروؤں کی چھنا چھن تھی۔ تھا یقیں کہ آئے گی یہ راتاں بھی۔

پھر یہ سارا شور تھم گیا۔ شاربہ بائی اور انسپکٹر وغیرہ کی آوازیں فون پر ابھرنا شروع ہوئیں۔ کچھ فقرے سمجھ میں آ رہے تھے، کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد شاربہ بائی کا پارا چڑھ گیا۔ حسبِ توقع وہ غصے سے چلّانے لگی۔ "تمہارے منہ میں پورے ٹائم پر پوری ہڈی ڈالتے ہیں، پھر بھی چین نہیں لینے دیتے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟"

"آپ ذرا اکیلے میں آ کر میری بات سن لیں تو آپ کے لیے بہتر ہوگا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کیوں اکیلے میں سنوں؟ میں نے کوئی چوری کی ہے... ڈاکا ڈالا ہے؟ تمہیں جو کہنا ہے یہیں کہو۔"

"تو پھر آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ آپ کے خلاف رپورٹ ہوئی ہے۔"

"کہاں ہے رپورٹ کی نقل؟ مجھے بھی تو دکھاؤ۔ کوئی وارنٹ گرفتاری ہے تمہارے پاس... کوئی تلاشی کا وارنٹ ہے؟"

"سب کچھ دکھائیں گے آپ کو لیکن ابھی آپ کو کچھ دیر کے لیے تھانے جانا ہوگا۔" انسپکٹر نے کہا۔

ایک کرخت مردانہ آواز ابھری۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند گھنٹے پہلے عمران سے فون پر بدتمیزی کے ساتھ بات کرتا رہا ہے۔ وہ بولا۔ "انسپکٹر! یہ ہمارا کاروبار کا ٹائم ہے، اگر تمہاری جان زیادہ مصیبت میں آئی ہوئی ہے تو ہم تمہیں اوپر سے فون کرا دیتے ہیں۔"

"یہ آرڈر بھی اوپر سے ہی آئے ہیں۔ کافی اوپر سے۔ ابھی بائی جی کو جانا ہی پڑے گا۔"

"یہ کیا تماشا ہے؟ کیا اندھیر نگری ہے؟" کرخت مردانہ آواز ابھری۔ پھر بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شور پڑ گیا۔ لڑکیوں کے چلّانے کی سریلی آوازیں بھی سنائی دیں۔ تب ہم نے دیکھا کہ کچھ اور پولیس والے بھی دوڑتے ہوئے پلازا میں داخل ہو رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی ریزرو اہلکار تھے جن کے بارے میں عمران نے حمزہ صاحب سے کہا تھا...

آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اوپر کچھ مارکٹائی بھی ہوئی ہے۔ پھر آوازیں کچھ مدھم پڑ گئیں۔ غالباً مزید نفری پہنچنے سے صورت حال کچھ سنبھل گئی تھی۔

اردگرد کے لوگ پوری طرح چونک گئے تھے۔ سب کی توجہ شاربہ بائی والے پلازا کی طرف ہوگئی تھی۔ لوگوں کا خیال غالباً یہ تھا کہ کسی اشتہاری وغیرہ کو پکڑنے کے لیے چھاپا مارا گیا ہے لیکن یہاں صورت حال کچھ اور تھی۔ خود "کوٹھے والی" پر آفت آئی تھی۔ عمران گاڑی سے نکل کر پان فروشوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں لوگ چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ دفعتاً میری نگاہ پلازا کی ایک بغلی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ کوئی شخص دوسری منزل کی کھڑکی سے نکلا اور پھر چھلانگ لگا کر ساتھ والی چھت پر آگیا۔ یہاں سے وہ چھجے پکڑ کر نیچے اترا اور گلی میں کود گیا۔ وہ فرار ہو رہا تھا۔ عمران مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں گاڑی سے اترا اور اس شخص کے پیچھے لپکا۔ تیس چالیس میٹر آگے جا کر میں نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ لیا۔ وہ بھاگتے قدموں کی آواز سن کر جان چکا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ جونہی میں نے اس کا کالر پکڑا، وہ چنگھاڑا اور پلٹ کر اندھا دھند اپنا دایاں ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی اور بے شک یہ تیز دھار آلے سے زیادہ خطرناک تھی۔ اس نے بوتل کو گردن کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے پھرتی سے خود کو بچایا پھر بھی بوتل کا نکیلا کنارہ میرے کندھے پر خراش ڈالتا گزر گیا۔ بوتل کا دوسرا وار میں نے جھک کر خالی دیا اور اس کے ساتھ ہی حملہ آور کی کلائی پکڑ لی۔ وہ پکی عمر کا شخص تھا اور خاصا زور آور بھی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک ہمارے درمیان زبردست کشمکش ہوئی۔ پھر میں نے اس کا بوتل والا ہاتھ دو تین بار عقب میں پختہ دیوار سے ٹکرایا اور بوتل چکنا چور کر دی۔ میرا ایک زوردار گھونسا کھا کر وہ پیچھے کی طرف گیا اور ایک دروازے کو توڑتا ہوا ایک کمرے میں جا گرا۔ یہاں بالکل ناکافی لباس میں ایک لڑکی ڈری سہمی کھڑی تھی۔ ایک نوجوان بھی تھا۔ فرش کے قالین پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ میرے مدِمقابل نے

اپنی لمبی قمیص کے نیچے سے کچھ نکالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میں نے اپنا پستول اس کی پیشانی سے لگا دیا۔

"خبردار! گولی مار دوں گا۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

وہ اپنی جگہ ساکت لیٹا رہ گیا۔ ہمارے گرد بھی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ پھر پولیس والے بھی پہنچ گئے اور انہوں نے اس بندے کو کسٹڈی میں لے لیا... نہ صرف کسٹڈی میں لے لیا بلکہ اس سے پہلے اچھی طرح مارا پیٹا بھی۔ اس شخص کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی غصیلا دلال ہے جو فون پر عمران سے بدتمیزی کرتا رہا ہے۔ پتا چلا کہ اوپر کوٹھے پر باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی۔ اس حنیف نامی دلال نے شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل سے ایک پولیس والے کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔ اب شاربہ بائی اور حنیف سمیت قریباً چھ افراد کو تھانے لے جایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تھانے پہنچ کر شاربہ بائی کی اکڑفوں کافی حد تک ختم ہو گئی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ اس نے ایک دو ٹیلی فون بھی کرائے تھے لیکن حمزہ صاحب کی ہدایت پر ایس ایچ او شوکت نے کسی طرح کا دباؤ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور اب تو پولیس مقابلے کا کیس بھی بن رہا تھا۔ اس لیے رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ حمزہ صاحب نے بھی اپنے طور پر انتظامیہ کے ایک دو عہدیداروں سے بات کر لی تھی۔

تھانے میں شاربہ نے اپنے وکیل کو بلایا لیکن وہ بھی بے بس تھا۔ سرکاری تعطیل تھی۔ شاربہ کو عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کی ضمانت ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ یقیناً اسے ریمانڈ پر پھر حوالات میں ہی بھیجا جانا تھا۔ اس کے غصیلے دلال حنیف کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا تھا۔

اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اور عمران تھانے پہنچے تو شاربہ بائی زرد چہرے کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھی نظر آئی۔ شعلہ مزاج حنیف حوالات کے گندے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نیلگوں گومڑ تھے اور ناک سے خون رس رہا تھا۔ اس بدزبان کی یہ درگت دیکھ کر ہمیں گونا گوں تسلی ہوئی۔

ہمیں دیکھ کر شاربہ کے چہرے پر تردد اور کدورت کے آثار نمودار ہوئے۔ یقیناً ہماری یہاں آمد سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں عمران کا ہاتھ ہے۔ ہمیں آتے دیکھ کر انسپکٹر شوکت نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمران کو آنکھ سے اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے دو کانسٹیبل بھی باہر چلے گئے۔ ایک طرح سے اس نے ہمیں شاربہ سے گفتگو کا موقع فراہم کیا تھا۔

عمران اور میں شاربہ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں میرے اور میری بچیوں کے پیچھے پڑے ہو؟''

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''تم نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا کیونکہ ابھی ہم نے تمہیں ہیروئن صاحبہ کا ایڈوانس ہی نہیں دیا تھا۔ اگر ہم تمہیں دو لاکھ روپیا دے دیتے تو پھر ضرور پھنس جاتے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم دو نمبر کام کے اندر دو نمبر کام کر رہی ہو۔ دکھاتی کچھ اور ہو، سودا کچھ اور دیتی ہو۔ جیسا تم نے یوسف کے ساتھ کیا۔''

''پتا نہیں تم کیا بول رہے ہو۔ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس کے لیے تم سب کو پچھتانا پڑے گا۔''

''فی الحال تو تمہارے پچھتانے کی باری ہے۔ بہتر ہے کہ جو دھندا تم چلا رہی ہو، اس کے بارے میں صاف بتا دو۔'' عمران نے کہا۔

وہ بھنّا کر بولی۔ ''تم سب پر اللہ کی مار۔ مجھے تو اب تک یہ سمجھ ہی نہیں آئی کہ مجھ پر الزام کیا ہے؟''

عمران بولا۔ ''تفصیل سے تو تمہیں پولیس والے ہی بتائیں گے۔ ہمیں یہ پتا ہے کہ تم دو نمبری کے اندر دو نمبری کر رہی ہو۔ گاہکوں کو چند خاص فلمی پریوں کے چہرے دکھاتی ہو۔ ان کے ساتھ رات گزارنے کے لیے بھاری رقم وصول کرتی ہو اور ان کی جگہ ان کی ہم شکل لڑکیوں کو گاہکوں کے حوالے کر دیتی ہو۔''

شاربہ کا رنگ بدل گیا۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ ''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایسا... کیسے ہو سکتا ہے؟ لوگ اندھے نہیں ہوتے... کہ... انہیں دکھایا کچھ اور جائے، دیا کچھ اور جائے۔''

''تم لوگ ایسا ماحول دیتے ہو کہ نقلی بھی اصلی معلوم ہوتا ہے۔ رہی سہی کسر امپورٹڈ شراب اور دیگر نشیلی چیزیں پوری کرتی ہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو تمہاری دو نمبری کا پتا چل جائے تو تم لوگ اسے ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیتے ہو یا پھر ویسے ہی غائب کرا دیتے ہو۔ یوسف فاروقی کی طرح۔''

میں جانتا تھا کہ عمران نے جو آخری جملہ کہا ہے، وہ دراصل اندھیرے میں تیر چھوڑا ہے۔ اسے ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ یوسف کو کیوں غائب کیا گیا ہے اور اس کا اغوا کار کون ہے۔

''تت... تم ہوش میں نہیں ہو۔ جو منہ میں آ رہا ہے بکتے جا رہے ہو۔ میرا کسی ایسی فراڈ بازی سے کوئی تعلق ہے اور نہ میں یوسف کے بارے میں جانتی ہوں۔''

''تمہاری اس فراڈ بازی کے ہم چشم دید اور کان سے گواہ ہیں بقلم خود۔'' عمران نے کہا۔ ''تم نے جمعرات رات اپنے کوٹھے پر ہم سے ٹاپ کلاس پاکستانی ہیروئن کی بات کی۔ اس کی بکنگ کے لیے دو لاکھ ایڈوانس لیے بلکہ بکنگ کی ڈیٹ بھی بتا دی۔ وہ فلمی ہیروئن بھی کٹہرے میں آ کر تمہارے خلاف گواہی دے گی۔ تم نے اس کے نام کا ... ترین استعمال کیا ہے۔''

''یہ سراسر الزام ہے، بہتان ہے۔ میں تم سب لوگوں کے خلاف عدالت میں جاؤں گی۔ تمہیں بتا دوں گی کہ ہم لوگ جب کسی سے ٹکر لیتے ہیں تو کس طرح لیتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر اکڑنے لگی۔ اس کی باچھوں سے پان کی لالی جھانک رہی تھی۔ تراشی ہوئی بھویں کمان کی طرح کس گئی تھیں۔

اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل پھر ہونے لگی۔ ایک بار پھر ثروت کا فون تھا۔ اس کی بے چینی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ یوسف کے غائب ہونے سے پہلے میں ہی اس کے آس پاس رہا تھا۔ دوسرا وسیم احمد تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اب اس کے سارے سوالوں اور تمام انکوائری کا رخ میری طرف تھا۔ دوسری طرف میں خود ہوا میں لٹکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یوسف کہاں ہے اور کیسے غائب ہوا ہے۔

میں نے کال ریسیو نہیں کی اور اس وقت کو کوسنے لگا جب رات کے پچھلے پہر سڑک پر ہونے والی لڑائی کے بعد میں زخمی یوسف کو لے کر اسپتال گیا تھا۔ میری جگہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔ جیلانی، اقبال یا پھر عمران کا کوئی اور ساتھی۔ میرے ہونے سے بہت فرق پڑا تھا۔ ایک بہت بڑا بوجھ آ گیا تھا مجھ پر۔

کچھ دیر بعد میرے فون پر نصرت کا میسج موصول ہو گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''تابش بھائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے یوسف کے گم ہونے کا زیادہ دکھ نہیں، دکھ اس بات کا ہے کہ باجی، اس کی گمشدگی سے پریشان ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کے لیے فکرمند ہو رہی ہیں جو ان کی زندگی خراب کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ اس واقعے کے سبب یوسف کے حوالے سے باجی کے رویے میں تبدیلی آ گئی ہے ورنہ وہ تو اس سے بات تک نہیں کر رہی تھیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ اس معاملے میں آپ کا نام آ رہا ہے۔ اسپتال میں یوسف کے پاس آپ ہی موجود تھے۔ میری ناقص رائے میں آپ کو چاہیے تھا کہ آپ فوراً یوسف کے گھر والوں کو اطلاع دیتے اور یوسف کی تیمارداری ان کے سپرد کرتے۔ اب یہ مسئلہ بھی ہے کہ آپ فون کا جواب نہیں دے رہے۔ اس وجہ سے فاروقی صاحب کے دل میں شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ پلیز! آپ رابطہ کریں۔''

میں نے میسج بھیجا۔ ''نصرت! تسلی رکھو، ثروت کو بھی تسلی دو۔ ہم یوسف کا کھوج ہی لگا رہے ہیں۔ اس وقت تھانے میں ہیں۔ ایک عورت سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ جونہی کوئی سرا ہاتھ آتا ہے، میں تمہیں فون کرتا ہوں۔''

سہ پہر تین بجے کے قریب ایک ہٹی کٹی لیڈی سب انسپکٹر اپنی دو تین سپاہیوں کے ساتھ تھانے پہنچ گئی۔ شاربہ بائی ایک علیحدہ کمرے میں موجود تھی۔ لیڈی سب انسپکٹر نے آتے ساتھ ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ سب انسپکٹر ایسے کاموں میں ماہر نظر آتی تھی۔ اس کی ناک چپٹی اور ماتھے پر ایک طرف پھلبہری کا سفید نشان تھا۔ اسے حمزہ صاحب نے خاص طور پر بھیجا تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں تھے۔ تاہم ایک بند کھڑکی کے ذریعے اندر کی آوازیں ہم تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ انسپکٹر بھی ہمارے ساتھ تھا اور اپنی کرسی پر موجود تھا۔ سب انسپکٹر نے جاتے ساتھ ہی شاربہ سے کہا کہ وہ اپنے کپڑے اتارے۔

شاربہ چلّانے لگی۔ سب انسپکٹر کو دھمکیاں دینے لگی۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ ''اپنے کوٹھے پر ہر رات درجنوں لڑکیوں کے کپڑے اترواتی ہو اور انہیں شرابی مردوں کے حوالے کرتی ہو۔ آج تمہارے کپڑے اتر جائیں گے تو کون سی بڑی بات ہے؟''

شاربہ چلّائی۔ ''میں وردیاں اتروا دوں گی تمہاری، جیل میں سڑا دوں گی۔ میں کوئی کرائے کی کوٹھڑی میں دھندا کرنے والی کسبی نہیں ہوں، میں شاربہ بائی ہوں۔ بازار کی سب سے بڑی ڈانس اکیڈمی چلاتی ہوں۔ منتھلیاں دیتی ہوں تم لوگوں کو۔ رات دن تمہارے منہ میں ہڈیاں ڈالتی ہوں۔ تیس ہزار انکم ٹیکس ہے میرا۔ تمہارے تو وزیر مشیر اتنا ٹیکس نہیں دیتے اور... اور تم مجھے کپڑے اتارنے کا کہہ رہی ہو؟''

سب انسپکٹر بولی۔ ''ابھی اتارنے کا کہہ رہی ہوں۔ خود نہ اتارو گی تو پھٹ کر اترے گا۔ کافی مہنگا سوٹ ہے۔''

''کتے کی بچی۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔'' شاربہ چلّائی۔

جواب میں چٹاخ کی زوردار آواز ابھری۔ شاربہ کو تھپیڑ پڑا تھا۔ اس کے بعد شاربہ کے چلّانے کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ کمرے کے اندر ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ بازارِ حسن کی ایک بااثر آنٹی کی دھنائی ہو رہی ہے۔

ایک منٹ بعد سب انسپکٹر نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی صرف مارا ہے۔ اس کے بعد الٹا لٹکاؤں گی اور تب یہ کپڑے شپڑے نہیں ہوں گے تیرے پنڈے پر۔''

شاربہ کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ اس ہائے ہائے میں تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لیا جا سکتا ہے۔ وہ کراہتی رہی اور ساتھ ساتھ خطرناک نتائج کا ذکر بھی کرتی رہی مگر اب اس کی آواز میں وہ دم خم نہیں تھا۔

سب انسپکٹر نے بے خوفی سے کہا۔ ''تو جو کچھ کرے گی، وہ بعد کی بات ہے لیکن ابھی یہاں چمڑے کے چھتر کے ساتھ تیری جو نتھ اتروائی ہو گی... وہ کسی کی نہیں ہوئی ہو گی۔ بہتر ہے کہ جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے، بک دے۔''

''مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔ میں اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں صرف ہمدردی کی وجہ سے اس کا حال پوچھنے اسپتال چلی گئی تھی...''

سب انسپکٹر نے اپنی کسی ساتھی سپاہن سے کچھ کہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ شاربہ بائی اچانک چلّانے لگی۔ ''نہیں... نہیں... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں۔ سب کچھ تو بتا رہی ہوں...''

سب انسپکٹر پھنکاری۔ ''میں نے بھی پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے تیری ہیرامنڈی پر۔ تو بڑی پکی ہے۔ جتنی اوپر ہے، اس سے تین گنا زمین کے نیچے ہے۔ میں تجھے باہر نکالوں گی اور ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر نکالوں گی۔''

سب انسپکٹر کے خطرناک لب و لہجے اور ماہرانہ گفتگو نے شاربہ بائی کا پِتّا پانی کر دیا تھا۔ اس نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں وہ بالکل ڈھب پر آ گئی۔

انسپکٹر شوکت ہم دونوں کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو شاربہ بائی مطیع اور خاموش نظر آئی۔ کوٹھے پر اہلکاروں کو خطرناک دھمکیاں دینے والی شاربہ بائی اور اس شاربہ بائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ماتھے اور ایک ہاتھ کی پشت پر چوٹ کا نشان نظر آرہا تھا۔ اس کے چربی دار جسم میں ہلکی سی لرزش محسوس کی جاسکتی تھی۔

ہم تینوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تومند سب انسپکٹر ہمارے عقب میں مستعد کھڑی رہی۔ عمران نے سارے سوال انسپکٹر شوکت کو سمجھا دیے تھے۔ انسپکٹر نے سب سے پہلا سوال ہی یہ پوچھا۔ ”یہ ہم شکل لڑکیوں والا کام کب سے ہو رہا ہے؟“

”مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن ڈیڑھ دو سال تو ہو گئے ہیں۔“ وہ اپنے فربہ ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ کر بولی۔

”یہ کام کیسے شروع ہوا؟“

”میں قسم کھاتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ سلطان چٹے کا میرے کوٹھے پر آنا جانا تھا۔ ایک دن... وہ ایک بڑے بدمعاش کو لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ یہ ڈان جاوا ہے۔ انڈیا کی فلم لائن میں اس کا بڑا اثر رسوخ ہے۔ فلمی ہیروئنوں سے اس کے رابطے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کے کام کرا سکتا ہے۔ اب پاکستان کے فلمی لوگوں سے بھی اس کے تعلقات بڑھ رہے ہیں... وہ یہاں کی فلمی لڑکیوں کو انڈیا میں کام دلانے کی بات کرتا ہے اور لڑکیاں اس کے آس پاس رہتی ہیں... پھر ایک روز سلطان چٹے نے ہی مجھے بتایا کہ پاکستان کی ایک دو ٹاپ کلاس ہیروئنوں سے ہمارے پکے رابطے ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے کئی طرح کے کام سنبھال رہے ہیں۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اگر میرا کوئی گاہک اچھے پیسے خرچ کر سکے تو وہ ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے۔ شروع میں مجھے یقین نہیں آیا لیکن جب دو تین بار سلطان نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تو مجھے یقین کرنا پڑا۔ آپ سب جانتے ہو، میرا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ گاہک اور لڑکی کے درمیان رابطہ کرنا۔ اگر لڑکی بکنے پر راضی ہو تو پھر ہمارے پیشے میں سب جائز ہے۔“

”لیکن یہاں تو دو نمبر کام ہو رہا تھا۔ کیا تمہیں پتا نہیں تھا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں اسی طرف آرہی ہوں۔ چار پانچ گاہک بھگتانے کے بعد میرے ملازم حنیف کو شک ہو گیا کہ یہ دو نمبر کام ہو رہا ہے۔ اس کی بات درست تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ لیکن جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جاوا ہمیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اگر ہم زبردستی پیچھے ہٹتے تو نقصان اٹھاتے۔ جاوا نے ہمیں بس اتنی گارنٹی دی کہ اگر کبھی کوئی گاہک کسی طرح کا پھڈا ڈالے گا تو سلطان وغیرہ اس سے خود نمٹیں گے اور مجھ پر یا میری بچیوں پر کوئی زد نہیں آئے گی۔“

”بس اتنی سی گارنٹی لے کر تم نے یہ فراڈ بازی جاری رکھی، اچھا خاصا پیسا بھی کماتی رہیں اور یوسف فاروقی جیسے موٹے مرغے پھانستی رہیں۔“

”میں نے بتایا ہے نا، میں جاوا جیسے بندے سے ٹکر نہیں لے سکتی تھی اور نہ اب لے سکتی ہوں۔“

”ہمیں پورا یقین ہے کہ یوسف کو تمہارے فراڈ کا پتا چل گیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے انسپکٹر! اسے ایک آدھ گھنٹے کے لیے لیڈی پولیس کے حوالے کر ہی دینا چاہیے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ انسپکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ سب انسپکٹر مستعد انداز میں دو قدم آگے آگئی۔

شاربہ کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ ”میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں اور کچھ نہیں جانتی۔“

”لیکن ہم کچھ کچھ جانتے ہیں۔“ عمران نے کہا۔ ”یوسف کو اسپتال سے کیسے اٹھایا گیا، کہاں رکھا گیا، تمہیں سب معلوم ہے۔ تم پوری نگرانی کر رہی تھیں۔ تمہیں ڈر تھا کہ وہ شور مچائے گا۔ تمہارے ہی کہنے پر اغوا کرنے والوں نے اسے دوا پلائی تھی تاکہ وہ بے ہوش پڑا رہے۔“

شاربہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ عمران کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ نیلم سے حاصل کی گئی معلومات یہاں ہمارے کام آرہی تھیں۔ انسپکٹر شوکت نے کہا۔ ”تم کچھ بتاتی ہو یا ہم کمرے سے نکل جائیں اور سب انسپکٹر سمیرا کو کام کرنے دیں؟“

وہ ایک دم رونے لگی۔ دبنگ عورت تھی مگر حالات کے گھیرے میں آکر اس کی آن بان سارے پندار سمیت ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ وہ بلکی۔ ”جاوا بڑا ظالم شخص ہے، اس کے سامنے میری کوئی پیش نہیں چل سکتی۔ وہ جو کہتا ہے، مجھے کرنا پڑتا ہے... اپنی اور اپنی بچیوں کی جان کے ڈر سے کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کے جال میں پھنس چکی ہوں۔ میں کدھر جاؤں؟ کیا کروں؟ اس کا کارندہ سلطان چٹا ہر وقت موت کے فرشتے کی طرح ہمارے سر پر سوار رہتا ہے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”تمہارا یہ واویلا ہم بعد میں سن لیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یوسف کے ساتھ کیا کیا تم نے اور کیوں؟“

وہ بولی۔ ”میں قسم کھاتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ اندر کی بات کیا ہے۔ بس انڈیا سے جاوا کا آرڈر تھا کہ یوسف کو اسپتال سے اٹھانا ہے۔ یوسف کو اٹھانے سے پہلے میرے پاس کوٹھے پر ایک بندہ بھیجا گیا تھا۔ وہ انڈین تھا اور جاوا کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں اس کا نام تک نہیں جانتی۔ وہ میرے ساتھ اسپتال گیا تھا اور اس نے یوسف کو دیکھا۔ جب اس کی تسلی ہو گئی تو سلطان چٹے کے لوگوں نے اگلا قدم اٹھایا اور اسے اسپتال سے لے گئے۔ وہ اسے وہیل چیئر پر اسٹیشن وین تک لائے اور پھر اسٹیشن وین میں ڈال کر نکل گئے۔“

”وہ آسانی سے کیسے چلا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آسانی سے نہیں گیا۔ انہوں نے اس پر پستول تانا ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پستول ایک کپڑے کے نیچے تھا اور کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے یوسف سے کہا تھا کہ اسٹیشن وین میں ایک بندہ ہے جو اس سے دو چار سوال پوچھنا چاہتا ہے اگر اس نے جواب دے دیے تو وہ دس پندرہ منٹ میں اسے چھوڑ دیں گے لیکن یہ غلط تھا، وہ اسے وین میں ڈال کر لے گئے۔ راوی کے پل پر ناکابندی کی وجہ سے اسے تین چار گھنٹوں کے لیے میری گلبرگ والی کوٹھی میں رکھا گیا، اس کے بعد آگے لے گئے۔“

”آگے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔“

”چلو جتنا پتا ہے، اتنا ہی بتا دو۔“ میں نے کہا۔

”وہ لوگ اتنا ہی بتاتے ہیں، جتنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میری بات کا یقین کرنا، میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ ہم... میں نے ان کی باتوں میں صرف فقیر والا کا نام سنا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ ”فقیر والا“ کوئی شہر ہے یا پنڈ شنڈ ہے۔ میں نے سلطان سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے بات پلٹ دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کچھ نہیں بتائے گا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ لوگ یوسف کو فقیر والا نامی جگہ لے کر گئے ہیں؟“

”مجھے یہی لگتا ہے لیکن اب اگر آپ لوگ چاہو کہ میں سلطان سے کوئی ٹوہ وغیرہ لوں تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ بہت نخرے لوگ ہیں، بہت ہی زیادہ ہوشیار۔ انہیں پتا چل چکا ہو گا کہ پولیس مجھے شک میں لے کر گئی ہے۔ اب وہ کچھ عرصے تک مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ بازار کی کسی اور عورت سے وہی کام لینا شروع کر دیں جو میں کرتی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے تو ان کی طرف سے جان کا بھی خطرہ ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”تم تسلی رکھو۔ انسپکٹر صاحب تمہاری حفاظت کا پورا انتظام کریں گے۔ بڑے افسر بھی اس کیس میں پوری دلچسپی لے رہے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپاؤ مت۔“

وہ ایک بار پھر روہانسی ہو گئی۔ ”میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے ہو... کیوں نہیں... مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔ اب میری جان بھی نکال لو گے تو مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکو گے۔ میرے پاس اب بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں۔“

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، چلو انسپکٹر صاحب کو یہی بتا دو کہ جاوا کے پاس کتنی ہیروئنوں کی ہم شکل لڑکیاں ہیں؟“

”مجھے صرف دو کا پتا ہے۔ ایک تو یہی جس کے لیے یوسف نے بات کی تھی اور تم لوگوں نے بھی۔ دوسری وہ نئی ہیروئن سونو ہے۔“

”یہ لوگ ہم شکل چہرے تلاش کس طرح کرتے ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل ہے شاید ”ڈوکٹی فور“ نام ہے اس کا۔ اس میں ہر ہفتے میں چار دن ایک بڑا کامیڈی شو چلتا ہے۔ اس میں اہم اور مشہور لوگوں کے خاکے اڑائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر فلمی لوگ ہی ہوتے ہیں۔ چینل والے اخبار میں بھی اشتہار دیتے ہیں کہ انہیں اہم شخصیات کے ہم شکل لوگوں کی ضرورت ہے۔ چینل پر بھی اشتہار چلتا ہے کہ... اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی صورت کسی مشہور چہرے (سیلیبریٹی) سے ملتی ہے تو ہم سے رابطہ کریں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جاوا وغیرہ کا رابطہ اس چینل سے ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ان کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔“ شاربہ بائی نے جواب دیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، ہم شکل لڑکیوں سے اور کیا کام لیا جاتا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”مجھے ٹھیک سے پتا نہیں... بس وہ...“ شاربہ کہتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہتے اٹک گئی۔

انسپکٹر شوکت نے اسے پھر رواں کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کرے گی تو اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی... بلکہ اس معاملے میں اس کا نام ہی نہیں آئے گا۔ دوسری صورت میں اس کا رخ حوالات سے سیدھا لاہور جیل کی طرف ہو جائے گا۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ”پچھلے مہینے ان لوگوں نے مشہور بھارتی ایکٹر ایشوریا رائے کی ایک ہم شکل لڑکی ڈھونڈی تھی۔ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ بس اس کے بال کچھ گھنگرالے تھے جو انہوں نے سیدھے کرالیے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کو یہ لوگ انڈیا لے جائیں گے یا ہو سکتا ہے کہ لے بھی گئے ہوں۔ وہاں اس سے کئی کام لیے جاسکتے ہیں۔ اسے کسی فلم کے سینوں میں اصل ہیروئن کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے یا پھر اس طرح کے غلط کام کرائے جاسکتے ہیں جیسے یہاں ہوتے ہیں۔“

میرے تصور میں سویٹی نامی وہ لڑکی آگئی جو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہمیں ملی تھی۔ شیخوپورہ کے نواحی ویرانے میں راجا کو اس لڑکی سے ”مستفید“ ہونے کا نادر موقع ملا تھا۔ اس سے پہلے یہ لڑکی سیکریٹری ندیم کی راتوں کو چکاتی رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم و بیش نوّے فیصد تک معروف فلم اسٹار سے ملتی تھی۔ اس کا رنگ ابھی کچھ سانولا تھا لیکن آج کل رنگ گورا کرنا کون سا مشکل کام ہے۔

یہ ایک لمبا چوڑا تانا بانا تھا اور اس کی تفصیلات توجہ طلب تھیں۔ یقینی بات تھی کہ انڈیا میں بھی اس طرح کی مہم جوئی ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہاں بھی کسی ٹی وی چینل یا فلم کمپنی یا آرٹ اکیڈمی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہو۔

انسپکٹر شوکت کا اندازہ یہی تھا کہ ہم جو کچھ اس نائکا سے پوچھ سکتے ہیں، وہ پوچھ چکے ہیں۔ تاہم عمران کا خیال تھا کہ ہمیں تھوڑا بہت دلال حنیف کو بھی ٹٹولنا چاہیے۔ ہم لاک اپ میں پہنچے، وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ یہاں ہونے والی دھنائی کے بعد اس کی تن فن بھی ختم ہو چکی تھی۔ جس اے ایس آئی پر حنیف نے ٹوٹی ہوئی بوتل سے حملہ کیا تھا، وہ اسپتال میں تھا۔ اہلکار پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں زیرِ دفعہ 333، حنیف کو بہ آسانی آٹھ دس سال قید کی سزا ہو سکتی تھی۔ اس وقت وہ بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ”استاد! جو کچھ ہوا ہے تیری بداخلاقی اور گندی زبان کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تو اس وقت میرا فون سن لیتا اور باجی سے میری بات کرا دیتا تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔“

وہ عمران سے معافی مانگنے لگا۔ وہ مجھے بھی سادہ لباس میں پولیس والا ہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی منت سماجت شروع کر دی۔ ہم نے اس سے دس پندرہ منٹ سر کھپایا لیکن اس کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہو سکا جو شاربہ ہمیں بتا چکی تھی۔

ایس پی حمزہ صاحب کے کہنے پر رات تک شاربہ کو شخصی ضمانت پر گھر بھیج دیا گیا اور اس کی حفاظت پر گارڈز بھی لگا دیے گئے۔ حنیف کا جرم سنگین تھا، اس کے خلاف پولیس کی مدعیت میں ہی پرچہ کاٹ دیا گیا۔

☆☆☆

اب ہمارے پاس صرف ایک سراغ تھا، فقیر والا... لیکن یہ کہاں تھا؟ کوئی قصبہ تھا، گاؤں تھا یا کسی علاقے کا نام تھا؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس حوالے سے ہمیں سیکریٹری ندیم کچھ اتا پتا دے سکتا تھا مگر صرف دو دن پہلے سیکریٹری ندیم کے حوالے سے ہمیں ایک بری خبر مل چکی تھی۔ عمران نے اسے جیلانی کے سپرد کیا تھا اور جیلانی نے اسے لاہور ہی میں کسی مکان میں محبوس رکھا ہوا تھا مگر دو دن پہلے ندیم کو وہاں سے بھاگنے کا ایک نادر موقع مل گیا تھا۔ ایک ساتھ والی بلڈنگ میں آگ لگی تھی جس کی وجہ سے اس مکان میں بھی دھواں بھر گیا جہاں ندیم بند تھا۔ موقع پر دو مسلح چوکیدار موجود تھے۔ انہوں نے اس خوف سے کہ کہیں ندیم کی موت نہ ہو جائے، اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور صحن میں لے جانا چاہا مگر اسی دوران میں ندیم کام دکھا گیا۔ اس نے ایک چوکیدار کے سر پر لوہے کی لٹھ ماری اور گہرے دھوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ یوں وہ عقبی دیوار پھاند گیا۔ اس واقعے کے بعد عمران کو وہ مکان مقفل کرنا پڑا تھا۔

اگلے آٹھ دس گھنٹے میں عمران نے سرتوڑ کوشش کی کہ کسی طرح سلطان چیٹے کا کوئی بندہ ہاتھ آجائے اور اس سے ”فقیر والا“ کا اسرار معلوم کیا جائے مگر ناکامی ہوئی۔ شاربہ کا کہا درست نکلا تھا۔ یہ لوگ ایک دم روپوش ہو گئے تھے۔ سلطان چیٹے کی وہ کوٹھی بھی خالی پڑی تھی جہاں ہم نے نادر ٹی کو شوٹ کیا تھا اور سلطان کے کان میں جھمکا ڈالنے کی جگہ بنائی تھی۔ عمران کی نگاہ میں ایک دو اور ٹھکانے بھی تھے۔ اس نے جیلانی، اقبال اور امتیاز وغیرہ کو سرچ کے لیے بھیجا مگر مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔

دوسری طرف کبھی ثروت اور کبھی نصرت کا میسج آرہا

تھا۔ وہ جلد از جلد مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ خاص طور سے ثروت بے چین تھی۔ شام کے بعد میں، عمران اور اقبال اندرون شہر یعنی راوی روڈ والے مکان میں سر جوڑ کر بیٹھے اور فقیر والا کا کھوج لگانا شروع کیا...... ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قصبہ یا گاؤں کس ضلع یا کس صوبے میں ہے۔ نام سے بھی کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا... پنجاب، جنوبی پنجاب اور سندھ میں بھی اس طرح کے نام پائے جاتے تھے۔ عمران نے اپنے ایک تحصیل دار دوست سے رابطہ کیا اور اس کے ذریعے ایک ایسے سرکاری افسر سے بات کی جسے چھوٹے شہروں، قصبات اور دیہات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل تھیں اور ریکارڈ وغیرہ بھی موجود تھا۔ یہ شخص دو دن کی چھٹی پر تھا اور اس کے بعد ہی تفصیل سے ریکارڈ وغیرہ دیکھ کر کچھ بتا سکتا تھا۔ عمران کے کہنے پر اقبال کہیں سے دو بڑے بڑے نقشے لے آیا۔ یہ پاکستان کے تفصیلی نقشے تھے لیکن ان میں بھی کہیں فقیر والا نظر نہیں آیا۔ ایک جگہ دکھائی دی پر اس کا نام فقیراں پور تھا۔

ہم نقشوں میں مگن تھے جب دروازے پر بیل ہوئی۔ عمران نے کہا۔ ”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ نسوانی بیل ہے۔ کہیں شاہین ہی نہ ہو۔ اگر وہ ہوئی تو آج ضرور مجھ سے طلاق لے لے گی۔“

”شادی سے پہلے طلاق کیسے ہو سکتی ہے؟“ اقبال نے کہا۔

”یہ سیل فون کا دور ہے، اس میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔

اقبال دروازے پر گیا اور چند سیکنڈ بعد ثروت کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ثروت کا اس طرح آنا میرے لیے تعجب خیز اور پریشان کن تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھتری تھی اور تب ہمیں اندازہ ہوا کہ باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔

ثروت کی خوب صورت آنکھوں میں اندوہ آمیز تھکن تھی۔ بالوں کی دو لٹیں زرد رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ ”سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ بولی اور شولڈر بیگ میز پر رکھ دیا۔

میں نے اسے کرسی دی اور کہا۔ ”سوری تو مجھے کہنا چاہیے۔ میں تم سے رابطہ نہیں کر پا رہا تھا۔ دراصل یوسف کے سلسلے میں ہی مصروف تھا۔ یہ دیکھو... اب بھی ہم یہ نقشے وغیرہ ہی دیکھ رہے تھے۔ میں چاہتا تھا... کہ کوئی ٹھوس اطلاع ہو تو تم سے رابطہ کروں۔“

”اور اگر دس دن تک ٹھوس اطلاع نہیں ملتی تو آپ رابطہ ہی نہیں کرتے؟“ وہ شکوہ کناں انداز میں بولی۔

”ایسی بات نہیں ثروت! میں اتنا ہی پریشان ہوں جتنی تم ہو۔ یقین کرو، کل سے ایک لقمہ نہیں کھایا گیا مجھ سے... بلکہ یہ عمران بھی اسی طرح بھوکا پیاسا میرے ساتھ پھر رہا ہے۔“

”ہاں ثروت! ہم مسلسل کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کیا کامیابی ہوئی ہے؟“ وہ سر جھکا کر آنسو بہانے لگی۔

عمران نے مجھے اشارہ کیا اور چائے لانے کا بہانہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے اقبال بھی کھسک گیا۔ میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ ”ثروت! صورت حال اچھی نہیں۔ لیکن اتنی بُری بھی نہیں کہ ہم اس طرح رونے لگیں اور ہمت ہار کر بیٹھ جائیں۔“

”آپ... مجھے سچ بتائیں۔ کیا انہیں اغوا کر لیا گیا ہے؟“

”ہم اسے اغوا تو نہیں کہہ سکتے ثروت... یوں لگتا ہے کہ... ان لوگوں کے ساتھ یوسف کا کوئی تنازع تھا۔ وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ شاید اپنی کوئی بات منوانا چاہتے ہیں اس سے۔“

”آپ بات کی شدت کو کم کر رہے ہیں لیکن بات تو وہی ہے نا۔ وہ لوگ یوسف کو لے گئے ہیں لیکن یوسف تو چیریٹی شو میں گئے تھے۔ وہ فورٹریس کی طرف تھا۔ پھر وہ گلبرگ کس لیے آئے اور جب ایکسیڈنٹ ہوا تو آپ وہاں کیسے پہنچ گئے؟“

ثروت کے لہجے میں الجھن تھی اور شک کی ہلکی سی بُو بھی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ فورٹریس نہیں گیا تھا، وہ تو گلبرگ میں تھا اور کسی کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا۔ اگر میں بتاتا بھی تو شاید وہ یقین نہ کرتی اور اسے بھی میری رقابت قرار دیتی۔ میں اس معاملے میں خاموش رہا۔ ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچنے کے حوالے سے میں نے اسے بتایا کہ میں اور میرا دوست عمران ایک شادی میں شرکت کے بعد آرہے تھے۔

”آخر وہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ کیا انہوں نے کوئی رابطہ کیا ہے؟“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر سوالیہ انداز میں بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”اور وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ آپ تھانے میں موجود تھے؟“

میں نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ یوسف کے ایک دفتری دوست کی جاننے والی ہے۔ اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھوڑی بہت معلومات ملی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ وہ لوگ یوسف کو لاہور سے باہر لے گئے ہیں۔ کوئی فقیر والا نام کا قصبہ یا گاؤں ہے۔ اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان ہے کہ یوسف کو وہاں لے جایا گیا ہو۔ ہم فقیر والا کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ فقیراں پور کے نام سے ایک چھوٹے قصبے کا پتا تو چلا ہے لیکن فقیر والا کا نام کسی نقشے میں نظر نہیں آرہا۔ دراصل ایسے چھوٹے قصبوں یا دیہات کو اسی وقت ڈھونڈا جاسکتا ہے جب ان کے پاس کے کسی معروف شہر یا قصبے کا پتا ہو۔"

میرے اور ثروت کے درمیان اس موضوع پر آٹھ دس منٹ بات ہوئی، اچانک وہ چونک کر بولی۔ "میری ایک دوست مرینہ "پاکستان اسٹڈی" کی لیکچرار ہے۔ میں نے اس کے پاس ایک نقشہ دیکھا تھا بلکہ پورا اٹلس تھا۔ اردو کے اس اٹلس میں پاکستانی علاقوں کی بڑی تفصیل تھی۔ صوبوں کے نقشے تھے اور پھر صوبوں کے اندر کمشنریوں کے علیحدہ نقشے تھے۔ جیسے کمشنری لاہور، کمشنری گوجرانوالہ وغیرہ... چھوٹے چھوٹے ٹاؤنز کے نام بھی لکھے تھے۔ اگر... اگر واقعی فقیر والا کوئی جگہ ہے تو ان نقشوں میں ضرور ہوگی۔"

"تمہارے پاس اپنی دوست کا فون نمبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سیل فون نکال کر اسے کال کرنے لگی۔ فون بند تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس نے اسی وقت شولڈر بیگ اٹھایا، چھتری پکڑی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جارہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مرینہ کی طرف... ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"کس میں آئی ہو تم؟"

"ٹیکسی میں۔ ٹیکسی ابھی باہر ہی کھڑی ہے۔"

"نہیں ثروت! اگر تم ابھی جانا چاہتی ہو تو پھر میں گاڑی نکالتا ہوں۔"

اس نے انکار کیا لیکن میں نے اسے قائل کرلیا۔ اسی دوران میں عمران چائے وغیرہ لے آیا۔ میں نے اقبال سے کہا کہ وہ باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کردے۔ اس دوران میں ہم نے چائے پی اور عمران کو تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

دس منٹ بعد ثروت اور میں، عمران کی مہران گاڑی پر موجود تھے اور بازار سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف جارہے تھے۔ میں ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ثروت میرے برابر بیٹھی تھی۔ یہ رات کے دس بجے کا وقت تھا، بارش مسلسل ہورہی تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی نے ثروت کے اعصاب کو بے طرح جکڑا ہوا تھا۔ مرینہ کے گھر تک کا فاصلہ ہم نے تقریباً خاموشی میں ہی طے کیا۔ یہ نسانده روڈ تھا۔ میں نے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ ثروت چھتری تان کر اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ ایک کتابچہ سا اس کے ہاتھ میں تھا۔ گاڑی میں گھس کر اس نے چھتری بند کی اور دروازہ بھی بند کردیا۔ اس کے چہرے پر ہیجان سا تھا۔ اس گاڑی کی اندرونی بتی جلا کر کتابچے کے صفحے الٹنے لگی۔ یہ ایک بغیر جلد کا اٹلس تھا۔ کچھ پرانا لگتا تھا۔ اس میں واقعی پاکستان کی مختلف کمشنریوں کے تفصیلی نقشے تھے۔

اس نے ایک صفحہ نکالا اور بولی۔ "یہ دیکھیں... یہ ہے کمشنری بہاولپور... یہ ہے ہارون آباد اور یہ اس سے آگے بیس پچیس کلومیٹر... فقیر والا۔ یہ دراصل فقیر والی ہے۔" مجھے یاد آیا کہ شاریہ بائی نے بھی اپنی گفتگو میں فقیر والا یا فقیر والی ہی کہا تھا۔ یعنی تلفظ میں تھوڑا سا شک تھا۔

فقیر والا کا لفظ میری نگاہوں میں چمکا اور اس کے ساتھ ہی ایک سنسنی خیز احساس بھی ہوا۔ یہ جگہ انڈین بارڈر کے بالکل قریب تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ فقیر والی ہے جس کا ذکر شاریہ بائی نے کیا ہے اور جس کا نام جاوا کے ساتھیوں کی گفتگو میں آیا ہے۔

ثروت دھیان سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں... اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زیادہ بڑا قصبہ نہیں ہے۔ ایسی جگہوں پر کسی باہر کے بندے کا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا... مگر..."

"ایک اور بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔" ثروت نے جذباتی انداز میں کہا۔ "اپنے پیر احمد تھانوی صاحب بھی آج کل ہارون آباد میں ہیں۔ وہاں ان کے بہت سے مرید ہیں۔ ان میں ایک دو پولیس افسر بھی ہیں۔ تھانوی صاحب ہماری بہت مدد کرسکتے ہیں۔"

پیر احمد تھانوی وہی نیک خو بزرگ تھے جن کے آستانے پر میں نے پہلی بار نصرت کو دیکھا تھا اور پھر ثروت کو دیکھنے کی سبیل بھی پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایک روحانی شخصیت تھے اور روحانی شعبدہ بازوں کی طرح عقیدت مندوں کو الو نہیں بناتے تھے۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش جاری تھی۔

کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہوجاتی تھی۔ ثروت کے سراپا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ وہ بولی۔ "تابش! ابو جان (فاروقی صاحب) تو بیمار ہیں۔ وہ کہیں آجا نہیں سکتے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں سوچتی ہوں کیوں نہ میں ابھی ہارون آباد چلی جاؤں۔ احمد تھانوی صاحب کے وہاں ہوتے ہوئے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب؟ تم اکیلی جاؤ گی اور اس وقت؟"

"تابش! ایسے کاموں میں جتنی دیر ہو، اتنا ہی معاملہ بگڑتا ہے۔ ہم پہلے ہی کافی دیر کرچکے ہیں۔"

"اگر ایسی بات ہے ثروت تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا لیکن... ابھی نکلنے کے لیے وقت اچھا نہیں ہے۔ ہم صبح سویرے نکل سکتے ہیں۔ ڈرائیونگ آسان ہوگی اور شاید موسم بھی ٹھیک ہوجائے۔"

"مگر میں تو بس پر جانا چاہتی ہوں۔"

"چلو، بس پر ہی چلے جائیں گے مگر صبح نکلنا بہتر رہے گا۔ اس دوران میں، میں ساتھیوں سے بھی مشورہ کرلیتا ہوں۔"

"نہیں تابش! کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ میں اکیلی چلی جاؤں۔ وہاں ہارون آباد میں مجھے ہر طرح کی سہولت مل جائے گی۔" ایک مشرقی بیوی کی تمام تر بے قراری اور خلوص آمیز فکر مندی ثروت کے لہجے میں پائی جاتی تھی۔ اس کے لہجے کی یہ کیفیت میرے اندر تک ایک طرح کا کرب جگانے لگی۔ وہ کیا کررہا تھا اس کے ساتھ اور یہ کس طرح ہلکان ہورہی تھی اس کے لیے۔

"نہیں ثروت!" میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا لیکن موسم خراب ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت سفر مشکل ہوگا۔ چند گھنٹوں کی بات ہے بلکہ میں ابھی فون پر بس کی ٹائمنگ کا پتا کرلیتا ہوں اور بکنگ بھی کرالیتا ہوں۔ ہمیں ڈائریکٹ ہارون آباد کی بس مل جائے تو بہت اچھا رہے گا۔"

میں نے اسی وقت بس اسٹینڈ پر فون کیا۔ پتا چلا کہ لاہور سے براہ راست ہارون آباد کے لیے بس صبح گیارہ بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوگی۔ میں نے دو نشستیں ریزرو کرنے کے لیے کہہ دیا۔

ثروت کل جانے کے لیے نیم رضامند نظر آنے لگی مگر اس کے اندر بے قراری موجود رہی۔ اس کے پاس احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ کا فون نمبر موجود تھا لیکن وہ عشا کے کچھ ہی دیر بعد سو جاتے تھے۔ اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا ثروت نے مناسب نہیں سمجھا۔ ہم نے وہیں گاڑی میں چار پانچ منٹ گفتگو کی اور ہمارے درمیان کل دوپہر کا پروگرام تقریباً طے ہوگیا۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ثروت کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤں مگر اسی دوران میں ایک خالی ٹیکسی آگئی۔

ثروت نے کہا۔ "آپ کو بڑا لمبا چکر پڑے گا۔ میں آرام سے ٹیکسی پر چلی جاتی ہوں۔"

میرے روکنے کے باوجود وہ باہر نکل گئی۔ مجھے خدا حافظ کہا اور ٹیکسی پر سوار ہوکر چلی گئی۔ ٹیکسی قریباً سو میٹر دور گئی ہوگی جب میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ کہیں ثروت نے میرے ساتھ غلط بیانی تو نہیں کی تھی؟ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے ٹیکسی کی "ٹیل لائٹ" نظر آنے لگی۔ میں محفوظ فاصلے سے ٹیکسی کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد بارش پھر شروع ہوگئی۔ گرج چمک بھی ہونے لگی۔ موسم کے تیور پل پل بدل رہے تھے۔

یکایک میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ یتیم خانہ چوک سے سیدھا آگے نکل کر گارڈن ٹاؤن کا رخ کرنے کے بجائے ٹیکسی دائیں طرف بندروڈ کی طرف مڑ گئی۔ اس سڑک پر بسوں کے بہت سے اڈے تھے۔ میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ثروت نے میری بات نہیں مانی اور ابھی اسی وقت تنہا ہارون آباد روانہ ہورہی تھی۔ یقیناً اس نے سیل فون کے ذریعے اپنے گھر والوں کو اپنی روانگی کی اطلاع پہنچادی ہوگی۔ بارش زور پکڑتی جارہی تھی۔ سڑکوں پر پانی جمع ہورہا تھا۔ ٹیکسی بس اسٹینڈ پر پہنچی، میں نے مہران کچھ فاصلے پر روک دی۔ ثروت رنگین چھتری تانے ہوئے ٹیکسی میں سے نکلی اور تیزی سے بس اسٹینڈ کی انتظار گاہ میں داخل ہوگئی۔ اب شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ ابھی اور اسی وقت جارہی تھی۔

میں نے بھی مہران لاک کی اور بارش سے بچنے کے لیے ایک مارکیٹ کے برآمدے میں چلتا ہوا بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ کوشش کے باوجود میرے جسم پر بارش کی بوچھاڑیں آئی تھیں اور میں جزوی طور پر بھیگ گیا تھا۔ میں بس اسٹینڈ پر پہنچا تو مجھے بکنگ آفس کے پاس ثروت نظر آئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ ٹکٹ لینے کے لیے کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ میں اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور بکنگ کلرک سے بولی۔ "ایک ٹکٹ بہاولنگر کا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے نوٹ اس کے ہاتھ سے اچک لیا اور ہزار کا نوٹ کلرک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ایک نہیں، دو ٹکٹ۔“

وہ حیرت سے مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ بارش کے چھینٹوں سے اس کی چادر بھیگ گئی تھی اور بالوں کی نم لٹیں بائیں رخسار سے چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں تعجب، گریز اور اطمینان کے ملے جلے آثار نظر آئے۔ ایک ایسی کیفیت جسے کوئی بھی نام دینا مشکل تھا۔ ٹکٹ لے کر ہم بس میں آگئے۔ بس درمیانے درجے کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تم کیا سمجھتی تھیں، میں تمہیں اکیلا جانے دوں گا؟“

”شکریہ۔“ اس نے بس اتنا ہی کہا۔

”تم تو کہا کرتی تھیں کہ شکریہ بیگانوں کا ادا کیا جاتا ہے۔“

وہ خاموش رہی۔ چھتری کے باوجود اس کا لباس ایک طرف سے بھیگ گیا تھا۔ لان کی قمیص میں سے کندھے کا گلابی پن اور پہلو کے نشیب و فراز نظر آرہے تھے۔ میں نے ہولے سے اس کی اوڑھنی درست کر دی۔ شاید اس نے پھر ”شکریہ“ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس بار خاموش رہی۔

بس کی سواریاں تیزی سے پوری ہوئیں اور ڈرائیور نے نشست سنبھال لی۔ میں نے موبائل پر عمران کا نمبر ملایا۔ وہ بولا۔ ”ہیلو تابی! کہاں چلے گئے ہو؟ اتنے رومانی موسم میں نوجوان جوڑے بہک بھی سکتے ہیں۔“

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”عمران! میں بہاولنگر جا رہا ہوں۔ وہاں سے ہارون آباد جاؤں گا۔ ثروت میرے ساتھ ہے۔“

”ہارون آباد؟ وہ کیوں؟“ عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ بعد میں فون کروں گا۔“

”اوئے لکڑ بھگے! گاڑی کا موبل آئل بدلنے والا تھا۔ کہیں رستے میں ہی انجن چوک نہ ہو جائے۔“

”نہیں ہوگا چوک یار... وہ ادھر ہی کھڑی ہے۔ بس اسٹینڈ کے پاس۔ دوسری چابی تو ہے نا تمہارے پاس؟ آ کر لے جاؤ۔“

”اور تم کس پر جا رہے ہو؟“

”بس پر۔“

”یہ فقیر والا کہیں ہارون آباد کی طرف تو نہیں ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔ باقی باتیں پھر۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے فون بند کرنے سے ثروت کو اطمینان کا احساس ہوا۔ ثروت کے منع کرنے کے باوجود میں نے پانچ سو کا نوٹ اس کے شولڈر بیگ میں ڈال دیا جو کھڑکی میں اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔

میرے ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ حالات مجھے اور عمران کو تنکے کی طرح اڑا رہے تھے۔ چند دن پہلے اسی طرح ڈاکٹر مہناز غائب ہوئی تھی۔ وہ بدھا کی مورتی اور آرا کوئے والا معاملہ تھا اور وہ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ جلالی صاحب زندگی اور موت کی کشمکش میں تھے اور جاوا ایک ذاتی سانحے کا شکار ہو کر ممبئی جا چکا تھا۔ اب اسی سلسلے میں سے یہ یوسف کی گمشدگی والا چکر نکل آیا تھا۔

جلد ہی میرے خیالات کا دھارا پھر ثروت کی طرف مڑ گیا۔ اس کی دلکش شخصیت نے اس عام سی بس کو جیسے جگمگا دیا تھا۔ کئی حضرات کن انکھیوں سے اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ میرے پہلو میں سکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کے بھیگے بدن کی جانی پہچانی لیکن بھولی بسری خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی، مجھے ماضی کی بھول بھلیوں میں پہنچا رہی تھی۔ جب ہم ساون کی بارشوں میں بھیگتے تھے۔ ”برساتیوں“ میں چھپتے تھے اور ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے تھے۔ کتنے رسیلے آم تھے ان ساونوں کے اور ہونٹوں سے لگنے والی ہر چیز کتنی رسیلی تھی۔ ہم سپنے بنتے تھے، آنے والے سہانے دنوں کے خواب دیکھتے تھے لیکن اب درمیان میں فاصلے تھے... بے مہر فاصلے۔

وہ مجھ سے یوسف ہی کی باتیں کرتی رہی۔ ایکسیڈنٹ میں کس کا قصور تھا؟ لڑائی کیسے ہوئی؟ یوسف کو کتنا زخم آیا تھا؟ اسپتال میں اس کی کیفیت کیا تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ آخر وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”ہر شخص میں خوبیاں خامیاں ہوتی ہیں۔ یوسف میں بھی تھیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتی کہ ان کے معاملات کسی سے اتنے بگڑے ہوئے تھے کہ زبردستی ساتھ لے جانے کی نوبت آگئی۔ یہ کوئی اور معاملہ لگتا ہے... اچھا، جب آپ کپڑے وغیرہ بدلنے کے لیے گھر جانے لگے تو انہوں نے آپ سے کیا بات کی تھی؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ”بس یہی کہ میں کتنے بجے آؤں گا۔ آتے ہوئے میں ایک گلاس، پلیٹ اور تولیا لے آؤں۔ بس اس طرح کی بات ہوئی تھی۔ اس وقت وسیم احمد اس کے پاس تھا۔“

”کاش، اس بندے کا ہی کچھ پتا چل سکتا۔“ وہ بولی۔

بس ہموار سڑک پر رواں تھی۔ پھسلن کی وجہ سے رفتار زیادہ نہیں تھی۔ ڈرائیور نے میوزک آن کر دیا۔ فریدہ خانم کی مدھر آواز بس میں گونجنے لگی۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا حال بتائیں کیا۔

ثروت خاموشی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ باہر دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ تاریکی تھی اور اس میں درختوں کے بھاگتے سائے تھے۔ وہ بھی شاید صرف اپنے ”اندر“ سے دھیان ہٹانے کے لیے باہر جھانک رہی تھی۔

آواز گونج رہی تھی... اک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی... جب جسم ہی سارا جلتا ہو تو دامنِ دل کو بچائیں کیا...

سینے میں عجیب سا دھواں بھر رہا تھا۔ بے کلی سی تھی۔ ہم کسی تفریحی ٹور پر نہیں جا رہے تھے۔ یہ سفر بڑی غیر یقینی صورتِ حال میں ہو رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں فقیر والی میں کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ ثروت کو احمد تھانوی صاحب کی طرف سے بڑا آسرا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یوسف کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔ یہ بہت بڑے مگرمچھوں کا بین الاقوامی گروہ تھا۔ پیر احمد تھانوی بے چارے یہاں کیا کر سکتے تھے۔ نہ ہی یہ کسی انسپکٹر، سب انسپکٹر کے بس کا روگ تھا۔ میں عمران سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ثروت اسے پسند نہیں کرے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سلسلے میں اپنے کسی دوست کو گھسیٹوں۔

صادق آباد کے قریب گاڑی کچھ دیر کے لیے رکی تو میں ڈرنکس وغیرہ لینے کے لیے نیچے اترا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں نے چپس، بسکٹس اور جوس وغیرہ لیے۔ اسی دوران میں، میں نے ایک اوٹ میں ہو کر عمران کو فون بھی کیا اور جلدی جلدی اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ فقیر والی کا قصبہ ہارون آباد سے تھوڑا آگے ہے اور انڈین بارڈر کے قریب ہے۔

انڈین بارڈر والی بات نے عمران کو بھی چونکا دیا۔ وہ بولا۔ ”یہ تو خطرناک بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یوسف کو کسی طرح انڈیا اسمگل کیا جا رہا ہو؟“

”میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی ہے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟ میں بھی آؤں؟“ عمران نے کہا۔

”آنا تو چاہیے لیکن ثروت کو پسند نہیں کہ میں اس سلسلے میں کسی کو کال کروں۔ وہ یہی سمجھ رہی ہے کہ پیر احمد تھانوی صاحب وہاں موجود ہیں۔ ان کے بااثر مرید بھی ہیں، وہ مسئلہ حل کرا دیں گے۔“

عمران نے کہا۔ ”یا پھر یہ ہے کہ تم پہلے وہاں پہنچو اور صورتِ حال دیکھو۔ میں اس دوران میں اقبال کو فقیر والی روانہ کر دیتا ہوں۔ وہ تمہارے آس پاس رہے گا۔ اگر تم سمجھو کہ میرے آنے کی ضرورت ہے تو میں بھی پہنچ جاؤں گا۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن پھر کوئی تماشا نہ لگا دینا۔ جب بھی تم اکیلے پرواز کرتے ہو، اپنی چونچ سیدھی کسی رائفل کی نال میں گھسا دیتے ہو۔ شکاری کو بس ٹریگر دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ وہ انڈسٹریل ایریا میں پیش آنے والے واقعے کا اشارہ دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”پرندے والی مثال غلط ہے۔ گھوڑے اور گھڑسوار کی مثال دو۔ وہ کیا کہتے ہیں، گرتے ہیں شہسوار ہی میدان میں... اچھا خدا حافظ۔ وہ بس میں میرا انتظار کر رہی ہے۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ بس چلنے والی تھی۔ وہ بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں دیکھنا مجھے اچھا لگا۔

”اتنی دیر؟“ اس نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

”ہاں، دیر تو واقعی بہت ہو گئی ہے۔“ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

میں نے پتلون کے ساتھ ذرا کھلے گھیرے کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کو پتلون کے اندر نہیں ڈالا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پتلون کی بیلٹ میں، میں نے کولٹ پسٹل اڑسا ہوا تھا۔ میں جب بیٹھتا تھا تو شرٹ کے نیچے سے پسٹل کا ابھار نمایاں ہوتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ یہ ابھار ثروت کی نظر میں نہ آئے۔ میرا دوسرا ہتھیار میرا چاقو تھا جو چمڑے کے بینڈ سے میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ میں اور ثروت ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ پیچھے جانے والی ایک تنومند عورت کو راستہ دینے کے لیے میں ثروت کی طرف سمٹا تو کولٹ پسٹل کا سخت ابھار ثروت کے پہلو سے مس ہوا۔ اپنے جسم پر پسٹل کی چبھن محسوس ہوئی تو اس نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔ ”یہ... کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کک... کچھ نہیں۔“ میں نے شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر پسٹل کو بیلٹ کے اندر گھسیڑا۔ وہ بچی نہیں تھی، سمجھ گئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی طرح باہر دیکھتے دیکھتے بولی۔ ”تابش! بہت بدل گئے ہیں آپ، بہت زیادہ۔“

”وقت نے بدلا ہے۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اور... تم نے بدلا ہے۔“

”میں نے؟“ وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

”ہاں ثروت! وہ رات مجھے کبھی بھولی نہیں جس نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کیا۔ وہ اوباش لڑکے... وہ تمہاری بدنامی... وہ ہماری بے بسی، وہ تھانے دار اشرف

اور ایم پی اے گورا یا جیسے لوگوں کی کمینگی اور وہ تمہارے گھر کی بربادی... وہ سب کچھ میرے سینے پر انگاروں کی طرح دہک رہا ہے اور دہکتا رہے گا۔ مجھے اس بدنصیب وقت نے بدلا ہے ثروت جو ہمارا سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اب میں وہ تابش نہیں ہوں۔ کبھی کبھی تو میرے لیے خود کو پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کسی سے انتقام لینے کے لیے اپنی زندگی کو تباہ کر لینا کوئی اچھا وطیرہ نہیں تابش۔"

"اس زندگی کے تباہ ہونے سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا ثروت۔ میں اب اس سے کافی آگے نکل گیا ہوں... خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہمیں اپنی ساری توجہ اس کام کی طرف رکھنی چاہیے جو ہم کرنے جا رہے ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔"

"لیکن... پھر بھی میں چاہتی ہوں تابش کہ ہم جو کریں، قانون کے اندر رہ کر کریں۔ ہم... مجھے اس بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ آپ نے اپنے پاس ہتھیار رکھا ہوا ہے۔ اس کا لائسنس وغیرہ ہے آپ کے پاس؟"

"لائسنس بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ صرف اپنے بچاؤ کے لیے ہے ثروت! اس کا کوئی غلط استعمال نہیں ہوگا۔"

"اللہ کرے اس کا کوئی استعمال ہی نہ ہو۔ ایک شریف شہری کے خلاف جرم ہوا ہے، اب مقامی پولیس کی ذمے داری ہے کہ اس کو بازیاب کرائے۔ ہم نے قانون ہاتھ میں نہیں لیا۔"

"ہاں، ذمے داری تو پولیس ہی کی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ثروت! مجھے ایک بات سچ سچ بتانا... پلیز۔"

"کک... کیا؟"

"تمہارے دل میں کوئی شبہ تو نہیں میرے بارے میں؟"

"کس حوالے سے؟"

"یوسف کے حوالے سے۔ اسپتال میں آخری وقت میں ہی اس کے پاس تھا۔"

اس نے شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"کیا میں آپ کو جانتی نہیں ہوں؟"

"لیکن تم خود ہی تو کہتی ہو، میں بہت بدل چکا ہوں۔ جب بندہ بدل جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو پھر اس وقت میں آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔"

"میں تو زبردستی چل پڑا ہوں۔"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "آپ نے سچ بولا ہے۔ میں سچ ہی کہوں گی۔ مجھے آپ کی طرف سے نہیں، آپ کے دوستوں کی طرف سے کچھ بدگمانی ضرور تھی۔ میں ان کو جانتی نہیں۔ نصرت نے بتایا تھا کہ وہ مار دھاڑ کرنے والے لوگ ہیں۔"

"اگر تم ان سے ملو گی تو تمہاری رائے بدل جائے گی ثروت۔"

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی تابش اور... میں ایک بار پھر کہوں گی۔ ہماری میل ملاقات جتنی کم ہو گی، اتنا ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ میں اب شادی شدہ ہوں تابش! کسی سے وابستہ ہو چکی ہوں۔ پلیز... پلیز! آپ میرے لیے خود کو کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔ میرے لیے وہ زندگی کا سب سے خوشگوار دن ہوگا، جب آپ شادی کریں گے۔"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ "اگر کہتی ہو تو میں ابھی بس رکوا کر اتر جاؤں؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ ریشمی رخساروں پر دو آنسو ریگ گئے۔ "سوری۔" اس نے بس اتنا کہا۔

... بہاولنگر سے ہم نے ایک اور بس پکڑی۔ اس بس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اڈے سے نکلتے نکلتے بھی بس نے تقریباً ایک گھنٹا لگایا۔ ایک دو بار عمران کی کال آئی لیکن میں نے ریسیو نہیں کی۔ میں ثروت کے سامنے اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار نصرت کی کال بھی آئی لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ ہم آٹھ بجے کے قریب ہارون آباد پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا شہر تھا۔ اس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ مرکزی جامع مسجد کے مینار دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ اس کا شمار بہاولنگر کے اہم شہروں میں ہوتا ہے۔ ہم ایک خوب صورت نہر کا نظارہ اپنی نگاہوں میں سموتے ہوئے منزل پر پہنچ گئے۔

بس اسٹینڈ پر اترتے ہی ہم نے ایک قریبی ریستوران میں ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ ثروت نے چائے کے ساتھ بسکٹ لیے۔ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ انڈے کا آملیٹ کھایا۔ بارش یہاں بھی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پنجاب میں دور دور تک مطلع ابر آلود ہے۔ ناشتے کے فوراً بعد ثروت نے پیر احمد تھانوی صاحب کے نمبر پر کال کی۔ کال ریسیو ہو گئی۔ ثروت نے احمد تھانوی صاحب کو اپنا نام بتایا۔ انہوں نے فوراً پہچان لیا اور خوش دلی سے بات کی۔ ثروت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔ ”حضرت! ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ میرے شوہر یوسف کا معاملہ ہے۔ امید ہے آپ مدد فرمائیں گے۔ میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ کچھ دیر بعد آپ کے پاس حاضر ہو جاتی ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس بتا دیجیے۔“

دوسری طرف سے احمد تھانوی صاحب نے ایڈریس بتانا شروع کیا۔ یہ ایڈریس غالباً ثروت کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ ”حضرت! میرے ساتھ میرے کزن تابش ہیں۔ آپ انہیں سمجھا دیجیے۔“ اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

احمد تھانوی صاحب نے فوراً میری آواز پہچان لی۔ حال چال پوچھا۔ عمران کی خیریت دریافت کی۔ پھر اپنا ایڈریس سمجھایا۔ یہ ہارون آباد کی ایک نئی رہائشی کالونی کا ایڈریس تھا۔ میں نے کوٹھی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ ثروت کو تھوڑا سا تعجب ہوا کہ تھانوی صاحب مجھے بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

ناشتے کا بل میں نے زبردستی ادا کیا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر ہم مطلوبہ کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ چھوٹے شہروں میں فاصلے زیادہ نہیں ہوتے۔ ہم جلد ہی منزل پر پہنچ گئے۔ کوٹھی بھی جلد ہی نظر آ گئی۔ میں نے ٹیکسی رکوائی ہی تھی جب ایک منظر دیکھ کر بُری طرح چونک گیا۔ کوٹھی کے بڑے سے سیاہ گیٹ کے سامنے ایک قطار میں موٹر سائیکلیں اور کچھ گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ یہ تھانوی صاحب کے مریدین کی گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں کے قریب ایک سیاہ کرولا کار رکی اور اس میں سے ایک خوب صورت لڑکی ذرا لڑکھڑاتی ہوئی سی اتری۔ ایک شخص نے اسے بڑھ کر سہارا دیا۔ لڑکی نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ لباس بھی اچھی تراش کا تھا۔ اس کی ٹانگ میں نقص تھا اور چہرے پر بیماری کی جھلک۔ دور سے دیکھ کر بالکل یہی لگا کہ وہ معروف انڈین اداکارہ کرشمہ کپور ہے۔ وہ دو افراد کا سہارا لیتی ہوئی گیٹ میں داخل ہو گئی۔ میں ساکت و جامد بیٹھا رہا۔

”کیا ہوا تابش؟“ پچھلی نشست سے ثروت نے پوچھا۔

”کک... کچھ نہیں لیکن ہم ابھی اندر نہیں جا سکتے۔“

”کیوں؟“

”یہ بعد میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا پھر ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ٹیکسی واپس موڑ لے۔

ثروت خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میری نگاہ میں وہ مناظر گھوم رہے تھے جب مال روڈ والی کوٹھی میں ہم نے سلطان چیتے کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ عمران نے دراز قد نادرٹی ٹی کو شوٹ کر دیا تھا۔ اس لڑائی کے دوران میں سلطان چیتے نے عمران پر گولی چلائی تھی مگر عمران کی بے وردی ”کک“ نے کام کیا اور سلطان کی چلائی ہوئی گولی اس ساتھی نیتو عرف کرشمہ کپور کی برہنہ ٹانگ میں لگی تھی۔

آج وہی کرشمہ کپور اپنی زخمی ٹانگ اور بیمار چہرے کے ساتھ یہاں احمد تھانوی صاحب کے آستانے پر دکھائی دی تھی۔ غالباً وہ ایک مریض کی حیثیت سے یہاں پہنچی تھی۔ لاہور سے دور اس سرحدی علاقے میں اس کا پایا جانا بھی اک جگہ معنی خیز تھا۔

پیر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلے پر لبِ سڑک ہمیں ایک ہوٹل کا بورڈ نظر آیا۔ اچھا ہوٹل لگتا تھا۔ ہم نے ٹیکسی ہوٹل کے عین سامنے رکوائی اور اندر داخل ہو گئے۔ بارش ایک بار پھر زور پکڑ رہی تھی۔ کالے بگلے ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ ایک ہی چھتری تلے سمٹ کر ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔

میں نے ثروت کو بتایا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے کچھ ایسے بندے نظر آئے ہیں جو مجھے جانتے ہیں اور میرے مخالفین میں سے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہی ہم حضرت صاحب کے پاس جا سکیں گے۔ غنیمت تھا کہ ثروت نے مجھ سے مخالفین کی تفصیل نہیں پوچھی۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ یہ انڈین ڈان جاوا کے لوگ ہیں اور درحقیقت یہی ہیں جنہوں نے یوسف کو اغوا کیا ہے تو یقیناً ثروت کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو جاتے۔

ہم برستے موسم میں چائے پیتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ میں نے ہوٹل کی دوسری منزل پر جا کر دیکھا۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ نظر آتی تھی۔ سیاہ گیٹ کے باہر سیاہ کرولا اب بھی موجود تھی۔ اوپر کی منزل سے ہی میں نے عمران کو فون بھی کیا اور مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ عمران نے بتایا کہ اقبال اور امتیاز فقیر والی کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں، میں نے تین چار بار بالائی منزل پر جا کر دیکھا۔ کرولا وہیں نظر آئی۔ ثروت بے چین ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں بہت تاخیر ہو چکی تھی، اب وہ تاخیر نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا تھا کہ اگر کچھ لوگ یوسف کو زبردستی فقیر والی لے کر آئے ہیں تو کیوں؟ اور یہی لاینحل سوال میرے اور عمران کے ذہنوں میں بھی موجود تھا۔ اگر یہ کوئی تاوان وغیرہ کا چکر ہوتا تو اب تک ثروت یا فاروقی صاحب سے رابطہ کیا جا چکا ہوتا مگر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر جاوا جیسے امیر کبیر بدمعاش کو یوسف

سے تاوان لینے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے رہ رہ کر وہ منظر یاد آتا تھا جب شارب بائی کے ساتھ موٹی سفید آنکھوں والا شخص یوسف کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ وہ یوسف کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ جیسے کسی شاندار نسل کے گھوڑے یا کسی اور پالتو جانور کو دیکھا جاتا ہے... پسند کیا جاتا ہے۔

دن کے تقریباً بارہ بجے تھے جب کرولا احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ سے اوجھل ہوئی۔ ثروت نے فوراً فون کیا لیکن اب وہاں ایک اور مصیبت منتظر تھی۔ احمد تھانوی صاحب کے مریدِ خاص فرید نے بتایا۔ ”حضرت صاحب تو چلے گئے ہیں۔“

”کہاں؟“ ثروت نے گھبرا کر پوچھا۔

”شہر سے باہر گئے ہیں کسی کام سے۔“

”کب تک آئیں گے؟“

”اب تو کل ہی آنا ہوگا۔ نو بجے کے قریب۔“ سیل فون کے اسپیکر سے آواز ابھری۔

”او گاڈ۔“ ثروت سٹپٹا گئی۔ ”ان کا سیل نمبر ہے؟“

”بی بی! آپ کو پتا ہوگا، حضرت موبائل وغیرہ نہیں رکھتے۔“

ثروت نے فون بند کیا اور ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اب ہمیں کل تک انتظار کرنا تھا۔ اس گرجتے برستے موسم میں ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور ہوٹل میں ہی ایک کمرا لے لیا۔ میں نے ثروت سے کہا۔ ”کمرا تم استعمال کرنا۔ میں لابی میں وقت گزار لوں گا۔“

”آپ... دو کمرے لے لیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔

ہمارے عقب میں ایک میز پر تین نوجوان اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ پودینے کی چٹنی لگا کر گرم پکوڑے کھا رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”یار! میں نے اسے کار میں چڑھتے دیکھا ہے۔ صرف پندرہ بیس فٹ کے فاصلے سے۔ یہ وہی تھی... کرشمہ کپور۔ اس کے ساتھ کوئی فلم ڈائریکٹر قسم کا بندہ تھا۔“

دوسرا بولا۔ ”یہ بات ماننے والی نہیں۔ اتنی بڑی بھارتی فلم اسٹار اور ہمارے اس چھوٹے سے شہر میں۔ یہاں اس نے گھاس چرنے آنا تھا۔“

تیسرا بولا۔ ”یار! شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ فلم اسٹار سے ملتی جلتی ہو یا پھر...“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور ذرا توقف سے بولا۔ ”ویسے اس طرح بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی جگہ چوری چھپے شوٹنگ کے لیے آ جاتے ہیں۔“

میں ان کی باتیں سنتا رہا پھر ہم اٹھ کر دوسری منزل پر آ گئے۔ ہم نے یہاں لابی میں ہی کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر رم جھم جاری تھی۔ اسی دوران میں نصرت کا بھی فون آ گیا۔ صورتِ حال جو بھی تھی، نصرت اس بات پر اندر سے بہت خوش تھی کہ میں اور ثروت ساتھ ہیں اور اگلے ایک دو دن ساتھ ہی رہیں گے۔ ہوٹل کی لابی میں ٹی وی موجود تھا۔ میں ٹی وی دیکھنے لگا۔ ثروت آرام کرنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ دروازہ اندر سے بند رکھے۔ وہیں صوفے پر لیٹے لیٹے مجھے نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو گہرا اندھیرا چھا چکا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی اور بارش بھی جاری تھی۔ ہوٹل کی بجلی چلی گئی تھی۔ مختلف جگہوں پر موم بتیاں روشن تھیں۔ میں نے لیٹے لیٹے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گھڑی سے پھسل کر میری نظر سامنے گئی اور میں سکتہ زدہ لیٹا رہ گیا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر وہی انڈین اداکارہ کرشمہ کپور کی ہم شکل لڑکی نیتو موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسٹک تھی اور وہ رک رک کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند شخص تھا۔ اس شخص کو آج دوپہر بھی میں نے دیکھا تھا۔ نیتو نے اپنا نصف سے زائد چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ دونوں ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ شاید وہاں کھڑے ہو کر بارش کا نظارہ کرنا چاہتے تھے۔

شکر کا مقام تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ یہ بات عیاں تھی کہ یہ لوگ بھی شب بسری کے لیے اسی ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں لابی چھوڑ دوں اور کمرے میں چلا جاؤں لیکن وہاں ثروت تھی اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کمرے میں اس کا حصے دار بنوں۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ مجھے ثروت اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ ذرا پریشان تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ڈرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرے ساتھ کمرے میں آئیں۔ وہاں کچھ ہے۔“

”کیا ہے؟“

”آئیں نا۔“ اس نے تیز سرگوشی کی۔ میں خود بھی لابی میں مزید رکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ یہاں بھی شمع روشن تھی۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔

”مجھے آواز آ رہی ہے... کھرچ کھرچ کی... اس الماری کے پیچھے سے۔“ اس نے انگلی اٹھائی۔

میں کان لگا کر سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے بھی آواز آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی جیسے لکڑی کو اپنے دانتوں سے کاٹ رہا تھا اور پنجوں سے کھرچ رہا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ یہ کوئی چوہا ہے۔ ثروت نے ہراساں آواز میں کہا۔ ''میں یہاں نہیں رہوں گی۔ کوئی دوسرا کمرا خالی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم لابی میں رات گزار لیں گے۔'' وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا نسوانی خوف اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

''نہیں ثروت!'' میں نے اسے روکا۔ ''ہم باہر نہیں جا سکتے... وہی دوپہر والے لوگ اب یہاں ہوٹل میں آ گئے ہیں۔'' میں نے ثروت کو تفصیل بتائی۔ وہ اور پریشان ہو گئی۔

باہر کا خوف اندر کے خوف سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ میں نے ثروت کو صوفے پر بٹھایا اور خود الماری کے پیچھے تاک جھانک شروع کی۔ سیل فون کی ٹارچ سے احتیاط کے ساتھ ہر طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نظر نہیں آیا لیکن اسی دوران میں پھر کھرچنے کی سی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کسی نکیلی شے سے لکڑی وغیرہ کو کریدا جا رہا ہو۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز کمرے کے اندر سے نہیں، باہر سے آ رہی ہے۔ شاید کوئی دیوار کے ساتھ موجود تھا۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس کی چٹخنی بغیر آواز پیدا کیے اتاری اور تیزی سے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ کوئی حرکت سی محسوس ہوئی جیسے کوئی پرچھائیں تیزی سے دائیں طرف اوجھل ہو گئی ہو۔

''کچھ نظر آیا؟'' ثروت نے پوچھا۔

''نہیں... کچھ بھی نہیں... مجھے تو لگتا ہے کوئی بلی وغیرہ ہو گی۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر ہم موم بتی کی روشنی میں بیٹھے رہے۔ ثروت بولی۔ ''میں ادھر بیڈ پر نہیں لیٹوں گی۔ آپ نے لیٹنا ہے تو لیٹ جائیں۔ میں یہاں صوفے پر ٹھیک ہوں۔''

''لیکن کھانا؟''

''مجھے تو بالکل بھی بھوک نہیں، آپ نے کھانا ہے تو یہیں منگوا لیں۔''

''نہیں، بھوک تو مجھے بھی نہیں۔'' میں نے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ صوفے پر لیٹ گئی۔ آواز دوبارہ نہیں آئی لیکن مجھے یقین تھا کہ ثروت کے کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔ بارش کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ ثروت کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس ہوٹل میں ہمارے ساتھ کون لوگ موجود ہیں۔ یہ سفاک مجرم اور خطرناک قاتل تھے۔ یوسف کی گمشدگی سے بھی ان کا تعلق مسلمہ تھا۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرک رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس بند کمرے میں اپنی اور ثروت کی موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگا۔ دل چاہا کہ اس سے کوئی بات کروں... سے کہوں۔ ''ثروت! تم اتنے عرصے سے شادی شدہ ہو... شادی شدہ نہیں ہو۔ تمہارے شوہر نے سارے اختیار... رکھنے کے باوجود ابھی تک تمہیں چھوا تک نہیں۔ کیا یہ قدر... کی طرف سے کوئی اشارہ ہے؟ کوئی کرشماتی رعایت ہے؟'' ... کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔ بس آنکھیں بند کیے... رہا... دفعتاً مجھے لگا کہ ثروت صوفے سے اٹھی ہے۔ وہ... سے آئی اور میرے بازو کے ساتھ چمٹ سی گئی۔ ''تابش... وہاں کوئی ہے۔ میں نے کھڑکی میں سایہ دیکھا ہے۔ وہ... جھانک رہا تھا۔'' وہ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''میں... صاف دیکھا ہے تابش!''

میں نے پھونک مار کر شمع بجھا دی اور پتلون کی... سے بھرا ہوا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ میں اور ثروت وہاں... پر ساکت و جامد بیٹھے رہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے... نہ جانے کیوں مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی آس پاس... لیکن کھڑکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ثروت اسی طرح... میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ اس نے مضبوطی سے میرا بازو... رکھا تھا۔ اس کے گھنے نرم بالوں کی مہک میرے حواس... سرایت کر رہی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کھڑکی کے آس پاس کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔ دھیرے دھیرے میرے باز... پر ثروت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، تاہم وہ اسی طرح میرے ساتھ لگی بیٹھی رہی۔ غیر یقینی حالات اسے مجھ سے دور ہونے نہیں دے رہے تھے۔ اس کا سر میرے کندھے سے لگا... تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا کہ شاید وہ اونگھنے لگی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور اس کا ثبوت مجھے ایک نمی کی صورت میں ملا۔ یہ نمی میں نے اپنے کندھے پر محسوس کی۔ یہ ثروت کی آنکھ کا پانی تھا... یہ ''میری'' ثروت کی آنکھ کا پانی تھا۔ وہ... بڑی خاموشی سے رو رہی تھی۔ باہر ہونے والی بے آواز بار... کی طرح۔

میں نے کولٹ پسٹل کو بائیں ہاتھ میں لیا اور دا... ہاتھ سے ثروت کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''ثروت!'' میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

وہ سسکنے لگی۔ مجھے لگا کہ چار پانچ برس کی جدائی... بعد وہ آج پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ اپنا دکھ مجھے بتا رہی ہے۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

دوسرا شکار

بابر نعیم

شکار کے شوقین افراد کی سب سے نمایاں خوبی متحمل مزاجی ہے... اس شوق کی تکمیل میں طویل انتظار سے گزرنا پڑتا ہے... تب شکاری کو شکار سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے... ایک شکاری اور سراغ رساں کو درپیش مشکلات... انتہائی کوشش اور انتظار کے باوجود دونوں اپنے ہدف سے دور تھے...

اپنے ہی تیر سے شکار ہو جانے والے شکاری کا ناہموار کھیل...

میں نے بہت کوشش کی کہ جولیس کو سمجھا سکوں لیکن وہ مجھے مسلسل نظرانداز کر رہا تھا بلکہ شاید اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ ورنہ وہ زبان یا ہاتھ کے اشارے سے کوئی جواب ضرور دیتا۔

''قتل کا یہ مقدمہ دو دن پہلے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی، لیکن سرکاری وکیل اور وکیلِ صفائی دونوں ہی کارروائی کو طول دے رہے تھے، حالانکہ یہ ایک سیدھا سادہ مقدمہ تھا۔ ملزم کی بیوی کے مقتول سے

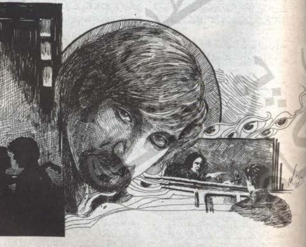

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعلقات تھے اور وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ پولیس نے اسے آلۂ قتل کے ساتھ مقتول کی لاش کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس نے پولیس کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا۔ اس کے دستانے بھی برآمد ہو گئے جن سے بارود کی بو آ رہی تھی لہٰذا یہ ہر لحاظ سے ایک عام سا کیس تھا لیکن صرف میڈیا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ اسے طول دے رہے تھے۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی سنگِ مرمر کے مجسمے سے بات کر رہا ہوں۔ اس کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ جولیس کا شمار بوسٹن کے ذہین ترین پرائیویٹ سراغ رسانوں میں ہوتا تھا لیکن وہ اس مقدمے میں جیوری ممبر کے طور پر شریک تھا۔ گو کہ یہ کام اس کے مزاج کے خلاف تھا لیکن اس نے سماعت کے دوران ایک لفظ بھی نہیں کہا اور اپنی توجہ مقدمے پر مرکوز رکھی لیکن وہ کم از کم ہاتھ کے اشارے سے ہی مجھے جواب دے سکتا تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی ناراضی کا سبب کیا ہے۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اس بات کا غم ہے کہ اپنی زندگی کے یادگار ڈنر میں شرکت نہیں کر سکو گے۔ کوئی بات نہیں آج رات میکرونی اور پنیر پر ہی گزارہ کر لینا۔“

اس بار میں نے جولیس کی آنکھوں میں ناراضی کی ہلکی سی جھلک دیکھی اور واقعی مجھے گزشتہ تین دنوں بعد یہ دیکھ کر اچھا لگا۔ اس ڈیوٹی کی وجہ سے جولیس کے روزانہ کے معمولات متاثر ہو رہے تھے اور اسی لیے اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر بُری بات یہ ہوئی کہ جج نے جیوری کو بھی مزید سماعت کے لیے پابند کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ جیوری کے ممبران مقدمے کی سماعت مکمل ہونے تک سب سے الگ رہتے اور یہی فیصلہ جولیس کو گراں گزر رہا تھا۔ اسے آج رات ایک ایسے ڈنر میں شریک ہونا تھا جس کا وہ ایک سال سے انتظار کر رہا تھا۔ اس ڈنر کی تیاری کے لیے پیرس کا مشہور شیف انتونی اسکوپیئر بوسٹن آیا ہوا تھا اور اس ڈنر میں صرف انہی لوگوں کو دعوت دی گئی تھی جو کھانے پینے کے شوقین اور اچھی شراب کے رسیا تھے... اور جولیس ان میں سے ایک تھا۔ لیکن اس کے ارمانوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب جج نے جیوری کو سماعت مکمل ہونے تک پابند کر لیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ ایک سیدھا سادہ مقدمہ تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ملزم بل چیس نے اپنے باس ڈیل واکس کو قتل کیا تھا جس کے ساتھ غالباً اس کی بیوی نے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ ممکن ہے کہ پولیس نے اسے دستانے پھینکتے ہوئے نہ دیکھا ہو لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس سے وہ کریڈٹ کارڈ بھی برآمد ہو گیا تھا جس سے یہ دستانے خریدے گئے تھے۔ لیکن یہ مقدمہ جسے دو دن میں ختم ہو جانا چاہیے تھا، چوتھے روز بھی چلتا رہا اور ابھی تک اس کی کارروائی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گواہوں پر جرح مکمل کر لی تھی جبکہ چیس نے ان شہادتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مرحلے پر سرکاری وکیل اور وکیلِ صفائی نے جج سے بحث شروع کر دی۔ وہ اتنی آہستہ گفتگو کر رہے تھے کہ عدالت میں موجود کوئی شخص ان کی بات نہیں سن سکتا تھا۔

ان کی گفتگو ختم ہوئی اور میری توقع کے مطابق انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی جولیس اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ وہ اس سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جج نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وکیلِ صفائی اور جیوری کے دوسرے ارکان کا بھی کم و بیش یہی ردِعمل تھا۔ مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ جولیس ڈنر میں شرکت کرنے کے لیے ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ اس نے جج کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہے...“

”اور انتہائی نامناسب بھی۔“ جج نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”یہ ایک طرح سے توہینِ عدالت بھی ہے۔“

”میں مانتا ہوں۔“ جولیس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں کبھی ایسی درخواست نہ کرتا اگر یہ معاملہ فوری اہمیت کا حامل نہ ہوتا۔“

جج اس کی ساکھ سے اچھی طرح واقف تھی کیونکہ وہ ایسے چھ مقدمات کی سماعت کر چکی تھی جن میں جولیس نے شہادت دی تھی اور ہر مقدمے میں مجرم کو صاف بچا لیا تھا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں اپنے چیمبر میں پانچ منٹ دے سکتی ہوں۔“ پھر وہ وکیلِ استغاثہ اور وکیلِ صفائی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے چیمبر میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تمام نظریں جولیس کی طرف اٹھ گئیں۔ مجھے خود بھی بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ جج کے چیمبر کی طرف جانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں توہینِ عدالت کے جرم میں جیل بھی ہو سکتی ہے۔ انتونی اسکوپیئر کے ڈنر کو بھول جاؤ ورنہ آج کی رات جیل میں گزارنا ہو گی۔“

جولیس نے ایک بار پھر مجھے نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ وہ خاصا معقول اور ذہین شخص تھا لیکن ڈنر میں جانے کی خاطر وہ ایسی احمقانہ حرکتوں پر اتر آیا تھا۔ میں بھی سب کی آنکھ بچا کر اندر چلا گیا اور ایک دروازے کی آڑ میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ کسی کو نظر نہ آ سکوں۔

”میں تمہیں صرف پانچ منٹ دے رہی ہوں۔“ جج نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ سرکاری وکیل سینڈرس غصے میں اپنے ناخن چبا رہا تھا جبکہ وکیلِ صفائی مارک زول پُرشوق نگاہوں سے جولیس کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ جولیس کوئی ایسا نکتہ اٹھا دے جس کی مدد سے وہ اپنے مؤکل کو بچانے میں کامیاب ہو جائے جو اس وقت تک واضح طور پر مجرم نظر آ رہا تھا۔

”شکریہ یور آنر۔“ جولیس نے طنز آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہے لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ ملزم بے قصور ہے۔“

جولیس کے اس انکشاف پر کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ وکیلِ استغاثہ سینڈرس نے بے ربط انداز میں بولنا شروع کر دیا جبکہ وکیلِ صفائی کی بڑبڑاہٹ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ جج نے سرد نگاہوں سے جولیس کی جانب دیکھا اور اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں بولی۔ ”جیوری کے ممبر ہوتے ہوئے تمہیں یہ سب کچھ مجھے بتانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

جولیس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”مانتا ہوں کہ جیوری کے ممبر کے طور پر مجھے مقدمے کی سماعت کے دوران میں اپنی رائے دینے کا حق نہیں اور میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ سماعت ختم ہونے تک خاموش رہوں گا اور اس کے بعد اپنے ساتھی اراکین کو ملزم کی بے گناہی کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ایسی صورت میں شاید حقیقی قاتل پر کبھی مقدمہ نہ چلتا۔ لہٰذا میں اسی تذبذب میں تھا کہ جیوری کے رکن کے طور پر خاموش رہوں یا معاشرے کا ایک ذمے دار فرد ہوتے ہوئے اصلی قاتل کو سزا پاتے دیکھوں۔“

”آئی سی!“ جج نے کہا۔ گو کہ وہ کچھ زیادہ قائل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ”پھر تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا؟“

”مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اصلی قاتل کو پکڑنے کے راستے مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر میں نے فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا تو ہم کبھی بھی اصلی قاتل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

جج نے مشتبہ انداز میں جولیس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم قاتل کے بارے میں جانتے ہو؟“

جولیس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ”یہ معاملہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر ہم نے احتیاط سے کام نہ لیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ قاتل فرار ہو جائے گا۔“

میں جانتا تھا کہ جولیس اپنا کھیل، کھیل رہا ہے۔ مجھے اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی جبکہ وکیلِ استغاثہ خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا اور وہ اپنے آپ کو دخل اندازی سے باز نہ رکھ سکا۔

”یہ انتہائی احمقانہ بات ہے۔“ وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ وہ قاتل کو جانتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا نام بتانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ بہت تماشا ہو چکا۔ میں جج سے درخواست کروں گا کہ وہ اسے قاتل کا نام بتانے کا حکم دیں۔“

جولیس اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سینڈرس کی جانب مڑا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں وہی کچھ جانتا ہوں جو اس عدالت میں گزشتہ چار روز سے کہا جا رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ عدالت کا اسٹینوگرافر معزز وکیل کو اس کارروائی کا خلاصہ فراہم کر سکتا ہے۔ اس کارروائی کے نتیجے میں جو معلومات حاصل ہوئیں، انہی سے میں نے واکس کے اصل قاتل کے بارے میں اندازہ لگایا ہے۔“

جج نے اپنا گلا صاف کیا اور جولیس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”اب تمہاری کیا تجویز ہے؟“

جولیس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہنا شروع کیا۔ ”میں ان پانچ افراد سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا جن کا اس مقدمے سے تعلق بنتا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے ان لوگوں سے سوالات کرنے کی اجازت دی گئی تو میں اصل قاتل کو سامنے لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”اور اگر تم ناکام ہوئے تو؟“ جج نے پوچھا۔

جولیس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ”اگر میں ناکام ہو گیا تو ناکام ہی کہلاؤں گا۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہو لیکن یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ آپ میری جگہ کسی دوسرے شخص کو

جیوری کا رکن مقرر کر سکتی ہیں۔ سماعت جاری رہے گی اور یہ سمجھا جائے کہ میں نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔"

وکیلِ استغاثہ پھٹ پڑا اور غصے سے بولا۔ "یہ اپنے احمقانہ دعوے کے ساتھ ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے اور اس سے مقدمے کی سماعت متاثر ہو سکتی ہے۔"

جولیس نے ناگوار انداز میں سینڈرس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس کارروائی کا مقدمے کی سماعت سے کوئی تعلق بنتا ہے۔"

"کیا تم نے جیوری کے دوسرے ارکان کے سامنے بھی اپنے شبہات کا اظہار کیا؟" جج نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اس بارے میں ان سے بھی پوچھنا چاہیے۔" سینڈرس نے مطالبہ کیا۔

"یہ ممکن ہے۔" جج نے اعتراف کیا۔

سینڈرس احتجاج کرتے ہوئے جج سے بولا۔ "آپ کو اس شخص کی تجویز پر غور نہیں کرنا چاہیے ورنہ یہ مقدمہ ایک تماشا بن کر رہ جائے گا۔"

وکیلِ صفائی زول، اس تمام کارروائی کے دوران میں خاموش بیٹھا رہا لیکن وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جولیس ناکام ہو کر جیوری سے نکل جائے اور وہ ایک ایسے رکن سے محروم ہو جائیں جو اس کے مؤکل کو بے قصور سمجھتا ہے لہٰذا وہ بولنے سے باز نہ رہ سکا۔ "میں وکیلِ استغاثہ سے متفق ہوں۔ ہمیں مسٹر جولیس کو جیوری میں واپس بھیج دینا چاہیے اور مقدمے کی سماعت جاری رہنی چاہیے۔"

جج نے جولیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری تجویز قابلِ غور ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فون اٹھایا اور کسی سے مختصر بات کی۔ اس کے فوراً بعد بیلف اندر آیا اور جولیس کو انتظار گاہ میں لے گیا۔ میں بھی چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب ہم دونوں کو تنہائی نصیب ہوئی تو میں نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسی حرکت کرو گے۔ جانتا ہوں کہ تم ڈنر میں جانے کے لیے کتنے بے چین ہو لیکن اس کے لیے تم نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ دھوکا دہی پر مبنی ہے کیونکہ تم اگر جج سے یہ کہتے کہ جیوری سے الگ ہونا چاہتے ہو تاکہ آج رات ڈنر میں شریک ہو سکو تو تم پر توہینِ عدالت کا الزام آ جاتا جس کے نتیجے میں تم جیل بھی جا سکتے تھے۔ چنانچہ تم نے چیس کو بے گناہ ثابت کرنے کا ڈراما رچایا کیونکہ تم جانتے تھے کہ کچھ بھی ثابت نہ کر سکو گے اور ناکامی کی صورت میں جیوری سے باہر ہو جاؤ گے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں کوئی ڈراما کر رہا ہوں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اس ڈنر میں جانے کے لیے کتنے بے چین ہو۔ اس کے علاوہ تمام ثبوت اور شواہد چیس کے خلاف ہیں پھر وہ بے گناہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں محض ڈنر میں جانے کی خاطر انصاف میں خلل ڈال رہا ہوں۔ تمہارا الزام دلچسپ ہے آرچی لیکن میں بقول تمہارے جو ڈراما کر رہا ہوں، اس سے تیسرا نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔ شاید اس طرح میں حقیقی قاتل کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"یہ کہانی اس کو سنانا جو تمہاری چالوں کو نہ سمجھتا ہو۔ میں صرف تمہارا معاون ہی نہیں بلکہ رازدار بھی ہوں اور مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں جان سکتا۔"

"میں گزشتہ تین روز کے رویّے پر تم سے معذرت خواہ ہوں۔" اس نے واش روم کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بیالیس سال کی عمر میں بھی کافی خوش شکل اور اسمارٹ نظر آتا تھا اور اس کا موازنہ کسی بھی ہالی ووڈ ایکٹر سے کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عورتیں اس پر فدا ہوتی تھیں۔

"مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ تم پر اپنا غصہ اتاروں۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جس کا مجھے افسوس ہے۔ اپنے اندر تھوڑی سی ہمت پیدا کرو آرچی۔ تم میرے بارے میں غلط انداز سے سوچ رہے ہو، چیس بے گناہ ہے اور جج نے مجھے پانچ گواہوں سے جرح کرنے کی اجازت دے دی ہے اور اگر میں نے اس وقت کوئی قدم نہیں اٹھایا تو اصل قاتل کبھی انصاف کے کٹہرے میں نہیں آ سکے گا۔ مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ چیس بے گناہ ہے؟"

"صبر کرو آرچی، میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس کمپنی بریٹزسسٹم کے بارے میں معلومات حاصل کرو جس میں چیس اور واکس کام کرتے تھے۔"

میں نے یہ معلومات مقدمہ شروع ہونے کے پہلے دن ہی حاصل کر لی تھیں۔ وہ ایک چھوٹی سی ٹیکنالوجی فرم تھی جو ویب سائٹ کی کارکردگی بڑھانے کے لیے سوفٹ ویئر تیار کرتی تھی۔ یہ کمپنی فیلیکس بینر اور ڈیل واکس نے شروع کی تھی۔ بینر اس کا چیف ایگزیکٹو آفیسر اور واکس چیف ٹیکنالوجی آفیسر تھا جبکہ بل چیس، پروڈکٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ وہ لوگ نو ماہ سے اس کمپنی کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں کامیابی واکس کے قتل کے تین ہفتے بعد ہوئی۔ کمپنی کے بقیہ ممبر کافی دولت مند ہو گئے جن میں چیس بھی شامل تھا۔ اسے صرف اپنے شیئرز کی فروخت سے اسّی لاکھ ڈالرز کی آمدنی ہوئی اور اگر اسے قتل کے الزام میں عمر قید ہو جاتی تو وہ یہ رقم کبھی خرچ نہ کر پاتا۔ میں یہ سب باتیں جولیس کو بتا ہی رہا تھا کہ بیلف اسے لینے آ گیا۔

عدالت کے کمرے سے جیوری اور وہاں موجود دوسرے لوگوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ میں حسبِ معمول کارروائی سننے کے لیے ایک دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ اب وہاں صرف دونوں وکیل اور پانچ گواہ رہ گئے تھے۔ ان میں سے چار اگلی نشست پر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ یعنی فیلیکس بینر، گلوریا واکس، اسٹیسی ڈیکر، ماریا چیس اور اس کا شوہر بل چیس جو ان سے الگ بیٹھا ہوا تھا۔ فیلیکس بینر کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ گلوریا واکس، مقتول ڈیل واکس کی بیوہ تھی۔ اسٹیسی ڈیکر اس کمپنی میں آفس ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام کرتی تھی جبکہ ماریا ملزم چیس کی بیوی تھی۔ میں بل چیس کو ان لوگوں کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا جن سے جولیس نے سوال کرنا تھے کیونکہ اس نے سماعت کے دوران میں بھی گواہی نہیں دی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ اب بھی کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں اور جولیس کے سوالوں کے جواب میں خاموشی اختیار کرے گا۔

جج نے جولیس کے آنے کا انتظار کیا پھر پانچوں گواہوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی کہ اس نے صرف انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جولیس کو ان سے سوالات کرنے کی اجازت دی ہے لیکن یہ ان کی طرف سے ایک رضاکارانہ اقدام ہوگا۔ "گزشتہ سترہ سال کے دوران میں نے کبھی ایسا نہیں کیا اور نہ ہی کسی دوسری عدالت میں ایسا سنا یا دیکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سب مسٹر جولیس کی ساکھ سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ لہٰذا میں انہیں آپ سے سوال کرنے کا موقع دے رہی ہوں لیکن یہ عدالت کے ریکارڈ یا اس کی کارروائی کا حصہ نہیں ہوگا۔ آپ میں سے کوئی بھی ان سوالات کا جواب دینے یا عدالت میں موجود رہنے کا پابند نہیں ہے۔"

میں نے گلوریا واکس اور اسٹیسی ڈیکر کے چہروں پر بے چینی کے آثار دیکھے اور یوں لگا جیسے وہ کمرائے عدالت سے باہر جانا چاہ رہی ہوں۔ جولیس کچھ دیر بل چیس کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی نظریں بقیہ چاروں گواہوں پر جما دیں۔ نہ جانے اس کے انداز میں کیا بات تھی کہ گلوریا اور اسٹیسی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں لیکن دونوں میں سے کوئی بھی خوش نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"میں جج کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ میرا خیال ہے کہ بل چیس بے گناہ ہے اور اس نے ڈیل واکس کو قتل نہیں کیا۔ اس کے لیے میں پہلے کچھ وضاحت کر دوں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ بل چیس نے ڈیل واکس کو قتل نہیں کیا تو یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ اس کی بنیاد چند حقائق پر ہے جو میرے علم میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں سے بیس منٹ میں سوالات کر کے اصلی قاتل کو بے نقاب کر دوں گا۔ اگر آپ میں سے کوئی میرے سوالوں کا جواب نہ دینا چاہے تو یہ اس کی اپنی توہین ہو گی اور میں اس کے بعد بھی اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ یہ کوئی دھمکی نہیں ہے۔ میں آپ میں سے کسی ایک کو نشانہ نہیں بنا رہا بلکہ قاتل کو بے نقاب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یقیناً اس میں مجھے کامیابی ہوگی۔ اگر آپ لوگوں کے تعاون کے باوجود میں ناکام رہا تو یہ میری بدنصیبی ہوگی لیکن کم از کم مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ اگر آپ میں سے کسی ایک نے ڈیل واکس کو قتل کیا ہے جیسا کہ مجھے شبہ ہے تو آپ مجھے جھٹلا سکتے ہیں۔"

جولیس کے اس بیان کے بعد وہ چاروں گواہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور ان کے درمیان ہونے والی سرگوشیاں بھی بند ہو گئیں۔

"آپ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کوئی چکر چلا رہا ہوں۔" جولیس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "سماعت شروع ہونے کے ابتدائی چند گھنٹوں میں ہی میں جان گیا تھا کہ چیس بے گناہ ہے اور میرے ذہن میں ایک دھندلا سا خاکہ تھا کہ کس طرح اصل قاتل کو بے نقاب کیا جائے۔"

گلوریا واکس اسے غصے سے دیکھ رہی تھی۔ جولیس اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں جو کچھ کر رہا ہوں، کیا تمہیں اس سے اختلاف ہے مادام؟"

"ہاں۔" یہ کہہ کر اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کی عمر تینتالیس برس تھی۔ شوہر کے قتل اور اس مقدمے کی کارروائی نے اس پر واضح اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور چہرے کا گوشت ڈھلک گیا تھا۔ کئی سیکنڈ تک اس کے ہونٹ یوں ہلتے

رہے جیسے وہ چیونگم چبا رہی ہو پھر اس نے سرد نگاہوں سے چیس کی طرف دیکھا اور بولی کہ جو شخص اس کے دائیں جانب بیٹھا ہے، وہی اس کے شوہر کا قاتل ہے۔ پھر وہ جولیس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور میں ہرگز نہیں چاہتی کہ تم اس مقدمے میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔“

”اوہ... آئی سی۔“ جولیس نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اسے گلوریا سے اس کے شوہر کی موت پر تعزیت کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے ہی واکس کا اصلی قاتل سمجھ رہا تھا۔ میں نے گلوریا کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق اس کے پاس کوئی گن نہیں تھی بلکہ ایک لائسنس یافتہ ریوالور تھا جبکہ اس کے شوہر کا قتل نو ملی میٹر کی گن سے ہوا تھا۔ میں نے یہ بات جولیس کو بتا دی تھی لیکن اس نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر کے ماریا چیس کے ساتھ تعلقات تھے جس کا ذکر مقدمے کی کارروائی کے دوران بھی کیا گیا؟“

”یقیناً نہیں۔“ وہ بولی لیکن اس کی آواز کے ارتعاش سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے یا اسے پوری طرح یقین نہیں ہے۔

”پھر یہ افواہ کس طرح پھیلی؟“ جولیس نے پوچھا۔

”اس کی وجہ سے۔“ گلوریا نے غصے سے اسٹیسی ڈیکر کی طرف دیکھا جو اس سے دو سیٹ چھوڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گلوریا کی ناراضی کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بدستور مسکراتی رہی۔ وہ ستائیس سالہ دلکش خدوخال کی مالک لڑکی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں البتہ پرکشش ضرور تھی۔

”میں صرف سچ بیان کر رہی تھی۔“ اسٹیسی ڈیکر نے سوال کیے بغیر ہی جواب دے دیا۔ ”میں نے ان دونوں کو کمپنی کی گزشتہ کرسمس پارٹی میں ایک ساتھ دیکھا تھا۔ وہ پورے وقت ایک دوسرے سے چپکے رہے۔ اس کے بعد ڈیل کے مرنے سے پانچ ہفتے پہلے میں نے اسے سیل فون پر کال ریسیو کرتے ہوئے دیکھا جسے سنتے ہی وہ دفتر سے اٹھ کر چلا گیا اور دو گھنٹے تک اس کی واپسی نہیں ہوئی۔“

”یہ سچ نہیں ہے۔“ ماریا چیس نرم اور دھیمے لہجے میں بولی۔ اس کی عمر تیس سال ہوگی۔ اس کے بال سنہری، آنکھیں نیلی اور جسم متناسب تھا۔ اخبارات میں اس کی جو تصاویر شائع ہوئیں، ان میں وہ خوب صورت لگ رہی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

اس نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا پھر وہ جولیس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”ڈیل میرے شوہر کا باس تھا اور کرسمس پارٹی میں اس نے شراب پی رکھی تھی لہٰذا میں کوئی تماشا بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ مجھے ایک کونے میں لے گیا اور اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن میں نے جلد ہی اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کروالیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ میرے اس کے ساتھ تعلقات تھے۔“

”میں نے جو کچھ دیکھا، وہی بتایا ہے۔“ اسٹیسی ڈیکر اپنی بات پر قائم رہی۔

”بہت خوب!“ جولیس اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم نے کچھ دیکھا بھی تھا تو اسے پھیلانا کیوں ضروری سمجھا؟ کیا تم اپنے کمپنی پارٹنرز کے درمیان جھگڑا کرانا چاہتی تھیں؟“

اسٹیسی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہی۔ ”میں وہی کچھ کہہ رہی ہوں جو سچ تھا۔“

”لیکن اس طرح تمہاری ملازمت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ تم نے یہ خطرہ کیوں مول لیا؟“ جولیس نے پوچھا۔ ”خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ کمپنی فروخت ہونے کی باتیں ہو رہی تھیں اور تمہیں کمپنی کے شیئرز ملنے کی امید تھی پھر تم نے یہ افواہ کیوں پھیلائی؟“

میں اسٹیسی ڈیکر کی ذاتی فائل دیکھ چکا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کو ملنے والے شیئرز کی مالیت کتنی تھی۔ گو کہ یہ رقم لاکھوں میں نہیں پھر بھی خاصی معقول تھی۔ اس نے جولیس سے نظریں نہیں ملائیں اور نہ ہی اس کے سوال کا جواب دیا۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ڈیل واکس کے ساتھ تمہارے تعلقات تھے؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھوٹ کی پرچھائیاں دیکھیں لیکن اس کی مسکراہٹ کی طرح وہ بھی فوراً غائب ہو گئیں اور اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”یہ معاملہ کتنے عرصے چلتا رہا؟“ جولیس نے پوچھا۔

”سولہ مہینے۔“

”اور ختم کب ہوا؟“

اس کی مسکراہٹ لوٹ آئی اور وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ”جس رات کرسمس پارٹی تھی اور میں نے ان دونوں کو ایک کونے میں راز و نیاز کرتے دیکھا جبکہ ڈیل مجھ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ میری خاطر اپنی بیوی کو چھوڑ دے گا لیکن اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مجھ سے بے وفائی کر کے ماریا سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔ لیکن میں نے ڈیل کو قتل نہیں کیا۔ میرا قصور اتنا ہے کہ جو کچھ دیکھا وہ لوگوں کو بتا دیا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔“ پھر وہ گلوریا واکس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں اس معاشقے کا علم تھا؟“

گلوریا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ممکن ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہو۔ اگر اسے اپنے شوہر اور اسٹیسی ڈیکر کے معاشقے کا علم ہوتا تو یہ واکس کو قتل کرنے کا ایک مضبوط جواز بن سکتا تھا۔ اسی طرح اسٹیسی ڈیکر کے پاس بھی واکس کو قتل کرنے کا محرک موجود تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے واکس کو قتل کیا ہے تو بل چیس درمیان میں کہاں سے آ گیا؟ جو آلۂ قتل ہاتھ میں پکڑے گلی میں کھڑا ہوا تھا جب پولیس وہاں پہنچی۔

جولیس نے فیلکس بینر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم جانتے تھے کہ واکس کا معاشقہ تمہارے دفتر کی ایڈمنسٹریٹر سے چل رہا ہے؟“

بینر نے شکی نگاہوں سے جولیس کو دیکھا۔ وہ باسٹھ سال کا دبلا پتلا شخص تھا جس کے سر کے بال غائب ہو چکے تھے اور اب وہاں سفید بالوں کی ایک جھالری نظر آ رہی تھی۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ”ڈیل اپنی ذاتی باتوں کو خفیہ رکھتا تھا اور مجھے شبہ ہے کہ وہ اسٹیسی کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ بہرحال، میں اس سلسلے میں زیادہ نہیں جانتا اس لیے تمہیں یقین سے کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”میں سمجھ گیا۔“ جولیس نے کہا۔ ”اب میں تم سے وہ سوال پوچھوں گا جس کا جواب تم یقیناً دے سکتے ہو۔ کیا یہ سچ ہے کہ ڈیل واکس کے قتل سے کوئی نو مہینے پہلے تم کمپنی کی فروخت کے بارے میں مختلف لوگوں سے بات کر رہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ تمہیں اس دوران ایک پیشکش بھی ہوئی تھی۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

بینر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن واکس کے قتل ہونے کے تین ہفتے بعد ہی تم نے کمپنی فروخت کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا اس پیشکش میں کوئی معقول تبدیلی ہو گئی تھی؟“

بینر کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں۔ اس پیشکش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن ڈیل کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے بعد ہم نے سوچا کہ اب آگے بڑھنا چاہیے۔“

”میرے نزدیک یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ کسی

اجازت نامہ

ایک مسجد کے اراکین مجلس منتظمین انتہائی تنگ نظر اور تنگ دل معززین تھے۔ وہ ہر بات میں افادیت کے رخنے تلاش کرتے پھرتے تھے۔

جب علاقے کے مشہور غنڈے باسو بھائی نے اپنے کردار میں تغیر پیدا کیا تو اسے خدمتِ دین کا شوق چڑھا۔ اس نے مسجد امامت پر فائز حافظ عبدالقدوس صاحب سے رجوع کیا اور خود کو مجلس انتظامیہ میں داخلے کے لیے پیش کیا۔ حافظ عبدالقدوس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اراکین مجلس سے بات کر کے بتائیں گے۔

اجتماع انتظامیہ میں جب یہ بات پیش ہوئی تو سب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اس ناسور کو مسجد سے دور رکھنے پر اکتفا کیا اور اسے خانہ خدا میں خرابی کا سبب کہا۔

اگلے روز باسو بھائی کے استفسار پر حافظ عبدالقدوس نے کہا۔ ”میاں! میں نے تمہارا مسئلہ مجلس میں پیش کیا تھا مگر سب کی متفقہ رائے یہی ہے کہ یہ خدائی معاملہ ہے اسی لیے باسو بھائی کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ براہِ راست خدا سے رجوع کرے۔ تم خدا سے پوچھ لو!... اگر اجازت نامہ مل جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

باسو بھائی مایوس ہو کر چلا گیا۔

ایک دن پیش امام صاحب کی سرِراہ ملاقات باسو بھائی سے ہوئی تو انہوں نے استفسار کیا۔ ”کہو میاں...! اجازت نامہ حاصل ہوا یا نہیں...؟“

باسو بھائی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”پوچھا تھا مولانا صاحب! لیکن اللہ میاں کہنے لگے... ہوش کے ناخن لے باسو... جب سے یہ مسجد بنی ہے، انہوں نے مجھے اس میں گھسنے نہیں دیا۔ تمہیں کہاں اجازت دیں گے۔“

(تلاش! خلیل احمد انجم، دھنی سیداں، کھاریاں)

کمپنی کا بانی قتل ہو جائے اور اس کے بعد بھی خریدار کے لیے اس سودے میں کشش باقی رہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ڈیل کمپنی کا بانی ہونے کے ساتھ ساتھ چیف ٹیکنالوجی آفیسر بھی تھا۔"

بینر کرسی میں مزید دھنس گیا اور اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ "خریدار کو لوگوں سے زیادہ ہماری تیار کردہ اشیا میں دلچسپی تھی۔ اس کے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ڈیل کے ساتھ کیا ہوا۔"

جولیس نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں اور بولا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ڈیل واکس کمپنی فروخت کرنے کے خلاف تھا؟"

بینر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا خیال تھا کہ ہم کمپنی کو چلا سکتے ہیں۔ وہ بے وقوف تھا اور بدقسمتی سے اس نے بورڈ کے اراکین کو بھی اپنے حق میں قائل کر لیا تھا۔ مجبوراً مجھے ان کی رائے کے خلاف عمل کرنا پڑتا۔"

"یہ ممکن تھا۔" جولیس نے کہا۔ "لیکن تمہیں واکس کے قتل سے بہت فائدہ ہوا اور تمہارے حصے میں چار کروڑ ڈالرز سے زیادہ آئے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے کمپنی کی فروخت سے زیادہ فائدہ ہوا لیکن ہمارے پارٹنرز اور ملازمین کو بھی اتنا ہی حصہ ملا جس کے وہ حق دار تھے۔"

"کیا لوگوں کے علم میں یہ بات تھی کہ واکس اس کمپنی کی فروخت کے خلاف ہے اور اس طرح وہ کمپنی کے لوگوں کو ایک بڑے فائدے سے دور رکھ رہا ہے؟"

بینر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سمیت سارے پارٹنرز، ملازمین اور ان کے رشتے داروں کے پاس واکس کو قتل کرنے کی وجہ موجود تھی۔"

بینر نے بلند آواز میں کہا۔ "بل چیس ہی وہ واحد شخص ہے جو گلی میں واکس کی لاش کے پاس آلۂ قتل سمیت پایا گیا۔"

جج نے گلا صاف کرتے ہوئے جولیس کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بولی۔ "ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ تم ملزم کے علاوہ کسی اور شخص کو قاتل ثابت کرو گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم دوسرے لوگوں کے درمیان شبہات پھیلاؤ۔"

اسی لمحے مجھے ٹام ڈنکن کی کال موصول ہوئی۔ وہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اور جولیس کے لیے بھی کبھی فری لانس کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ میری آواز سن کر حیران رہ گیا اور بولا۔ "آرچی! کیا تم بھی جولیس کے ساتھ عدالت کے کمرے میں موجود ہو؟"

"نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "لیکن میں تمہارا پیغام اس تک پہنچا سکتا ہوں۔ بتاؤ کیا کہنا ہے؟"

"اسے بتا دینا کہ میں تین منٹ میں پہنچ رہا ہوں اور میرے بیگ میں اس کے لیے بہت کچھ ہے۔"

میں نے کسی طرح یہ بات جولیس کو بتا دی اور اس نے پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ جج سے کہا کہ وہ تین منٹ کے اندر قاتل کو سامنے لے آئے گا۔ جج نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے جولیس کی بات پر اعتبار نہ آیا ہو۔ پھر اس نے اسے ہدایت کی کہ وہ گواہوں پر جرح جاری رکھے۔

جولیس نے اس بار گلوریا واکس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس بات کا علم تھا کہ واکس تمہارے روشن مستقبل کے راستے میں رکاوٹ ہے؟"

گلوریا نے اسے ناگواری سے دیکھا اور بولی۔ "میں صرف یہ جانتی تھی کہ میرا شوہر وہی کر رہا ہے جسے وہ کمپنی کے لیے بہتر سمجھتا ہے۔"

جولیس نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں لیکن کوئی اعتراض نہیں کیا پھر وہ اسٹیسی ڈیکر کی جانب مڑا اور بولا۔

"اور تم؟"

وہ مسکرا دی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جولیس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہی سوال ماریا چیس سے بھی کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بل چیس نے مجھے بتایا تھا کہ کمپنی بیچنے کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔"

"تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"دو سال۔"

"شادی سے پہلے وہ کب سے اس کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا؟"

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ کہنا چاہ رہی ہو کہ یہ سوال اس کے شوہر سے پوچھنا چاہیے لیکن پھر اس نے خود ہی بتا دیا کہ وہ شروع سے ہی اس کمپنی کے ساتھ ہے۔ وہ فخریہ انداز میں بولی۔

"چیس ان کا پہلا ملازم تھا؟"

"گویا وہ سات سال سے وہاں کام کر رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اسے اتنا عرصہ ہو گیا ہوگا۔"

"کیا تم نے شادی سے پہلے کسی معاہدے پر دستخط

کیے تھے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں چیس کو اپنے شیئرز محفوظ رکھنے کا الزام نہیں دے سکتی۔ اس نے کمپنی کو بہت وقت دیا تھا اس لیے اس کا حصہ بھی بہت زیادہ بنتا تھا۔"

"اس معاہدے کی رو سے اگر تمہارا شوہر کسی ناقابلِ معافی جرم میں قصور وار ٹھہرے تو تمہاری پوزیشن کیا ہوگی؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"تم نے یہ جاننے کے لیے کسی وکیل سے مشورہ نہیں کیا؟"

"بالکل نہیں۔"

جولیس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "یہ ایک ضروری سوال تھا کیونکہ اگر اس پر قتل جیسا جرم عائد ہو جاتا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ معاہدے کی رو سے تمہیں سب سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ گویا تمہارے پاس دوسروں کے مقابلے میں ڈیل واکس کو قتل کرنے اور اپنے شوہر پر اس کا الزام عائد کرنے کا زیادہ جواز موجود تھا۔"

اس سے پہلے کہ ماریا کوئی جواب دیتی، کمرائے عدالت کا دروازہ کھلا اور ٹام اندر داخل ہوا۔ بل چیس اسے دیکھ کر چونک گیا۔ ماریا کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "بل! اس کی بات مت سنو۔ یہ تمہارے ساتھ چالاکی کر رہا ہے۔"

"نہیں مادام۔" جولیس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ڈیل واکس کو اس گلی میں نہیں بلایا تھا تاکہ اسے قتل کر سکوں اور نہ ہی میں نے تمہارے شوہر کو فون کر کے وہاں بلایا تھا کہ وہ تمہیں بچا سکے اور اس طرح قتل کا الزام اس کے سر آ جائے۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے بل... میرا یقین کرو۔ اس کی بات مت سنو۔"

جولیس اسے نظرانداز کرتے ہوئے بل چیس کی طرف بڑھا اور بولا۔ "اب تمہیں جان لینا چاہیے کہ تمہیں وہاں بیوی کی حفاظت کی غرض سے نہیں بلایا گیا تھا جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ یہ قتل کوئی حادثہ نہیں تھا۔ ماریا نے واکس کو قتل کرنے کی نیت سے اسے اس گلی میں بلایا۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ میں نے اس وکیل کو بھی عدالت میں بلا لیا ہے جس نے یہ معاہدہ تحریر کیا تھا۔ اگر تم چاہو تو اس سے پوچھ سکتے ہو کہ تمہاری بیوی نے اس معاہدے کے بارے میں اس سے مشورہ کیا تھا یا نہیں۔ تم نے اپنی بیوی کی کال سنی جو مدد کے لیے بلا رہی تھی اور تم اس کی پکار پر اس گلی کی جانب دوڑتے چلے گئے۔"

بل چیس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ ماریا چیس اپنی جگہ سے اٹھی اور غصے کے عالم میں جولیس کی طرف بڑھی۔ میں جانتا تھا کہ ماریا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ فوراً ہی دو پولیس والے آگے بڑھے اور انہوں نے ماریا کو قابو کر لیا۔ وہ کسی زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہی تھی۔

☆☆☆

"اس بار بھی تم مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے اور مچھلی جال میں پھنس گئی۔" میں نے گھر پہنچ کر جولیس سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو آرچی؟"

"تم یہ نہیں جانتے تھے کہ بل چیس بے گناہ ہے اور یہ کہ اس کی بیوی اصلی قاتل ہے۔ میں نے سماعت کے دوران پوری کارروائی کا بغور جائزہ لیا اور تمہارے لیے ناممکن تھا کہ یہ حقیقت جان سکتے۔ تم جیوری سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ اس لیے تم نے ٹام کو اس وکیل کے پاس بھیجا تاکہ تمہارے ہاتھ ایک کہانی آ جائے۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا تم چاہ رہے تھے۔"

میں نے دیکھا کہ گھر آنے کے بعد اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک ٹائی کا انتخاب کرنے میں مصروف تھا جسے پہن کر وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ ڈنر میں جا سکے۔ بالآخر وہ ایک ٹائی پسند کرنے میں کامیاب ہو گیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"آرچی! میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا تھا۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہونے کے تین گھنٹے بعد ہی میں جان گیا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔"

مجھے یقین نہیں آیا۔ گو کہ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا لیکن جو کچھ وہ بتا رہا تھا، وہ ناممکن تھا۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔ "تم یہ سب کیسے جانتے تھے؟"

"اس کی کئی وجوہات تھیں۔ جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ ڈیل واکس کے قتل کے صرف تین ہفتے بعد ہی کمپنی فروخت کر دی گئی تو مجھے اس قتل میں معاشی محرک نظر آیا لیکن میری سوچ کو تقویت اس عورت کی کارکردگی نے دی۔ وہ لوگوں کو اپنی مسکراہٹ اور پیار بھرے انداز سے بے وقوف بناتی تھی۔ مقدمے کے دوران بھی وہ اپنے شوہر کی طرف داری کرتی رہی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ شطرنج کی اچھی کھلاڑی ہے۔ جب میں نے اسے بل چیس سے باتیں کرتے سنا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اسے اس مقدمے میں پھنسا رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔اس کے بعد میں وہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا جو درست تھا۔"

"اس نے شوہر کو کیا بتایا تھا؟"

"مجھے تمہاری صلاحیتوں سے انکار نہیں لیکن اگر تم غور سے مقدمے کی کارروائی کا جائزہ لو تو اس بارے میں اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن اس کے باوجود جو کچھ بھی ہوا، وہ واضح تھا۔ مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ ڈیل واکس چائنا ٹاؤن والی گلی میں کیوں گیا تھا، سوائے اس کے کہ کوئی اسے بندوق کی نوک پر وہاں لے جاتا کیونکہ بل چیس اور واکس دونوں کی گاڑیاں گلی کے قریب کھڑی پائی گئیں۔ اس لیے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ چیس اسے وہاں لے کر گیا ہو گا۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ واکس نے اس عورت سے اس گلی میں ملنے کا پلان بنایا تھا تو ایسا بھی نہیں ہوا۔ بل چیس کبھی اس گلی میں نہ جاتا اگر ماریا اسے فون کر کے وہاں جانے کے لیے نہ کہتی۔ کم از کم مقدمے کی کارروائی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ چیس کے حق میں گواہی دینے والا کوئی نہیں تھا اور نہ ہی اس نے عدالت میں اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ اگر اسے ایسا ہی کرنا تھا تو اس نے کورٹ میں مقدمہ شروع ہونے کے بجائے کوئی سودا کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

میں نے اس بارے میں سوچا لیکن کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیونکہ وہ کسی معجزے کی امید کر رہا تھا۔" جولیس نے کہا۔ "وہ اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتا تھا اور اسے امید تھی کہ کوئی ایسی بات ضرور ہو گی کہ وہ آزاد ہو جائے گا۔"

"تمہیں شادی سے پہلے ہونے والے معاہدے کے بارے میں کیسے علم ہوا؟"

"مجھے پہلے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے ٹام کی ڈیوٹی لگائی کہ اگر ایسا کوئی معاہدہ ہے تو اسے تلاش کیا جائے اور اس وکیل کو بھی ساتھ لیتا آئے جس نے یہ معاہدہ لکھا تھا۔ میں اس معاملے میں کئی اعتبار سے خوش قسمت رہا۔ ویسے تو چیس کے وکیل کا پتا لگانا کچھ مشکل نہ تھا لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ ماریا اس سے مشورہ کرنے پہنچ گئی اور اسے تم میری خوش قسمتی ہی سمجھ لو کہ اسے دیکھتے ہی وہ گھبرا گئی کیونکہ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ عدالت کے سامنے یہ اقرار نہیں کرے گا کہ ماریا نے اس سے اس معاہدے کے بارے میں کوئی مشورہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان پہلے ہی یہ طے پا گیا تھا کہ وہ اس بارے میں اپنی زبان بند رکھے گا اور اس کے عوض ماریا اسے ایک خطیر رقم دے گی۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماریا نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی۔ واکس کو قتل کرنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ وہ کمپنی کی فروخت کے خلاف تھا۔ اس کے بغیر کمپنی کے پارٹنرز، ملازمین اور ان کے رشتے داروں کو بھاری رقوم... نہ ملتیں اور چیس کو اس لیے پھنسایا گیا کہ اگر اسے قتل کے جرم میں سزا ہو جاتی تو اس کے حصے کا سارا پیسا معاہدے کے مطابق ماریا کو مل جاتا۔ اس کا حصہ بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتا کیونکہ وہ کمپنی کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ تمہاری کوششوں سے ایک بے گناہ کی جان بچ گئی اور اصل قاتل پکڑا گیا بلکہ پکڑی گئی اور اب تم آج کی رات ڈنر پر بھی جا سکتے ہو۔"

میں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہارا ڈنر میں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو تب بھی تم اسی طرح کوشش کرتے؟"

"بالکل، میں انصاف کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس عورت کو پھانسنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس کے شوہر کو بولنے پر آمادہ کیا جائے اور اس کا بہت کم امکان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کو رہائی سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ ڈنر کا پروگرام ہوتا یا نہیں، میں وہی کرتا جو میں نے کیا ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس عورت کی وجہ سے مجھے چار دن تک اپنے گھر، کچن اور شراب کے ذخیرے سے دور رہنا پڑا اور ان چار دنوں میں مجھے نہ صرف اس مقدمے کی کارروائی سننا پڑی بلکہ ایک نامعقول ہوٹل میں قیام بھی کرنا پڑا۔ اتنا کچھ برداشت کرنے کے بعد میں کس طرح انصاف کا خون ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ جیوری کے ممبر کی حیثیت سے مجھے خاموش رہ کر مقدمے کی کارروائی سننا تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ چیس کو اپنے دفاع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ محض بیوی کو بچانے کے لیے اپنی زبان پر قفل لگائے بیٹھا ہے تو مجبوراً مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جس کے نتیجے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ ہو گیا اور ہم اصلی قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔"

اب میرے پاس پوچھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ واضح ہو چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر جولیس کے پاس قانون کی ڈگری ہوتی تو وہ سراغ رساں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب وکیل بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

بے ساختہ

مریم کے خان

مغرب میں مرد اور عورت کے درمیان تعلق ایک عام سی بات ہے... ان کی گہری صحبتیں اس وقتی تعلق کو دیرپا رشتے میں بدلنے میں ناکام رہتی ہیں... جبکہ مشرق میں فقط ایک ملاقات دور تلک چلی جاتی ہے... اور یہی اصل محبت... اور اٹوٹ بندھن کی نشانی ہے...

اس شخص کا المیہ جس سے اچانک ہی ایک جرم سرزد ہو گیا تھا

پیری سائمن میرے سامنے بیٹھا برگر اور کافی سے انصاف کر رہا تھا۔ اس نے صبح ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا تھا اور اس کی ذمے دار اس کی بیوی تھی جو کبھی اسے وقت پر ناشتا نہیں دیتی تھی۔ آج بھی اسے ادھورا ناشتا چھوڑ کر دفتر کی طرف بھاگنا پڑا تھا۔ ہم دونوں ایک قتل کیس میں ایک گواہ سے مل کر آئے تھے۔ پیری نے راستے میں اپنے لیے چیز برگر لیا اور اب کافی کے ساتھ اسے حلق سے اتار رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کیپٹن جیک کے بارے میں اپنے عزائم کا اعلان کر رہا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اب اس نے مزید کوئی کیس ہمارے سر تھوپنے کی کوشش کی تو وہ جاب چھوڑ دے گا یا کیپٹن جیک کو نہیں چھوڑے گا۔

نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کا ہومی سائڈ ہمیشہ سے مشکل ترین شعبہ رہا ہے کیونکہ نیویارک میں قتل کا تناسب باقی امریکا سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں مافیا بھی ہے اور مختلف متحارب گروہ بھی... جرائم پیشہ اس کے علاوہ ہیں۔ تقریباً ہر تیس منٹ میں ایک انسان غیر طبعی موت سے ہم کنار ہوتا ہے اور موت کی وجہ دوسرا کوئی انسان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے ہومی سائڈ پر دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میرے اور پیری کے پاس چار مختلف کیسز تھے۔

''ڈیک۔'' پیری نے مجھ سے کہا۔ ''غضب خدا کا... چار کیس... ایسا امریکا میں کہیں نہیں ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ٹیکساس چلا جاؤں۔''

''قتل کا تناسب وہاں نیویارک سے کچھ ہی کم ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں لیکن وہاں قاتل فوراً پکڑا جاتا ہے یا مفرور ہو جاتا ہے۔ پولیس کا کام آسان ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہاں اندھے قتل نہیں ہوتے.... اکثر لوگوں کو پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ کون قتل ہوگا اور قاتل کون ہوگا۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ ہم جن چار کیسز کی تفتیش کر رہے تھے، ان میں سے ایک میں بھی قاتل پکڑا نہیں گیا تھا اور ہم تفتیش کر کر کے ہلکان ہو رہے تھے۔ پیری نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ ''اب میں ایسا کوئی کیس نہیں لوں گا جس میں قاتل کو فوراً ہی نہ پکڑ لوں۔''

اسی لمحے کیپٹن جیک کی سیکریٹری جینا نے اپنے کمرے سے جھانکا اور بولی۔ ''ڈیک... پیری کیپٹن تمہیں یاد کر رہا ہے۔''

پیری نے منہ بنایا اور زیرِ لب کچھ کہا مگر جانا تو تھا اس لیے ہم کھڑے ہو گئے۔ پیری نے جاتے ہوئے کافی کا خالی مگ اور برگر کا ریپر ڈسٹ بن میں ڈال دیا مگر اپنا منہ صاف کرنے کی زحمت نہیں کی جس پر برگر کا چیز لگا ہوا تھا۔ کیپٹن جیک نے سرد مہری سے ہمارا استقبال کیا اور بنا تمہید بولا.... ''ساتویں شاہراہ کی ایک عمارت کی لفٹ میں ایک عورت کا قتل ہوا ہے۔ پولیس موقع پر موجود ہے۔ تم دونوں وہاں جاؤ اور ابتدائی تفتیش کر کے مجھے رپورٹ دو۔''

''لیکن کیپٹن ہمیں بہت کام ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''چار مقتولین پہلے ہی ہماری جان کو رو رہے ہیں۔''

''انہیں فی الحال رونے دو۔ مجھے دو گھنٹے بعد رپورٹ چاہیے۔''

ہم دل ہی دل میں کیپٹن کو برا بھلا کہتے ہوئے باہر آ گئے۔ پیری ہمہ وقت ہی روتا تھا لیکن اس وقت میرا بھی غصے سے برا حال تھا۔ ہال میں کم سے کم نصف درجن افسران فارغ بیٹھے گپیں مار رہے تھے لیکن کیپٹن نے ہمیں منتخب کیا تھا۔ بہرحال، جائے واردات تک پہنچتے پہنچتے کم سے کم میرا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ البتہ پیری کا موڈ بدستور خراب تھا۔ اس نے کار سے اترتے ہوئے فریادی لہجے میں کہا۔ ''سمانتھا مجھے کچا چبا جائے گی۔ دو ہفتے سے میں اسے ٹال رہا ہوں۔ وہ مووی دیکھنا چاہتی ہے اور مجھے فرصت نہیں مل رہی ہے۔''

''ممکن ہے ہم جلدی فارغ ہو جائیں۔''

''جلدی...!'' وہ جل بھن کر بولا۔ ''اس نئی مصیبت کے بعد بھی تم جلدی فارغ ہونے کی توقع کر رہے ہو؟''

پیری نے جسے نئی مصیبت قرار دیا تھا، وہ ایک نہایت خوب صورت اور نوجوان لڑکی ثابت ہوئی..... اگر دائیں کنپٹی میں بالوں کے جوڑے کی سلاخ نہ گھسی ہوتی اور وہ زندہ ہوتی تو بہت اچھی بھی لگتی مگر موت کی تکلیف اور خون کی سرخی نے اس کا سارا حسن چھین لیا تھا۔ سلاخ میں ایک طرف چھ پنکھڑی والا پھول تھا۔ سلاخ چار انچ لمبی اور بے داغ فولاد کی تھی۔ امکان یہی تھا کہ وہ مقتولہ کے بالوں سے نکالی گئی تھی اور پھر اس کی کنپٹی میں گھسا دی گئی۔ کیونکہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آس پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو بالوں کو باندھنے کے کام آتی..... یہ بڑی ایکسپریس لفٹ تھی اور مقتولہ اس کے فرش کے عین وسط میں یوں پڑی تھی کہ اس کے دونوں پاؤں اس کے جسم تلے دبے تھے۔ جب ہم پہنچے تو اس کا جسم کسی قدر گرم تھا اور زخم سے خون رس رہا تھا۔ اسے مرے ہوئے نصف گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرا تھا۔ مقتولہ لباس سے اوپری درمیانی طبقے کی لگ رہی تھی اور اس کی عمر چوبیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لباس کا انداز جاب والا تھا۔ اس کا پرس ابھی تک اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔ میں اور پیری یہاں آتے ہوئے ربر کے دستانے پہن چکے تھے۔ اس لیے پیری نے بے دھڑک اس کا پرس کھینچ لیا۔

پرس میں زیادہ تر وہی چیزیں تھیں جو ایک لڑکی کے پرس میں ہو سکتی ہیں۔ میک اپ کا سامان، ٹشوز، ایک جدید ترین آئی فون، چابیاں اور چھوٹا پرس۔ کام کی چیز چھوٹے پرس سے ملی۔ دو سو ڈالرز کی رقم کے علاوہ اس میں مقتولہ کا ڈرائیونگ لائسنس اور جاب کارڈ موجود تھا۔ ایک عدد ڈیبٹ کارڈ بھی تھا۔ اس کا نام شیرن کونل تھا اور وہ اسی عمارت میں سی

بی انٹرپرائز میں جاب کرتی تھی۔ کارڈ کے مطابق وہ مارکیٹنگ آفیسر تھی۔ کیپٹن جیک نے ہمیں سوا دس بجے کال کی تھی اور ہم پندرہ منٹ میں یہاں پہنچے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شیرن تقریباً دس بجے فوت ہوئی تھی۔ اس کی تصدیق لفٹ کے باوردی آپریٹر نے کی۔ اس کا نام ایرک تھا۔ وہ تقریباً بیس سال کا نوجوان تھا۔ پیری کا موڈ نہیں تھا اس لیے سوالات کا کام میں نے سنبھالا۔ ''یہ واقعہ کس وقت پیش آیا؟''

''ٹھیک دس بجنے میں تین منٹ پر۔'' ایرک نے یقین سے کہا۔ ''اس سے دو یا تین سیکنڈ پہلے میں نے لفٹ کی گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔''

''اس کے دو یا تین سیکنڈ بعد لڑکی کو قتل کر دیا گیا... کیا تم نے قاتل کو دیکھا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کیا، کسی نے بھی نہیں دیکھا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے شک سے کہا۔ ''کیا اس وقت لفٹ میں شیرن اکیلی تھی؟''

''نہیں جناب! لفٹ میں...... آٹھ افراد تھے۔''

''ایک محدود جگہ..... افراد کی موجودگی میں ایک لڑکی قتل ہو جاتی ہے اور تم کہتے ہو کہ تم سمیت کسی نے قاتل کو نہیں دیکھا۔''

پیری جواب تک خاموشی سے سُن رہا تھا، اس نے مداخلت کی۔ ''ایک منٹ، ایرک! تم شروع سے بتاؤ... آرام اور سکون سے... وقت کی فکر مت کرو مگر کوئی بات مس نہ ہو۔''

ایرک نے سر ہلایا اور شروع ہو گیا۔ ''میری ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوتی ہے اور میں گزشتہ ایک مہینے سے لفٹ نمبر پندرہ پر ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ آج بھی میں حسبِ معمول آٹھ بجے آیا۔ یہ پوری عمارت جو اڑتالیس منزلہ ہے، دفاتر پر مشتمل ہے اس لیے یہاں آٹھ سے دس بجے تک اوپر جانے والوں کا رش ہوتا ہے۔ رش ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوتا ہے اور ساڑھے نو بجے کے بعد کم ہونے لگتا ہے۔ یہ ایکسپریس لفٹ ہے۔ اگر لگاتار چلائیں تو پانچ منٹ میں اڑتالیسویں منزل پر پہنچ جاتی ہے مگر جگہ جگہ رکنے کی وجہ سے ایک چکر عام طور سے پندرہ منٹ کا ہوتا ہے۔ دس منٹ اوپر جانے میں اور پانچ منٹ واپس نیچے آنے میں لگتے ہیں۔ یہ آج کا آٹھواں چکر تھا۔ لفٹ میں پندرہ افراد کی گنجائش ہوتی ہے لیکن جیسے میں نے بتایا کہ اس وقت رش ختم ہو جاتا ہے اس لیے اس چکر میں صرف آٹھ افراد تھے۔ یعنی سات مسافر تھے، ان میں تین عورتیں اور چار مرد تھے۔ اس وقت ہم چالیسویں منزل کے پاس تھے۔ اچانک لفٹ کو جھٹکا لگا اور وہ رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اندر اندھیرا ہو گیا۔ یہ اندھیرا مشکل سے آدھے منٹ کے لیے تھا۔ تقریباً سب گھبرا گئے تھے اور عورتیں چیخنے لگی تھیں پھر ایک عورت کی آواز آئی... یہ کیا کر رہے ہو؟

میں سمجھا کہ کوئی تاریکی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لفٹس میں اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ میں یا کوئی اور مداخلت کرتا یا روشنی کرتا، لفٹ کی روشنی بحال ہو گئی۔ تب میں نے اور سب نے مس شیرن کو فرش پر اسی حالت میں پڑے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ عورتیں ایک بار پھر چیخنے لگیں اور مرد بھی خوف زدہ ہو گئے۔''

''تم شیرن کو جانتے ہو؟''

''جی جناب! وہ گزشتہ تین سال سے سی بی انٹرپرائز میں کام کر رہی تھی۔ بے شمار بار میں نے اسے بیالیسویں فلور تک پہنچایا۔ اکثر اس کے ساتھی بھی ہوتے تھے اور وہ باتیں کرتے تھے اس سے مجھے مس شیرن اور دوسرے لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا۔''

''تم نے کبھی شیرن سے براہِ راست بات کی؟''

''نہیں، بس گڈ مارننگ اور گڈ آفٹر نون ہی کہتا تھا۔ وہ جواب دیتی تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کبھی کوئی بات ہوئی ہو۔''

''تاریکی کے دوران کوئی چیخ سنائی دی تھی؟''

''اس وقت تو سب ہی چیخ رہے تھے اور اونچی آواز میں بول رہے تھے۔''

''جس عورت نے کہا تھا کہ یہ کیا کر رہے ہو، کیا وہ شیرن تھی؟''

''میں نے بہ مشکل سنا تھا جناب... اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے بھی میرا ذہن لفٹ کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا اور میں انٹرکام پر مرکزی کنٹرول روم سے رابطے کا سوچ رہا تھا کہ لائٹ آ گئی اور لفٹ چل پڑی۔''

پیری نے مجھ سے کہا۔ ''اس سے لفٹ میں موجود افراد کے جائے وقوع کا نقشہ لو، جب تک میں یہاں آنے والے پولیس والوں سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے نوٹ بک پر لفٹ کا خاکہ بنایا اور ایرک سے کہا۔ ''اب بتاؤ لوگ کہاں کہاں کھڑے تھے۔''

وہ اپنی یادداشت کے مطابق بتانے لگا کہ کون کہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑا تھا۔ آنے والے میں ایک جوڑا بھی تھا۔ اسے سینتالیسویں فلور پر جانا تھا۔ عورت جانی پہچانی تھی۔ وہ بھی کبھی لفٹ میں نظر آتی تھی اور ہمیشہ سینتالیسویں منزل پر جاتی تھی۔ البتہ مرد ایرک کے لیے اجنبی تھا۔ وہ لفٹ کے وسط میں دیوار کے پاس ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے تھے۔ دو مرد بائیں طرف کھڑے تھے جبکہ ایک مرد اور ایک عورت ان کے دائیں طرف تھے۔ شیرن بالکل درمیان میں سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ میں نے اس کی بتائی جگہوں پر دائرے بنائے۔ اب ان دائروں کے ساتھ نام دینے سے نقشہ مکمل ہو جاتا۔ ایرک چھ افراد کے نام جانتا تھا اور صرف جوڑے والے مرد سے ناواقف تھا۔ لفٹ گراؤنڈ پر رکی ہوئی تھی اور پولیس نے لابی کو ممنوعہ علاقہ قرار دے کر پیلی پٹیاں لگا دی تھیں۔ ڈاکٹر اور لیب کا عملہ آ گیا تھا۔ میں نے فنگر پرنٹس اٹھانے والوں کو سلاخ کی پنکھڑی کی طرف توجہ دینے کو کہا۔ اس کے علاوہ پرس سے بھی نشانات اٹھانے تھے۔ اگرچہ پرس بالکل فطری انداز میں شیرن کی بغل میں دبا ہوا تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ اسے کسی نے نہیں چھوا ہے۔ باقی کسی چیز سے فنگر پرنٹس ملنے کے امکانات نہیں تھے۔

میں باہر آیا تو پیری غائب تھا۔ میں نے وہاں موجود ایک پولیس مین سے پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ”وہ ذرا آگے بائیں طرف کے کمرے میں موجود ہیں۔ لفٹ میں قتل کے وقت موجود افراد بھی وہیں ہیں۔“

گویا پیری ان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ لیکن پیری وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ نزدیک ہی ایک لابی میں باری باری تمام افراد سے سوال کر رہا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ قاتل ان سات افراد میں سے کوئی ایک تھا۔ اور قاتل کوئی بھی ہو سکتا تھا کیونکہ شیرن لفٹ کے وسط میں کھڑی تھی اور باقی سب اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے تھے۔ جیسے ہی لفٹ کی لائٹ گئی اور تاریکی ہوئی، قاتل نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیرن کے بالوں میں لگے جوڑے کی سلاخ نکالی اور اس کے سر میں گھونپ دی۔ وار اتنا سخت اور نازک مقام پر تھا کہ شیرن کو آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی اور وہ فوراً ختم ہو گئی۔ میں پیری کے پاس آیا تو اس نے لفٹ میں سوار تین اکیلے مردوں کو پوچھ گچھ کے لیے میرے حوالے کر دیا۔ میں باری باری انہیں لابی کے دوسرے کونے میں بلا کر ان سے سوالات کرنے لگا۔

یہ تین مرد فرینک آرسن، جیمز بیٹ اور ریو ایڈورڈ تھے۔ فرینک اور جیمز لفٹ میں دائیں طرف ساتھ کھڑے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ ریو ایڈورڈ دائیں جانب کھڑا تھا۔ وہ بھی اسی بلڈنگ کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ تینوں کا بیان کچھ مختلف نہیں تھا۔ تینوں شیرن سے لفٹ کی حد تک واقفیت رکھتے تھے اور تقریباً روز ساتھ سفر کرتے تھے اس لیے ان میں رسمی جملوں کی حد تک تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کسی خاص واقعے پر بات بھی ہو جاتی تھی لیکن ان کے درمیان کبھی آپس میں کوئی نجی گفتگو نہیں ہوئی، نہ ہی وہ شیرن کے بارے میں اس سے زیادہ جانتے تھے کہ وہ سی بی انٹر پرائز میں مارکیٹنگ آفیسر تھی۔ بہ ظاہر ان کے پاس شیرن کو یوں قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے ان کے نام پتے اور کونٹیکٹ نمبرز لے لیے اور انہیں خبردار کیا کہ وہ ہمہ وقت ان نمبروں پر دستیاب رہیں، پولیس کبھی بھی ان سے رابطہ کر سکتی ہے۔

اس دوران میں پیری جوڑے اور اکیلی عورت سے سوالات کر چکا تھا۔ مسز سارہ جیسن بائیسویں فلور پر ایک دفتر میں کام کرتی تھی لیکن اس کے باس نے اسے ایک کام سے تینتالیسویں فلور پر واقع فرم کے ذیلی دفتر بھیجا تھا۔ مرد اور عورت کا جوڑا آپس میں منگیتر تھے اور ان کی حال ہی میں منگنی ہوئی تھی۔ عورت فلایا روز شائن روز نامی کاسمیٹک کمپنی میں ڈائریکٹر تھی۔ درحقیقت یہ اس کے باپ جیف روز کی کمپنی تھی اور وہ اس کی اکلوتی وارث تھی۔ اس کا منگیتر ڈیوڈ بوتھ تقریباً تیس برس کا پرکشش اور ہینڈسم جوان آدمی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو عورتوں کو مسحور کر لیتے ہیں۔ وہ فلوریڈا کا رہنے والا تھا اور فلایا سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی جو محبت میں بدل گئی اور بالآخر انہوں نے جیف روز کی رضامندی سے منگنی کر لی تھی۔ ڈیوڈ پہلی بار نیویارک اور اس بلڈنگ میں آیا تھا۔ یعنی شیرن سے واقف نہیں تھا اور ان کا پہلی بار لفٹ میں سامنا ہوا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں ڈاکٹر کے پاس آیا کیونکہ پیری کا موڈ بدل گیا تھا اور اب وہ لابی میں کافی سے شغل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے تصدیق کی۔ ”موت بہت تیزی سے ہوئی، اسے سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ سلاخ سر میں پیوست ہوتے ہی وہ مر گئی تھی۔“

موت کا وقت مجھے معلوم تھا اس لیے ڈاکٹر سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی‘ اس کے بجائے میں نے سوال کیا۔ ”موت کی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے؟“

”وجہ اس کے سر میں پیوست ہے۔“

”کیا یہ حادثہ ہو سکتا ہے؟“

”نہیں، خودکشی بھی ہو سکتی ہے، اگر لڑکی سلاخ کی نوک کنپٹی پر رکھ کر اس رخ سے فرش پر گرے لیکن اس صورت میں پوری سلاخ جو صرف چار انچ کی ہوتی ہے، اس کے سر میں گھس جانی چاہیے تھی۔ مگر تم دیکھ سکتے ہو تقریباً ڈیڑھ انچ کی سلاخ باہر ہے اور یہ وہ خلا ہے جو اس کے فولادی پھول کو انگلیوں اور ہتھیلی کے درمیان پکڑنے سے بن سکتا ہے۔“

وہ پولیس کا ڈاکٹر تھا اور آئے روز اس کا واسطہ لاشوں سے پڑتا رہتا تھا اس لیے وہ بھی آدھا سراغ رساں ہو گیا تھا۔ پیری نے اس کی بات سن کر بھی برا سا منہ بنایا۔ لیب والے اور ڈاکٹر اپنا کام کر چکے تھے اس لیے میں نے لاش اٹھانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد کا مرحلہ نہایت بور اور طویل تھا۔ لفٹ میں موجود افراد کو جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن شہر میں ان کی موجودگی اور پولیس کو دستیابی لازمی قرار دی گئی تھی۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کے وارنٹ نکل آتے۔ اس کے بعد ہم ان افراد کے دفاتر سے تصدیق کرنے اور معلومات حاصل کرنے نکل کھڑے ہوئے جو لفٹ میں موجود تھے۔ سب سے آخر میں ہم شیرن کی فرم کے دفتر گئے۔

دو بجے میں نے پیری کے ساتھ اسی عمارت کے کیفے ٹیریا میں لنچ کیا۔ ہم سی بی انٹر پرائز سے شیرن کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر کے آئے تھے۔ شیرن کی کسی سے خاص دوستی نہیں تھی لیکن وہ ہنس مکھ اور سب سے محدود تعلق رکھنے والی کولیگ تھی۔ کسی کو اس سے شکایت نہیں تھی۔ دفتر میں وہ صرف مسز کیتھ جانسن سے بے تکلف تھی اور اس سے اپنی نجی باتیں بھی کر لیا کرتی تھی۔ مسز کیتھ کے مطابق شیرن اکیلی تھی اور بارھویں اسٹریٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں اکیلی رہتی تھی۔ اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی اور نہ وہ مردوں سے تعلق رکھنا پسند کرتی تھی۔ اسے اپنا کام پسند تھا اور دفتر سے جانے کے بعد وہ زیادہ وقت اپنے گھر میں گزارنا پسند کرتی تھی۔ شیرن نیویارک کی باسی تھی اور گزشتہ پچیس برس سے یہیں مقیم تھی۔ یعنی اس نے نیویارک سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ تعلیم مکمل کر کے اس نے بعض دوسری کمپنیوں میں ملازمت کی اور پھر تین سال پہلے وہ سی بی انٹر پرائز میں آ گئی۔ یہاں اس کا ریکارڈ صاف ستھرا تھا۔ وہ کمپنی کے مفید ملازمین میں شمار ہوتی تھی اور اس سال اسے اچھا بونس ملنے کا پورا امکان تھا۔ ساتھ ہی ترقی کا امکان بھی تھا۔ دفتر میں کبھی اس کا کوئی اسکینڈل نہیں بنا تھا اور نہ اس کے حوالے سے افواہیں سننے میں آئی تھیں۔ حالانکہ وہ دفتر کی سب سے حسین و دلکش لڑکی تھی۔ مسز کیتھ نے ایک خاص بات بتائی تھی کہ شیرن کو اپنے باپ سے ورثے میں اچھی خاصی دولت ملی تھی اور وہ صرف روٹین کی خاطر جاب کرتی تھی۔

”کیس بڑا مشکل لگ رہا ہے۔“ میں نے سینڈوچ کھاتے ہوئے کہا۔ ”بہ ظاہر تو کوئی قاتل نظر نہیں آتا اور سب ہی قاتل ہو سکتے ہیں۔“

”اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے برخوردار۔“ پیری نے سر ہلایا۔ ”ہم کیپٹن کو رپورٹ دیں گے اور اس کے بعد اس کی مرضی، وہ کسے اس کیس پر لگاتا ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ ہمیں یہ کیس دے چکا ہے ورنہ ہمارے بجائے کسی اور کو روانہ کرتا۔“

پیری نے سرد آہ بھری۔ ”میں جانتا ہوں لیکن خوش امیدی رکھنے میں کیا قباحت ہے؟“

”پانچواں کیس۔“ میں نے کراہ کر کہا۔ ”ابھی تو پچھلے چار کیس کھلے پڑے ہیں اور ان کے جلد حل ہونے کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔“

ہم لنچ کر کے واپس دفتر کی طرف روانہ ہوئے تو پیری کام کے موڈ میں آ گیا۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا، اس نے کہا۔ ”دیکھو، یہ تو طے ہے کہ قتل کسی منصوبے کے تحت نہیں ہوا ہے بلکہ قاتل نے یہ فیصلہ شاید لفٹ میں اور ان چند لمحوں میں کیا جب لائٹ چلی گئی تھی۔“

”ممکن ہے... لیکن قاتل کو شیرن سے ایسا کیا خطرہ لاحق ہو گیا تھا جو اس نے خود اتنا بڑا خطرہ مول لیا؟“

”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو شیرن سے زندگی کا یا اس جیسا کوئی خطرہ تھا۔ دیکھو نا، بعض لوگوں کے لیے زندگی کے عام معاملات بھی زندگی و موت کا مسئلہ بن جاتے ہیں۔“

”مثلاً کوئی افیئر... لفٹ میں موجود کسی مرد سے شیرن کا چکر تھا اور اب مرد اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔ اتفاق سے سوائے ان لڑکا لڑکی جو منگیتر ہیں اور ایرک کے تمام مرد شادی شدہ اور بچوں والے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی شیرن کی خاطر اپنا گھر تباہ کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔“

پیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مسز کیتھ لازمی واقف ہوتی اور وہ تم سے اس کا ذکر ضرور کرتی۔ عورتیں اس قسم کی باتیں کرنے کی شوقین ہوتی ہیں۔ مگر شیرن کا کردار بالکل صاف ہے۔“

”اگر اس کا کردار صاف نظر آتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سچ مچ پاکیزہ زندگی بسر کرتی ہوگی۔ آج کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دور میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ ہاں، اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو اور وہ مردوں کی قربت ناپسند کرتی ہو تو الگ بات ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کے کسی مرد سے خفیہ تعلقات تھے اور انہی تعلقات کی وجہ سے وہ ماری گئی؟"

"ہاں ورنہ اس کے قتل کا اور کیا جواز ہے۔ وہ اچھی پوسٹ پر تھی، اچھی خاصی دولت مند بھی تھی۔ اس کی ذات سے کوئی اسکینڈل بھی وابستہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ معاملہ ابھی تک سب سے چھپا ہوا ہے اور قاتل نے اس کے منظر عام پر آنے کے خدشے کی وجہ سے شیرن کو لفٹ میں قتل کر دیا۔"

"اچھی دلیل ہے۔" پیری نے سر ہلایا۔ وہ آتے ہوئے کافی کا ایک کپ لے آیا تھا اور اب اس کے گھونٹ لے رہا تھا۔

"بہ ظاہر قتل اچانک ہوا لیکن اس کا امکان ہے کہ قاتل نے پہلے سے اس کی منصوبہ بندی کر لی ہو۔"

پیری نے اعتراض کیا۔ "آلۂ قتل ... کیا ضروری تھا کہ شیرن آج جوڑا اسٹک لگا کر آتی؟"

"قاتل نے قسمت پر انحصار کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ابھی اس کی تصدیق کر لیتے ہیں۔"

میں نے نوٹ بک نکالی اور اس میں ایرک کا سیل فون نمبر دیکھا۔ اسے اپنے سیل فون سے کال کی۔ "میں آفیسر ڈیک بات کر رہا ہوں۔ تم سے دو سوال کرنے ہیں۔"

"ضرور آفیسر۔" اس نے کہا۔

"یہ بتاؤ کہ لفٹ میں یہ خرابی آج ہی ہوئی یا اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے؟"

"اس سے پہلے تین چار بار اسی طرح کی پاور فیل ہوئی ہے۔ میں نے لفٹس کے سپروائزر کو اس کی تحریری شکایت بھی کی تھی لیکن مسئلہ اب تک حل نہیں ہوا۔"

مجھے اپنا اندازہ درست ہونے پر خوشی ہوئی۔

"دوسرا سوال اہم ہے۔ کیا شیرن ہمیشہ بالوں میں جوڑا اسٹک لگاتی تھی؟"

"میں نے اس کو سوائے جوڑا اسٹک کے، بالوں میں اور کچھ استعمال کرتے نہیں دیکھا۔" اس بار بھی ایرک نے یقین سے جواب دیا۔

فون بند کر کے میں نے پیری کی طرف دیکھا۔

"تصدیق ہو گئی۔ لفٹ میں خرابی پرانی بات ہے اور ایرک کے مطابق یہ کم سے کم تین چار بار اسی طرح کی خرابی کا شکار ہو چکی ہے۔ دوسرے اس نے یقین سے کہا ہے کہ شیرن ہمیشہ جوڑا اسٹک ہی لگاتی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارا مفروضہ درست ہونے کا امکان ہے۔" پیری نے دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے کہا اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس کی دلچسپی برقرار رہے۔

"ہم شروع سے اس امکان کا جائزہ لیتے ہیں۔ فرض کر لو ان تین مردوں میں کسی ایک سے شیرن کے تعلقات تھے۔ ظاہر ہے، مرد کی دلچسپی عارضی تھی اور وہ صرف شیرن کے حسن سے خوشہ چینی کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ دوسری طرف شیرن اس معاملے میں سنجیدہ تھی اور وہ سمجھ رہی تھی کہ مرد بھی سنجیدہ ہے۔ کوئی بھی عورت جب کسی مرد کے معاملے میں سنجیدہ ہو تو اس کا مطالبہ بالآخر شادی کی طرف جاتا ہے۔ شیرن نے مرد سے شادی کا مطالبہ کیا لیکن مرد پہلے سے شادی شدہ اور بچوں والا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے اس نے شیرن کو ٹالنا شروع کر دیا۔ لیکن جب اس کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا تو مرد نے اسے کھل کر منع کر دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ وہ شیرن سے تعلق کو عارضی حیثیت دیتا ہے۔"

پیری نے کافی کا مگ خالی کر کے اسے بے پروائی سے کار سے باہر سڑک کی طرف اچھال دیا۔ لاقانونیت کے اس مظاہرے پر میں اپنے سینئر کو سوائے گھورنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "مرد کی طرف سے انکار کے بعد اب ہم آتے ہیں شیرن کے ممکنہ ردِعمل پر۔ عام طور سے خواتین کا ایسی صورت میں کیا ردِعمل ہوتا ہے؟"

"بہت خوفناک!" میں نے ماضی کا ایک واقعہ یاد کر کے جھرجھری لی، جب میں ایسی ہی ایک مشکل میں پھنس گیا تھا اور اپنی ازدواجی زندگی کے ساتھ نوکری سے بھی ہاتھ دھوتے دھوتے رہ گیا تھا۔ وہ اچانک ہی مہربان محبوبہ سے چڑیل ویمپ بن جاتی ہیں اور اپنے سابق محبوب کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔

"شیرن نے بھی یہی کیا ہوگا لیکن پہلے اس نے مرد کو دھمکیاں دی ہوں گی اور اسے بتایا ہوگا کہ وہ اسے یوں چھوڑ کر آسانی سے نہیں جا سکتا، اسے اس کی کوئی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ دیکھو، تینوں مرد اپنی کمپنیوں میں اچھے عہدوں پر ہیں۔ تینوں کی عمریں چالیس کے آس پاس ہیں، یعنی ان کے پاس ابھی ترقی کرنے اور آگے جانے کا چانس ہے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تینوں اپنی گھریلو زندگی سے بھی خوش ہیں۔ اس صورت میں مذکورہ مرد کے پاس شیرن کی دھمکی سے بچنے کے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے۔"

"کہ وہ شیرن کو قتل کر دے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"بالکل۔" پیری نے کہا اور پھر یہ کہہ کر میرے جوش کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی۔ "اسی لیے میرا خیال ہے کہ قتل کی وجہ یہ نہیں ہے۔ شیرن کے قتل میں پہلے سے تیار قاتل اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتا کہ اسے اس طرح قتل کرے جس میں اس کے پکڑے جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوں۔"

میں جھنجلا گیا۔ "تب تمہارے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"وجہ تو وہی ہے کہ قاتل نے شیرن سے کوئی ایسا خطرہ محسوس کیا جو اسے تباہی کے دہانے میں دھکیل دیتا اس لیے جب اچانک لفٹ میں لائٹ گئی تو اس نے موقع غنیمت جان کر اسے قتل کر دیا۔ شاید اسے یہ خطرہ بھی ہو کہ اب شیرن کو موقع ملا تو وہ اسے نہیں چھوڑے گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے اعتراض کیا۔ "ابھی میں یہی بات کہہ رہا تھا تو تم نے اسے مسترد کر دیا اور اب خود یہی بات کر رہے ہو۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قاتل کے سامنے شیرن کا خطرہ اچانک سامنے آیا اور اس نے فوری طور پر اس سے چھٹکارے کا سوچا ہوگا۔ لیکن یہ کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ تمہارا مفروضہ درست ہو۔ خوف زدہ انسان کا عمل جانور سے مختلف نہیں ہوتا۔ وہ بعض اوقات ایسے موقع پر حملہ کر بیٹھتا ہے جب اس کی توقع نہیں کی جا رہی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں نے تمہارے تجزیے سے دو نتائج اخذ کیے ہیں۔ اول یہ کہ قاتل کے لیے شیرن کا قتل ناگزیر تھا اس لیے اس نے انتہائی رسک لیا اور لفٹ میں اسے قتل کر دیا۔ دوسرا یہ کہ قتل سوچا سمجھا نہیں تھا کیونکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قاتل کے لیے لفٹ میں قتل سو میں سے آخری آپشن ہو سکتا تھا۔ اس سے کم رسکی تو سرعام قتل ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا... قاتل نے اضطراری طور پر اپنا کام کر کے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ اب ہمارے پاس لفٹ بوائے ایرک سمیت سات افراد ہیں اور باری باری ان پر کام کر کے ہم بالآخر اصل قاتل تک پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن باقی چار کیس جو ہمارے گلے میں پھنسے ہوئے ہیں؟"

"ان میں سے دو کیس تو صاف مافیا کا کارنامہ ہیں اور ان کے قاتل قسمت سے ہاتھ آ گئے تو آ گئے، تفتیش سے نہیں پکڑے جائیں گے۔ باقی کیس عام نوعیت کے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جلد یا بدیر ہم ان کو حل کر لیں گے۔ اب ہمیں ایک موقع ملا ہے اپنی کارکردگی دکھانے کا۔"

"اس کیس کی صورت میں؟" میں نے کہا۔

"بالکل... فی الحال ہمیں سارے کام چھوڑ کر اسی کیس پر توجہ دینی چاہیے۔" پیری کا موڈ ایک بار پھر بدل گیا۔ کچھ دیر پہلے وہ اس کیس سے جان چھڑانا چاہتا تھا اور خود میرا بھی یہی حال تھا لیکن جب ہم نے جاسوس کے نقطۂ نظر سے اس کیس کو دیکھا تو اب ہم اسے لینے کے لیے بے قرار تھے۔ ہم دفتر پہنچے تو جائے واردات کی تصاویر آ چکی تھیں۔ لفافہ ہماری ڈیسک پر پڑا تھا۔ پیری نے سب سے پہلے کیپٹن کے لیے رپورٹ تیار کی اور اسے دینے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کیپٹن سے درخواست کرتا کہ یہ کیس ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ میں تصاویر کا معائنہ کر رہا تھا کہ وہ برہمی کے عالم میں واپس آیا۔ میں اس کی صورت دیکھ کر معاملہ سمجھ گیا۔ "کیپٹن نے انکار کر دیا ہے؟"

"ہاں، وہ یہ حلوہ کیس اپنے کسی چہیتے کو دینا چاہتا ہے۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "بلاوجہ ہمارے کئی گھنٹے ضائع کیے۔"

مجھے بھی غصہ آنے لگا۔ "تم نے رپورٹ میں ان نکات کا ذکر تو نہیں کیا جو ہم نے راستے میں ڈسکس کیے تھے؟"

"میں احمق نہیں برخوردار... ان کی تو میں نے ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے۔ صرف واقعاتی رپورٹ تیار کی ہے اور وہ بھی سرسری انداز میں۔ اب جسے وہ کیس دے گا، اسے نئے سرے سے سب سے پوچھ گچھ کرنا پڑے گی۔"

"لیکن وہ ہمارا سر کھانے آ جائے گا۔" میں مایوسی سے بولا۔ پیری کی بات درست تھی۔ کریڈٹ کے لیے یہ کیس بہت اچھا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں کام کرنے کی گنجائش تھی۔ اس سے پہلے جو چار کیسز ہمارے پاس تھے، وہ تقریباً اندھے تھے اور ہم تاریکی میں ہاتھ چلا رہے تھے۔

"جو سر کھانے آئے گا، میں اسے بھی یہی رپورٹ پکڑا دوں گا۔ ذرا ان کو بھی تو پتا چلے، تفتیش کیسے کرتے ہیں۔"

شام سے ذرا پہلے ہم مافیا والے ایک کیس میں جائے واردات کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قتل بھری سڑک پر ہوا تھا جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ لیکن اتفاق دیکھیں، کسی دکان دار یا راہ گیر نے قاتل کو نہیں دیکھا جس نے پستول سے اس آدمی کو شوٹ کیا اور پیدل ہی فرار ہو گیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ انہوں نے صرف گولی چلنے کی آواز سنی اور پھر مقتول کو دیکھا تو وہ اس وقت ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ہمیں ایک معمولی سا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کلیو ملا تھا۔ کسی لڑکے نے ہمیں کال کر کے اطلاع دی تھی کہ جس وقت قتل ہوا، ایک باربر شاپ کا مالک دکان کے سامنے تولیے لٹکا رہا تھا اور مقتول اس سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہمیں اس باربر نے کہا تھا کہ وہ دکان کے اندر تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ بلند آواز کی وجہ سے اس نے فائر کی آواز بھی نہیں سنی تھی اور جب لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا تو اسے گڑبڑ کا احساس ہوا اور تب اسے پتا چلا کہ اس کی دکان کے سامنے کوئی قتل ہو گیا ہے۔

ممکن ہے باربر سچا ہو اور اطلاع دینے والے لڑکے نے صرف اسے پھنسانے یا شرارت میں جھوٹ بولا ہو لیکن چیک کرنا ضروری تھا۔ حسبِ توقع باربر سچا ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک گواہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ اسی سڑک پر ذرا آگے مسٹر والٹر رہتے تھے جو ہر روز اس سے شیو بنوانے آتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اتفاق سے دکان میں موجود تھے اور شیو بنوا کر وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ مسٹر والٹر نے تصدیق کی کہ وہ واقعی اس وقت باربر کی دکان میں موجود تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے اس سوال پر صرف شانے اچکائے کہ جب وہ وہاں موجود تھے تو انہوں نے پولیس کو بیان کیوں نہیں دیا۔ ان کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی اس لیے ہم نے زیادہ پوچھ گچھ سے گریز کیا۔ دراصل ہم اس کیس پر پہلے ہی مٹی ڈال چکے تھے۔ پیری نے باہر آ کر کہا۔

”باربر جھوٹ بول رہا ہے، وہ باہر ہی تھا لیکن اس نے قاتل کو دیکھا بھی ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی گواہی کے بعد یہ خود مارا جائے گا اور مافیا اپنے قاتل کا پتا بھی صاف کر دے گی۔ بیٹھے بٹھائے دو قتل اور گلے پڑ جائیں گے۔“

میں اس سے متفق تھا۔ مافیا سے متعلق جرائم عام طور سے غیر حل شدہ رہ جاتے ہیں اور پولیس جتنی گہرائی سے تفتیش کرنے کی کوشش کرتی ہے، مافیا اتنی ہی مزاحمت کرتی ہے اور وہ تمام نشان مٹا دیتی ہے جس پر چل کر پولیس مافیا کے بڑوں تک پہنچ سکے۔ اس صورت میں بہترین حل یہی تھا کہ باربر اور مسٹر والٹر کے بیان کو کیس کا حصہ بنا دیا جائے۔ پیری کو پھر بھوک لگ رہی تھی حالانکہ ابھی شام ہی ہوئی تھی اور سورج بھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اس نے صرف چار گھنٹے پہلے لنچ کیا تھا۔ گھر سے کھانے کی کمی وہ دن بھر باہر سے کھا کر پوری کرتا تھا۔ اس نے ایک فٹ پاتھی کیفے میں بیٹھ کر پنیر اور انڈے کے سینڈوچز اور کافی کا آرڈر دیا۔ پھر اس نے سرد آہ بھری۔ ”شاید ہمارے نصیب میں ایسے ہی کیس ہیں۔ میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ ٹیکساس چلا جاؤں۔“

”تم وہاں ایڈجسٹ ہو جاؤ گے؟“

پیری شمال کا پلا بڑھا تھا اور اسے جنوب کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ”آدمی کوشش کرے تو کیا نہیں کر سکتا۔“

عام طور سے پولیس مین جہاں سے بھرتی ہوتا ہے وہیں سے ریٹائر ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ سے تنگ ہو تو جاب چھوڑ دیتا ہے لیکن کسی دوسرے علاقے میں تبادلہ نہیں کراتا۔ دس میں سے کوئی ایک پولیس مین ہی ایسا کرتا ہے اور عام طور سے اس کی بھی کوئی معقول وجہ ہوتی ہے۔ جیسے وہ کسی ایسی عورت سے شادی کر لیتا ہے جو دوسری ریاست کی رہنے والی ہو اور وہ اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہ ہو۔ میں اور پیری دونوں جانتے تھے کہ یہ بہت مشکل ہے۔ وہ تو کسی اور شعبے میں اپنا تبادلہ بھی نہیں کرا سکتا تھا۔ اسے اپنا کیریئر نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا۔ اس لیے مجبوراً اسے اور مجھے کیپٹن جیک کے ساتھ گزارہ کرنا تھا۔ ویسے اس کا رویہ ہم سے کچھ زیادہ سخت بھی نہیں تھا۔ وہ ہمیں مشکل کام ضرور دیتا تھا لیکن بعد میں اس کا پورا کریڈٹ بھی ہمیں دیتا تھا۔ مگر اس بار اس نے بیچ بیچ کمینگی کا ثبوت دیا تھا اور اسی وجہ سے پیری دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”کیپٹن جیک کی ریٹائرمنٹ میں دو سال کا وقت بھی نہیں رہا ہے۔ امید ہے اس کے بعد آنے والا اس سے بہتر ہی ہوگا۔“

مگر میری تسلی سے پیری کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا اس لیے میں نے موضوع بدل دیا اور لفٹ والے قتل پر بات کرنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”اب کیا فائدہ اس پر بات کرنے کا... کون سا ہم اس کیس کو حل کریں گے۔“

”عملی طور پر حل نہیں کریں گے لیکن اس کے پہلوؤں کا جائزہ لینے میں کیا حرج ہے؟“

پیری نے میری بات پر غور کیا اور پھر مسکرایا۔ ”تم میرا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”بات وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے صبح چھوڑی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ قاتل شیرن سے شدید خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ لفٹ میں سامنا ہوا اور جیسے ہی لائٹ گئی، اس نے اضطراری طور پر یہ قدم اٹھا لیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ پکڑا نہیں گیا۔ اس صورت میں ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟“

پیری نے سینڈوچز کا صفایا شروع کیا اور ساتھ ہی سوچنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”قاتل اب ماضی کی

شہادتوں اور گواہیوں سے پکڑا جائے گا۔ وہ جانتا ہوگا کہ جلد یا بدیر شیرن سے اس کا تعلق سامنے آ جائے گا۔ اس صورت میں وہ اس تعلق کی کڑیاں غائب کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو، تم خود کو شیرن کی جگہ رکھ کر تصور کرو... اس نے قاتل سے جذباتی وابستگی پیدا کی اور اس حد تک وابستہ ہو گئی کہ اس نے فرض کر لیا کہ قاتل لازمی اس سے شادی کرے گا۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ میں نے ایمان داری سے کہا۔

”یار! سمجھنے کی کوشش کرو، اگر کوئی عورت کسی مرد سے اتنی زیادہ وابستہ ہو جائے تو کیا اس کے گھر میں اس مرد کے بارے میں کوئی چیز نہیں ہوگی؟ کوئی تصویر، کوئی تحریر، کوئی چیز اور کچھ بھی...؟“

میں اچھل پڑا۔ ”یہ تو سامنے کی بات ہے۔ شیرن کے پاس یقیناً اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی چیز ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ ”مگر اس کا بھی تو امکان ہے کہ محبت میں ناکامی کے بعد اس نے ان ساری چیزوں کو تباہ کر دیا ہو۔“

”اگر شیرن اس قسم کی لڑکی ہوتی تو اس طرح قتل نہیں کی جاتی۔“ پیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو محبت میں ناکامی کو دل کا داغ بنا کر سینے میں چھپا لیتی ہیں۔ وہ ایسی تھی کہ اسے آگ بنا لیتی ہیں اور اس آگ میں دوسرے کو جلا دینا چاہتی ہیں۔ اس نے یقیناً قاتل کو دھمکیاں دی تھیں اور اس نے خالی خولی دھمکیاں نہیں دی ہوں گی بلکہ اس کے پاس ایسا مواد موجود ہوگا جو قاتل کی زندگی کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔“

”او کے! میں سمجھ گیا۔“ میں نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے صرف کافی لی تھی۔ ”اب ہمارا کیا ردِعمل ہونا چاہیے؟“

”ہمیں تو اپنا کام لگے بندھے انداز میں کرنا ہے اس لیے تم فی الحال یہ سوچو کہ قاتل کا کیا ردِعمل ہوگا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا پھر مجھے پیری کی بات یاد آئی۔ قاتل درمیان کی کڑیاں غائب کرنے کی کوشش کرے گا جو اس کی طرف اشارہ کر سکیں۔ میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ ”وہ شیرن کے گھر میں گھس کر تلاشی لے گا اور اپنے متعلق تمام مواد غائب کر دے گا۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ پیری نے آخری سینڈوچ بھی حلق سے اتار کر ڈکار لی۔

”تب ہمیں فوراً شیرن کے گھر پر پولیس کا پہرا لگا دینا چاہیے۔“ میں نے کہا اور اپنے سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اتنی جلدی کی نہیں ہو رہی برخوردار... ذرا صبر سے کام لو۔ یہ کام ذرا بہتر طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔“ اس نے کافی کا مگ اٹھا لیا۔ ”ابھی کافی وقت ہے، قاتل رات کسی وقت ہی شیرن کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرے گا اور وہ کم سے کم پولیس کی آمد سے پہلے تو وہاں گھسنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ اس کے بعد ہی وہ کوئی کارروائی کرے گا... میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

میں پیری کی بات سمجھ گیا۔ اس صورت میں قاتل کو مسلسل خطرہ رہے گا کہ پولیس کسی وقت بھی وہاں آ سکتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہم کس حیثیت سے اس کیس میں دخل اندازی کر سکتے تھے جبکہ کیپٹن جیک نے کیس باضابطہ ہمارے حوالے بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیری سے پوچھا تو اس نے کیپٹن کی سیکریٹری جینا کو کال کی۔ ”جینا! کیپٹن نے لفٹ مرڈر کیس کس آفیسر کے سپرد کیا ہے؟“

پھر اس نے سیل فون بند کر دیا اور میری طرف دیکھا۔ ”فی الحال کیپٹن نے کیس کسی کو نہیں دیا ہے۔“

میں پُرامید ہو گیا۔ ”یعنی ہم اس پر کام کر سکتے ہیں اور امید ہے کہ کریڈٹ ہمیں ہی ملے گا۔“

”ملے گا نہیں، ہم حاصل کریں گے۔“ پیری نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

”وہ کیسے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ پیری نے کہا اور دوبارہ سیل فون نکال کر کسی سے رابطہ کیا۔ ”ایڈی! میں پیری بات کر رہا ہوں... ہاں ایک جگہ کو بگ کرنا ہے... پتا، ہاں لکھو...“ پیری نے ایڈی کو شیرن کی رہائش گاہ کا پتا لکھوایا۔ ”یہاں میں اور ڈیک ملیں گے لیکن تم اس طرح آنا کہ کسی کو پتا نہ چلے... ہاں، اپنی کار میں آنا۔“

ایڈی ہمارے شعبے میں جاسوسی کے آلات کا ماہر تھا۔ جیسے ہی پیری نے فون بند کیا، میں نے کہا۔ ”تم شیرن کا گھر بگ کراؤ گے؟“

”بالکل، صرف اسی طرح قاتل کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکتا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب چلو، کہیں ایڈی ہم سے پہلے وہاں نہ پہنچ جائے۔“

شیرن کا اپارٹمنٹ ایک لگژری قسم کی عمارت میں تھا اور خاصے پُرتعیش اور خوب صورت سامان سے آراستہ تھا۔ مسز کیتھ نے درست کہا تھا۔ شیرن کا باپ اس کے لیے خاصی دولت چھوڑ کر گیا تھا۔ اپارٹمنٹ تیسرے فلور پر تھا اور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پانچ منزلہ عمارت میں لفٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ عمارت کے منیجر نے ہمارے پولیس کارڈ دیکھے، تب کہیں جا کر اسے یقین آیا کہ ہم پولیس والے ہیں... بلکہ مجھے لگا کہ وہ کارڈز کے بارے میں بھی مشکوک تھا۔ مگر جب ہم نے اس کے سوالات سے تنگ آکر اسے بتایا کہ شیرن کا مرڈر ہو گیا ہے اور ہمیں اس کے اپارٹمنٹ کو دیکھنا ہے تو وہ سیدھا ہو گیا اور اس نے ہمارے ساتھ پورے تعاون کا یقین دلایا۔ اب وہ شیرن کے قتل کے بارے میں سوالات کر رہا تھا اور افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے ہمارے لیے ماسٹر کی سے شیرن کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ میں اور پیری اندر آئے لیکن جب منیجر نے اندر آنے کی کوشش کی تو میں نے اسے روک دیا۔

”تمہارا شکریہ... اب تم نیچے جاؤ اور ایڈی نام کا ایک شخص آئے تو اسے اوپر بھیج دینا۔“

منیجر نے منہ بنایا لیکن میں نے دروازہ بند کر دیا۔ پیری نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اپارٹمنٹ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ تین بیڈ روم کا بڑا شاندار اپارٹمنٹ تھا اور شیرن یہاں اکیلی رہتی تھی۔ اس کا بیڈ روم صاف ستھرا تھا مگر استعمال کی متعدد اشیا بتا رہی تھیں کہ یہ اسی کا بیڈ روم ہے۔ ہم نے احتیاط سے دستانے پہن کر تلاشی کا کام شروع کیا۔ ہماری توجہ کا مرکز درازیں تھیں لیکن اس میں ہمیں کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔ نہ کوئی تصویر اور نہ کوئی ڈائری۔ لیونگ روم میں ایک میز پر لیپ ٹاپ تھا۔ پیری نے اسے آن کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں پاس ورڈ لگا تھا اس لیے اس نے برا سا منہ بنا کر اسے بند کر دیا۔ اگر شیرن کا کوئی معنی خیز ماضی تھا تو اس نے کم سے کم سامنے اس کا ریکارڈ نہیں رکھا تھا۔ اپارٹمنٹ میں کہیں کوئی لاکر جیسی چیز نہیں تھی۔ اس کی الماری میں جو لاکر تھا وہ بھی کھلا ہوا تھا اور اس میں صرف اس کی ذاتی البمز تھیں جن میں وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ موجود تھی۔ مگر ان البمز میں ایک بھی فرد ایسا نہیں تھا جس پر لفٹ میں موجود ہونے کا شبہ کیا جا سکتا۔ جیسے ہی ہم تلاشی سے فارغ ہوئے، اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا اور ایڈی کو اپنے بکس سمیت موجود پایا۔

”نیچے منیجر گدھ کی طرح نظریں جمائے بیٹھا ہے۔“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”اسے میرا نام کیوں بتایا... جبکہ مجھ سے کہا تھا کہ چھپ کر آنا ہے؟“

”فکر مت کرو، اسے تمہارے بارے میں سوائے نام کے اور کچھ نہیں بتایا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر اپارٹمنٹ دکھایا۔ اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

”اپارٹمنٹ تو بڑا شاندار ہے۔ پیری! کیا تم نے رشوت لینا شروع کر دی ہے؟“

”یہ اس مقتولہ کا اپارٹمنٹ ہے جو آج صبح لفٹ میں قتل کی گئی ہے اور اس کا قاتل لفٹ میں موجود تھا۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی کیونکہ پیری کا منہ بن گیا تھا۔ وہ بڑی جلدی ناراض ہو جاتا تھا۔ ”اب امکان ہے کہ قاتل یہاں کا دورہ کرے گا اور وہ کوشش کرے گا کہ شیرن کے پاس اس سے متعلق کوئی چیز ہے تو یہاں سے نکال لے جائے۔ اپارٹمنٹ کو اس طرح بگ کرنا ہے کہ آنے والا لازمی کیمرے کی زد میں آئے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ ایڈی نے کہا اور دستانے چڑھا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے منی سائز کیمرے اور اسی قسم کے جاسوسی کے آلات نکال کر اپارٹمنٹ میں انہیں لگانے کے لیے مناسب جگہیں دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کا خیال بھی رکھ رہا تھا کہ اندر آنے والے کو کیمرے یا دوسرے آلات دکھائی نہ دیں۔ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں اپنا کام نصف گھنٹے میں ختم کر لیا اور ہم سے پہلے وہاں سے رخصت ہو گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے اس کارروائی کے سلسلے میں ایک نوٹ پر ہم دونوں سے سائن کرا لیے تھے، جب اسے پتا چلا کہ یہ کیس باضابطہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ایڈی! ہم شعبے میں ساتھی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن تم کیپٹن جیک کو جانتے ہو نا... میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہم بھی نکلے اور پیری نے باہر نکلتے ہی گھر جانے کی بات کی۔ ”آج سمانتھا نے بہت اچھا ڈنر بنانے کا اعلان کیا ہے۔“

میں نے پیری کو راستے میں ایک جگہ ڈراپ کیا جہاں سے وہ گھر جانے والی میٹرو پکڑ سکتا تھا۔ میں واپس دفتر آیا اور پولیس کار وہاں چھوڑ کر خود اپنی کار لے کر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگلے روز صبح پہلے ہمیں شیرن کے اپارٹمنٹ جانا تھا، وہاں ایڈی بھی آتا اور پھر ہم دفتر جاتے کیونکہ رات میں نے پیری کو دفتر چھوڑا تھا اس لیے صبح وہ مجھے جاتے ہوئے دفتر لے کر گیا۔ ہم دونوں باری باری اپنی گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ اس طرح نیویارک کے پُرہجوم ٹریفک میں ایک گاڑی کی کمی ہوتی تھی۔ ہم شیرن کے اپارٹمنٹ پہنچے تو ایڈی بھی پہنچ چکا تھا۔ اسے قاتل سے زیادہ اپنے قیمتی آلات کی فکر تھی کہ کہیں انہیں کوئی نقصان نہ ہوا ہو۔ جب منیجر نے ماسٹر کی سے دروازے کا لاک کھولنا چاہا تو وہ کسی قدر مشکل سے کھلا جبکہ گزشتہ روز یہی لاک فوراً کھل گیا تھا۔ اس نے خفت سے ہماری طرف دیکھا۔ ”لگتا ہے نئے مالک کے آنے سے پہلے لاک کی سروس کرنی پڑے گی۔“

”یہ شیرن کا ذاتی اپارٹمنٹ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، اس کے باپ سے اسے منتقل ہوا ہے۔“

اس دوران میں پیری لاک کا معائنہ کر رہا تھا، اس نے کہا۔ ”لاک خراب نہیں ہے۔ کسی نے اسے زبردستی کھولنے کی کوشش کی ہے اور نئے مالک کو اسے تبدیل کرانا ہوگا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ منیجر نے جلدی سے کہا۔ ”یہاں کوئی غیر متعلقہ فرد نہیں آ سکتا۔“

”یہ دیکھو، تالے کے سوراخ پر نشانات ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی نے درست چابی کے بجائے اسے کسی اور چیز سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔“

”نیچے صرف تم ہوتے ہو اور تم چوبیس گھنٹے نہیں ہوتے۔ اس لیے کوئی بھی غیر متعلقہ فرد نہایت آسانی سے اندر آ سکتا ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا اور گزشتہ روز کی طرح اندر آ کر دروازہ بند کر لیا۔ منیجر پھر باہر رہ گیا تھا۔ اگرچہ اپارٹمنٹ کی حالت تقریباً ویسی ہی تھی جیسی گزشتہ روز ہم نے دیکھی تھی مگر ہماری تجربہ کار نگاہوں نے محسوس کر لیا کہ کوئی آیا تھا اور اس نے نہایت احتیاط سے تلاشی لی تھی۔ اگر میں اور پیری کچھ نشانیاں مقرر کر کے نہ جاتے تو شاید ہمیں بھی پتا نہ چلتا۔ پیری نے فضا سونگھنے کے انداز میں ناک اوپر کر کے کہا۔

”یہاں کوئی آیا تھا۔“

”کیا وہ اتنا بدبودار تھا؟“ ایڈی نے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپارٹمنٹ میں دو کیمرے اور دو مائک لگائے تھے۔ یہ تمام آلات مکمل طور پر خودکار تھے۔ یہ بہت مختصر کیمرے تھے جو چوبیس گھنٹے تک تین فریم فی سیکنڈ کی شرح سے مووی بنا سکتے تھے۔ چند منٹ میں ایڈی نے کیمرے اور مائک نکال لیے اور ہم دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں اپنے خاص کمرے میں ایڈی نے پہلے کیمروں کی ریکارڈنگ کمپیوٹر میں منتقل کی پھر انہیں کچھ ایڈٹ کیا اور اس کے بعد وہ مووی چلا کر دکھانے لگا۔ اس میں وقت بھی آ رہا تھا۔ اس نے رفتار دس گنا تیز کر دی تھی اور بڑے سائز کی اسکرین پر سب واضح دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے ہم داخلی دروازے پر لگے کیمرے کی مووی دیکھ رہے تھے۔ اچانک کوئی تیزی سے اندر آیا اور چلا گیا۔ ایڈی نے فوراً بٹن دبا کر مووی روکی اور ذرا سی ریوائنڈ کی۔

”بارہ بج کر پچیس منٹ۔“ پیری نے کہا۔ اب مووی نارمل رفتار سے چل رہی تھی۔ بارہ بج کر اٹھائیس منٹ پر ایک شخص دروازہ کھول کر اندر آیا اور اس نے پہلے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اندر چلا گیا۔ وہ مشکل سے تین سیکنڈ دروازے پر رکا تھا لیکن اتنا وقت کافی تھا۔ پیری اور میں نے اسے بہ آسانی شناخت کر لیا کیونکہ یہ ہمارے اندازے کے خلاف تھا اس لیے ہمیں شاک لگا تھا۔ پیری نے میری طرف دیکھا تو میں نے سر ہلایا۔ اب ایڈی بیڈ روم والے کیمرے کی اسی وقت کی مووی لگا رہا تھا۔ بارہ بج کر تیس منٹ پر مداخلت کار بیڈ روم میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ وہ نہایت سکون سے بیڈ روم کی تلاشی لے رہا تھا مگر وہ بار بار کیمرے کی زد میں آ رہا تھا۔

کیونکہ اپارٹمنٹ میں تاریکی تھی، اس لیے ایڈی نے کیمرے نائٹ ویژن موڈ پر کر دیے تھے اور وہ تاریکی میں بھی نہایت عمدہ مووی بنا رہے تھے۔ آدمی تقریباً نصف گھنٹا اپارٹمنٹ میں موجود رہا اور اس نے یقیناً ایک ایک جگہ دیکھی تھی۔ اس نے کہیں بھی روشنی نہیں کی اور صرف ایک چھوٹی سی ٹارچ سے کام چلاتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپارٹمنٹ سے چلا گیا۔ ”اس مووی کے چند اچھے اور واضح فوٹیج نکلوا دو۔“ پیری نے ایڈی کو ہدایت کی اور ہم باہر نکل آئے۔ پیری نے میری طرف دیکھا۔ ”اب ذرا کیپٹن سے بات کرتے ہیں لیکن ذرا فوٹیج آ جائیں۔“

حسبِ توقع فوٹیج دیکھ کر اور ہماری کارکردگی سن کر کیپٹن جیک نے بادلِ ناخواستہ یہ کیس ہمارے سپرد کر دیا۔ میں اور پیری بہت خوش تھے۔ اس کیس کو انجام تک پہنچانے کے لیے روانہ ہونے سے پہلے پیری نے چند کالز کیں۔ جب ہم جائے واردات والی بلڈنگ پہنچے تو وہاں تینتالیسویں فلور پر شائن روز کمپنی کے دفتر میں فلایا روز اور ڈیوڈ بوتھ ہمارے منتظر تھے۔ پیری نے انہیں کال کر کے دفتر میں ملنے کو کہا تھا۔ دونوں متفکر تھے کہ پولیس نے اچانک ان سے ملاقات کا کیوں کہا؟ خلافِ توقع پیری نے کوئی ڈرامائی صورتِ حال پیدا کرنے کے بجائے فوٹیج کا لفافہ ڈیوڈ بوتھ کے سامنے ڈال دیا۔ ”ان میں کچھ تصاویر ہیں۔ انہیں دیکھو اور یہ بتاؤ کہ تم نے شیرن کو کیوں قتل کیا؟“

ڈیوڈ بوتھ نے ہر مجرم کی طرح احمقانہ انداز میں بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے ٹانگ اڑا کر اسے منہ کے بل گرایا اور پھر اس کی گالیوں کی پروا کیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بغیر ہتھکڑی اس کے ہاتھوں میں ڈال دی۔ اگر میں اسے گرانے کے بجائے براہِ راست روکنے کی کوشش کرتا تو مجھے خاصی جدوجہد کرنا پڑتی۔ فلایا پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے ڈیوڈ کو ہتھکڑی پہنائی، وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

''بے چاری فلایا۔'' میں نے لنچ پر پیری کا ساتھ دیتے ہوئے افسوس سے کہا۔

''بے چاری کہاں سے؟'' پیری ایک زنگر برگر کا صفایا کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی تو قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئی ورنہ ڈیوڈ جیسے شخص سے کیا بعید کہ شادی کے بعد اس کی دولت د جائداد ہتھیانے کے لیے اسے بھی قتل کر دیتا۔ اس نے شیرن کو نہایت مہارت سے قتل کیا تھا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے جوڑا اسٹک نکالی۔ شاید اسی وقت شیرن نے کہا تھا کہ یہ کیا کر رہے ہو اور اس سے زیادہ کی اسے مہلت نہیں ملی کیونکہ فوراً ہی ڈیوڈ نے جوڑا اسٹک اس کی کنپٹی میں اتار دی تھی اور وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہوگئی۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس نے کتنی قوت سے وار کیا ہوگا۔''

ڈیوڈ بوتھ طاقتور آدمی تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کو قابو کرتے ہوئے بہ خوبی ہوگیا تھا۔ اس نے گرفتاری کے بعد اور ویڈیو کی فوٹیج دیکھتے ہوئے اعترافِ جرم کر لیا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ گزشتہ موسمِ گرما میں شیرن چھٹیاں گزارنے فلوریڈا گئی تھی۔ وہ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں کہیں جاتی تھی۔ فلوریڈا میں اس کی ملاقات ڈیوڈ بوتھ سے ہوئی اور دونوں عارضی عشق میں مبتلا ہوگئے۔ دونوں نے بیس دن ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہنسی خوشی گزارے۔ اس کے بعد شیرن واپس آگئی اور اپنی جاب میں لگ گئی۔ پیری نے زنگر برگر کا خاتمہ کرتے ہوئے سرد آہ بھری۔ ''میرا اور تمہارا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ شیرن چمٹ جانے والی عورت نہیں تھی۔ وہ ڈیوڈ کے ساتھ صرف وقت گزاری کر رہی تھی۔ واپس آکر وہ اسے بھول بھی گئی تھی، ایسا وہ ہر گرمیوں میں کرتی تھی۔ اس طرح وہ بغیر کسی اسکینڈل کے اپنے فطری تقاضے پورے کر لیا کرتی تھی مگر بدقسمتی سے جب ڈیوڈ نے فلایا کو پھنسایا اور اس سے منگنی بھی کرنے میں کامیاب رہا تو لفٹ میں شیرن سے سامنا ہوگیا۔''

ڈیوڈ کا ماضی بھی صاف نہ تھا۔ وہ اس سے قبل دو لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس کا اصل مقصد لڑکیوں کو اپنے عشق کے جال میں پھانس کر دولت کا حصول تھا۔ درحقیقت وہ بلیک میلر تھا اور لڑکیوں کو اپنی تسکین کے لیے استعمال کرتے وقت ان کی قابلِ اعتراض ویڈیو بنا لیتا تھا اور پھر انہیں بلیک میل کر کے رقم وصول کرتا تھا جو دو لڑکیاں شیرن سے پہلے قتل ہوئیں، ان سے ڈیوڈ کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ وہ اس کا راز فاش کر دیں گی اور وہ قانون کی گرفت میں آجائے گا۔ وہ اب تک بڑی خاموشی اور صفائی سے اپنا کام کرتا آیا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کسی بھی قسم کا مجرمانہ ریکارڈ پولیس کی نظر میں آئے اور وہ پھنس جائے۔

اس نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی اور دونوں لڑکیوں کو ابدی نیند سلا دیا۔ چونکہ یہ قتل باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کیے گئے اس لیے وہ صاف بچ گیا اور پولیس کو دونوں لڑکیوں کے قاتل کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ شیرن کا معاملہ الگ تھا۔ ڈیوڈ کی اس سے ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی اور بظاہر ڈیوڈ نے صرف اپنی تسکین کا سامان کیا تھا۔ شیرن کو بلیک میل کرنے کا اس کا ارادہ نہ تھا کیونکہ اسے علم نہ تھا کہ شیرن دولت مند ہے۔ وہ صرف اس کے حسن کی وجہ سے اس کی طرف مائل ہوا تھا اور پھر شیرن بھی منظر سے غائب ہوگئی تھی مگر شیرن کو اچانک اپنے سامنے پا کر اس کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

شیرن کا شاید ایسا کوئی ارادہ نہ ہو لیکن ڈیوڈ جو کامیابی کے بالکل قریب تھا، اس نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ شیرن کا کہا ہوا ایک لفظ یا ایک اشارہ بھی اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر وہ اتنا بدحواس ہوا کہ جب اچانک لفٹ کی لائٹ گئی، لفٹ رکی اور اندر اندھیرا ہوگیا تو اس نے بے اختیار شیرن کے بالوں سے جوڑا اسٹک نکال کر اس کی کنپٹی میں گھونپ دی۔ وہ بیان دیتے ہوئے رو رہا تھا اور اسے اپنی سنگین غلطی قرار دے رہا تھا۔ اسے سزائے موت ہونا یقینی تھی۔ اس کی زندگی صرف ایک غلطی کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی اور وہ قانون کی گرفت میں آگیا تھا۔

''سوچے سمجھے بغیر قدم اٹھانا اکثر اوقات مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔'' پیری نے کہا۔ ''اگر وہ ذرا تحمل سے کام لیتا اور شیرن کے ردِعمل کا اندازہ کرتا تو عین ممکن ہے، اس قتل کی نوبت ہی نہ آتی۔''

میں نے سوچا، پیری ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن جب انسان کامیابی کے پیچھے اندھا دھند بھاگنا شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے صبر و تحمل کا دامن ہی ہاتھ سے چھوڑتا ہے۔

سرپرائز

سلیم انور

بعض اوقات مختصر سی ملاقات میں قربت کا گہرا احساس پوشیدہ ہوتا ہے... اور کبھی زندگی کے کئی ماہ و سال ساتھ بتانے کے باوجود ایک دوسرے کے مزاج و عادات سے ناواقفیت ہی رہتی ہے... ایک دوسرے سے وابستہ کی جانے والی توقعات کا شاخسانہ...

ایک چونکا دینے والے اختتام سے مزین...... جرم اور محبت کا انوکھا انجام

یہ سنیچر کا دن تھا اور اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔

سائمن ناشتے کی میز پر بیٹھا اطمینان سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے اسے دفتر جانے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ گزشتہ ہفتے کام کی زیادتی کے سبب خاصا تھک چکا تھا اور آج چھٹی کے دن مکمل آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس کی بیوی سیلی کچن میں ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس ابھی تبدیل نہیں کیا تھا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ یہ ان دونوں کے لیے ایک مخصوص چھٹی کا دن تھا۔

''آج تمہارا کیا پلان ہے، سیلی؟'' سائمن نے اخبار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر سے نگاہ اٹھائے بغیر پوچھا۔
”میں نے ابھی تک کچھ نہیں سوچا ہے۔“ سیلی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کو مل کر کوئی کام کر لینا چاہیے۔“
”میں آج قدرے تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“ سائمن نے جواب دیا۔ ”اس لیے میرا خیال ہے کہ میں گھر پر ہی رہوں اور بیٹھ کر ٹی وی دیکھوں.....“
سیلی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
”تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ باہر جا کر کچھ باغبانی کر لو؟ موسم بھی اچھا ہے اور آج کا دن بھی عمدہ گزرے گا۔“
’یہ بھول گیا ہے۔‘ سیلی نے دل ہی دل میں سوچا۔ ’یہ بھول گیا ہے کہ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ میں جانتی تھی کہ اسے یاد نہیں رہے گا۔ میں نے دس سال اس کی اطاعت میں گزار دیے ہیں... اور یہ ہے کہ ہمیشہ صرف اور صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا ہے۔ ہفتے بھر یہ دن میں چودہ گھنٹے گھر سے باہر رہتا ہے.... جب گھر لوٹتا ہے تو اس بُری طرح تھک چکا ہوتا ہے کہ پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔‘
گزشتہ تین برسوں میں وہ شاید ہی کبھی اکٹھے باہر گئے ہوں۔ خاص طور پر جب سے سائمن کی اپنی کمپنی میں بطور ایڈورٹائزنگ منیجر ترقی ہوئی تھی۔ سیلی کڑھ رہی تھی اور دل ہی دل میں حساب کتاب میں مصروف تھی۔
”سب کچھ ٹھیک تو ہے نا، سیلی؟“ سائمن کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا اور وہ چونک گئی۔
”ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں.... بس ذرا سوچ میں ڈوب گئی تھی۔“ سیلی نے جواب دیا۔
”میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ تمہیں باہر نکل کر تھوڑی بہت باغبانی کر لینی چاہیے۔ سال کے آغاز میں تو تم نے باغبانی کے لیے بڑے جوشیلے پن کا اظہار کیا تھا۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ روکری کے برابر میں ایک روز گارڈن بنا لو۔ وہاں گلاب کے پودے بے حد خوشنما لگیں گے۔ باغبانی کے تمام اوزار گیراج میں رکھے ہوئے ہیں۔“
”کیا تم بھی میری مدد کرو گے؟“
”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ آج مجھے خاصی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ البتہ تم خود یہ کام کر لو تو میں بُرا نہیں مانوں گا۔ میں یہیں پر ٹھیک ہوں۔ بس بیئر کا ایک کین اور چند سینڈوچز میرے سامنے رکھ دینا میں مزے سے ٹی وی دیکھتا رہوں گا۔“ سائمن نے جواب دیا۔
سیلی ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ ’یہ اس کا مخصوص انداز ہے۔ خود اطمینان سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا رہے اور میں باہر جا کر باغ میں کھدائی کر کے اپنی کمر تڑوا لوں؟ جیسے یہ کام میرے لیے عمدہ رہے گا۔ لیکن کیا میں اس سے کسی قسم کی مدد کی توقع کر سکتی ہوں؟ اوہ نہیں! اس لیے کہ وہ تھکن محسوس کر رہا ہے۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ میں ہفتے بھر ٹی وی دیکھتی رہی ہوں، پڑوسیوں کے ساتھ چائے پیتی اور گپیں لڑاتی رہی ہوں؟‘
”میں واقعی صحیح کہہ رہا ہوں کہ تمہیں باہر نکل کر کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔“ سائمن نے اخبار پر سے نظریں اٹھائے بغیر اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ”تم اپنی بائیک پر سواری کرنے کیوں نہیں چلی جاتیں؟ میں نے وہ بائیک تمہیں گزشتہ سال لے کر دی تھی اور تم نے اب تک اس پر صرف دو مرتبہ سواری کی ہے۔ وہ یونہی گیراج میں کھڑی ہے۔“
سیلی نے سائمن کے مشورے کو نظر انداز کر دیا اور ناشتا بنانے میں مصروف رہی۔ وہ اسے پاگل کیے دے رہا تھا جبکہ وہ خود کو کنٹرول میں رکھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے سائیکاٹرسٹ نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ غصے سے گریز کرے اور کبھی غصے کو خود پر حاوی نہ ہونے دے۔ اس پر غصے کی لہر ایک بار حاوی ہو گئی تو غصہ بڑھتا چلا جائے گا۔
”اگر تم سائیکلنگ شروع کر دو تو اپنے جسم کے تھلتھلاتے گوشت سے نجات حاصل کر سکتی ہو۔“ سائمن نے تبصرہ کیا۔ سیلی اس کی باتوں سے جتنی زیادہ چڑتی تھی، اسے چڑانے میں سائمن دل ہی دل میں خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔
سیلی کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کی نظریں بریڈ کاٹنے والی اس بھاری چھری پر جمی ہوئی تھیں جو آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی۔ چھری کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کے اندر اپنے شوہر کو قتل کرنے کی خواہش بھی شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔
”آج صبح جب تم بستر سے اٹھ کر نیچے اتری تھیں تو تب میں نے غور سے دیکھا کہ تمہارے جسم پر کتنی چربی چڑھی ہوئی ہے۔ میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہیں باغبانی یا سائیکلنگ کرنی چاہیے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ یہ دونوں ہی تمہارے فربہ جسم کے لیے بہتر رہیں گے۔“ سائمن نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ سیلی کی اندرونی کیفیات سے یکسر بے خبر تھا۔ اسے اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ اس کی باتیں سیلی کے اندر کیسی آگ بھڑکا رہی ہیں۔
یہ سیلی کی خوش قسمتی تھی کہ سائمن اخبار کے مطالعے میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے اپنی پشت پر سیلی کی آمد کا قطعی احساس نہیں ہو پایا۔ وہ دھیرے دھیرے، دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے عقب میں پہنچ چکی تھی۔
یہ بھی سیلی کی خوش قسمتی تھی کہ ڈبل روٹی کاٹنے والی چھری کی دھار حال ہی میں تیز کرائی گئی تھی۔
سیلی نے آہستگی سے چھری کو اوپر اٹھایا اور پھر بجلی کی سی سرعت سے اس کا پھل اپنے شوہر کے شانوں کے عین درمیان پشت میں گھونپ دیا۔
سائمن کے حلق سے کوئی آواز تک نہیں نکل سکی۔ اس کے جسم نے آگے کی طرف جھٹکا کھایا اور پھر وہ گھٹنوں کے بل نیچے گر گیا۔ چند لمحوں میں اس کا اوپری جسم بھی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ڈبل روٹی کاٹنے والی چھری کا پھل اب بھی اس کے شانوں کے درمیان گڑا ہوا تھا۔
”ٹھیک ہے، اب میں باہر جا کر تمہارے لیے کچھ باغبانی کرتی ہوں، ڈارلنگ!“ سیلی نے زہرخند کے ساتھ نیم ہذیانی لہجے میں۔
وہ اپنے لانگ بوٹ تلاش کر کے انہیں پہننے لگی۔ ”میں پتھریلے ٹیلے کے برابر میں ایک گڑھا کھود کر تمہیں اس میں دفن کر دوں گی اور پھر اس گڑھے کو بھر کر اس پر گلاب کے چند پودے اگاؤں گی جیسا کہ تمہاری خواہش تھی۔“ سیلی نے اپنے شوہر کی لاش سے مخاطب ہو کر کہا۔
اپنے جوتے اور جیکٹ پہننے کے بعد وہ اوزار لینے کے لیے تیزی سے گیراج کی جانب چل پڑی۔ اسے احساس تھا کہ اسے گڑھا کھودنے میں پورا دن لگ جائے گا۔ پھر وہ رات میں اپنے شوہر کی لاش کو گھسیٹ کر اس گڑھے تک لے جائے گی اور اس میں دفن کر دے گی۔
جونہی سیلی نے گیراج کا دروازہ کھولا، اس کی نگاہ سامنے کھڑی ہوئی پیلے رنگ کی نئی جگمگاتی اسپورٹس کار پر پڑی جس پر گلابی ربن بندھے ہوئے تھے۔ کار کے بونٹ پر ایک بڑا سا کارڈ موجود تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:
”ہماری شادی کی دسویں سالگرہ پر اپنی پیاری اور حسین بیوی کے لیے۔ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں اور تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا..... سائمن!“
سیلی کا سارا غصہ دھواں ہو گیا۔ وہ بے اعتباری سے کارڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھتے ہوئے لڑکھڑائی اور پھر پختہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔
برسوں ساتھ گزارنے کے باوجود وہ یہ نہیں جان سکی تھی کہ سائمن دل و جان سے اسے چاہتا تھا..... بس مزہ لینے کے لیے اسے چڑانے والی باتیں کیا کرتا تھا!

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ
سرگزشت
اکتوبر 2012ء کی جھلکیاں
علم دوست
اردو کے ایک فقیر منش بلند پایہ ادیب کا زندگی نامہ
تخیل کا مسافر
اس مصنف کا احوال جس کے ناول ہاتھوں ہاتھ بکے
موت کے قریب
ایک شکاری عورت کے شکار کی تحیر خیز روداد
یوسف خان شیر بانو
خیبر پختون خواہ سے عشق کی بے مثل داستان
خالی ہاتھ
آنکھوں میں آنسو بھر دینے والی دلچسپ سچ بیانی
اس کے علاوہ
”سراب“ ایک لہورنگ آپ بیتی ”فلمی الف لیلیٰ“ بھولے بسرے فلمی قصے جو خود میں زندہ تاریخ ہیں۔ انوکھے اور دلچسپ سچے واقعات۔ پاکستان بھر سے جمع کی گئی سچ بیانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں
خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسما قادری

قسط 40

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا ساہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو اغوا ہو کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے۔ وہ اسلم کو شادی کی آفر دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماہ بانو، اسلم ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ مشابرم خان تاہلی والا پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو مشابرم خان کے ذریعے تاہلی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ تاہلی والا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جا رہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو اکھاڑ لیتا ہے۔ شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشابرم خان کو اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ راستے میں گاڑی کے خراب ہونے پر وہ ایک جگہ رکتے ہیں۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں اور اس کی شناخت بدلنے کے معاملات پر غور ہوتا ہے۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی اور عملی طور پر بھی ایسا دکھایا جائے گا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ کوما میں چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ اسپتال میں کوئی دوسرا شخص ہوتا جبکہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کر دی جاتی۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ پھر اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما لے کر دیا جاتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے تاہم مراد شاہ کشور اور آفتاب سے بہت خلوص سے ملتا ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں کے ایک گرو بوبی کو اس مشن میں اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ بوبی اسے ایک ہندو خواجہ سرا شالنی کے پاس لے جاتا ہے۔ شالنی اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیتی ہے مگر پھر اسے کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں لے آتی ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شالنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ وہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرتا ہے اور شالنی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شالنی کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی شروع کر دی جاتی ہے۔ ادھر ذیشان موہنی کو اٹھا کر اس سے اگلوا لیتا ہے کہ وہ را کی ایجنٹ ہے۔ اسے موہنی سے کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذیشان شہریار کو تفصیل سے تمام صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر جاوید علی ہیڈ کوارٹر رپورٹ کر رہا ہوتا ہے کہ نوازش علی کی بیٹی شاز مین اس کی گفتگو سن لیتی ہے۔ وہ جاوید علی کو حقائق بتانا چاہتی ہے اور دوسرے دن اپنے کمرے میں آنے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ شالنی پکڑے جانے والے مال کے بارے میں ورما کو وضاحت دیتی ہے۔ وہ کراچی فون کر کے رجنی پر نظر رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ورما اس کی گفتگو سن لیتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ورما اپنا ٹھکانا چھوڑتا ہے مگر سی ایف پی کا اہلکار اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نئے ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ شہریار کو اس کی تصویر بھیجی جاتی ہے تو وہ اسے شناخت کر لیتا ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین کے کمرے میں پہنچ کر شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے اور کوٹھی میں کارروائی کی تیاری کرتا ہے۔ وہ صورت حال پر غور کے لیے کمرے میں ٹہل رہا ہوتا ہے کہ مدھو اچانک کمرے میں آ جاتی ہے۔ مدھو کام کرنے کے بہانے آتی ہے مگر اس کا مقصد کمرے کی صورت حال کا جائزہ لینا ہوتا ہے تاکہ اسے پتا چل سکے کہ رجنی کہاں موجود ہے۔ شاز مین سمجھ جاتی ہے کہ وہ لوگ جاوید علی کو تلاش کر رہے ہیں۔ ادھر اظفر اور اس کے ساتھی جنگل میں جاتے ہیں مگر انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی موت حادثاتی ہوئی ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے پر اصرار کرتی ہے۔ جاوید علی اس کے لیے گاڑی بھجوا دیتا ہے۔ جونہی گاڑی حرکت میں آتی ہے، وہاں کئی گھنٹوں سے موجود سیاہ گاڑی اس کے پیچھے دوڑنے لگتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”یہ سب کیا ہو رہا ہے، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ یوں ایک کے بعد ایک ہمیں اپنے لوگوں کا نقصان اٹھانا پڑا ہو۔ موہنی کی موت، نواب نوازش علی کی کوٹھی پر ریڈ اور اب ورما کی گرفتاری معمولی واقعات نہیں ہیں۔ موہنی کی موت کو حادثہ قرار دے کر ہم نے من کو بہلا لیا تھا لیکن اب حالات بتا رہے ہیں کہ اس کی موت حادثہ نہیں تھی بلکہ اسے باقاعدہ ٹریس کیا گیا تھا۔ دشمن کی قید میں اس نے جانے کیا کچھ اگلا ہو گا، ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ البتہ صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں ہماری راہ پر لگ چکی ہیں جب ہی تو انہوں نے رجنی کے بہروپ میں اپنا بندہ نواب نوازش کی کوٹھی پر بھیج دیا تھا۔ اس رجنی کی بچی کی وجہ سے ہماری اتنی اہم ڈیل پکڑی گئی اور ہم نواب کی کوٹھی جیسے محفوظ ٹھکانے کے ساتھ ساتھ اپنے کئی ساتھیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ شالنی جیسے اہم مہرے کو ہم خود ٹھکانے لگانے پر مجبور ہو گئے اور اب ورما صاحب کی گرفتاری... پتا نہیں کیسے وہ دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا بیٹھے تھے کہ وہ سیدھا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے اور اچھے خاصے حفاظتی انتظامات کے باوجود پکڑے گئے۔“

”ورما تو اپنی عیاشی کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ اس کے مکان سے جو بازاری عورت نکلی ہے، اسی سے سمجھ آتا ہے کہ ورما عیاشی میں مصروف تھا اس لیے بے خبری میں مارا گیا۔“ پانڈے کے تشویش زدہ تبصرے کے جواب میں سامع کا کردار ادا کرتی سنتھیا نے جلبلا کر جواب دیا۔

”تم ایسا نہیں کہہ سکتیں میڈم! اگر ورما صاحب بے خبری میں مارے گئے ہوتے تو مدد کے لیے کال نہ کر

پاتے۔ ہماری ہیلپ ٹیم کے لوگوں کا مارا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہاں بہت منظم کارروائی کی گئی تھی۔“ پانڈے نے ورما سے وفاداری نبھاتے ہوئے اس کی حمایت کی۔

”منظم کارروائیاں ایسے ہی نہیں ہوتیں۔ ہر ایجنٹ اپنی غلطی سے مارا جاتا ہے۔ ورما نے غلطی کی ہو گی اسی لیے پکڑا گیا۔“ سنتھیا اپنی رائے پر قائم تھی۔

”اوکے، میں مان لیتا ہوں کہ تم جو کہہ رہی ہو وہ ٹھیک ہے لیکن اب ہم ہاتھ پر ہاتھ تو دھر کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں اپنے حالات سدھارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔“ پانڈے نے زیادہ بحث کرنے کے بجائے ہار مان لینے میں ہی عافیت سمجھی اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب کی ہے تم نے کام کی بات۔ واقعی اب ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس سچویشن میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں اس سارے معاملے پر غور کرتی رہی ہوں اور چند پوائنٹس میرے ذہن میں آئے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ موہنی کا ساتھ دینے والا ہمارا ساتھی وکرم اپنی جگہ سے کیوں غائب ہے؟“

”وہ تو اس نے بتایا تھا کہ موہنی کے مرڈر کی وجہ سے وہ احتیاطاً دوسری جگہ شفٹ ہو گیا ہے۔“ پانڈے نے فوراً جواب دیا۔

”تم اس سے اس دوسری جگہ کا پتا مانگو... اگر وہ انکار کرے تو اسے کہیں باہر ملنے کے لیے کہو۔ سچ سامنے آ جائے گا کہ جو کچھ اس نے کہا، وہ سچ ہے یا وہ دشمن کی قید میں اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہے۔“ سنتھیا نے بڑے مدلل لہجے میں تجویز پیش کی جسے پانڈے کو قبول کرنا پڑا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔“ پانڈے نے فوراً ہی اپنی میز کی دراز سے ایک چپٹا سا آپریٹس برآمد کیا اور اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔ مخصوص کوڈز کے تبادلے کے بعد اس نے سنتھیا کی پیش کردہ تجویز کے مطابق وکرم سے گفتگو شروع کر دی۔

”حالات بہت خراب ہیں وکرم! ان حالات میں ہمیں اپنے ساتھیوں کی حفاظت کی فکر ہو گئی ہے۔ تم کئی دن سے غائب ہو اور ہمیں تمہارے ٹھکانے کا بھی پتا نہیں۔ اپنا ایڈریس بتاؤ تاکہ خفیہ طور پر تمہاری حفاظت کا بندوبست کیا جا سکے۔“

”مجھے حالات کی ساری خبریں مل رہی ہیں سر... لیکن آپ میری فکر نہ کریں۔ میں محفوظ ٹھکانے پر ہوں۔ ایڈریس اس لیے نہیں بتا سکتا کہ اگر یہ کال پکڑی گئی تو میں آپ کی مدد پہنچنے سے پہلے مارا جاؤں گا۔“ مؤدبانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے وکرم نے صاف انکار کیا جسے سن کر سنتھیا نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، تم اپنا ایڈریس مت بتاؤ لیکن میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ آج شام چھ بجے مینارِ پاکستان پہنچ جاؤ۔ میرے لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہیں وہاں سے پک کر کے مجھ تک پہنچا دے گا۔“ پانڈے نے فوراً ہی متبادل تجویز پیش کر دی جس کے لیے ظاہر ہے وکرم انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ہچکچاتا ہوا بولا۔ ”اوکے سر! اگر ملنا اتنا ضروری ہے تو میں خطرے کے باوجود ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اوکے، گڈ بائے۔“ پانڈے نے کال منقطع کر دی اور سنتھیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میرا اندازہ ہے کہ یہ وکرم نہیں تھا، کوئی اور وکرم کی آواز میں بات کر رہا تھا۔ وکرم جانتا ہے کہ جس آپریٹس پر اس سے بات ہو رہی تھی اس کی کال اتنی آسانی سے ٹریس نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کے کال ٹریس ہونے والے خدشے کو مان لیا جائے تو پھر اسے مینارِ پاکستان آتے ہوئے بھی ڈرنا چاہیے تھا اور یہ سوچنا چاہیے تھا کہ وہاں اسے اور ہمارے ساتھیوں کو گھیرا جا سکتا ہے لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم سے بات کرنے والا وکرم نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا شخص تھا جس نے سوچا ہو گا کہ وہ وکرم کے ذریعے ہمارے ایک اور ٹھکانے تک پہنچ سکتا ہے اس لیے فوراً ہامی بھر لی۔“ سنتھیا نے دوٹوک لہجے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اب یہ بتاؤ کہ شام چھ بجے ہم کیا کریں گے؟“ پانڈے نے تشویش سے پوچھا۔ وہ ورما کے انڈر میں کام کرتا تھا اور نامساعد حالات میں زیادہ تر فیصلے ورما ہی کرتا تھا اس لیے وہ اپنی مرضی سے اکیلا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا اور مسلسل سنتھیا سے مشورے لے رہا تھا۔

”ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وکرم کو لینے کے لیے کسی کو بھیج دیں اور ایک علیحدہ ٹیم اس کی نگرانی پر لگا دیں جو یہ دیکھے کہ کون اس کا تعاقب کرتا ہے۔ لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ ہمیں براہِ راست اپنے آدمیوں کو سامنے لانا پڑے گا اور فی الحال یہ مناسب نہیں ہے۔ اس کی جگہ ہم کوئی متبادل ترکیب بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ وہ ورما کو متبادل ترکیب بتانے لگی۔

”لیکن اس میں تمہارے لیے رسک ہے۔“ ترکیب سن کر وہ متامل ہوا۔

”میری فکر نہیں کرو۔ میں نے اپنے کیریئر میں اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بھی بڑے رسک لیے ہیں اور اب اس عمر میں تو مجھے مرنے سے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا۔ ویسے بھی ماریا کے بعد میرے پاس زندہ رہنے کا اگر کوئی جواز ہے تو صرف یہ کہ میں اس کی موت کا سبب بننے والوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکوں۔ اس مشن میں اگر میری جان بھی چلی گئی تو مجھے کوئی دکھ نہیں۔"

ٹھوس لہجے میں بولتی سنتھیا کی آنکھوں میں وہ کرب تھا جو اپنی اکلوتی اولاد کو کھو دینے والی کوئی ماں محسوس کرتی ہے۔ لیکن وہ ظالم عورت ماں ہونے کے باوجود یہ نہیں سمجھتی تھی کہ اس نے ساری زندگی جن زندگیوں کے چراغ گل کرتے ہوئے گزاری، وہ مظلوم لوگ بھی کسی ماں کی آنکھوں کا نور، کسی عورت کا سہاگ یا کسی خاندان کے کفیل تھے۔ اس نے صرف اور صرف اپنی بیٹی کے مرنے کا دکھ محسوس کیا تھا اور اس کی موت کو مکافاتِ عمل سمجھنے کے بجائے سراپا انتقام بن گئی تھی۔

"ٹھیک ہے، تم مجھ سے سینئر ہو اور زیادہ بہتر فیصلے کر سکتی ہو۔" پانڈے نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے اس کی تجویز قبول کر لی۔

"دوسرا کام تم یہ کرو کہ نواب نوازش علی کی بیٹی شازمین کی نگرانی کرواؤ۔ آشا کے ذریعے ہم تک جو آخری اطلاعات پہنچی تھیں، اس کے مطابق اسے بہروپیے خواجہ سرا رنجنی، شازمین اور کاجل کے گٹھ جوڑ کا شک تھا اور اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ رنجنی کوٹھی سے فرار ہونے کے بجائے اندر ہی شازمین کی پناہ میں تھی۔ بعد کے حالات بھی اس کے اس اندازے کی تصدیق کرتے ہیں اور ہم امید کر سکتے ہیں کہ شازمین کا کوٹھی پر ریڈ کرنے والوں سے کوئی نہ کوئی رابطہ ہوگا یا وہ ان کے بارے میں کچھ معلومات رکھتی ہوگی۔ مستقل نگرانی سے کوئی کام کی بات سامنے آسکتی ہے۔ ایک دوسرا انتظام یہ کرو کہ دارالامان کی وارڈن کو خرید لو۔ شازمین وہاں ہے تو یہ طے ہے کہ ہم وارڈن کے ذریعے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔" سنتھیا کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، یہ کام بھی میں ابھی شروع کروا دیتا ہوں۔ آگے یہ بھی سوچو کہ ورما صاحب کی رہائی کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟ وہ ہمارے قیمتی ساتھی ہیں اور ہم انہیں یوں دشمنوں کے قبضے میں نہیں چھوڑ سکتے۔" پانڈے کو مسلسل ورما کی فکر دامن گیر تھی۔

"پہلے ان دونوں معاملات کو نمٹنے دو۔ ہم کامیاب رہے تو سمجھو کہ ان لوگوں تک پہنچ جائیں گے جنہوں نے ورما کو اریسٹ کر رکھا ہے اور ہمارے خلاف یہ ساری کارروائیاں کر رہے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اب تک جو بھی کارروائی ہوئی ہے، اس میں پولیس یا رینجرز والے سامنے نظر آتے ہیں لیکن میں اس بات کو نہیں مان سکتی۔ اس طرح کا کام بہت تربیت یافتہ اور کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی کر سکتے ہیں اور ہمیں ان تک پہنچنا ہے۔" سنتھیا کی رائے صائب تھی اس لیے پانڈے کو ماننی پڑی اور وہ اس کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے اپنے کارندوں کو احکامات دینے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

یہ شازمین کی بدقسمتی تھی کہ جب اس سے جاوید علی نے رابطہ کیا اس وقت تک را کے گرگے فعال ہو چکے تھے اور انہوں نے دارالامان کی وارڈن سے اپنے معاملات طے کر لیے تھے۔ وارڈن چالاک اور زمانہ شناس عورت تھی۔ ایک طرف اس نے را والوں سے پیسے کھرے کیے، دوسری طرف شازمین کو باہر جانے کی اجازت نہ دینے کا ڈراما کر کے اس سے رشوت میں قیمتی انگوٹھی ٹھگ لی۔ شازمین کے لیے زر و زیور کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اس لیے وہ ایک انگوٹھی کے بدلے جاوید علی تک پہنچنے کا راستہ صاف پا کر خوش تھی۔ لیکن حقیقت میں بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ راستہ صاف نہیں بلکہ باہر خوفناک شکاری اس کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ مقررہ وقت پر جاوید علی کی بھجوائی ہوئی گاڑی میں اس سے ملنے کے لیے اسپتال روانہ ہوئی تو انجانے میں را کے گرگوں کو بھی اپنے پیچھے لگا کر لے گئی۔ وارڈن کے تعاون کی وجہ سے چونکہ وہ لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر میں تعاقب کرنے والی گاڑی بدل جاتی تھی اس لیے تجربہ کار اور مشاق ڈرائیور بھی تعاقب کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اسپتال جیسی عوامی جگہ پر کسی کا داخل ہو جانا اور یہ دیکھ لینا کہ شازمین کس کمرے میں داخل ہوئی ہے، کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اپنے اور جاوید علی کے سر پر منڈلاتے خطرے سے بے خبر شازمین اس کے کمرے کے باہر موجود گارڈ کو اپنی شناخت سے مطمئن کر کے جذبات میں بھری ہوئی اندر داخل ہوئی اور جاوید علی کے زخم زخم وجود کو دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں سفید پٹیاں موجود نہ ہوں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کینولا لگا ہوا تھا جس کے ذریعے قطرہ قطرہ خون اور گلوکوز اس کے جسم میں اتارا جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوٹھی میں ہونے والے دھماکے میں بری طرح زد میں آیا تھا اور کسی معجزے نے ہی اس کی زندگی بچائی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر شازمین سسک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھی۔ فون پر جاوید علی کی نقاہت زدہ آواز سن کر اس نے اس کی حالت کا جو اندازہ لگایا تھا، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ابتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ شازمین کے لبوں سے سسکی نکلی تو اس نے اپنی بند آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا؟ تم رو رہی ہو۔ میں نے تمہاری ضد پر محض تسلی کے لیے .... یہاں بلوایا تھا۔ اگر مجھے تمہارا یوں آنسو بہانا ہی منظور ہوتا تو پھر تم وہیں ٹھیک تھیں۔" اس نے لہجے میں خفگی سموتے ہوئے اسے ٹوکا لیکن وہ بدستور اس کے بیڈ کے قریب کھڑی اشک بہاتی رہی۔ مختصر عرصے میں دل کے بہت قریب آجانے والے جاوید علی کو اس حال میں دیکھنا اس کے لیے کڑا امتحان تھا۔

"مت رو شازمین! تمہارے رونے سے مجھے اس سے کہیں زیادہ تکلیف ہو رہی ہے جتنی تکلیف میں اپنے زخموں کی وجہ سے محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر شازمین کا گداز ہاتھ تھاما لیکن اس عمل میں وہ خود بری طرح تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے اس بازو میں فریکچر تھا اور اسے یوں حرکت دینے میں اسے سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"میں جان بوجھ کر نہیں رو رہی ہوں۔ تمہاری حالت دیکھ کر آنسو خود بخود میری آنکھوں سے نکل رہے ہیں۔" بائیں ہتھیلی سے اپنے بھیگے رخساروں کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا تو ساتھ ہی اس کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی اور رخسار خشک ہونے سے پہلے ہی آنسوؤں کے نئے ریلے نے گلاب سے دہکتے رخساروں کو ایک بار پھر تر کر دیا۔

"تمہارا رونا اس صورت میں جائز ہوتا اگر یہاں اس بستر پر میرے زخمی وجود کے بجائے مردہ جسم پڑا ہوتا۔ میں جس فیلڈ میں ہوں، وہاں زخم کھانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ہم جیسوں کے عزیزوں کو ہمیں صرف زخمی دیکھ کر شکر ادا کرنا پڑتا ہے کہ چلو زندگی سلامت ہے۔ تھوڑی مرمت کے بعد بندہ آخر کار اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ سچ کہوں تو ہم تو اپنے پیاروں کو اپنے مرنے کے بعد بھی رونے کی اجازت نہیں دیتے کہ شہیدوں پر رویا نہیں جاتا بلکہ فخر کیا جاتا ہے۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔" اس کی باتیں سن کر وہ کچھ بے بسی اور جھنجلاہٹ سے چلائی۔

"اور میں تم سے کہوں گا کہ ایک غریب سپاہی سے اپنا دل یوں نہ لگاؤ۔ تم جیسی نواب زادی اور میرے جیسے معمولی آدمی کا کوئی جوڑ نہیں۔" ایک اداس سی مسکراہٹ جاوید علی کے ہونٹوں پر ابھری اور فوراً دم توڑ گئی۔ وہ اتنا زخمی تھا کہ مسکرانے میں بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی اور اس سے بات چیت بھی صرف وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر کر رہا تھا۔

"خود کو معمولی کہہ کر مجھے میری نظروں میں مزید مت گراؤ۔ میرا تعلق تو اس گھرانے سے ہے جو جانے انجانے میں وطن کی تباہی میں شامل تھا جبکہ تم... تم تو اس ملک کا سرمایہ ہو۔ بغیر کچھ دیکھے بھالے صرف وطن کی محبت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والا شخص معمولی کیسے ہو سکتا ہے؟ تم اگر خود کو میری نظروں سے دیکھو تو .... اتنا عظیم پاؤ گے کہ مجھ جیسی معمولی لڑکی تمہاری تمنا کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ دل بڑی ظالم شے ہے جاوید علی... تمہارے اور اپنے درمیان موجود فرق کو جانتے ہوئے بھی تمہاری طرف ہی لپک رہا ہے لیکن... لیکن میں تم سے کچھ مانگوں گی نہیں۔ میں خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ تم جیسے انمول انسان کو اپنے لیے مانگ سکوں۔ ہاں، اس جسم میں جب تک جان ہے، میرا دل تمہارے نام پر ہی دھڑکتا رہے گا۔ دل پر انسان کا زور نہیں چلتا اس لیے تم بھی مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتے کہ مجھے خود کو چاہنے سے روک سکو۔"

وہ جذبات میں آ کر بولنا شروع ہوئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

"تم پاگل ہو شازمین... اور پتا نہیں کیا کیا سوچ رہی ہو۔ تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان اتنا بڑا فرق بھی ڈھونڈ نکالا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ تم بھی اس وطن سے محبت کرتی ہو اور میں بھی۔ فرق ہے تو صرف ہمارے حالات کا۔ میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے ماحول نے مجھے ایسی شاندار ملازمت میں پہنچا دیا جبکہ تم پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھیں اور اس کے باوجود اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں... تو میرے خیال میں یہ بھی کافی تھا ورنہ یہاں تو لوگ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ عیش و عشرت میں مگن انہیں ملک کے بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ ہمارے خوش حال لوگوں کی اکثریت کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ کے فارمولے پر عمل پیرا ہے اور باقی رہ جاتے ہیں متوسط اور غریب طبقے کے لوگ... تو وہ بھی اعلیٰ طبقے میں شامل ہونے کی جدوجہد میں ناکام ہونے پر انہیں گالیاں دینے میں مصروف ہیں۔ ایسی نفسا نفسی کے عالم میں تمہارے ہمارے جیسے لوگ جو دل میں ملک کا درد رکھتے ہیں، بہت نایاب ہیں اس لیے ہم میں سے کسی کو بھی معمولی نہیں سمجھا جاسکتا۔ تم بھی میرے لیے بہت انمول ہو اور میں تمہارے لیے اپنے دل میں ایسی قدر محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس وقت اتنا زخمی نہ ہوتا تو ابھی ابھی عملی مظاہرہ کر کے تمہیں اپنی محبت کا

یقین دلا ڈالتا۔'' اتنی طویل بات کرتے ہوئے وہ بری طرح ہانپ گیا تھا لیکن پھر بھی آخری لفظوں میں شوخی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آیا۔ اداس وملول شاز مین کے ہونٹوں پر اس کی بات سن کر پہلی بار مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔

''گڈ گرل...! دیکھو مسکراتی ہوئی کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ آئندہ جب بھی ملنا ایسے ہی مسکراتے ہوئے ملنا۔'' محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جاوید علی نے کہا تو اس کے ہونٹوں پر جھلک دکھانے والی مسکان کچھ اور گہری ہوگئی۔ اس مسکراہٹ میں خوشی اور حجاب کے رنگ ملے جلے تھے جو شاز مین کے خوب صورت چہرے کو مزید نکھار بخش رہے تھے۔ جاوید علی اپنے ہر زخم کو بھول کر اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی لڑکی کے دل میں اپنے لیے محبت کے جذبات اتنی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ بن گیا تھا۔ شاز مین خوب صورت تھی، اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں تھا لیکن اس خوب صورتی کو جو نکھار محبت نے بخشا تھا، اس نے اسے بالکل ہی جداگانہ روپ دے دیا تھا۔ جاوید علی کو یقین تھا کہ پرستان سے اگر کوئی پری بھی اتر کر آجائے تو شاز مین کی خوب صورتی کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ شاز مین کی صورت جو اپسرا اس کے سامنے موجود تھی، اس نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ مدہوشی کی اس کیفیت کو دروازے پر ابھرنے والی دستک کی آواز نے توڑا۔ دستک کے ساتھ ہی دروازہ آہستہ سے کھلا اور سفید براق یونیفارم میں ایک نرس اندر داخل ہوئی۔

''ایکسکیوزمی سر! میں آپ کو یہ یاد دلانے آئی تھی کہ ابھی آپ کو زیادہ بولنے کی اجازت نہیں ہے اور ڈاکٹر نے آپ کے بے حد اصرار پر آپ کو صرف دس منٹ کے لیے اس ملاقات کی اجازت دی تھی اور اب تقریباً بیس منٹ ہونے والے ہیں۔'' نرس نے مہذبانہ لہجے میں اسے مطلع کیا۔

''سوری سسٹر! مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔'' جاوید علی نے فوراً اس سے معذرت کی جسے سن کر نرس کے ہونٹوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ بکھر گئی.... یوں لگا کہ وہ بہ زبانِ مسکراہٹ کہہ رہی ہو کہ جب ملاقاتی اتنا خوب صورت ہو تو وقت کا اندازہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

''میں چلتی ہوں۔'' گھبرائی، شرمائی سی شاز مین نے بھی دل نہ چاہنے کے باوجود اذنِ رخصت چاہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ اور اب پریشان نہ ہونا۔ اگر موقع ملا تو میں پھر تمہیں بلواؤں گا ورنہ فون پر رابطہ رکھوں گا۔ لیکن تمہیں نہ تو رونا دھونا ہے اور نہ ہی اداس ہونا ہے۔'' رخصت کرنے سے قبل جاوید علی نے اسے نصیحت کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اسے اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

اسپتال کے باہر ڈرائیور سمیت وہی گاڑی موجود تھی جس میں وہ یہاں تک آئی تھی۔ ڈرائیور نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اس کی واپسی تک یہیں ٹھہرے گا تاکہ اسے واپس دارالامان چھوڑ دے۔ وہ سیدھی گاڑی کی عقبی نشست پر جاکر براجمان ہوگئی اور آنکھیں موند لیں۔ ڈرائیور نے سبک رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پچھلی نشست پر بیٹھی شاز مین کو کوئی غرض نہیں تھی کہ گاڑی کن راستوں سے گزر رہی ہے۔ وہ تو جاوید علی سے ہونے والی ملاقات کی جزئیات کو سوچنے میں مصروف تھی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ پے در پے ہونے والے دو دھماکوں نے توڑا۔ دھماکوں کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی بری طرح لہرائی اور یوں لگا کہ بے قابو ہو کر سڑک سے اتر جائے گی۔ اس صورتِ حال پر شاز مین کے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن ڈرائیور نے بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی کو سڑک سے اترنے سے بچا لیا اور چیخ کر اس سے بولا۔ ''سیٹ کے نیچے ہو کر بیٹھ جائیں۔ گاڑی کے دونوں ٹائر گولیاں لگنے سے برسٹ ہو گئے ہیں۔'' خوف زدہ سی شاز مین نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ابھی حال ہی میں تو اس نے اپنی کوٹھی پر ہونے والا خونی کھیل دیکھا تھا چنانچہ ڈرائیور کی زبانی گولیوں کا ذکر سن کر سخت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ البتہ اس نے خود گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی اور یہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ فائر بے آواز ہتھیار سے کیے گئے تھے۔

ادھر ڈرائیور گاڑی روکنے سے پہلے ہی اپنا ہتھیار نکال چکا تھا اور مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اگر گاڑی کے اگلے دونوں ٹائر برسٹ نہ کیے گئے ہوتے تو وہ شاز مین کی موجودگی میں مقابلے پر ڈٹنے کے بجائے گاڑی نکال لے جانا بہتر سمجھتا۔ لیکن اب مجبوری تھی، ان مخدوش حالات میں مقابلہ کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان پر بہت سوچ سمجھ کر بالکل سنسان راستے پر حملہ کیا گیا تھا اور حملہ کرنے والے زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے سڑک کے دونوں طرف پوزیشنز سنبھال رکھی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ ان کی یقینی واپسی کے ساتھ انہوں نے یہاں گھات لگائی ہوئی تھی۔ ان لمحات میں وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ دارالامان سے اسپتال جاتے ہوئے ان کا تعاقب کیا گیا تھا اور تعاقب کرنے والوں نے اس سے زیادہ ہوشیاری

کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے وہ ان کی موجودگی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اس وقت اسے تن تنہا ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ جدید ساخت کی خطرناک گن تھامے اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا۔ فوراً ہی بے آواز گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کے سر سے چند انچ کے فاصلے پر سے گزری۔

''گاڑی سے نکلنے کی حماقت نہیں کرنا۔ تم ہمارے نشانے پر ہو اور ہم چاہیں تو گاڑی سمیت تمہیں اڑا سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ شرافت سے گاڑی میں بیٹھے رہو اور ہتھیار باہر پھینک دو۔'' گولی چلنے کے فوراً بعد ایک جانب سے کسی نے بلند آواز میں احکامات صادر کیے۔ بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گا۔ ڈرائیور نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گن باہر پھینک دی۔ حملہ آور جو بھی تھے، حالات بتا رہے تھے کہ وہ انہیں فوری طور پر ہلاک کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں اس لیے وہ انہیں بھڑکانے کے بجائے کھل کر سامنے آنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کے گن پھینکتے ہی دونوں طرف سے مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ساتھ ہی ایک بڑی گاڑی بھی سڑک پر چڑھ آئی۔ مسلح افراد میں سے تین نے ان کی گاڑی کا رخ کیا۔ ایک نے اگلی سیٹ سنبھالی اور دو دو دائیں بائیں سے دروازہ کھول کر شاز مین کو درمیان میں دبوچ کر بیٹھ گئے۔

''گاڑی آگے بڑھاؤ۔ اگر ہوشیاری دکھانے کی حماقت کی تو اپنی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔'' ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے والے شخص نے اس کی پسلیوں میں پسٹل کی نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں حکم دیا تو وہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس کے حکم پر عمل کرنے لگا۔ ان حالات میں وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان لوگوں سے بھڑنے کی جرأت کر بھی بیٹھتا تو یہ شاز مین کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ عام سی لڑکی تھی جو کسی طرح ان مسلح افراد کے مقابلے میں کچھ کرنے کی اہل نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ پیچھے وہ گاڑی بھی موجود تھی جس میں انہیں گھیرنے والوں کے بقیہ ساتھی سوار تھے۔

''یہاں گاڑی روک دو اور اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤ۔'' تھوڑا سا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ ایک موڑ پر نیا حکم صادر کیا گیا۔ اس نے حسبِ ہدایت گاڑی تو روک دی لیکن آنکھیں بند کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''آنکھیں بند کرو ورنہ یہ چھٹانک بھر کی گولی ہمیشہ کے لیے تیری آنکھ بند کر دے گی۔'' اس کے برابر میں بیٹھا شخص پسٹل کی نال سختی سے اس کے پہلو میں چبھو کر غرایا تو اسے ناچار اس کی بات ماننی پڑی۔ سی ایف پی کے ہر جیالے کی طرح اسے اپنی جان جانے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن بے مقصد بھی زندگی گنوانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زندہ رہ کر شاید اسے کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع مل جاتا ورنہ تو ابھی یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس طرح اچانک گھیر لینے والے کون تھے اور ان کے مقاصد کیا تھے۔

آنکھیں بند کرتے ہی اس کی ناک سے کلوروفام میں ڈوبا ہوا رومال لگا دیا گیا۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر دو مسٹنڈوں کے نرغے میں بیٹھی شاز مین یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہم ستانے لگا کہ جانے یہ غنڈے اس کے ساتھ کیا کریں گے لیکن پھر اسے زیادہ سوچنے اور پریشان ہونے کی مہلت نہیں ملی اور ایک رومال اس کی ناک سے بھی لگا دیا گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں کتنا طویل راستہ طے کر کے انہیں کس جگہ پہنچایا گیا، کچھ خبر نہیں ہو سکی۔ دوبارہ ہوش آیا تو اس نے خود کو لوہے کی ایسی کرسی پر بیٹھا پایا جس کے ساتھ منسلک کڑوں نے اس کے ہاتھ پیروں کے ساتھ گردن کو بھی جکڑ رکھا تھا اور وہ سر کو دائیں بائیں ذرا سی جنبش دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر بعد ہوش میں آئی ہے، البتہ ہوش آتے ہی یہ ضرور یاد آ گیا تھا کہ اس کے ساتھ ڈرائیور بھی موجود تھا جسے اس سے پہلے بے ہوش کیا گیا تھا۔ ڈرائیور کی تلاش میں اس نے اضطراری طور پر سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ بائیں جانب وہ اسے نظر آ گیا لیکن اس حال میں کہ اسے چھت سے الٹا لٹکایا گیا تھا اور بالائی جسم سے قمیص غائب تھی۔ بغیر قمیص کے بدن کی حالت دیکھ کر شاز مین کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔ اس کا جسم یوں خون خون تھا جیسے کسی کانٹے دار کوڑے سے ادھیڑ کر رکھ دیا گیا ہو۔ زخموں سے رستا خون قطرہ قطرہ کر کے اس کے چہرے کو بھگوتا ہوا نیچے فرش پر اس کے سر کے عین نیچے چھوٹے سے تالاب کی صورت ڈھیر ہو گیا تھا۔ شاز مین اندازہ نہیں کر سکی کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی زخمی ہے یا نہیں۔ وہ تو اس کی حالت دیکھ کر ہی اوسان کھو بیٹھی اور ایک انسان کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر بُری طرح سسک اٹھی۔ ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ غور سے اس ستم ظریف کا جائزہ لے کر یہ اندازہ کر سکتی کہ وہ صرف بے ہوش ہے یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہیلو بے بی! ابھی سے کیوں رو رہی ہو؟ ابھی تو تمہارے ساتھی کی سانسیں باقی ہیں۔'' کمرے میں ایک زہریلی نسوانی آواز گونجی تو اس نے رونا بھول کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی جس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نظروں نظروں میں ہی اسے بھسم کر ڈالنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

''کون ہو تم لوگ اور کیوں ہمیں اغوا کیا ہے اور اس بے چارے کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟'' شازمین نے خوف زدہ رندھی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔

''اوہ نو... دیکھو لڑکی، سوال صرف میں کروں گی جن کے تمہیں صحیح صحیح جواب دینے ہوں گے ورنہ اپنے ساتھی کی طرح تم بھی اسی حال میں لٹکی ہوئی ہو گی۔'' عورت جو کہ سنتھیا تھی، اس کا لہجہ مزید سخت ہو گیا اور اس نے قہر برساتی آواز میں اسے دھمکی دی۔

''آپ مجھ سے پتا نہیں کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ صرف ایک ڈرائیور ہے۔'' شازمین نے مدافعانہ لہجے میں اس سے کہا۔

''اس سے تعلق نہیں ہے لیکن اس شخص سے تو ضرور تعلق ہو گا جس سے ملنے تم اسپتال گئی تھیں۔ مجھے اس شخص کے بارے میں بتاؤ۔'' سنتھیا اس کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ گچھ کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ یہ اسی کی تجویز تھی کہ شازمین کو کسی طرح اغوا کر لیا جائے اور اس سے رنجنی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اب یہ شازمین کی بدقسمتی تھی کہ جس وقت سنتھیا کے ذہن میں یہ تدبیر آئی اسی وقت اس نے جاوید علی سے ملاقات کے لیے اسپتال جانے کا قصد کیا۔ سنتھیا جیسی زیرک عورت کھٹک گئی کہ یہ کون شخص ہے جس سے ملاقات کے لیے شازمین اتنے مخدوش حالات میں دارالامان سے نہ صرف باہر نکلی ہے بلکہ اس شخص کی طرف سے اسے گاڑی بھی بھجوائی گئی ہے۔ چنانچہ اس نے تفتیش کا آغاز رنجنی سے متعلق سوال جواب کرنے کے بجائے اسپتال میں داخل شخص کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے کیا۔

''وہ میرے ایک عزیز ہیں اور میں ان کی عیادت کے لیے گئی تھی۔'' شازمین، جاوید علی کی کسی خفیہ ایجنسی سے وابستگی سے واقف تھی اس لیے فوراً سمجھ گئی کہ اسے اغوا کرنے والے دراصل جاوید علی کے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں اور اسی کی وجہ سے وہ اغوا کی گئی ہے اس لیے بات بنانے کی کوشش کی۔

''تمہارے عزیز کا کیا نام ہے اور وہ کس وجہ سے اسپتال میں داخل ہے؟'' سنتھیا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے اگلا سوال داغا۔

''ان کا نام علی ہے۔ وہ کسی حادثے میں زخمی ہو گئے تھے۔'' شازمین نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور حتی الامکان مناسب جوابات دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہارے یہ علی صاحب کیا کام کرتے ہیں؟''

''وہ بزنس مین ہیں۔'' شازمین نے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔ پے در پے جھوٹ بولتے ہوئے اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔

''کیا بزنس کرتے ہیں وہ؟'' سنتھیا اسے ذرا بھی مہلت دینے کو تیار نہیں تھی۔

''مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم۔ اصل میں ہمارا آپس میں اتنا زیادہ ملنا جلنا نہیں ہے۔'' اس بار وہ روانی سے جھوٹ نہ بول سکی اور اٹک اٹک کر وضاحت دی۔

''بڑی عجیب بات ہے کہ تم نے اپنے جن عزیز سے ملنے کے لیے دارالامان کی وارڈن کو ایک نہایت قیمتی انگوٹھی رشوت میں دے ڈالی، تمہیں اس عزیز کے بارے میں کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں معلوم ہے۔ تمہارا بتایا ہوا نام، پیشہ، حادثے کی نوعیت سب اسپتال کے ریکارڈ سے مختلف ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں تمہیں صحیح سمجھوں یا اسپتال کے ریکارڈ کو؟'' سنتھیا کا لہجہ طنز و تحقیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شازمین کی بولتی بند ہو گئی پھر وہ بڑی ہمت کر کے بولی۔

''صحیح غلط کا مجھے نہیں معلوم۔ میں جو جانتی تھی، وہ آپ کو بتا دیا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری یہ بات مان لیتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ رنجنی کہاں ہے؟'' سنتھیا کا یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ شازمین کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کہیں سامنے بیٹھی عورت کو جاوید علی اور رنجنی کی حقیقت کا علم تو نہیں ہو گیا ہے۔

''تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟'' اسے خاموش پا کر سنتھیا چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ رنجنی کون ہے؟'' شازمین نے ایک بار پھر سنبھالا لینے کی کوشش کی۔

''بڑی جلدی بھول گئیں اپنے عیاش باپ کی دل لگی کے لیے لائے گئے اس حسین خواجہ سرا کو جسے بعد میں تم نے اپنے کمرے میں پناہ دی تھی۔'' سنتھیا کے جواب پر جہاں

شازمین کا چہرہ خفت سے سرخ پڑا، وہاں اسے اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ اس کے سامنے بیٹھی ہستی کی معلومات غضب کی ہیں اور اتنی زبردست معلومات رکھنے والی شخصیت کوئی عام عورت تو ہو نہیں سکتی تھی۔ یقینی طور پر اس کا تعلق انہی لوگوں سے تھا جن کے خلاف جاوید علی اور اس کے ساتھی برسرِپیکار تھے۔

''تمہیں ہر معاملے کی اتنی خبر ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میرے باپ کے پاس رنجنی کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے خواجہ سرا موجود تھے جنہیں یاد رکھنا میں نے کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ نہ ہی مجھے ان میں سے کسی کو اپنے کمرے میں چھپانے کی کوئی ضرورت پڑی تھی۔ کوٹھی پر جو تباہی ہوئی، اس میں دوسرے خواجہ سراؤں کے ساتھ رنجنی بھی مر کھپ گئی ہو گی۔'' شازمین اب تک نرم اور مدافعانہ لہجے میں ہر سوال کا جواب دیتی رہی تھی لیکن باپ کی عیاشی جتلائے جانے پر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''میرے خیال میں تم بھی اپنے ساتھی کی طرح الٹا لٹکے بغیر کچھ نہیں اگلو گی۔ اس نے بھی الٹا لٹک کر کھال اترنے کے بعد ہی تسلیم کیا تھا کہ رنجنی اور وہ شخص جس سے ملنے تم اسپتال گئی تھیں، کسی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ ہیں۔ اب یہ تم بتاؤ گی کہ وہ ایجنسی کون سی ہے اور کس کے ماتحت کام کرتی ہے؟'' سنتھیا نے اپنے قائم کردہ اندازوں کی بنیاد پر اس کے ساتھ بلف کیا، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ڈرائیور کی چمڑی ادھیڑ ڈالنے کے باوجود اس سے کچھ بھی نہیں اگلوا پائی تھی اور اس کے نیم جان زخمی وجود کو محض شازمین پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے وہاں لٹکا رکھا تھا۔ البتہ اس کی غلطی یہ تھی کہ وہ بالکل غلط سمت میں کام کر رہی تھی اور شازمین جیسی غیر متعلق لڑکی کو گھیر لیا تھا جو جاوید علی کے نام اور اس کی کسی خفیہ ایجنسی سے وابستگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ آنے والے لمحات میں اس کی یہ خوش فہمی دھری رہ جانی تھی کہ وہ ایک کمزور لڑکی کے ذریعے زیادہ معلومات حاصل کر سکتی ہے۔

''یقین کرو، میں کچھ نہیں جانتی۔'' شازمین کی نظروں کے سامنے ڈرائیور کا ادھڑا ہوا خون میں لت پت جسم تھا چنانچہ خود بھی اسی تکلیف سے گزرنے کے خیال سے وہ دہشت زدہ سی ہو کر چیخی۔

''تھوڑی دیر میں تم خود ہی فر فر بتانے لگو گی کہ کیا کچھ جانتی ہو۔'' سنتھیا نے سرد مہری سے جواب دیا اور اپنی کرسی کے ہتھے کے ساتھ منسلک ایک بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی کمرے میں ایک قوی الجثہ شخص داخل ہوا اور ہاتھ باندھے سنتھیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''موہن! یہ لڑکی سیدھی طرح سے اپنا منہ کھولنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تم اس سے پوچھو کہ یہ کیا کچھ جانتی ہے۔'' سنتھیا آنے والے سے مخاطب ہوئی۔

''ٹھیک ہے میڈم! میں اسے بھی اس کے ساتھی کے ساتھ لٹکا دیتا ہوں۔ جب جسم سے کھال اترے گی تو سب بولنے لگے گی۔'' وہ فوراً مستعدی سے بولا۔

''ارے او قصاب کی اولاد، تجھے عقل نہیں ہے کہ اتنی خوب صورت لڑکی کے جسم کی کھال نہیں اتاری جاتی بلکہ کچھ اور کیا جاتا ہے۔ دیکھ کتنا خوب صورت کھلونا ہے... جا کھیل اس کے ساتھ اور کھیل کھیل میں سب معلوم کر لے پھر بھی یہ نہ بولے تو توڑ ڈالنا اس چینی کی گڑیا کو۔'' وہ سفاکی کی انتہا پر تھی۔ اس کی بات سن کر شازمین ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کچھ نہیں جانتی۔'' لیکن وہاں موجود نفوس نے اپنے کان مکمل طور پر بند کر رکھے تھے۔ موہن جیسے خبیث مرد کے لیے اگر کمزور چڑیا کی طرح پھڑکتی لڑکی کا واویلا پُرلطف تھا تو سنتھیا اپنی اکلوتی بیٹی کلارا عرف ماریا کی موت کے بعد سراپا انتقام بن گئی تھی۔ اپنے انتقام کی آگ میں جلتی شاید ہر پاکستانی کو موت کے منہ میں دھکیل دینا چاہتی تھی۔ اس کا سفاک جذبۂ انتقام شازمین کی تڑپ سے تسکین پا رہا تھا۔ موہن نے شازمین کے ہاتھ پیر آزاد کرنے کے بعد اسے کپڑوں کی قید سے آزاد کیا تو وہ یہ سارا منظر اتنے اطمینان سے دیکھتی رہی جیسے ٹی وی اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہی ہو۔

''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ رنجنی، شالنی کے پیچھے لگ کر ہماری کوٹھی تک پہنچی تھی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رنجنی کوئی خواجہ سرا نہیں بلکہ مرد ہے جو کسی خفیہ ادارے کے لیے کام کرتا ہے۔ اس ادارے کا نام پتا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ اسپتال میں داخل علی اور رنجنی ایک ہی شخصیت ہیں۔'' اگر شازمین کو چھت سے الٹا لٹکا کر اس کی کھال اتار دی جاتی تو شاید وہ اپنی زبان نہ کھولتی لیکن ہر باعصمت لڑکی کی طرح اپنی عزت داؤ پر لگتے دیکھ کر اس نے آخری کوشش کے طور پر سچائی ظاہر کر دی۔

''گڈ، اچھی امپروومنٹ ہے۔ تم اپنی آگے کی کارروائی کرو یہ ابھی آگے اور بولے گی۔'' سنتھیا نے موہن کو مزید شہ دی اور وہ جانور بالکل آپے سے باہر ہو گیا۔ منحوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس نے نازک اندام شاز مین کا وہ حشر کرڈالا کہ اس میں چیخنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ سنتھیا کو گڑیا سی اس لڑکی کے ٹوٹ پھوٹ جانے پر کوئی افسوس نہیں تھا لیکن وہ اس بات پر غصے سے کھول رہی تھی کہ اتنا سب ہو جانے کے باوجود شاز مین سے اپنی پسند کی معلومات حاصل نہیں کر سکی تھی۔

"گلا گھونٹ کر اسے اور اس کے ساتھی کو کہیں لے جا کر پھینک دو۔" اس نے ایک نفرت بھری نظر شاز مین کے نیم جان وجود پر ڈالی اور یوں حکم صادر کیا جیسے انسانوں کو نہیں طاعون زدہ چوہوں کو پھینکنے کی بات کر رہی ہو۔ حقیقتاً وہ مسلمانوں کو سمجھتی بھی یہی تھی۔ مسلمانوں سے خون میں رچی ہوئی نفرت نے بیٹی کے انتقام کے ساتھ مل کر اسے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے اندر کی آگ میں سب کچھ جلا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

شاز مین کا اغوا بہت دیر تک جاوید علی سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ شاز مین کو دارالامان ڈراپ کرنے کے بعد ڈرائیور نے جب وقت پر رپورٹ نہیں کی تو اس نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے دارالامان فون کیا تو وہاں سے معلوم ہوا کہ شاز مین واپس نہیں پہنچی ہے۔ تشویش زدہ ہو کر اس نے فوراً کراچی یونٹ کے انچارج کو اطلاع دی اور اس نے اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر فوراً ہی محکمے کی کار کو ایک پارکنگ میں خالی کھڑا دریافت کروالیا۔ خالی گاڑی نے شاز مین کے ڈرائیور سمیت اغوا کو کنفرم کر دیا۔ صورتِ حال سامنے آتے ہی کراچی یونٹ کا انچارج ایکٹو ہو گیا۔ اس نے ایک طرف شاز مین اور ڈرائیور کے اغوا کاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ٹیم ترتیب دی تو دوسری طرف جاوید علی کے تحفظ کے لیے بھی سرگرمی دکھائی۔

"میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کے ذریعے دشمن کسی طرح تمہاری راہ پر لگ گئے ہیں اس لیے میں تمہیں فوری طور پر اس اسپتال سے شفٹ کروا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں کسی نہ کسی طور تمہاری نگرانی ہو رہی ہو گی اور موقع پاتے ہی وہ لوگ تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔" اس نے شاز مین کی طرف سے سخت تشویش میں مبتلا جاوید علی سے کہا تو اس کا بہت شدت سے دل چاہا کہ وہ انچارج سے کہے کہ وہ اس کی فکر کرنے کے بجائے پہلے شاز مین کو بازیافت کروانے کی کوشش کرے لیکن کہہ نہ سکا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ فورس کے ڈسپلن میں اس قسم کی جذباتیت کی کوئی گنجائش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہے۔ شاز مین کے لیے جو کچھ کرنا ممکن ہو گا، وہ اس کے کہے بغیر بھی کیا جا رہا ہو گا اور اسے صرف اس پر عمل کرنا ہو گا جو اس سے کہا جا رہا تھا۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ زخموں سے چور ابھی تک گلوکوز اور دواؤں پر ڈپینڈ کر رہا تھا اور کسی صورت بستر سے اتر کر شاز مین کی تلاش کے لیے نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ تن بہ تقدیر رہ کر خاموش تماشائی بنے رہنے پر مجبور تھا۔

"مسٹر فیاض! آپ کے پاؤں کے فریکچر کے بارے میں ہمارا اندازہ ہے کہ یہ عام پلاستر سے ٹھیک نہیں ہو گا اور ہمیں اسے آپریٹ کرنا پڑے گا اس لیے ہم نے وقت ضائع کرنے کے بجائے فوری طور پر آپریشن کا فیصلہ کیا ہے۔ کچھ دیر میں آپ کو یہاں سے اوٹی میں شفٹ کر دیا جائے گا۔" ابھی انچارج سے گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ اس کا ڈاکٹر کمرے میں نازل ہو گیا اور اسے اس نام سے مخاطب کرتے ہوئے جو کہ اسپتال کے ریکارڈ میں درج تھا، مطلع کیا۔ جاوید علی کے پاس اس اطلاع پر "یس" کہنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ڈاکٹر کے بتائے بغیر بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اسے اسپتال سے نکال لے جانے کی کوئی ترکیب تھی۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی اس کے کمرے میں دو میل نرس آ گئے جنہوں نے اسے آپریشن کے لیے مخصوص لباس تبدیل کروا کر اسٹریچر پر شفٹ کر دیا اور پھر اسے اس کے کمرے سے نکال کر آپریشن تھیٹر کی طرف چل پڑے۔

"آپریشن کے دوران ایک صاحب کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ ان کی ڈیڈ باڈی گھر بھجوانے کے بہانے ہم آپ کو یہاں سے دوسری جگہ شفٹ کر دیں گے۔" اندر پہنچ کر دونوں میل نرسوں میں سے ایک نے اسے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ دیر میں اسے کسی مردے کی طرح سفید چادر سے سر سے پیر تک ڈھانپ کر آپریشن تھیٹر سے باہر لے جایا گیا۔

"ڈیڈی۔" سفید چادر کے نیچے دم سادھے لیٹے اسے کسی لڑکی کے زور سے رونے کی آواز سنائی دی اور یوں لگا کہ وہ اس کے اسٹریچر کے بالکل قریب آ کھڑی ہوئی ہو۔

"بی بی! ڈاکٹر نے آپ کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ آپ کے والد کی باڈی میں خطرناک قسم کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں جو چھونے پر کسی دوسرے شخص کو بھی لگ سکتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کی بات یاد رکھ کر ان سے دور رہیں اور ہمیں اپنی کارروائی کرنے دیں تاکہ ہم ان کی ڈیڈ باڈی کو محفوظ طریقے سے آپ کے گھر تک پہنچا سکیں۔" اس کے اسٹریچر کے ساتھ مسلسل موجود میل نرسوں میں سے ایک نے لڑکی کو سخت آواز

میں جھڑکا تو اس کا کوئی مرد عزیز اس کے قریب چلا آیا اور اسے سمجھا بجھا کر اسٹریچر سے دور لے گیا۔ جاوید علی کا اسٹریچر ایک بار پھر حرکت میں آ گیا لیکن وہ لڑکی کی سسکیاں اب بھی سن رہا تھا اور اسے شاز مین یاد آ رہی تھی۔ بہت زیادہ دیر تو نہیں گزری تھی جب وہ اس کے قریب بیٹھی اس کے زخمی وجود کو دیکھ کر بری طرح سسک رہی تھی۔ اس کے رونے پر جاوید علی نے اپنے دل میں شدید تکلیف محسوس کی تھی اور یہ وہ خود ہی جانتا تھا کہ جس کا رونا بھی اس کے لیے سخت تکلیف دہ تھا، وہ اغوا ہو کر یقینی طور پر دشمنوں کی تحویل میں چلی گئی تھی تو اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ اس کا ایک ایک پل یہ سوچتے ہوئے گزر رہا تھا کہ وہاں اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا جا رہا ہو گا اور وہ کیسے ان حالات سے نمٹ رہی ہو گی۔ اسے سخت افسوس تھا کہ شاز مین جیسی دکھی لڑکی جس نے اپنے بچپن سے لے کر نوجوانی تک کا عرصہ اپنے باپ کی عجیب و غریب نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے تکلیف میں گزارا تھا، محبت کے دریا میں اترتے ہی گرداب میں پھنس گئی تھی اور اس کا سبب یقیناً جاوید علی کی ذات تھی۔ ابھی تک حقائق کھل کر سامنے نہ آنے کے باوجود وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ شاز مین کو اسی کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے اور دشمن ایک کمزور لڑکی کے سہارے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کمزور سی لڑکی جو اسے بہت عزیز ہو چلی تھی، دشمن کی قید میں تھی اور وہ خود کسی محفوظ جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس بات کا اس کے ذہن پر بہت بوجھ تھا اور سفید چادر تلے لیٹے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ کوئی لاش ہو جس سے عمل کی طاقت چھین لی گئی تھی۔

بے بسی کے اس عالم میں کب اسے ایمبولینس میں ڈال کر مقررہ جگہ پر پہنچا دیا گیا، پتا ہی نہیں چلا۔ اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے میل نرس یہاں بھی موجود تھے جنہوں نے اسے ایک کمرے میں آرام دہ بستر پر منتقل کر دینے کے بعد ڈرپ وغیرہ لگانا شروع کر دی۔ آپریشن تھیٹر سے اسے ایک مردے کی طرح باہر نکالنے کی غرض سے اسے ان چیزوں سے آزاد کر دینا پڑا تھا لیکن اسے ابھی ان کی ضرورت تھی۔ گلوکوز کے ساتھ اسے زخم جلد ٹھیک کرنے کے لیے اینٹی بائیوٹک ادویات وغیرہ بھی شامل کر کے دی جا رہی تھیں۔ اس لیے ایک سوئی کا ہمہ وقت اس کے جسم میں چبھا رہنا ضروری تھا۔

"یہ جگہ اسپتال نہیں بلکہ سی ایف پی کا ایک ٹھکانا ہے۔ ہم دونوں سی ایف پی کے ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرس بھی ہیں اس لیے ہمیں اسپتال میں آپ کی سیکیورٹی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ہم دونوں آپ کی دیکھ بھال کریں گے اور بارہ بارہ گھنٹے کے حساب سے ڈیوٹی دیں گے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت محسوس ہو، ہم میں سے ڈیوٹی پر موجود شخص کو بلاجھجک آگاہ کر دیجیے گا۔ ہمیں اوپر سے آپ کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔" اب تک خاموش رہنے والے میل نرس نے کام سے فارغ ہو کر اس سے کہا۔

"شکریہ، میں بتا دوں گا۔ البتہ تم میں سے اگر کسی کو شاز مین کی بازیابی کے سلسلے میں ہونے والی کارروائیوں کا علم ہو تو کچھ تفصیل مجھے بھی بتا دو۔" اس نے درخواست کی۔

"سوری سر! ہم اسپتال میں مصروف تھے اس لیے ہمیں کچھ پتا نہیں چلا، البتہ شنید ہے کہ انچارج صاحب یہیں موجود ہیں اور آپ سے ملاقات بھی کریں گے۔" میل نرس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اب اسے یہاں لیٹ کر انچارج کا انتظار کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے انتظار کی یہ گھڑیاں زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئیں اور آدھے گھنٹے میں ہی انچارج اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" کسی اور موضوع کو چھیڑنے سے پہلے اس نے مزاج پرسی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"فائن۔" جاوید علی نے یک لفظی جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے اور تمہیں مکمل آرام کے ساتھ ساتھ بہترین علاج کی بھی ضرورت ہے لیکن سیکیورٹی رسک کی وجہ سے میں نے تمہیں کسی دوسرے اسپتال شفٹ کروانے کے بجائے یہاں بلوا لیا ہے۔ یہاں تمہارے آرام اور علاج کا پورا خیال رکھا جائے گا۔"

"شکریہ سر۔" جاوید علی نے اس بار بھی سنجیدگی سے مختصر جواب دیا۔

"اس لڑکی شاز مین کی گمشدگی کے بارے میں ہمیں کچھ اہم کلیوز ملے ہیں۔ ہم نے اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کہیں نواب نوازش علی کی کوئی ذاتی دشمنی کی وجہ سے اس کی بیٹی کو اغوا نہ کیا گیا ہو، شاز مین کی والدہ سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ایسی کسی دشمنی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن اتفاق سے عین اس موقع پر انہوں نے ہمارے آدمی کے ساتھ موجود دارالامان کی وارڈن کی انگلی میں موجود شاز مین کی انگوٹھی کو پہچان لیا اور وارڈن سے بازپرس کرنے لگیں کہ ان کی بیٹی کی انگوٹھی اس کے پاس کیسے آئی۔ وارڈن نے بیگم نوازش علی کو تو ٹال دیا لیکن ہمارا بندہ اس کے سر ہو گیا جس کے سامنے اس نے اعتراف کیا کہ اس

نے شازمین کو دارالامان سے باہر جانے کی اجازت دینے کے لیے انگوٹھی بطور رشوت لی تھی۔ اس اعتراف کے بعد اس لالچی عورت کے ساتھ مزید سختی سے باز پرس کی گئی جس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ کسی اجنبی نے اسے بھاری رقم کے عوض شازمین کی نقل و حرکت اور ٹیلی فونک گفتگو سے آگاہ رکھنے کی ذمے داری سونپی تھی۔ وارڈن کو یہ اطلاع ایک موبائل نمبر پر دینی تھی سو جیسے ہی شازمین کا اسپتال جانے کا پروگرام طے پایا، اس نے موبائل پر اطلاع دے دی۔ وارڈن سے ملنے والے موبائل نمبر کی ہم نے جانچ پڑتال کروالی ہے۔ وہ جعلی کاغذات کی مدد سے حاصل کی گئی ایک سم کا نمبر ہے جسے اب بند کردیا گیا ہے اس لیے ہم اس نمبر کے ذریعے مجرموں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔ البتہ اسپتال سے دارالامان تک کے روٹ کا جائزہ لے کر اس بات کا تعین کرلیا گیا ہے کہ کس جگہ گاڑی روک کر ان دونوں کو اغوا کیا گیا ہوگا۔ اس سڑک سے ہمیں گولیوں کے خول ملنے کے علاوہ سڑک کے دونوں جانب کچے راستے پر ایسے نشانات ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ وہاں موجود تھے اور یقینی طور پر وہ اغوا کار ہی تھے جنہوں نے پہلے سے گھات لگا کر ایک ویران سڑک پر اپنی کارروائی کی تھی۔''

انچارج اسے تفصیلات سے آگاہ کررہا تھا اور اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی کہ کس طرح اس کامنی سی لڑکی کو تلاش کرے جو پہلا پیار بن کر بہت مختصر عرصے میں اس کے دل پر چھا گئی تھی۔ صورتِ حال قدرے غیر واضح ہونے کے باوجود اسے یقین تھا کہ شازمین پر جو کچھ گزری، اسی کی وجہ سے گزری ہے۔ وہ کسی ذاتی دشمنی یا عام مجرمانہ کارروائی کے بجائے اس وجہ سے مصیبت میں پھنسی ہے کہ اس کا جاوید علی سے تعلق بنتا تھا۔ اس جاوید علی سے جس نے رنجنی کے روپ میں را کا ایک خفیہ ٹھکانا ختم کروانے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے ہاتھوں ..... اسلحے کا ایک بڑا ذخیرہ تباہ کردینے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ اپنے انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ انچارج کے ہاتھ میں موجود موبائل سیٹ گنگنا اٹھا۔ انچارج نے کال وصول کی تو اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی کی تہ مزید دبیز ہوگئی۔

''میں آرہا ہوں۔'' کال سن کر اس نے یہ مختصر جواب دیا اور جاوید علی کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی پر موجود میل نرس ایک وھیل چیئر لیے اندر داخل ہوا۔

''سر آپ کو دوسرے کمرے میں بلوا رہے ہیں۔'' میل نرس نے اسے اطلاع دی اور وھیل چیئر پر منتقل ہونے میں مدد دینے لگا۔ جاوید علی کا دل اس صورتِ حال پر بری طرح تشویش میں گھر گیا۔ یہ بلاوا بہت غیر معمولی تھا۔ کچھ دیر قبل ہی تو انچارج اس کی حالت کے پیش نظر خود اس سے مل کر گیا تھا پھر اچانک ہی کیا ہوگیا تھا کہ اس کا وہاں سے بلاوا آگیا تھا؟ میل نرس وھیل چیئر کو دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو بھی تشویش سے اس کا برا حال تھا۔ اسی پریشانی اور الجھی ہوئی کیفیت میں اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں انچارج کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف رخ کیے بیٹھا تھا جہاں کسی اسپتال کے کمرے کا منظر نظر آرہا تھا لیکن اس منظر میں موجود انسانوں کے چہرے واضح نہیں تھے۔

''آؤ جاوید! میں نے تمہیں ایک اہم ضرورت کی وجہ سے تکلیف دی ہے ورنہ مجھے تمہاری کنڈیشن کا اچھی طرح اندازہ ہے۔'' اس کے وہاں پہنچنے پر انچارج اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''میں سمجھتا ہوں سر!'' جاوید علی نے سنجیدگی سے اسے جواب دے کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا جس پر چھائی سنجیدگی کی تہ معمول سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

''جس اسپتال میں تم ایڈمٹ تھے وہاں ہمارے آدمی کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہے تھے جس پر یہ شک ہو کہ وہ تمہاری نگرانی کررہا تھا۔ اس کام کے دوران اتفاق سے ان کی توجہ پولیس کے لائے ہوئے ایک جوڑے کی طرف چلی گئی جس میں سے مرد مرچکا تھا اور لاش کی حالت دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ اس پر بے تحاشا تشدد کیا گیا ہے۔ اس مرد کو شناخت کرلیا گیا، وہ وہی ڈرائیور تھا جسے شازمین کو دارالامان پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی اس لیے خیال کیا گیا کہ اس کے ساتھ موجود لڑکی شازمین ہی ہوسکتی ہے۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن مارنے والے سے شاید اندازے کی غلطی ہوگئی اور وہ اسے نیم مردہ حالت میں ایک میدان میں پھینک کر بھاگ گئے۔ ہمارے آدمی کی لاش کے ساتھ اسے میدان میں کرکٹ کھیلنے والے بچوں نے دریافت کیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہے اور فی الحال ڈاکٹرز کہنے سے قاصر ہیں کہ اس کی زندگی بچ سکے گی یا نہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے یہاں بلایا ہے کہ تم دیکھ کر شناخت کرلو کہ ملنے والی لڑکی شازمین ہی ہے یا نہیں۔'' انچارج نے بدستور سنجیدہ رہتے ہوئے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا اور دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کی پیڈ پر چند بٹن دبائے۔ اس بار مانیٹر پر

اسپتال کے کمرے میں موجود دیگر افراد کو چھوڑ کر صرف ایک چہرہ واضح ہوگیا جسے جاوید علی آکسیجن ماسک کی موجودگی کے باوجود شناخت کرسکتا تھا۔ وہ شازمین ہی تھی لیکن اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کسی قدر ناشناس نے قدرت کے بنائے اس حسین شاہکار کو بری طرح برباد کرکے رکھ دیا ہو۔

''یہ شازمین ہی ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں تکلیف کے شدید احساس کے ساتھ بمشکل تصدیق کی۔

''اوہ.....'' انچارج کے ہونٹوں نے سکڑ کر نیم دائرہ بنایا۔ ''بے چاری کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ اسے بری طرح زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹرز کا یہ بھی خیال ہے کہ گلا گھونٹنے کے لیے اس کی گردن پر جتنا شدید دباؤ ڈالا گیا ہے، اس سے شاید اس کی قوت گویائی بھی متاثر ہوئی ہو۔ بہرحال، فی الحال تو وہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کررہے ہیں، باقی معاملات اس کے ہوش میں آنے کے بعد واضح ہوں گے۔'' انچارج نے اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بٹن دبا کر مانیٹر کی اسکرین پر موجود شازمین کے چہرے کو غائب کردیا لیکن شازمین کا بے بس اور مظلوم چہرہ جاوید علی کے ذہن کی اسکرین پر ثبت ہوکر رہ گیا تھا اور اس کے جسم میں بیک وقت رنج و طیش کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''تم نے تیاری کرلی ہے پانڈے؟''

''ہاں، ہمارے آدمیوں نے مینارِ پاکستان کے پاس طے شدہ مقام کے اردگرد پوزیشنز سنبھال لی ہیں اور پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہیں کہ وکرم وہاں کس طریقے سے آتا ہے۔ باقی کا کام بھی وقت پر پورا ہوجائے گا۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ اس کی مخاطب سنتھیا جوزف تھی جسے اوپر سے آنے والے حکم کی وجہ سے فوری طور پر لاہور سے کراچی جانا پڑا تھا۔ کراچی میں اس سے کیا خاص کام لیا جانا تھا، یہ ابھی نہیں بتایا گیا تھا البتہ وہ وہاں جاتے ہی شازمین والے معاملے میں الجھ گئی تھی۔

''وکرم سے ملاقات کے لیے تم نے کسی ڈھنگ کے آدمی کا انتخاب کیا ہے نا؟ میں ہوتی تو خود یہ کام نمٹا دیتی لیکن اب فکر ہے کہ کوئی دوسرا صحیح سے کام کر بھی سکے گا یا نہیں۔'' اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ڈونٹ وری، تمہارے بعد اس کام کے لیے میں خود جاؤں گا۔'' پانڈے نے اسے تسلی دی اور پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''تم سناؤ، وہاں کیا حالات ہیں؟''

''یہاں حالات ابھی تک آؤٹ آف کنٹرول ہیں۔ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر ہونے والے ریڈ کے سلسلے میں انکوائری چل رہی ہے۔ نواب کی بیٹی اور اس کے ساتھ موجود ڈرائیور کو اغوا کرنے کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ ڈرائیور کوئی بے انتہا مضبوط اعصاب کا تربیت یافتہ شخص تھا جس نے اپنی جان دے دی لیکن منہ سے کچھ اگلا نہیں۔ البتہ شازمین نے اتنا اعتراف ضرور کیا کہ کوٹھی پر ہونے والی تباہی اور اس سے پہلے ہماری اسلحے کی ڈیل پکڑے جانے میں رنجنی نامی اسی خواجہ سرا کا ہاتھ تھا جس پر پہلے ہی ہم شک کررہے تھے۔ وہ دراصل کسی خفیہ ایجنسی کا بندہ تھا جو خواجہ سرا کا بہروپ بدل کر نواب کی کوٹھی میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ہم شازمین کا پیچھا کرتے ہوئے اسپتال میں ایڈمٹ جس بندے تک پہنچے تھے، وہ وہی تھا لیکن ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے شازمین کو اغوا کرکے اسے ہوشیار کردیا اور اس کے ساتھی بہت چالاکی سے اسے اسپتال سے نکال لے گئے۔ شازمین بھی ہمیں انہی چند باتوں کے سوا کچھ نہیں بتا سکی۔ اس اعتبار سے ہماری ساری بھاگ دوڑ بیکار گئی۔'' سنتھیا نے اسے حالات سے آگاہ کیا۔

''ویری بیڈ..... ایسا لگتا ہے کہ ہمارا اس بار کچھ تیز لوگوں سے پالا پڑ گیا ہے اس لیے ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' پانڈے نے تبصرہ کیا۔

''شاید ایسا ہی ہے اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری طرف کے کام میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔''

''ڈونٹ یو وری۔ ہم بہت محتاط ہیں۔ کسی گڑبڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' پانڈے نے اسے ایک بار پھر تسلی دے کر سلسلہ منقطع کردیا اور گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ وکرم سے طے کیا گیا وقت قریب آتا جارہا تھا۔

''کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے مینارِ پاکستان کے اردگرد مقرر کیے گئے اپنے ماتحتوں میں سے ایک سے رابطہ کیا۔

''سب کچھ معمول کے مطابق نظر آرہا ہے اور ابھی تک کوئی مشکوک شخص ہماری نظروں میں نہیں آسکا ہے۔'' ادھر سے جواب ملا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ پوری طرح ہوشیار رہنا۔ ذرا سی غلطی ہمارے لیے ناکامی بن جائے گی۔'' اس نے سخت لہجے میں ہدایت دی۔

''ہم ہوشیار ہیں سر۔'' اسے ویسی ہی تسلی دی گئی جو وہ اب تک سنتھیا کو دیتا رہا تھا۔ اس بار اس نے کچھ بھی کہے بغیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رابطہ منقطع کر دیا اور خود اپنے دفتر سے اٹھ کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہاں چست جینز اور سلیولیس ٹاپ میں ایک اسمارٹ سی لڑکی موجود تھی۔ لڑکی کے بال سرخی مائل بھورے تھے جنہیں پونی ٹیل کی شکل میں باندھا گیا تھا۔ گردن کی جنبش سے دائیں بائیں ہلتی پونی ٹیل اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ پانڈے کو دیکھ کر اس نے ذرا مؤدبانہ انداز میں اس کا استقبال کیا۔

''تمہاری تیاری مکمل ہے سنیتا؟''

''یس سر! میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے پانڈے کو مؤدبانہ انداز میں ایک اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ سیدھا اس کرسی پر جا بیٹھا۔ کرسی کے سامنے ایک بہت بڑا دیوار گیر آئینہ لگا ہوا تھا جس میں پانڈے اپنے عکس کا بہت بھرپور طریقے سے جائزہ لے سکتا تھا۔

''اسٹارٹ کروں سر؟'' اس کے بیٹھتے ہی سنیتا نے پوچھا۔

''شیور، اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' آئینے میں نظر آتے سنیتا کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے اجازت دی تو اس کے ہاتھ فوراً حرکت میں آگئے۔ پارلر کے انداز میں سیٹ کیے گئے اس کمرے میں وہ تمام جملہ لوازمات موجود تھے جو سنیتا کو پانڈے کی منشا کے مطابق .... ڈھالنے کے لیے درکار تھے۔ سنیتا ایک نہایت مشاق میک اپ آرٹسٹ تھی جسے کسی بھی شخص کا روپ بدل ڈالنے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ پانڈے نے اس کے اس ہنر کو کئی بار آزمایا تھا، اس کے باوجود ہر بار اسے داد دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اب بھی سنیتا کے تیزی سے چلتے ہاتھوں کے ساتھ اپنے حلیے میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں اسے سنیتا کو سراہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ سنیتا کے ہنر کے نتیجے میں وہ بہت تیزی سے ایک سوبر اور ویل آف شخص کے بجائے مفلوک الحال بھکاری کے روپ میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

''اب آپ ڈریس چینج کر لیں سر تاکہ میں فائنل ٹچ دے سکوں۔'' خاموشی سے اپنا کام انجام دیتی سنیتا نے اس سے کہا تو وہ ملحقہ واش روم میں گھس گیا جہاں اس کا مطلوبہ لباس پہلے ہی موجود تھا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے کمرے میں واپس آکر آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو اسے وہاں اصل پانڈے کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔ البتہ سنیتا کو ابھی اپنے ہنر کا کچھ جادو دکھانا باقی تھا سو وہ ایک بار پھر اس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

''آپ دیکھ لیں سر! کہیں کوئی کمی تو محسوس نہیں ہو رہی؟'' ہاتھوں کو روکنے کے بعد اس نے گھوم پھر کر ہر طرف سے پانڈے کا جائزہ لیا اور پھر اس سے مخاطب ہوئی۔ پانڈے جو مسلسل آئینے کی طرف ہی متوجہ تھا، بے ساختہ بول اٹھا۔

''پرفیکٹ اینڈ امیزنگ سنیتا۔ اس سمے تو میں بھی وشواس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آئینے میں جو شخص نظر آرہا ہے، وہ میں ہوں۔''

''تھینک یو سر۔'' سنیتا اس تعریف پر کھل اٹھی۔ پانڈے کی تعریف اس کے لیے اس لیے بھی خوشی کا باعث تھی کہ جب وہ اوپر والوں کو اپنے ماتحتوں کی پرفارمنس رپورٹ بھجواتا تو اس کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال کرتا اور ان الفاظ کی بدولت اسے ملنے والی مراعات میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

''میں چلتا ہوں۔ تم پرارتھنا کرنا کہ ہم کامیاب رہیں۔'' پانڈے اس سے کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے کچھ اور ضروری تیاریاں کیں اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس دوران میں اس نے وقت کا پورا خیال رکھا تھا اور مطمئن تھا کہ وہ لیٹ نہیں ہو گا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈرائیور نے اسے مینار پاکستان سے کافی فاصلے پر اتار دیا۔ یہاں سے اسے پیدل مقررہ مقام تک کا سفر کرنا تھا۔ وہ بھی بیساکھی کے سہارے۔ وہ بخوبی اس مرحلے سے گزر گیا۔ راستے میں مینار پاکستان پر ڈیوٹی دینے والے نے اس سے رابطہ کیا۔

''وکرم پہنچ گیا ہے سر اور بالکل اکیلا ہے۔ جس گاڑی میں آیا ہے، اسے بھی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔''

''اس کی گاڑی کے آگے پیچھے تم نے کوئی دوسری مشکوک گاڑی دیکھی؟'' اس نے بڑبڑانے کے انداز میں سوال کیا۔ وہ جس ڈیوائس پر اپنے ساتھیوں سے رابطے میں تھا، وہ اتنی مختصر تھی کہ دور سے دیکھنے پر تو کیا، قریب سے جائزہ لینے پر بھی اس کے نظر میں آجانے کا امکان نہیں تھا۔

''یہاں گاڑیوں کی مسلسل آمد و رفت جاری ہے اس لیے وشواس سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن پھر بھی ہم نے ہر طرف نظر رکھی ہوئی ہے اور ابھی تک ہمیں ایسی کوئی گاڑی یا آدمی نظر نہیں آیا ہے جس پر شک کیا جا سکے۔'' جو جواب ملا، وہ الجھا دینے والا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید وکرم کے بارے میں اس کے شکوک و شبہات غلط ہیں اور وہ واقعی ابھی تک کسی کی نظروں میں نہیں آیا ہے اور اپنے بیان

کے مطابق صرف احتیاط کے پیش نظر بیک گراؤنڈ میں چلا گیا ہے۔ جو بھی سچ تھا، بہرحال آزمانا تو تھا۔ اپنے آدمی سے رابطہ منقطع کر کے وہ آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں کئی جگہ اس نے کسی پیشہ ور بھکاری کی طرح مختلف لوگوں سے بھیک بھی مانگی۔ بالآخر وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا جہاں وکرم فوراً ہی اس کی نظر میں آگیا لیکن اس نے براہ راست اس کے قریب جانے کے بجائے آس پاس موجود کئی دوسرے افراد کے آگے ہاتھ پھیلا کر ان سے بھیک مانگی۔ ان افراد میں سے کچھ نے اسے بھیک دی اور کچھ نے ''معاف کرو بابا'' کہہ کر ٹال دیا۔ مختلف افراد سے بھیک طلب کرتا ہوا بالآخر وہ وکرم کے قریب جا پہنچا اور صدا لگاتے ہوئے اپنا کشکول اس کے سامنے کر دیا۔ وکرم جو بیزاری سے اسے ٹالنے والا تھا، یک دم چونک گیا۔ کشکول کی تہ میں ایک ایسا نشان نظر آرہا تھا جس نے ظاہر کر دیا کہ اس کے سامنے موجود شخص کا تعلق را سے ہے۔

''خطرہ۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے بھیک مانگنے والے کو دھتکار رہا ہو۔

''بھیک نہیں دینا تو نہ دو صاحب... گالی کیوں دے رہے ہو۔'' پانڈے نے بلند آواز میں کہا اور وکرم کو بازو سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ آگے کی طرف چلتے ہوئے بھی اس کی یہ آواز بلند بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

''گالی دیتا ہے۔ فقیر بابا کو گالی دیتا ہے۔ چار پیسے جیب میں رکھ کر خود کو خدا سمجھتا ہے۔ ایسے گھمنڈی کو خدا دو دن میں کنگال کر دے گا۔'' ارد گرد موجود راہ گیروں اور تفریح کے لیے آئے ہوئے لوگوں نے اس کے یہ الفاظ سنے، کچھ نے ملامتی نظروں سے وکرم کو دیکھا لیکن کسی نے اس قصے میں مداخلت بہرحال نہیں کی۔ پانڈے بڑبڑاتا اور چند ایک مزید افراد سے بھیک مانگتا ہوا بڑی ہوشیاری سے منظر سے غائب ہو گیا۔ اس بار اس نے پہلے کی طرح طویل فاصلہ طے نہیں کیا تھا بلکہ اس کا ڈرائیور گاڑی سمیت قریب ترین محفوظ مقام پر موجود تھا جہاں سے اس نے پانڈے کو پک کرنے کے بعد گاڑی کو فوراً ہی دوڑا دیا۔

''ایسے تمام افراد کو دھیان میں رکھنا جو وکرم کو اٹھانے اور اسپتال لے جانے کے لیے آگے بڑھیں۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے نئی ہدایات جاری کرنا شروع کر دیں۔ وکرم کی زبان سے خطرے کا لفظ سنتے ہی پہلے سے طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق اس نے بہانے سے وکرم کے بازو میں زہر میں ڈوبی ہوئی سوئی کی نوک چبھو دی تھی۔ یہ ایک ایسا زہر تھا جو کم مقدار میں بھی بھرپور کام دکھاتا تھا لیکن اس کا اثر ظاہر ہونے میں تین چار منٹ لگ جاتے تھے۔ تین چار منٹ کی یہ مہلت اس کے موقع سے فرار ہو جانے کے لیے کافی تھی اور اب وہ اپنی بچھائی ہوئی بساط پر باقی ماندہ چالیں چلنے میں مصروف تھا۔ اس نے اور سنتھیا نے مل کر جو منصوبہ ترتیب دیا تھا، اس میں یہی طے پایا تھا کہ اگر وکرم زیر نگرانی محسوس ہوا تو اس کی بلی چڑھا کر ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی جو اب تک انہیں بے حساب نقصان پہنچا چکے تھے۔ انہیں جاننا تھا کہ یہ افراد کون تھے کیونکہ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ ان افراد تک نہیں پہنچ سکے تھے جن کی وجہ سے انہیں نقصان پہنچ رہا تھا اور وہ اپنے طور پر پر یقین تھے کہ ان افراد کا تعلق پاکستان کی کسی جانی پہچانی خفیہ ایجنسی سے نہیں ہے، ورنہ اب تک انہیں کوئی نہ کوئی کلیو ضرور مل چکا ہوتا۔

''ہم نے نظر رکھی ہوئی ہے سر! وکرم کے گرنے کے بعد کئی افراد اس کی طرف بڑھے تھے لیکن ان میں سے صرف دو ایسے ہیں جو اسے ٹیکسی میں ڈال کر شاید اسپتال لے گئے ہیں۔ اس ٹیکسی کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ وہاں سے جو بھی رپورٹ ملی، آپ تک پہنچا دی جائے گی۔'' اسے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا گیا۔

''وہاں کسی نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟'' پانڈے نے ایک اور اہم سوال کیا۔

''نو سر! ہم نے اس طرف خاص نظر رکھی ہوئی تھی۔ کسی نے بھی آپ کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' یہ جواب پانڈے کے لیے خاصا اطمینان بخش تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر لگا لیا۔ اب امید ہو چلی تھی کہ وکرم کی بلی دے کر وہ اپنے دشمن تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

☆☆☆

سی ایف پی کے اہلکاروں نے نہایت مشاقی سے مینارِ پاکستان کے ارد گرد پوزیشنز سنبھال رکھی تھیں۔ وہ تعداد میں کل چار تھے جن میں سے دو ایک... گاڑی میں جبکہ دو الگ الگ سواریوں پر وہاں پہنچے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ وہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے ہوں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھ دوربین اور کیمرا وغیرہ بھی لے رکھا تھا اور بظاہر وکرم سے بالکل بے نیاز وہاں گھوم رہے تھے۔ ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ہو سکتا ہے وکرم کو بلوانے والے نے اس بات کا اہتمام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رکھا ہو کہ اس کی نگرانی کو چیک کیا جا سکے اس لیے انہوں نے بھی اسی حساب سے اپنی منصوبہ بندی کی تھی۔ وکرم کو گاڑی میں تنہا بھیجنا بھی اسی احتیاط کے سبب تھا۔ البتہ اسے وہاں بھیجتے ہوئے یہ باور کروا دیا گیا تھا کہ گاڑی بگڈ ہے اور اس نے طے شدہ روٹ سے ذرا بھی دائیں بائیں ہونے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔

قید کے دنوں میں وکرم کو جس بے پناہ ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حکم سے روگردانی کرنے کی جرأت کرتا چنانچہ وہ سیدھا طے شدہ جگہ پر جا پہنچا۔ راوالوں کی طرح سی ایف پی کے اہلکار بھی اردگرد پر نظر رکھے ہوئے تھے لیکن ان کی نظریں کسی مشکوک شخص تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ وہ بھکاری کے حلیے میں موجود پانڈے پر بھی شک نہیں کر سکے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وکرم تک پہنچنے سے قبل پانڈے نے جن افراد سے بھیک مانگی تھی، ان میں سی ایف پی کا اہلکار بھی شامل تھا۔ پانڈے کا میک اپ کچھ اس مہارت سے کیا گیا تھا کہ اسے شک بھی نہیں گزرا کہ وہ بھکاری را کا ایجنٹ ہو سکتا ہے۔ بھکاری کے وکرم تک جانے اور اس سے جھڑپ ہونے کا منظر بھی اس نے صرف اس لیے نظرانداز کر دیا کہ اس کے خیال کے مطابق وکرم بے پناہ ذہنی دباؤ کا شکار تھا اور اس کا کسی بھکاری کو دھتکار دینا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ چونکا تو وہ اس وقت جب بھکاری بلکتا جھلکتا وہاں سے آگے بڑھ گیا اور چند منٹ کے وقفے سے وکرم بری طرح لہراتا ہوا زمین پر آ گرا۔

وکرم کا یوں گرنا اس کی نگرانی پر موجود چاروں افراد کے لیے حیرت انگیز تھا لیکن اس موقع پر انہیں لیڈ کرنے والے نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور آپس میں رابطے کے لیے استعمال ہونے والے آپریٹس پر یہ حکم دیا کہ فی الحال ان میں سے کوئی بھی وکرم کے نزدیک نہیں جائے گا۔ بعد میں وکرم کے گرد رش لگنے کے بعد لیڈر خود ہجوم میں شامل ہو کر جائزہ لے آیا کہ وہ اپنی جان سے جا چکا ہے۔ بہت سے دوسرے افراد کی طرح وہ بھی خاموشی سے اس سے دور ہٹ گیا البتہ اس دوران میں اس نے یہ ضرور سن لیا تھا کہ وکرم کو کس اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ اسپتال کا نام معلوم ہونے کے بعد وہ باقی معلومات اپنے ذرائع سے حاصل کر سکتے تھے۔ وکرم کی لاش کے پیچھے جانا بے معنی تھا۔ ویسے بھی انہیں خاص طور پر وکرم سے دور رہ کر صرف اس کی نگرانی کا کام دیا گیا تھا تاکہ اس کے ذریعے دوسرے افراد تک پہنچا جا سکے۔ بدقسمتی سے وہ کسی تک نہیں پہنچ سکے تھے اور وکرم کو بھی گنوا دیا تھا اپنی اس ناکام مہم کی خبر انہوں نے ذیشان کو حرف بہ حرف تفصیل کے ساتھ پہنچا دی۔

"تم چاروں کے چاروں احمق ہو۔ آخر تم نے اس فقیر کو نظرانداز کیسے کر دیا؟ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اسی نے وکرم کے ساتھ کوئی ایسی کارروائی کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ اپنی جان سے چلا گیا۔" تفصیل سن کر ذیشان ان پر الٹ پڑا۔

"سوری سر! اس فقیر کا انداز اتنا نیچرل تھا کہ ہم کسی طور اس پر شک نہیں کر سکے۔ گڑبڑ کا احساس اس وقت ہوا جب وکرم گرا۔ اس وقت تک وہ فقیر وہاں سے غائب ہو چکا تھا پھر بھی ہم نے اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔" ٹیم کو لیڈ کرنے والے نے شرمساری سے اپنی غلطی تسلیم کی۔

"ظاہر ہے، وہ تم لوگوں کی طرح احمق تو تھا نہیں کہ ایک بار بچ نکلنے کے بعد ہاتھ آتا۔ اسے تو اپنا کام کر کے اڑن چھو ہونا ہی تھا۔ یہ تم لوگوں کی نااہلی ہے کہ وہ اتنی آسانی سے اپنا کام کر کے نکل گیا۔ اپنی نااہلی کے لیے تم نے کتنی فضول دلیل دی ہے کہ اس فقیر کا انداز اتنا نیچرل تھا کہ تمہیں شک ہی نہیں ہوا۔ احمقوں۔۔۔ وہ را کا تربیت یافتہ ایجنٹ تھا، کسی تھیٹر کا تھرڈ کلاس ایکٹر نہیں جو اپنے پھکڑپن سے تمہیں شک کرنے کا موقع دیتا۔ یہ موقع تو تمہیں خود تلاش کرنا تھا لیکن تم نے اپنی حماقت سے اسے گنوا دیا۔" ذیشان اپنے ماتحتوں پر اتنی بری طرح گرج برس رہا تھا۔ دراصل سی ایف پی میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اس کے اہلکاروں میں سے کسی نے اتنی خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ غلطی کے مرتکب زیرِعتاب افراد سر جھکائے کھڑے اس کی لعن طعن سنتے رہے۔

"فی الحال میں تم چاروں کو معطل کر رہا ہوں۔ آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھو۔ مستقبل میں تمہیں سی ایف پی میں رکھا جائے گا یا نہیں، اس بات کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔" آخر اس نے ایک سخت فیصلہ سنا دیا جس پر احتجاج کرنے کا ان چاروں میں ہی حوصلہ نہیں تھا۔ جھکی نظروں اور سروں کے ساتھ وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد ذیشان نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے اس بات پر اطمینان کا سانس لیا کہ وکرم کو مینار پاکستان تک بھیجنے کے لیے جو گاڑی استعمال کی گئی تھی، وہ چوری کی تھی اس لیے گاڑی کے ذریعے ان کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ دوسری اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اس کے ماتحتوں نے اپنی پہلی حماقت کے بعد دوسری حماقت نہیں کی تھی اور وکرم سے دور رہے تھے، ورنہ وہ جو شکار کرنے گئے تھے خود شکار ہو جاتے۔ یہ بات تو اب اس پر واضح ہو گئی تھی کہ جیسے وہ وکرم کو چارہ بنا کر راوالوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، بالکل اسی طرح راوالے بھی وکرم کے ذریعے ان تک پہنچنا چاہتے تھے۔ یقینی طور پر وہ کسی طرح اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ وکرم کا کسی اور جگہ شفٹ ہو جانے کا بہانہ غلط ہے اور وہ دھر لیا گیا ہے۔

وکرم کے ہاتھ سے نکل جانے اور اپنے ماتحتوں کی حماقت کی جھلاہٹ اس حد تک بڑھی کہ وہ اپنے دفتر سے اٹھ کر سیدھا اس کمرے میں جا پہنچا جہاں ورما کو رکھا گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد سے اب تک ورما سے کوئی قابلِ ذکر تفتیش نہیں کی گئی تھی اور فی الحال صرف اتنا کیا جا رہا تھا کہ اسے اعصابی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلا حربہ تو یہ استعمال کیا جا رہا تھا کہ ایک پل کے لیے بھی اسے سونے نہیں دیا جا رہا تھا۔ ورما کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو بے حال ہو جاتا لیکن اس نے تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خود کو سنبھال رکھا تھا جس پر ایک اور حربے کا استعمال کیا گیا تھا اور وقتاً فوقتاً اسے برف کی سل پر لٹا دیا جاتا تھا۔ ورما نے یہ تکلیف بھی جھیل لی تھی لیکن وہ حیران تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کرنے والے اس سے کچھ پوچھتے کیوں نہیں ہیں؟ وہ منتظر تھا کہ اس سے تفتیش کا آغاز کیا جائے اور ذیشان کی جھلاہٹ نے اس کا یہ انتظار ختم کر دیا۔

"پانی میں سرخ مرچیں اور نمک گھول کر اسپرے گن میں بھر کر لے آؤ۔" اس نے ورما کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک اہلکار کو حکم دیا اور خود دندناتا ہوا ورما کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ابھی ابھی برف کی سل پر سے ہٹایا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ نیلا پڑا ہوا تھا۔

"اسے گرمی پہنچاؤ۔" اس نے سردمہری سے حکم دیا۔ اس کے حکم پر عمل کیا جانے لگا اور ورما کو الیکٹرک ہیٹر کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ گرماہٹ ملنے سے اسے آرام محسوس ہوا تو نیند کے جھونکے آنے لگے لیکن منہ پر پڑنے والے پے در پے تھپڑوں نے اسے سونے نہیں دیا۔ ابھی وہ تھپڑوں سے سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ ذیشان نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا ایک پتلا سا چاقو تھا جس سے اس نے ورما کے اوپری عریاں بدن پر جابجا چرکے لگانا شروع کر دیے۔ ورما لب بھینچے یہ تکلیف سہتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم خون میں نہا گیا۔ لب بھینچے اس کارروائی میں مصروف ذیشان نے ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ چرکے لگانے کے بعد اس نے اپنے ماتحت سے وہ اسپرے گن لی جس میں نمک اور سرخ مرچوں کا محلول موجود تھا اور اس محلول کو ورما کے زخموں پر اسپرے کرنا شروع کر دیا۔ لازم تھا کہ ورما کے زخمی جسم میں شدید جلن پیدا ہو جاتی اور وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔

"ابھی یہ ابتدا ہے ورما! میں تیرے روئیں روئیں میں آگ بھر دوں گا۔" ذیشان نے نفرت سے کہا اور اسپرے گن کا رخ اس کے دائیں کان کی طرف کر دیا۔ عین کان کے سوراخ پر رکھ کر کیے گئے اسپرے کے نتیجے میں محلول کی دھار سیدھی کان کے اندرونی حصے تک پہنچ گئی۔ اس بار ورما کی کراہ زیادہ بلند تھی لیکن ذیشان نے پروا نہیں کی اور دوسرے کان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ ورما تلملانے لگا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ذیشان سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس میں تم سے ان سارے لوگوں کی تکلیف کا بدلہ لینا چاہتا ہوں جن کی زندگیوں کے چراغ تمہاری وجہ سے گل ہوئے اور جن کے لواحقین آج بھی اپنے پیاروں کے لیے تڑپتے ہیں۔ میں اس محلول کو تمہاری آنکھوں اور ناک سمیت جسم کے ہر سوراخ میں بھر دوں گا پھر تم سمجھو گے کہ تکلیف کیا ہوتی ہے اور پھر تمہیں پتا چلے گا کہ تم جس ملک کے خلاف اپنی ناپاک کارروائیاں کر رہے ہو، اس کے بسنے والے ابھی زندہ ہیں اور اتنی آسانی سے تمہیں چھوڑنے والے نہیں۔" ورما کو جواب دینے کے بعد ذیشان نے اسپرے گن اس کی ناک کے نتھنے سے لگا دی۔ محلول نازک حصوں میں پہنچا تو سچ مچ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ بری طرح تڑپتے ہوئے چیخنے لگا۔

"بھگوان کے لیے مجھے گولی مار دو مگر میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔" اس نے گڑگڑا کر ذیشان سے درخواست کی۔

"تمہاری مشکل اسی صورت میں آسان ہو سکتی ہے کہ تم میرے ہر سوال کا جواب بغیر رکے صحیح صحیح دیتے جاؤ۔" بالآخر ذیشان مطلب کی بات پر آ گیا۔

"میں تیار ہوں۔" ورما نے ہتھیار ڈال دیے اور اس کے بعد ذیشان اس سے وہ سب کچھ اگلواتا چلا گیا جو اس کے علم میں تھا۔

☆☆☆

"آج کشور اور اس کے شوہر کو رات کے کھانے پر بلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیتے ہیں مراد۔ میرا بڑا دل چاہ رہا ہے اس سے ملنے کو۔ اتنے دن سے تو اس لیے نہیں بلا سکی کہ اباجی یہاں تھے لیکن آج تو وہ کہہ کر گئے ہیں کہ رات واپس نہیں آئیں گے۔'' ننھی عالیہ کے بالوں کو کنگھے کی مدد سے سنوار کر اس کے بالوں میں رنگ برنگے خوب صورت سے کلپس لگاتے ہوئے شاہدہ نے مراد شاہ سے فرمائش کی۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے۔ میرا خود بڑا دل چاہتا ہے کہ اسے گھر بلاؤں اور اسے اس کے شوہر اور بچی کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھوں۔ میرا دل بہت کڑھتا تھا اس کے لیے۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ مجھے تینوں بہنوں میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔ لیکن افسوس کہ میں اس کی خوشیوں کے لیے کچھ نہیں کرسکا۔ ایک دو بار میں نے اباجی سے بحث ضرور کی کہ اگر خاندان میں کشور کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں ہے تو اسے باہر کسی اچھے خاندان میں بیاہ دیتے ہیں لیکن اباجی نے میری ایک نہ سنی۔ میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اسے یہاں اپنے پاس بلا کر کسی اچھے سے لڑکے سے چپکے سے بیاہ دیتا ہوں لیکن شاید اباجی کو اس معاملے میں مجھ پر کچھ شک تھا اس لیے وہ میرے بار بار کے اصرار کے باوجود بھی کشور کو یہاں بھیجنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان حالات میں کشور نے اپنے لیے جو راہ نکالی، وہ کوئی انہونی نہیں ہے۔ شکر یہ ہے کہ اسے اچھا ساتھی مل گیا جو اس سے مخلص اور ہر مشکل میں ساتھ دینے والا ہے۔'' مراد شاہ نے بیوی کی فرمائش کے جواب میں جذباتی لہجے میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''تو پھر طے ہے کہ آج ہم کشور کو اس کی فیملی سمیت اپنے گھر بلا رہے ہیں۔'' شاہدہ نے خوشگوار لہجے میں کہتے ہوئے ماحول کے اس بوجھل پن کو دور کرنے کی کوشش کی جو مراد شاہ کے تلخ حقائق کو دہرانے کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اسے فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کی کوئی ذاتی مصروفیت ہو اور وہ ہماری دعوت قبول نہ کرسکیں۔ تم میرے کنفرم کر لینے کے بعد ہی انتظامات کرنا۔'' مراد شاہ نے اس سے کہتے ہوئے فون سنبھال لیا۔ شروع میں احتیاطاً کشور نے اسے اپنا نمبر نہیں دیا تھا اور خود وقتاً فوقتاً کہیں باہر سے فون کرتی رہی تھی۔ بعد میں اعتماد بحال ہونے پر اس نے اپنے ذاتی نمبر سے فون کرنا شروع کردیا تھا چنانچہ اب مراد شاہ کے پاس اس کا رابطہ نمبر موجود تھا۔

''السلام علیکم بھائی! کیا حال ہیں؟'' مراد شاہ کا نمبر دیکھ کر کشور نے خوشی خوشی کال ریسیو کی اور کھلکھلاتی آواز میں بولی۔

''وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے۔ بس یہ تمہاری بھابی کو اچانک تمہاری یاد ستانے لگی اور مجھ سے کہنے لگیں کہ آج رات کے کھانے پر کشور اور آفتاب کو بلوا لیجیے ہیں۔ اگر آج تم لوگوں کی کوئی مصروفیت نہیں ہے تو ہماری طرف آجاؤ۔'' مراد شاہ نے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

''لیکن میری معلومات کے مطابق تو اباجی ابھی تک یہیں ہیں، واپس نہیں گئے۔'' کشور کے جواب نے واضح کیا کہ چودھری کی امریکا میں موجودگی کو وہ اپنے لیے خطرے کا باعث سمجھتی ہے اس لیے ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح یہ انتظام کر رکھا ہے کہ اس کے یہاں ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں باخبر رہ سکیں۔

''تمہاری معلومات ٹھیک ہیں لیکن ہم نے آج کے دن تمہاری دعوت کا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ آج اباجی کا گھر سے باہر کہیں رات گزارنے کا پروگرام ہے۔ اگر پھر بھی تم یہاں آنا مناسب نہیں سمجھتیں تو انکار کرسکتی ہو۔ میں اور شاہدہ بالکل بھی برا نہیں مانیں گے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں بھائی۔ آپ کا بلانا سر آنکھوں پر۔ ہم ضرور آئیں گے۔'' کشور کو لگا کہ اس کی بات مراد شاہ کو آزردہ کرگئی ہے اس لیے اس کی دل جوئی کے لیے فوراً ہامی بھرلی۔

''ٹھیک ہے پھر ہم انتظار کریں گے۔'' مراد شاہ خوش ہوگیا اور فون بند کر کے شاہدہ کو دعوت کے لیے انتظامات کرنے کی ہدایت کی اور خود بیٹی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ بہن، بہنوئی پہلی بار اس کے گھر آرہے تھے اس لیے ان کے لیے کچھ تحائف کی خریداری ضروری تھی۔ بہت دل لگا کر خریداری کرنے کے بعد وہ گھر واپس آیا تو شاہدہ کچن میں مصروف تھی۔ اچھے شوہروں کی طرح وہ اس کی مدد کرنے لگا۔ شام ڈھلنے سے پہلے کشور اپنی فیملی کے ساتھ ان کے گھر پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کیک اور چھوٹے موٹے تحائف بھی لائی تھی۔ شاہدہ اور وہ تو برسوں بعد ملے تھے، سو ایک دوسرے کو گلے لگا کر خوب پیار کرنے کے ساتھ ساتھ اشک بھی بہائے گئے۔ پھر گپ شپ اور پُرتکلف کھانے میں کیسے وقت گزرا، کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوسکا۔ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی بہت خوش تھے۔ مراد شاہ کی بیٹی عالیہ کو تو امید کی شکل میں کوئی جیتی جاگتی گڑیا مل گئی تھی جس کے ساتھ وہ دل بھر کر انجوائے کرتی رہی۔ امید بھی ماموں کے گھر آکر بہت خوش تھی اور خوب قلقاریاں مار رہی تھی۔ خوشی سے بھری

اس محفل کو برخاست کرنے کا خیال اس وقت آیا جب بچے نیند سے نڈھال ہوکر اپنی اپنی جگہ لڑھک گئے۔

''اب اجازت دیجیے بھائی! اللہ نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی۔'' کشور نے خوشی سے سرشار آواز میں نہ چاہتے ہوئے واپسی کی اجازت طلب کی۔

''ٹھیک ہے گڑیا... جاؤ۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اباجی کل کس وقت گھر آئیں گے ورنہ تمہیں یہیں ٹھہرا لیتا۔ اباجی واپس چلے جائیں تو پھر تم بہت سارے دنوں کے لیے میرے پاس رکنے کے لیے آنا۔'' مراد شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس اثنا میں شاہدہ وہ شاپنگ بیگز لے آئی جن میں کشور، آفتاب اور امید کے لیے کئی تحائف موجود تھے۔

''یہ سب کیا ہے بھائی؟'' کشور اندازہ کرسکتی تھی کہ ان شاپنگ بیگز میں ٹھیک ٹھاک قیمتی تحائف موجود ہوں گے اس لیے تھوڑا سا جھجک گئی۔ آفتاب کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزارنے کے باوجود وہ اپنے میکے کی خوش حالی کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی اس لیے ایسے تحائف لینے سے بھی گریزاں تھی جن کا بدل خود نہ دے سکے۔

''تم جانتی ہو کہ ہمارے ہاں میکے آئی بہنوں کو خالی ہاتھ واپس لوٹانے کا رواج نہیں ہے۔ میں غلط رسم و رواج کی شدت سے مخالفت کرتا ہوں لیکن صاحبِ حیثیت ہونے کے ناتے اس رسم کو نبھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ تمہیں ان تحائف کو قبول کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچانا چاہیے کیونکہ اس میں تمہارے بھائی کی محنت کی کمائی کے علاوہ وہ رقم بھی شامل ہے جو مجھے اباجی باقاعدگی سے دیتے رہتے ہیں۔ اور اباجی کے وارثوں میں سے ایک ہونے کے ناتے تمہارا بھی اس رقم پر پورا پورا حق ہے۔'' مراد شاہ نے فوراً ہی اس کی ہچکچاہٹ کا سبب سمجھ لیا تھا چنانچہ اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔

''وارث... یہ بھی آپ نے خوب کہا۔ اباجی میرے خون کے پیاسے ہورہے ہیں اور ان کے پاس اگر مجھے دینے کے لیے کچھ ہے تو صرف سزائے موت۔ ویسے بھی ہمارے ہاں لڑکیوں کو وارث سمجھنے کا کہاں رواج ہے۔ جائداد پر تو بس بیٹوں کا حق ہوتا ہے۔'' کشور نے آزردگی سے کہا۔

''اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں غلط رسوم و رواج کا کتنی شدت سے مخالف ہوں۔ جب جاگیر کے معاملات میرے ہاتھ میں ہوں گے تو میں ہر حق دار کو اس کا حق دوں گا۔ رہی اباجی کے سزائے موت دینے کی بات تو اباجی کوئی خدا نہیں ہیں جو انسانوں کی زندگی موت ان کے ہاتھ میں ہو۔ جس اللہ نے آج تک تمہیں ان سے محفوظ رکھا، وہ آئندہ بھی حفاظت کرے گا۔'' مراد شاہ کا جواب بڑا نپا تلا تھا۔ آفتاب نے بھی اس کی تائید کی۔

''مراد بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں کشور... ہمیں اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے۔''

''بس اب تم لوگ جاؤ۔ کافی رات ہوگئی ہے۔ چھوٹی بچی ساتھ ہے، خوامخواہ بے آرام ہورہی ہے۔ گھر پہنچ کر مجھے اپنی خیریت کا فون کردینا۔'' مراد شاہ نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے بھائی ہونے کا فرض ادا کیا اور وہ لوگ الوداعی الفاظ کہتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ مراد شاہ نے خود آگے بڑھ کر ان لوگوں کے لیے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ہر شخص اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ سامنے ہی چودھری افتخار کھڑا تھا جو ان لوگوں ہی کی طرح فوری ردعمل کے طور پر ساکت رہ گیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ کشور کی طرف جھپٹا۔ امید کو بانہوں میں لیے کھڑی کشور نے چودھری کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر خوف زدہ سی چیخ ماری۔ باپ سے بغاوت کر گزرنے کے باوجود وہ اس کی سفاکی سے واقف تھی اس لیے اس وقت اسے اپنے روبرو دیکھ کر بے انتہا خوف زدہ ہوگئی تھی۔

''بے غیرت، بے حیا... میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میرا شملہ نیچا کر کے خود اپنے یار کے ساتھ گل چھرے اڑاتی پھر رہی ہے۔'' اس نے دیکھتے دیکھتے کشور کی گردن دبوچ لی۔ کشور پر باپ کی اتنی دہشت طاری تھی کہ ذرا مزاحمت نہیں کرسکی البتہ اس کی گود میں سوئی بچی اس افتاد پر جاگ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اسی پل آفتاب اور مراد شاہ حرکت میں آئے اور چودھری کو کھینچ کر کشور کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان دو جوانوں کے لیے یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا۔ ٹھیک ٹھاک عمر ہونے کے باوجود چودھری خاصا توانا اور طاقتور تھا۔ اصل اور عمدہ غذاؤں کے استعمال نے اسے بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی طاقت دے رکھی تھی اور کچھ کمال اس وقت اس کے معدے میں موجود ام الخبائث کا بھی تھا جس نے اس کی بوٹی بوٹی میں آگ بھر رکھی تھی۔ آج وہ بڑے موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔ پروگرام تھا کہ لنڈا کے ساتھ رات بِتائے گا۔ ہوش ربا لنڈا کی قربت کے خیال سے ہی اس کے رگ و پے میں سرور دوڑنے لگا تھا لیکن جب وہ طے شدہ وقت پر پہلے سے بک کروائے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو وہ غائب تھی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ خیال نہ کیا کہ انتظار کروانا تو حسن والوں کی ادا ہوتی ہے اور انتظار کی مشکل گھڑیوں کو گزارنے کے لیے بنتِ انگور سے شغل کرنے لگا جس نے اس کے شوق کو مزید ہوا دینی شروع کر دی۔ لیکن لنڈا تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ اپنے پاس موجود اس کے نمبرز پر کال کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کسی طور رابطہ نہیں ہوا۔ اس چیز نے اس کی بے چینی کو مزید بڑھا دیا اور وہ اندیشے کا شکار ہونے لگا کہ کہیں لنڈا اس سے وقت طے کرنے کے بعد بھول تو نہیں گئی ہے۔ بے چینی اور اضطراب نے اسے مزید مے نوشی پر مجبور کر دیا لیکن پھر بھی وہ ہوٹل کے اس کمرے سے ہلا نہیں کہ کیا پتا لنڈا کو اپنا وعدہ یاد آہی جائے اور وہ یہاں چلی آئے۔ لنڈا تو نہیں آئی لیکن کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد روم سروس کے ایک ویٹر نے اسے ایک بند لفافہ ضرور لا تھمایا جو اس کے مطابق اسی وقت کوئی دے کر گیا تھا۔ چودھری نے بے چینی سے لفافہ کھولا۔ اندر ایک کاغذ پر مختصر پیغام لکھا تھا۔

''سوری ڈارلنگ! میں آج نہیں آسکتی۔ باس کے ساتھ بزی ہوں۔'' اس پیغام کو پڑھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ باس کے لفظ سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو یہ مسٹر الفا ہے جو پہلے بھی کئی بار اس کی راہ میں روڑے اٹکا چکا ہے۔ غصے، مایوسی اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں وہ ہوٹل سے نکل کر واپس مراد شاہ کے اپارٹمنٹ پہنچا تو وہاں کشور اور آفتاب سے سامنا ہو گیا اور اس کے غصے کو اظہار کا راستہ مل گیا۔ کشور تو اس کی نظر میں ویسے بھی معتوب تھی اور وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا کہ کسی طرح اسے آفتاب سمیت قتل کروا ڈالے لیکن خوبیٔ قسمت سے وہ دونوں ہر بار اس سے بچ نکلے، یہاں تک کہ اللہ نے انہیں امید دے دی اور بیٹی کے بعد انہوں نے سوچا کہ خطرے میں گھرے ہر وقت بھاگتے رہنے سے بہتر ہے کہ وہ جلاوطنی اختیار کر لیں۔ یوں وہ شہریار کی مدد سے نیویارک پہنچ گئے لیکن یہاں بھی چودھری کسی بھوت کی طرح ان تک آپہنچا تھا اور کشور کا نرخرہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آفتاب اور مراد نے مل کر اس بپھرے ہوئے سانڈ سے کشور کی جان چھڑائی۔

''تم لوگ جاؤ یہاں سے۔ میں اباجی کو دیکھ لوں گا۔'' مراد شاہ نے ہانپتے ہوئے آفتاب سے کہا تو وہ کشور کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گیا۔

''تو بے غیرت ہے مراد شاہ! تجھ پر لعنت ہے کہ تو گھر سے بھاگی ہوئی بہن کو اس کے جرم کی سزا دینے کے بجائے اسے اس کے عاشق کے ساتھ اپنے گھر میں گھسائے بیٹھا تھا، پر میں تیری طرح بے غیرت نہیں ہوں۔ میں اس بے حیا لڑکی اور اس کے عاشق کی جان لے کر رہوں گا۔'' مراد شاہ کے بازوؤں کی گرفت میں مچلتا چودھری اسے لعنت ملامت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عزائم کا بھی اظہار کر رہا تھا۔ مراد اسے بڑی مشکل سے دروازے سے کھینچ کر اندر لایا تو شاہدہ نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

''ہوش کی دوا لیں اباجی! یہ امریکا ہے، پاکستان نہیں جہاں آپ سرعام دس آدمیوں کی جان لے کر بھی اپنے اثر رسوخ کی وجہ سے بچ کر نکل سکتے ہیں۔ یہاں تو آپ سیدھے الیکٹرک چیئر پر پہنچا دیے جائیں گے بلکہ دعا کریں کہ میرے پڑوسیوں میں سے کسی نے آپ کے کھڑے کیے گئے ہنگامے کو سن کر پولیس کو فون نہ کر دیا ہو ورنہ کچھ دیر میں پولیس والے یہاں پہنچ کر ہم سے پڑوسیوں کے آرام میں خلل ڈالنے پر پوچھ گچھ شروع کر دیں گے۔'' مراد شاہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

''تو کر ان گوروں کی غلامی، ہور ان سے ڈر۔ میں نہیں ڈرنے والا کسی سے۔ تو دیکھنا، میں ان دونوں کو چھوڑوں گا نہیں۔ ایسے کام تمام ہو گا دونوں کا کہ نیویارک کی پولیس دیکھتی رہ جائے گی۔ تو نے سمجھ کیا رکھا ہے اپنے پیو کو۔ تو سمجھتا ہے کہ میری ٹور صرف پیر آباد تک ہے، پر اب تو دیکھ لینا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ چٹکی بجاتے دونوں کو غائب کروا دوں گا۔'' کچھ شراب کا نشہ تھا، کچھ غصے کی گرمی۔ چودھری اول فول بکنے پر آیا تو بکتا چلا گیا اور اپنے سارے ارادے بھی ظاہر کر دیے۔ اس کی یہ دھمکیاں پیر آباد کے حاکم چودھری افتخار عالم شاہ کی حیثیت سے نہیں تھیں بلکہ اس مجرم تنظیم سے وابستگی کے باعث تھیں جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ بہت پہنچ والے لوگ ہیں جن کے لیے نیویارک جیسے بڑے شہر میں بھی کشور اور آفتاب کو ڈھونڈ نکالنا کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔ ادھر بے چارہ مراد شاہ اپنے باپ کو پیر آباد کے ظالم حکمراں کے طور پر تو بے شک جانتا تھا لیکن اس کی منشیات کے بین الاقوامی اسمگلرز سے وابستگی سے ناواقف تھا اس لیے اس کی ہر دھمکی کو محض شراب کا اثر ہی سمجھتا رہا اور کسی نہ کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر سونے کے لیے اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ شاہدہ اس ساری کارروائی کے دوران خاموش تماشائی بنی ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی رہی تھی اور اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ پریشان تو مراد شاہ بھی تھا کہ جب چودھری کا نشہ اترے گا تو اسے کشور اور آفتاب کی اپنے اپارٹمنٹ میں موجودگی کے متعلق

وضاحت کرنی پڑے گی۔ یوں تو وہ اپنے موقف پر بہت مضبوط تھا اور اپنے باپ کو بے شمار دلائل دے سکتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا باپ دلائل سے قائل ہونے والا شخص نہیں اور اپنی ضد کا پکا ہے۔ بس اطمینان تھا تو صرف اتنا کہ نیویارک جیسے شہر میں چودھری کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا آسان نہیں ہو گا۔

☆☆☆

''کتنی آسانی سے یہ لوگ ہمارے ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ہر بار بس ٹامک ٹوئیاں ہی مارتے رہ جاتے ہیں۔ اتنی دوڑ دھوپ کے بعد بھی ہمارے ہاتھ کوئی بڑی کامیابی نہیں آپائی۔''

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ورما کے ہاتھ آنے کے بعد تو میرا ابھی یہ خیال تھا کہ ہم اس کی گرفتاری سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں گے لیکن کچھ حاصل وصول نہیں ہوا اور ہم بس ایسے ہی بھاگ دوڑ کرتے رہ گئے۔'' شہریار کی ہاں میں ہاں ملاتے ذیشان کے لہجے میں بھی گہرا تاسف تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی یہاں پہنچا تھا اور کراچی میں شازمین کے اغوا سے لے کر وکرم کی موت اور پھر اس کے بعد ورما سے تفتیش کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اپنی کارروائیوں تک کی ساری تفصیل اسے کہہ سنائی تھی۔ ورما سے اس نے لاہور میں موجود را کے تین ٹھکانوں کا پتا اگلوا لیا تھا اور بہت تیزی سے کارروائی بھی کی تھی لیکن کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ پہلا ٹھکانا ایک کافی پرانے پروجیکٹ میں موجود فلیٹ تھا جہاں انہیں کوئی نہیں ملا تھا اور صرف تھوڑا بہت اسلحہ اور کچھ غیر اہم کاغذات ہاتھ آسکے تھے۔ پڑوسیوں سے بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں اور انہوں نے یہی بتایا تھا کہ اس فلیٹ کا مالک ایک تنہا ادھیڑ عمر کا شخص تھا جو بہت کم وہاں آتا تھا۔ البتہ جب وہ موجود ہوتا تھا، اس سے ملنے کئی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو وہ شخص عجیب لگتا تھا لیکن کسی نے کبھی شکایت اس لیے نہیں کی کہ انہیں اس شخص سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ ان سب کے خیال میں وہ ایک بے ضرر آدمی تھا جس سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ سفید پوش آبادی کے وہ سادہ لوح افراد سمجھ ہی نہیں سکے تھے کہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا شخص ملک دشمن تھا جس نے حقیقت میں ان کی زندگیاں حرام کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

ورما سے حاصل ہونے والا دوسرا پتا ایک ون یونٹ بنگلے کا تھا جہاں سے وہ ایک چوکیدار کے سوا کسی کو گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ لمبے چوڑے پٹھان چوکیدار نے تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جس بنگلے کی چوکیداری کر رہا تھا اس کے مالکان مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے لیکن وہ ان کے پاس موجود جدید اسلحے اور ان کی راتوں کو ہونے والی آمد و رفت کی وجہ سے یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ وہ کوئی ڈاکو وغیرہ ہیں۔ ان کے جاسوس یا دہشت گرد ہونے کا تو اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا اور وہ محض اچھی تنخواہ کے لالچ میں ان کی مجرمانہ سرگرمیوں سے نظر چرائے بیٹھا تھا۔ اس بنگلے سے انہیں کچھ ایسے ثبوت ملے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں اسلحہ بارود وغیرہ بھی ذخیرہ کیا جاتا رہا ہے۔ انہیں وہاں سے ایک خودکش جیکٹ بھی ملی تھی لیکن چوکیدار صاف انکاری تھا کہ اسے ان سب چیزوں کی وہاں موجودگی کی خبر تھی۔ اس کے مطابق بنگلے میں رہنے والے وہاں جو کچھ بھی لاتے تھے، وہ اسے لوٹ کا مال سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔ اسے بنگلے کے اندر بلا اجازت جانے کی ممانعت تھی اور وہ ان خوفناک لوگوں سے اتنا ڈرتا تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی کبھی ٹوہ لینے کی ہمت نہ کر سکا۔

تیسرے ٹھکانے پر البتہ انہیں جزوی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ ایک بیوٹی پارلر تھا جس کی نچلی منزل پر پارلر کی مالکہ رہائش پذیر تھی۔ سنیتا نامی اس عورت نے پہلے تو انہیں بہت چکر دینے کی کوشش کی اور اپنے پارلر میں موجود مختلف وگوں، کانٹیکٹ لینسز اور داڑھی، مونچھوں وغیرہ جیسی چیزوں کی موجودگی کے بارے میں یہی توجیہہ دیتی رہی کہ اس کے پارلر سے مختلف پرائیویٹ پروڈکشن کمپنیاں اور تھیٹرز وغیرہ والے خدمات لیتے رہتے ہیں اس لیے یہاں ان سب چیزوں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے رہائشی حصے میں موجود بعض خفیہ مواصلاتی آلات کی موجودگی کا جواز پیش نہیں کر سکی اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ را کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ را کا منجھا ہوا ایجنٹ پانڈے وقتِ ضرورت وہاں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات جاری کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ بھی ماننا پڑا کہ وکرم کو موت کا نشانہ بنانے والا پانڈے ہی تھا جسے خود سنیتا نے اپنی مہارت سے ایک بوڑھے اور لنگڑے گداگر کے روپ میں ڈھالا تھا۔ وقتِ ضرورت پانڈے اپنے ساتھیوں کو وہاں جمع کر کے انہیں کسی آپریشن پر بھی آسانی سے بھیج دیتا تھا اور اردگرد والے اس لیے شک نہیں کر پاتے تھے کہ ٹی وی اور اسٹیج کے فنکاروں کے لیے کام کرنے کی وجہ سے سنیتا کے پارلر میں لوگوں کا کثرت سے آنا جانا لگا رہتا تھا اور جن میں سے دو پروڈکشن ہاؤس تو ایسے تھے جنہوں نے اپنا جدید ذاتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میک اپ روم قائم کرنے کے بجائے سنیتا کے پارلر پر ہی انحصار کیا ہوا تھا۔ ان دونوں پروڈکشن ہاؤسز کے فنکار اکثر گاڑیاں بھر بھر کر وہاں سے تیار ہو کر جاتے تھے اور سیٹ پر ان کا میک اپ آرٹسٹ ضرورت پڑنے پر تھوڑی بہت لیپا پوتی کر دیتا تھا۔

یہ کور حاصل کرنے کے لیے سنیتا نے بڑی ہوشیاری سے شوبز کی دنیا میں اپنے تعلقات بنائے تھے اور ہر ایک پر ان ''اچھے تعلقات'' کا احسان رکھ کر بے حد رعایتی نرخ میں اس کا کام کر دیا کرتی تھی۔ بس اس کی واحد شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ خود کہیں نہیں جائے گی اور کام کروانے والوں کو خود اس کے پارلر تک آنا پڑے گا۔ نہایت کم ریٹس پر ملنے والے اچھے نتائج کے چکر میں اس کی یہ شرط قبول کر لی جاتی تھی، سو وہ بڑی کامیابی سے راوالوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کیے ہوئے تھی۔ سنیتا سے حاصل ہونے والی یہ ساری معلومات انکشاف کا درجہ رکھنے کے باوجود اس اعتبار سے زیادہ مفید نہیں تھیں کہ خود سنیتا، پانڈے یا اس کے کسی ساتھی کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھی اور اس کے مطابق وہ لوگ ضرورت پڑنے پر خود اس سے رابطہ کرتے تھے۔ اس پر تھرڈ ڈگری کے استعمال کے ساتھ ساتھ اسے پولی گراف مشین سے بھی جانچ کر دیکھ لیا گیا تھا لیکن وہ فراہم کردہ معلومات سے ایک لفظ زیادہ نہیں بتا سکی تھی اور یوں ذیشان کی جھنجلاہٹ مزید بڑھ گئی تھی کہ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود اس کے ہاتھ کوئی ایسا کلیو نہیں آسکا تھا جس کی مدد سے وہ راوالوں کی راہ پر لگ کر ان کی گردن دبوچ سکتا۔ چنانچہ شہر یار کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنی ساری کوفت کا اظہار کر ڈالا۔ شہر یار بھی پوری طرح اس کا شریک غم تھا اور اسے خود ہر وقت یہ غم کھاتا رہتا تھا کہ وہ لوگ اپنے ملک کو دشمنوں سے پاک کرنے کے لیے اس حد تک کام نہیں کر پا رہے جتنی کہ خواہش رکھتے ہیں.... اس وقت تو ان کے لیے ایک اور صدمہ یہ بھی ہوا تھا کہ ورمانے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے بہت اچانک ہی الیکٹرک ہیٹر کا تار کھینچ کر خود کو برقی کرنٹ کی مدد سے ہلاک کر لیا تھا اور ذیشان کے پاس یہ امکان نہیں رہا تھا کہ وہ اس پر تشدد کا کوئی نیا حربہ استعمال کر کے اس سے مزید حقائق اگلوا سکے۔ شہر یار اپنی جگہ بے یقینی کا شکار تھا کہ رشنا کو اپنی ایک دیوی کے بھینٹ چڑھوا دینے والا ورما جس کو وہ بھیانک موت مارنے کی خواہش رکھتا تھا، یوں اچانک اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا اور حالات نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ تشدد سے گھبرا کر ورمانے جو کچھ بتایا تھا، وہ اس سے بہت کم تھا جو وہ جانتا تھا۔ شاید اس نے مہلت حاصل کرنے کے لیے اپنے ان چند ٹھکانوں کے پتے بتا دیے تھے جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہاں سے سی ایف پی والوں کو کچھ حاصل نہیں ہوگا... یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے دھر لیے جانے کے بعد اس کے ساتھیوں نے خود ہی ایسی تمام جگہوں سے غائب ہو جانا مناسب سمجھا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی، اب ورما اس دنیا میں نہیں تھا اس لیے وہ اس سے سچ جھوٹ کچھ بھی نہیں اگلوا سکتے تھے اور عجیب سی یاسیت کا شکار ہو گئے تھے۔

''مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم دونوں اس انداز میں سوچ رہے ہو اور تمہارا رویہ اتنا غیر عملی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چند جزوی ناکامیوں اور ورما کی موت نے تمہارے پاس کرنے کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے اور تم ایسے ناکارہ وجود... میں تبدیل ہو گئے ہو جس کے ہاتھ پیر کاٹ کر انہیں کچھ بھی کرنے کے قابل نہ چھوڑا گیا ہو۔'' عمر فاروق کی وہاں انٹری بہت اچانک اور غیر متوقع تھی۔ عموماً وہ وہاں اتنی خاموشی سے رہتے تھے کہ کسی کو ان کی موجودگی کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور وہ محض شہر یار کے انسٹرکٹر ہی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت انہوں نے بہت موقع سے دخل دے کر ان دونوں کی مایوسی کو ایک زبردست کوڑا لگایا تھا۔

''ایسی بات نہیں سر لیکن یہ تو فطری سی بات ہے کہ انسان جب بہت محنت کرے تو اس محنت کے نتائج بھی چاہتا ہے۔'' ذیشان نے گڑبڑا کر اپنے رویے کی وضاحت دی۔

''یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ انسان کو ہمیشہ حسب خواہش نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ خصوصاً ہماری فیلڈ میں کیونکہ ہمارے مقابل وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہم ہی جیسی اسپرٹ اور مقصد کے تحت کام کر رہے ہوتے ہیں۔ جب مقابل برابری کا یا ہم سے زیادہ زبردست ہو تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہماری محنت کا وہ نتیجہ نکلنا ضروری نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم کوئی دو اور دو چار کرنے والے لگے بندھے کاروباری نہیں ہیں جو ایسی احمقانہ توقعات رکھیں۔ ہم وطن کے رکھوالے اور مجاہد ہیں جنہیں اس وطن کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ہمیں ہر لمحے بس یہی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ کیا ہم یہ سب داؤ پر لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ حوصلہ زندہ ہے تو سمجھو دشمن تم پر حاوی نہیں ہو سکے گا، چاہے وہ کتنی بھی شدت سے حملہ آور ہو۔ وقتی ناکامیاں کبھی کسی مجاہد کا حوصلہ پست نہیں کر سکتیں بلکہ اسے سبق دیتی ہیں کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ کر پہلے سے زیادہ بہتر لائحہ عمل کے ساتھ میدان میں اترے۔'' عمر فاروق

بولتے جا رہے تھے اور ان کا ہر لفظ ان کے دلوں میں اتر کر انہیں شرمندہ کر رہا تھا۔

''سوری سر! اصل میں ہمیں کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی اس لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگے تھے۔'' شہر یار نے اپنی شرمندگی کا اعتراف کرنے میں پہل کی۔

''راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی تو چلو میں سمجھا دیتا ہوں۔ ابھی تمہارے سامنے سلو والا ٹارگٹ موجود ہے اور اس کے علاوہ ورمانے خواجہ سراؤں کے بارے میں جو تھوڑی بہت معلومات فراہم کی ہیں، تم ان پر کام کر کے بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ تم اپنے حوصلے کو پست نہ ہونے دو۔'' انہوں نے فوراً ہی انہیں مشوروں سے نواز دیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر... واقعی ہم ان دو لائنز پر کام کر سکتے ہیں۔'' ذیشان پُرجوش ہو گیا۔

''ہم نہیں صرف تم۔ میں تو ابھی زیر تربیت ہوں اور عمر فاروق صاحب کی اجازت کے بغیر یہاں سے قدم بھی باہر نہیں نکال سکتا۔'' شہر یار نے جان بوجھ کر منہ لٹکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا جس پر عمر فاروق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور پہلی بار وہ انسٹرکٹر کی سخت اور بے تاثر نظروں سے اسے دیکھنے کے بجائے محبت سے لبریز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ شیر دشمنوں پر بجلی بن کر گرنے کے لیے کتنا بے تاب ہے لیکن بس مصلحتوں نے مجھے تمہیں پابندی میں رکھنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ لیکن اب خوش ہو جاؤ کہ کرنل توحید نے تمہیں ایک خصوصی مشن کے لیے...... اجازت دے دی ہے۔'' عمر فاروق کا یہ کہنا تھا کہ شہر یار کا چہرہ کھل اٹھا۔

''واقعی سر! مجھے کس مشن پر بھیجا جا رہا ہے؟'' وہ جوش سے پوچھنے لگا۔

''اس مشن کے بارے میں تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تمہیں کراچی جانا ہوگا جہاں سلو والے معاملے کو تم ٹیسٹ کیس کے طور پر نمٹاؤ گے پھر آگے بات ہو گی۔'' انہوں نے اسے بتایا۔

''رائٹ سر! میں تیار ہوں اور انشاء اللہ سرخ رو ہو کر ہی آپ کے سامنے آؤں گا۔'' وہ بہت پُرجوش تھا کہ اب اسے بھی ہاتھ پیر کھولنے اور کچھ کر دکھانے کا موقع ملنے والا تھا چنانچہ پوری توجہ کے ساتھ عمر فاروق سے تفصیلات و ہدایات حاصل کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح ہونے تک چودھری کا نشہ اتر چکا تھا لیکن غصہ برقرار تھا۔ رات کشور کا مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں پایا جانا اتنی معمولی بات نہیں تھی جسے وہ نظر انداز کر دیتا۔ اس کے لیے یہ بات قطعی ناقابل برداشت تھی کہ اپنی جس بیٹی کو وہ قتل کرنے پر تلا ہوا تھا، مراد شاہ اس سے یہاں تک ربط ضبط رکھے ہوئے تھا کہ وہ اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ رات اس کے گھر پر موجود تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد اس نے مشکل حوائج ضروریہ ادا کرنے تک صبر کیا اور دندناتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ مراد شاہ نک سک سے تیار آفس جانے کے لیے تیار تھا اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔

''مجھے کشور کا ایڈریس دے۔'' چودھری نے اس کے سر پر پہنچ کر مطالبہ کیا۔

''مجھے نہیں معلوم اباجی کہ وہ کہاں رہتی ہے۔'' مراد شاہ نے چائے کا ایک کپ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

''جھوٹ مت بول۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیرا اس سے ملنا جلنا ہو اور تو اس کے گھر کا پتا نہ جانتا ہو۔'' چودھری اس کا جواب سن کر غرایا۔

''آپ یقین کریں نہ کریں، آپ کی مرضی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ میں کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔ وہ ایک بار اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ مجھے شاپنگ مال میں ملی تھی تو میں نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیا تھا۔ کل وہ اتفاقاً مجھ سے ملنے چلی آئی اور بس۔'' مراد شاہ نے سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے باپ کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''بکواس نہ کر اوئے، میں کوئی ننھا کاکا نہیں ہوں جو تیرے اس جھوٹ سے بہل جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تجھ جیسے بے غیرت کو اس بے حیا نے اپنا پتا ٹھکانا ضرور بتایا ہو گا۔ تیرے جیسے بے غیرت بھائی سے جو گھر سے بھاگی بہن سے ہنس ہنس کر ملتا ہے، اسے کون سا ڈر ہو گا کہ وہ تجھ سے اپنا پتا ٹھکانا چھپائے گی۔'' چودھری دہاڑا۔

''معاف کیجیے گا اباجی! مجھے اس بے غیرتی پر آپ کے مظالم نے مجبور کیا ہے۔ اگر آپ کشور کو اس کے حقوق دیتے ہوئے کسی اچھی جگہ شادی کر دیتے تو نوبت یہاں تک بھی نہ پہنچتی۔ میں بے غیرت نہیں ہوں بلکہ مجبور ہوں کہ کشور کو اس کے عمل میں درست سمجھوں اور جب وہ میرے حساب سے حق پر ہے تو میرے پاس کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ میں اس سے خفا ہوں اور اسے ڈراؤں۔'' اس بار مراد شاہ بھی اپنے لہجے کی تلخی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر قابو نہیں رکھ سکا اور باپ کو ترت جواب دیا۔

"تف ہے تیری ایسی روشن خیالی پر جس نے تجھے تیری روایات بھلا دی ہیں۔ تجھے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ تو میری اولاد ہے۔" چودھری اسے ملامت کرنے لگا۔

"اب میں خود کو آپ کی اولاد ثابت کرنے کے لیے لوگوں پر آپ جیسے مظالم توڑھانے سے رہا، لہٰذا آپ کی مرضی ہے کہ آپ مجھے اپنی اولاد سمجھیں یا نہیں۔" اس نے شانے جھٹکتے ہوئے جواب دیا اور اطمینان سے سلائس پر مکھن لگانے لگا۔ اس کے برعکس اس کی بیوی شاہدہ ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ برادری ہی کی لڑکی تھی اس لیے چودھری کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی اور امریکا میں مراد شاہ کے ساتھ آبسنے کے باوجود مکمل طور پر اس کے خوف سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے سسر کا پارا اگر ایک حد سے زیادہ چڑھ گیا تو پھر وہ اپنے سگے بیٹے کو بھی نہیں بخشے گا۔

"زبان کو لگام دے مراد شاہ اور سیدھے طریقے سے مجھے کشور کا پتا بتا دے۔" چودھری کی طیش میں بھری بلند آواز نے شاہدہ کو مزید لرزایا اور وہ شکر کرنے لگی کہ اس سارے تماشے سے قبل ہی عالیہ اسکول کے لیے روانہ ہو چکی ہے ورنہ اس کے ننھے ذہن پر بہت بوجھ پڑ جاتا۔

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں ابا جی! لیکن سچ یہی ہے کہ مجھے کشور کا پتا معلوم نہیں ہے۔" مراد شاہ نے اس بار اپنا لہجہ نرم کر لیا لیکن اپنے مؤقف پر قائم رہا۔

"اگر تو نے میری بات نہ مانی تو میں تجھے جائداد سے عاق کر دوں گا۔" بیٹے کی ہٹ دھرمی دیکھ کر چودھری نے اسے دھمکایا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ میں نے کبھی زمین جائداد کا لالچ نہیں کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اتنا کما لیتا ہوں جس میں اپنی بیوی اور بچی کا پیٹ پال سکتا ہوں۔" باپ کی دھمکی سے متاثر ہوئے بغیر اس نے رسان سے جواب دیا اور کرسی کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں چلتا ہوں، مجھے آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔"

"ہاں چلا جا، تجھ جیسے نکموں کے لیے غلامی کرنے والے کو کیا ملوم کہ زمین جائداد کی کیا اہمیت ہے۔" چودھری کا کچھ بس نہ چلا تو چلّانے لگا۔

"ایسی حکمرانی سے جو آدمی کو اپنی خواہشات کا غلام بنا دے، وہ نوکری بہتر ہے جو انسان کو انسانیت کے دائرے میں رکھے۔" کسی کی کیا مجال تھی کہ چودھری کے سامنے اتنا کچھ کہہ سکتا لیکن وہ مراد شاہ تھا، اس کی اولادوں میں سے وہ واحد اولاد جسے اس کے بعد اس کی گدی سنبھالنی تھی، چنانچہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا اور مراد شاہ اسے خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی چودھری تن فن کرتا ہوا اپنے کمرے میں واپس گیا اور لنڈا کا نمبر ملایا۔

"اوہ چودھری ڈارلنگ! آئی ایم رئیلی سوری کہ رات میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکی لیکن آئی ہوپ کہ تم میری مجبوری کو سمجھ سکتے ہو۔" لنڈا نے اس کی آواز سنتے ہی اپنے ساحرانہ لہجے میں بولنا شروع کر دیا لیکن فی الحال چودھری کو اس کی معذرت سے کوئی غرض نہیں تھی چنانچہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

"ان باتوں کو رہنے دو لنڈا... فی الحال میں نے تمہیں ایک دوسرے کام سے فون کیا ہے۔"

"ایسا کون سا کام ہے جو تم اتنی صبح مجھے فون کر بیٹھے؟" لنڈا چونکی۔

"مجھے اپنی جس بیٹی کی تلاش ہے، وہ یہاں نیویارک میں موجود ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اسے انجام تک پہنچانے میں میری مدد کرو۔" اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"دیکھو چودھری! یہ پاکستان نہیں ہے کہ یہاں کوئی بھی غیر قانونی کام اتنی آسانی سے ہو سکے۔ یہاں ہمیں اپنے تنظیمی معاملات ہی بہت دیکھ بھال کر چلانے پڑتے ہیں اس لیے ہم غیر ضروری معاملات میں بالکل بھی نہیں پڑتے۔ خود تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ یہاں ذرا ہاتھ پیر بچا کر رہو ورنہ خود بھی مشکل میں پڑو گے اور ہمیں بھی ڈالو گے۔" لنڈا نے مراد شاہ والی بات ہی اسے ذرا مختلف لہجے اور انداز میں سمجھائی۔

"تم اس معاملے کو نہیں سمجھ سکتیں لنڈا کیونکہ تم چودھری افتخار عالم شاہ نہیں ہو۔ میرے لیے یہ زندگی موت کی طرح اہم بات ہے اور میں کشور کے نظر میں آجانے کے بعد کسی طرح اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر تنظیم اس سلسلے میں میری مدد کرے تو میں اس کے بدلے میں اپنا اگلی دفعہ کا معاوضہ چھوڑنے کو تیار ہوں۔" انتقام کی آگ میں جلتے چودھری نے ایک بڑی پیشکش کی جس پر لنڈا سوچ میں پڑ گئی۔ رقم کی تو اس کے لیے اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن چودھری کو زیرِ بار کرنے کا ایک موقع مل رہا تھا تو اسے نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں تھا کیونکہ اس احسان کے بدلے وہ مستقبل میں اس سے اپنے دوسرے کئی کام نکلوا سکتے تھے۔

"تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم نے اپنی بیٹی کو کب اور کہاں دیکھا تھا پھر میں تمہیں کوئی مشورہ دے سکوں گی۔" اس نے دریافت کیا تو چودھری اسے تفصیل بتانے لگا۔

"یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں شبہ ہے کہ تمہارا بیٹا کشور سے رابطے میں ہے تو سب سے پہلے ایک کام یہ کرو کہ اس کے ٹیلی فون کی سی ایل آئی پر موجود سارے نمبرز نوٹ کر کے مجھے بھیج دو۔ میں ان نمبرز کی مدد سے کشور کو تلاش کرنے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ اس کا ایڈریس مل گیا تو میں تمہاری کسی ایسی پارٹی سے ملاقات کروا دوں گی جو اس قسم کے کام کرتی ہے جو تم کروانا چاہتے ہو۔ لیکن یہ سب میں ذاتی سطح پر کروں گی اور تنظیم اس میں انوالو نہیں ہوگی اس لیے مالی معاملات تمہیں خود دیکھنے ہوں گے ... اگر بعد میں کوئی گڑبڑ سامنے آئی تو اس سے بھی تم خود نمٹو گے۔" لنڈا نے اسے راہ سجھانے کے ساتھ ساتھ شرائط سے بھی آگاہ کر دیا۔

"میں راضی ہوں۔" چودھری فوراً تیار ہو گیا۔

"بس تو پھر مجھے ٹیلی فون نمبرز کی لسٹ بھیج دو۔" لنڈا نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد کے سارے مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے۔ اس دن کا اختتام ہونے تک چودھری نہ صرف کشور کا پتا حاصل کر چکا تھا بلکہ اس کے ایک ایسے گینگ سے معاملات بھی طے پا چکے تھے جو انسانی جانوں کی قیمت وصول کر کے انہیں نہایت صفائی سے ٹھکانے لگاتے تھے۔

☆☆☆

جاوید علی دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک عام سا کاغذ تھا جو کسی ایسے رائٹنگ پیڈ سے پھاڑا گیا تھا جو عموماً میڈیسن کمپنیاں اپنی اشتہاری مہم کے لیے مختلف ڈاکٹروں کو تحفے میں دیتی ہیں اور ڈاکٹرز ان پر نسخے لکھ کر مریضوں کو تجویز کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ پر کوئی ڈاکٹری نسخہ نہیں بلکہ ایک چند سطری پیغام لکھا ہوا تھا جس نے اس معمولی کاغذ کو غیر معمولی بنا دیا تھا۔ نیلے بال پوائنٹ کی مدد سے لکھی گئی شکستہ سی تحریر میں اسے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا۔

"جاوید!

تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے جس سے میں نے بہت مختصر عرصے میں بے تحاشا محبت کی اور بے شمار خواب دیکھے کہ میں تمہارے سنگ اپنی زندگی کیسے بتاؤں گی لیکن میرا ہر خواب میری ذات کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ ظالموں نے میرا جو حال کیا، اس کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تمہاری زندگی میں شامل ہونے کی تو کیا، زندہ رہنے کی بھی خواہش کر سکوں۔ چنانچہ میں نے اس دنیا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تم سے اپنے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مطالبہ نہیں کرتی لیکن یہ خواہش ضرور رکھتی ہوں کہ تم ساری زندگی وطنِ عزیز کے دشمنوں سے برسرِپیکار رہو گے۔

فقط تمہاری شازمین جس کا جسم بے شک تمہارا نہ رہ سکا لیکن جس کے دل کی ہر دھڑکن میں بس تم ہو۔"

یہ خط اسے کچھ دیر قبل ہی اس اطلاع کے ساتھ دیا گیا تھا کہ شازمین نے اسپتال میں خودکشی کر لی ہے۔ خودکشی کے لیے اس نے سیرپ کی ایک بوتل کو استعمال کیا تھا اور بوتل توڑ کر اس کے تیز دھار نکیلے شیشے سے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ لی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی اور بہت بہتر حالت میں ہونے کے باعث ڈیوٹی نرس اسے وہاں تنہا چھوڑ کر لنچ کے لیے چلی گئی تھی۔ وہ لنچ کر کے واپس آئی تو شازمین اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور اسے تمام تر کوششوں کے باوجود بچایا نہیں جا سکا تھا۔ شازمین کے تکیے کے نیچے سے نکلنے والے تہ شدہ کاغذ کو دیکھ کر نرس نے بتایا تھا کہ کاغذ اور قلم آج صبح ہی شازمین نے اس سے لیے تھے اور یہ بہانہ بنایا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں آنے والے کسی شاعرانہ خیال کو صفحے پر منتقل کرنا چاہتی ہے۔

اپنا کام کرنے کے بعد اس نے بال پوائنٹ نرس کو واپس کر دیا تھا جبکہ کاغذ تہ کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ نرس نے اس سے فرمائش بھی کی تھی کہ وہ اپنی شاعری اسے بھی سنائے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ فقط اس کے محبوب کے لیے ہے۔ اس جواب کے بعد نرس مزید اصرار نہیں کر سکی تھی لیکن بعد میں یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ شازمین اس روز خودکشی کا تہیہ کر چکی تھی اور مرنے سے پہلے اس نے جاوید علی کو آخری بار مخاطب کیا تھا۔ سی ایف پی والے اسپتال میں زیرِ علاج شازمین کی خفیہ طور پر خبرگیری کرتے رہے تھے اس لیے انہیں فوراً ہی اس واقعے کی اطلاع مل گئی اور انہوں نے وہ خط وصول کر کے جاوید علی تک پہنچا دیا۔ شازمین کی لاش البتہ اس کے بھائیوں نے وصول کی تھی جو اپنے والد نواب نوازش علی کی تدفین کے لیے کراچی پہنچنے کے بعد وہیں مقیم تھے۔ انہوں نے شازمین کی خودکشی پر اسپتال میں خاصا ہنگامہ کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ڈیوٹی نرس معطل کر دی گئی تھی جو ڈیوٹی آورز میں مریضہ کو تنہا چھوڑ کر لنچ کے لیے جانے جیسی غلطی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اس نرس کا بعد میں کیا ہوتا، وہ ڈیوٹی پر بحال ہوتی یا فارغ کر دی جاتی، اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ پھولوں سی لڑکی شاز مین جسے ظالموں نے مسل ڈالا تھا، اپنے ہاتھوں اپنی زندگی سے محروم ہو گئی تھی اور جاوید علی کے دل پر ایک کبھی نہ بھرنے والا گھاؤ لگا گئی تھی۔ نوجوان جاوید علی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ شاز مین جس تیزی سے اس کا پہلا پیار بن کر اس کی زندگی میں آئی تھی، اسی تیزی سے نکل بھی گئی تھی لیکن اس کے یوں چلے جانے پر وہ جتنی شدت سے تکلیف محسوس کر رہا تھا، اس سے یوں لگ رہا تھا کہ شاز مین کبھی اس کے دل سے نہیں نکل سکے گی اور وہ ساری زندگی اس زخم سے تڑپتا رہے گا۔

''حوصلہ کرو ینگ مین! جنگ کسی بھی درجے پر لڑی جا رہی ہو، اس میں حصہ لینے والوں کو ہر طرح کے نقصان کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بھی تسلی اور دلاسے سے تمہارے غم کا مداوا نہیں ہو گا۔ میں تم سے اس نقصان کے لیے دکھی نہ ہونے کا مطالبہ بھی نہیں کر رہا لیکن تمہیں حوصلہ ضرور کرنا ہو گا کیونکہ بے حوصلہ سپاہی وطن کے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور شاز مین نے اپنے خط میں جو آخری خواہش ظاہر کی ہے، وہ یہی ہے کہ تم دفاعِ وطن کے لیے ہمیشہ ڈٹے رہو گے۔'' وہ اس چند سطری خط کو کئی بار پڑھ لینے کے باوجود دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ایک بار پھر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یونٹ انچارج اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جاوید علی کو اپنے استغراق میں اس کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی تھی لیکن جب وہ بولا تو اسے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ساتھ ہی اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی۔

''میں ٹھیک ہوں سر! بس اچانک لگنے والے جھٹکے نے دل پر اثر کیا ہے۔ آپ فرمایئے کیسے زحمت کی؟ اگر کوئی کام تھا تو مجھے کال کر لیتے۔ اب تو میں پہلے سے بہت بہتر ہوں اور خود چل کر آپ کے کمرے تک آ سکتا ہوں۔'' آنسوؤں کی نمی کو اپنے اندر اتار کر اس نے بڑے حوصلے سے انچارج سے کہا۔

''مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ میں اپنے ماتحتوں کو اپنی فیملی کی طرح سمجھتا ہوں اور اپنے کسی فیملی ممبر کی خبر گیری کرنے میں زحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انچارج نے رسان سے اسے جواب دیا۔

''شکریہ سر! میں نے پہلی بار آپ لوگوں کے ساتھ کام کیا اور مجھے بالکل نہیں لگا کہ میں کسی دوسرے شہر میں اپنے یونٹ سے ہٹ کر کام کر رہا ہوں۔'' انچارج کے مہربان رویے پر اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

''شہر اور یونٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم سب سی ایف پی کے اہلکار ہیں اور پاکستان کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ لاہور سے میجر ذیشان کا فون آیا تھا۔ لاہور سے ایک اسپیشل ایجنٹ کراچی آ رہا ہے بلکہ آ چکا ہے اور ڈرائیور اسے ایئرپورٹ سے لے کر یہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔ تمہارے کارناموں کی خبر لاہور پہنچتی رہی ہے چنانچہ میجر ذیشان کے مطابق وہ اسپیشل ایجنٹ تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں پہلے سے انفارم کر دوں تاکہ اس کے پہنچنے سے پہلے تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسا بہادر سپاہی کسی کے سامنے اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرے گا، خصوصاً ایک اسپیشل ایجنٹ کے سامنے جو یقیناً تمہارے کارناموں سے متاثر اور خوش ہے۔'' انچارج نے اسے اپنے وہاں آنے کی وجہ بتائی تو اس کے دل میں انچارج کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔ وہ ظاہری زخموں کے علاوہ انسانی جذبات کا بھی خیال رکھنے والا آدمی تھا اور ایسے لوگ بڑے نایاب ہوتے ہیں۔

''میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کروں گا تو شاید یہ بات آپ کو زیادہ اچھی نہیں لگے گی۔ لیکن پھر بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں دل کی گہرائیوں سے آپ کا مشکور ہوں اور آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' جاوید علی نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔ انچارج نے کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے پُرجوش انداز میں اس کے شانے پر تھپکی دی۔

''آؤ، ہم مل کر اس اسپیشل ایجنٹ کا استقبال کرتے ہیں۔'' وہ جاوید علی کو لیے باہر نکل گیا۔

''گیسٹ پہنچ گیا ہے سر!'' وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے ایک اہلکار نے انچارج کو اطلاع دی۔ انچارج کے قدم مزید تیز ہو گئے اور اس نے جاوید علی سمیت باہر کا رخ کیا۔ جاوید علی بھی بھرپور ملنے والی طبی سہولیات کی وجہ سے بہت بہتر ہو چکا تھا اس لیے انچارج کا پورا پورا ساتھ دیا۔ عمارت کے پورچ میں انہوں نے لمبے قد کے ایک آدمی کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ گوری رنگت اور تیکھے نقوش والے اس آدمی نے نیلی جینز پر سیاہ رنگ کی چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کا خوب صورت جسم واضح ہو رہا تھا اور صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ورزش وغیرہ کرنے کا عادی ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا تو اس کا ہر قدم نپا تُلا تھا۔ جاوید علی اور اس کے ساتھ موجود کراچی یونٹ کا انچارج آنے والے کی شخصیت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ حقیقتاً وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور اسے سامنے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہالی ووڈ کی کسی ایکشن مووی کا ہیرو اسکرین سے ہٹ کر ان کے سامنے آ گیا ہے۔

''کراچی میں خوش آمدید۔'' یونٹ انچارج نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے نہایت گرم جوشی سے تھام لیا گیا۔ اس کے بعد جاوید علی کی باری آئی۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے مقابل کے ہاتھ کی مضبوطی کو بہ خوبی محسوس کیا۔

''یہ یقیناً جاوید علی ہیں جن سے ملنے کی میں نے خواہش ظاہر کی تھی۔'' وہ دیکھ جاوید علی کو رہا تھا لیکن مخاطب یونٹ انچارج سے تھا۔

''یس سر! یہ جاوید علی ہی ہے۔ اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر دشمن کے دانت کھٹے کرنے والا ہمارا قابلِ فخر ساتھی۔'' انچارج نے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔

''میں عادل خان ہوں۔ ایک اہم مشن پر کراچی آیا ہوں۔ امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر آپ لوگ مجھ سے تعاون کریں گے۔'' آنے والے نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں سر! ہم ہر وقت اور ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔ فی الحال آپ اندر چلیں اور چاہیں تو فریش بھی ہو جائیں۔ پھر آپ کی مرضی کے مطابق ہم ساتھ بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوں گے۔'' مؤدبانہ لہجے میں بولتا یونٹ انچارج اس وقت بہترین میزبان کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے کہنے پر عادل خان نے پورچ سے قدم آگے بڑھائے اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اندرونی عمارت میں داخل ہوا۔

''میں چائے سے پہلے فریش ہو کر چینج کرنا پسند کروں گا۔ امید ہے کہ اتنا انتظار آپ کے لیے زحمت نہیں بنے گا۔'' اندر پہنچتے ہی عادل خان نے فرمائش کی۔

''شیور سر! میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دیتا ہوں۔ آپ کا بیگ بھی وہیں پہنچا دیا جائے گا۔ آپ اطمینان سے ری فریش ہوں، آپ کے انتظار سے زحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انچارج نے خوش خلقی سے جواب دیا اور جاوید علی کو واپس اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کر کے خود عادل خان کے ہمراہ رہا۔

''جاوید...'' عادل خان نے اچانک واپس جاتے ہوئے جاوید علی کو پکارا۔

''یس سر!'' اب تک بالکل خاموش جاوید علی نے مؤدبانہ لیکن مستعدی سے اس کی پکار کا جواب دیا۔

''چائے پر تم بھی ہمیں جوائن کرنا۔'' اس نے فرمائش کی۔

''رائٹ سر!'' جاوید علی بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔

اسے ہدایت دینے کے بعد عادل خان، انچارج کے ساتھ اس کی راہنمائی میں آگے بڑھ گیا۔ انچارج کمرے تک اسے چھوڑ کر واپس پلٹ گیا اور ایک شخص نے اسے اس کا بیگ بھی پہنچا دیا تو اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اطمینان سے اپنے بیگ سے ایک آپریٹس نکالا۔

''ٹیسٹ کامیاب رہا۔ کافی دیر سامنے رہنے کے باوجود وہ مجھے نہیں پہچان سکا۔ اب میں نے اسے پھر اپنے ساتھ چائے پینے کی آفر کی ہے۔ چائے پینے کے دوران میں اس سے زیادہ سے زیادہ گفتگو کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ مجھ میں شناسائی کی کوئی جھلک ڈھونڈ پاتا ہے یا نہیں۔'' آپریٹس منہ کے قریب لا کر وہ بہت آہستہ آواز میں کسی کو بتانے لگا۔

''بہت خوب! اگر وہ تمہیں نہیں پہچان سکا تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم بہت پرفیکشن کے ساتھ عادل خان کے روپ میں ڈھل چکے ہو اور کسی اور کے لیے بھی تمہیں شناخت کرنا ممکن نہیں ہو گا۔'' اس کی رپورٹ سن کر دوسری طرف سے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

''پہلے مرحلے کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکے گا اور میں بہت آسانی اور رازداری سے اپنا کام مکمل کر کے لوٹ آؤں گا۔'' اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر بھرے اعتماد کے ساتھ ہونٹوں پر بے حد مطمئن مسکراہٹ بھی تھی۔ جاوید علی کے جل کھا جانے پر اس کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا اور وہ خود کو آزاد فضاؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

''آپ ان پوائنٹس پر اپنے لوگ پہنچا دیں اور پھر انہیں ایکشن میں لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت آسانی سے پورے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے اور وہاں سے ایک بھی فرد باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔'' شیشے کی میز پر کراچی کا تفصیلی نقشہ پھیلا ہوا تھا اور اس نقشے کو درمیان میں رکھے ایک مرد اور عورت ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت سنتھیا جوزف تھی جس کا حلیہ ماضی کی اس سنتھیا سے بہت مختلف تھا جسے ڈاکٹر ماریا کی ماں

ہونے کی حیثیت سے شہر یار کی ساس ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا اور وہ کافی عرصے تک پیر آباد میں رہ کر جنگل میں جاری افیون کی خفیہ کاشت کی نگرانی کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ایک استاد کے روپ میں معصوم ذہنوں میں زہر بھرنے کا کام بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ تو پیر آباد والوں کی قسمت اچھی نکلی کہ ماریا کی حرکات شہر یار کی نظر میں آجانے کے بعد جہاں وہ اپنے انجام کو پہنچی، وہیں سنتھیا کو بھی دوبارہ پیر آباد جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اگر پیر آباد کا کوئی باسی اس وقت اس پُرتعیش ڈرائنگ روم میں بیٹھی سنتھیا کو دیکھتا تو اس کے لیے اسے شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

پلاسٹک سرجری کے ذریعے کی جانے والی .... خدوخال کی تبدیلی سمیت بالوں کی رنگت اور انداز کی تبدیلی نے اسے بالکل نئی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اس نئی شخصیت کے اندر وہی پرانی دشمنی اور نفرت لیے وہ ایک بار پھر اپنے مذموم ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میدانِ عمل میں تھی اور ایک معروف سیاست داں کے ساتھ بیٹھی وہ کام انجام دے رہی تھی جس کے لیے اسے لاہور سے کراچی بھجوایا گیا تھا۔ یہ معروف سیاست داں ریاض انور کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کرنے یا نہ کرنے، دونوں صورتوں میں ہمیشہ میدان سیاست میں ''اِن'' رہتا تھا۔ اس کی اس مقبولیت کے پیچھے جو سب سے بڑی وجہ نظر آتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ ایک نیوٹرل، مخلص اور محبِ وطن آدمی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جس کا ہر طرح کے فلاحی اور امدادی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اس کا ایک اور پلس پوائنٹ تھا۔ لوگ اسے سیاست داں سے بھی زیادہ ایک فلاحی شخصیت کی حیثیت سے جانتے اور پسند کرتے تھے اور اس وقت وہی ملکی فلاح و بہبود کا علمبردار سنتھیا کے مقابل بیٹھا ایک ایسے نقشے کی طرف متوجہ تھا جس پر جابجا سرخ روشنائی سے گول دائرے بنائے گئے تھے۔ سنتھیا نے ان دائروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہی اس سے اپنی بات کہی تھی۔

را کی پاکستان میں موجودگی کا صرف اور صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ اپنی حرکات سے پاکستان کو کمزور کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اہم افسروں اور سیاست دانوں کو پھانس کر ملکی رازوں کے حصول سے لے کر خودکش حملوں اور لسانی فسادات تک سب کچھ کروانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سنتھیا کو اس بار کراچی میں لسانی فساد کروانے کا مشن سونپا گیا تھا۔ مختلف قومیت کے لوگوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بیٹھا کراچی جسے بجا طور پر منی پاکستان کہا جاتا تھا، اس قسم کے فسادات کے لیے آئیڈیل تھا۔ فسادات کا آغاز کروانے کے لیے اس وقت سنتھیا نے جس علاقے کا انتخاب کیا تھا، وہاں ایک مخصوص زبان بولنے والوں کی اکثریت آباد تھی جن کی دوسری زبان بولنے والوں سے سیاسی کشمکش جاری رہتی تھی۔ اس کشمکش کو باقاعدہ لڑائی کا رنگ دے کر وہ لوگ کراچی کے امن کو آسانی سے تہس نہس کر سکتے تھے کیونکہ ایک بار لسانی فسادات پھوٹ پڑتے تو پھر ان کا سلسلہ طویل ہوتا چلا جاتا اور اس سلسلے کو طویل کرنے کے لیے بھی را کی طرف سے کمک ملتی رہتی۔ را کو اس قسم کے کاموں کو انجام دینے کے لیے زیادہ مشکل اس لیے پیش نہیں آتی تھی کہ ان کے پاس بہت سے ایسے وظیفہ خوار موجود تھے جو سوئس بینکوں میں بڑھتے ہوئے اپنے بینک بیلنس کے عوض کتنی ہی معصوم اور بے گناہ زندگیوں کو بھینٹ چڑھا سکتے تھے۔

''ڈونٹ وری میڈم! میں کام کے آدمیوں کو ان جگہوں پر پہنچا کر پورے علاقے کی ناکا بندی کروادوں گا اور آپ دیکھیں گی کہ کوئی انسان تو کیا، چڑیا کا بچہ بھی یہاں سے زندہ باہر نہیں نکل سکے گا۔''

''کوشش کرنا کہ یہاں رہنے والوں کا باہر کی دنیا سے رابطہ کٹ کر رہ جائے۔ اس علاقے کی ٹیلی فون لائنز اور موبائل سگنلز بند کرنے کا بھی انتظام کر لینا تاکہ وہ لوگ بری طرح بلبلا اٹھیں اور انتقاماً خود بھی ہتھیار ہاتھوں میں اٹھالیں۔'' اس نے ایک اور ہدایت جاری کی۔

''علاقے کی لینڈ لائن بند کرنا تو زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ موبائل سروس کو مکمل طور پر بلاک کرنا تھوڑا مشکل ہوگا اور ہم جزوی طور پر ہی یہ کام کر سکیں گے، البتہ اس سے بڑھ کر دو کام اور کیے جا سکتے ہیں۔ اول علاقے کی الیکٹرک سپلائی روک دی جائے گی دوسرے واٹر ہائیڈرنٹس بھی بند کر دیے جائیں گے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ گھروں میں رہنے والے لوگ اس کارروائی سے کتنی بری طرح چراغ پا ہوں گے، آپ خود بعد میں ملاحظہ کر لیں گی۔'' وہ گھر کا بھیدی تھا جو اچھی طرح جانتا تھا کہ لوگوں کی کس رگ کو دبایا جائے تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، اس لیے لنکا ڈھانے کا کام خوب اچھی طرح انجام دے رہا تھا۔

''گڈ! میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ بہتر تجویز ہے۔ پریشانی اور تکلیف کا شکار اہلِ علاقہ جب فون کالز اور میسجز کے ذریعے دوسرے علاقوں میں مقیم اپنے عزیز و اقارب کو اپنے حال سے آگاہ کریں گے تو پورے شہر بلکہ ملک میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھونچال سا آجائے گا اور لوگ ایک بار پھر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حکومتی ادارے ہمارے لیے بالکل ناکارہ ہیں۔ پھر احتجاجاً پولیس اور دیگر متعلقہ اداروں کے خلاف پُرتشدد احتجاج کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔'' وہ گویا تصور کی آنکھ سے یہ سب دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے میڈم لیکن خیال رکھیے گا کہ اس ساری کارروائی پر بہت بڑی رقم خرچ ہوگی۔ کام کے بندے ہائر کرنے کے علاوہ معقول اسلحے اور گولہ بارود کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔''

''پہلے کب تمہیں رقم کے سلسلے میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے جو اب پریشان ہو رہے ہو؟ تم اپنا کام شروع کرو، رقم تمہیں مل جائے گی۔'' ریاض انور لالچی فطرت کا آدمی تھا جو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی رقم کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکا... اور سنتھیا کو اس کا مطالبہ کرنا برا لگا تھا اس لیے سخت لہجے میں اسے جواب دیا۔

''کام تو میں چٹکی بجاتے میں کروا دوں گا۔ آپ بتائیں کہ آپ کب اس کام کو کروانے کی خواہش مند ہیں؟'' اس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر ریاض انور نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔

''صرف دو دن بعد۔ کر لوگے نا تم دو دن میں سارا انتظام؟'' سنتھیا نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

''بالکل ہو جائے گا میڈم۔'' ریاض انور نے اعتماد سے جواب دیا۔

''کارروائی میں حصہ لینے والے بندے کام کے ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جدید اسلحہ تو فراہم کر دیں لیکن ان لوگوں کو اس کا استعمال ہی معلوم نہ ہو۔ اس آپریشن میں ہم ایسا اسلحہ استعمال کروانا چاہتے ہیں جو یہاں کی پولیس اور رینجرز نے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح پبلک کو یہ خاموش میسج جائے گا کہ ان کے تحفظ کے ذمے دار ادارے کتنے ناکام اور نااہل ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر ریاض انور کو ہدایت کی۔ اس آپریشن پر را کو جتنا خرچ کرنا پڑتا، اس حساب سے وہ نتائج حاصل کرنے کے بھی خواہش مند تھے۔ آپس میں لڑتی ہوئی عوام اور بے بھروسا حکومتی ادارے ان کے جذبۂ نفرت کی تسکین کے لیے بڑے اہم تھے اس لیے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا جا رہا تھا۔ سنتھیا جو درحقیقت موساد کی ایجنٹ تھی اور را میں رہ کر بھی موساد سے وفاداری نبھاتی رہتی تھی، اس آپریشن کے لیے سو فیصد را سے مخلص و متفق تھی کیونکہ وفاداری چاہے کسی سے بھی نبھائی جاتی، مشن دونوں کا ایک ہی تھا۔ پاکستان کو کمزور سے کمزور تر کر کے اسے ایک ناکام ریاست ثابت کرنا۔

''اس بات کی آپ فکر ہی نہ کریں میڈم! میرے پاس ایسے ایسے کام کے بندے ہیں کہ عام ہتھیار تو کیا ایٹم بم کو بھی آپریٹ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی پولیس اور رینجرز ان کے آگے کیا بیچتی ہے، اگر آرمی بھی مقابلے پر آجائے تو منہ کی کھا کر جائے گی۔'' ریاض انور اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے احمقانہ حد تک پُرجوش ہو گیا لیکن سنتھیا کو ان مقامی ایجنٹوں سے جو کہ دراصل اپنی زمین کے غدار ہوتے تھے، نمٹنے کا طویل تجربہ تھا۔ اس لیے ریاض انور کی شیخی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی اور پُرسوچ انداز میں بولی۔

''کل ہمارا ایک اہم بندہ کراچی پہنچ رہا ہے۔ اس کی تربیت پر ہم نے بڑا روپیا اور وقت خرچ کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جب وہ ہمارے لیے کام کرنا شروع کرے گا تو ہر طرف تہلکہ مچا کر رکھ دے گا۔ میں اس بندے کو تمہارے پاس بھجواؤں گی۔ تم اس کارروائی کے لیے اس سے بھی مشورہ کر لینا۔''

''ٹھیک ہے میڈم... جیسی آپ کی مرضی۔ اگر آپ مجھ پر مکمل اعتماد کرنے میں حرج سمجھتی ہیں تو میں آپ کے نمائندے کے مشوروں پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' کسی دوسرے آدمی کی آمد کا سن کر ریاض انور کا منہ لٹک گیا۔ وہ لالچی آدمی اس حد تک بدطینت تھا کہ مادرِ وطن کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے بھی ہیرا پھیری کرنے سے باز نہیں آتا تھا جن سے دونوں ہاتھوں سے روپیا سمیٹنے میں مصروف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے جو مشن سونپا جا رہا ہے، اس پر کتنی بڑی لاگت آئے گی۔ اس لاگت کو مزید بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کے بعد وہ اچھی خاصی رقم مار سکتا تھا لیکن کسی دوسرے بندے کی موجودگی کے باعث یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ مایوس ہو گیا۔

''دل برداشتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دوسرے آدمی کی شمولیت کا فیصلہ تم پر عدم اعتماد کی وجہ سے نہیں بلکہ معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر کیا ہے۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانچ لیں گے کہ وہ آدمی ہمارے لیے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تم بہرحال یہ اطمینان رکھو کہ وہ تمہارے سر پر مسلط نہیں رہے گا بلکہ تمہارے انڈر میں کام کرے گا۔'' سنتھیا نے اسے اطمینان دلایا۔

''تھینک یو میڈم!'' ریاض انور خوش ہو کر بولا۔ ''میں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی پوری پوری کوشش

کروں گا۔'' غیر ملکی آقا کے تلوے چاٹتے ریاض انور کو کہیں دور تک بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ایک ملک دشمن کے اعتماد پر پورا اترنے کا وعدہ کرتے ہوئے لاکھوں لوگوں کے اعتماد کا خون کر رہا ہے جو اسے کسی ہیرو کی طرح سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور اس کی بے تحاشا عزت کرتے تھے۔

☆☆☆

''آپ کو اتنے سال بعد وطن واپس آ کر کیسا لگ رہا ہے؟'' شوخ رنگ کے لباس میں میک اَپ کے جملہ لوازمات سے لیس چلبلی سی رپورٹر نے اس سوال کے ساتھ مائک کا رخ سلیم عرف سلو کی طرف کیا تو اس نے پہلے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نروٹھے پن سے بولا۔

''ظاہر ہے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہاں میرے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار ہیں جن سے مل کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔''

''آپ کی خوشی میں ہمارا چینل بھی شریک ہے اور پورے پاکستان کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی ٹیم کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے ہوں گے لیکن دیکھیے نا، یہ پورا ملک بھی تو آپ کے لیے ایک فیملی کی طرح ہی ہے اس لیے ہم اپنے چینل کے ذریعے آپ کی اس فیملی کے افراد کی آپ سے ملاقات کروانا چاہتے ہیں۔'' زیرک رپورٹر نے فوراً ہی سلو کی بے رخی کو بھانپ لیا اور چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت دینے لگی۔ اصل میں جب سے سلو اور اس کے ساتھ بھارت سے آنے والے دوسرے پاکستانی قیدیوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، نیوز چینلز کے نمائندے کسی بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگ گئے تھے اور اب یہ رپورٹر اپنے کیمرا مین کے ساتھ اس کی جھگی میں بھی چلی آئی تھی جس کی حالت گزرے برسوں میں اور بھی ابتر ہو گئی تھی اور غریب والدین اس جھگی سے بھی زیادہ خستہ حال نظر آتے تھے۔

بھارتیوں کی تربیت کے نتیجے میں اینگری ینگ مین بن جانے والا سلو گھر اور ماں باپ کی حالت دیکھ کر مزید برانگیختہ ہو گیا تھا اور اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں سے نفرت مزید گہری ہو گئی تھی۔ اب یہ نیوز رپورٹر اسے بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ پاکستان کے سارے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں تو اس کے یقین کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ اس کا موقف تھا کہ اگر کسی کو اس کا خیال ہوتا تو اس کی زندگی کے اتنے بہت سارے سال بھارت کی سرزمین پر نہ گزرتے اور اس کی رہائی کی کوشش کی جاتی یا پھر کم از کم اس کے ماں باپ کا ہی کوئی پرسانِ حال ہوتا جو غربت اور بیٹے کی جدائی کے غم میں وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس نے زبان سے اپنا یہ موقف ظاہر نہیں ہونے دیا اور بات بناتے ہوئے بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ میرے وطن کے لوگ میری رہائی پر خوش ہوں گے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے لیکن حکومت کا کام ہے کہ کھلے سمندر سے گرفتار ہو جانے والے ماہی گیروں کی خبر گیری کرے اور انہیں اتنے سال بھارتی جیلوں میں سڑنے نہ دے کیونکہ جب روزی کی تلاش میں جانے والا ماہی گیر گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے اس کے گھر والے بھوک سے مرنے لگتے ہیں۔'' سلو کے لہجے میں کرب سا تھا۔

''یہ شخص اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا ہے۔ ہماری حکومت نے کبھی بھی اور کہیں بھی پھنسے ہوئے اپنے شہریوں کی مدد کے لیے کوئی موثر کردار ادا نہیں کیا ہے۔ ایسے میں انسان کے دل میں شکایت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔'' ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے جاوید علی نے سلو کا جواب سن کر تبصرہ کیا۔

''یہ صرف شکایت نہیں ہے جاوید! یہ اس نفرت کا بہت معمولی سا اظہار ہے جو بھارتیوں نے اس کے دل و دماغ میں بھر دی ہے۔ تم اس شخص کی آنکھوں کو غور سے دیکھو۔ ان میں کتنی نفرت اور زہر بھرا ہوا ہے۔'' جاوید علی کے قریب ہی بیٹھے عادل خان نے جوابی تبصرہ کیا تو وہ قائل ہونے والے انداز میں خاموش ہو گیا اور توجہ ٹی وی اسکرین پر مرکوز کر لی جہاں رپورٹر سلو سے نیا سوال کر رہی تھی۔

''یہ بتائیں کہ بھارت میں آپ کا وقت کیسا گزرا؟ کیا انتہائی کم عمر ہونے کے باوجود وہاں کی جیل میں آپ پر سختی کی گئی؟'' نیوز رپورٹر وہ سوالات کر رہی تھی جو سلو کی شخصیت کو کھول کر سامنے لانے میں مدد دے سکیں۔ یہ سوال نامہ اسے کہیں اور سے مرتب شدہ حالت میں ملا تھا۔ دراصل سلو کے اس مختصر سے انٹرویو کے پیچھے بی الیف بی کا ہاتھ تھا۔ اس انٹرویو کا انتظام کثیر المقاصد نتائج کے حصول کے لیے کیا گیا تھا۔ پہلا مقصد تو سلو کی ذہنی گرہوں کو سامنے لانا تھا، دوسرے میڈیا کے گھیرے میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر محدود رہنے پر مجبور تھا اور فوری طور پر ادھر ادھر نہیں ہو سکتا تھا۔ تیسرے بھارت کی طرف سے جذبۂ خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ماہی گیروں کی رہائی کو ایک بڑی خبر بنا دینے کے نتیجے میں سلو کا چہرہ ملک بھر کے عوام کے لیے ایک دم ہی شناسا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اگر وہ کہیں کسی تخریبی کارروائی میں ملوث پایا جاتا تو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کا بہت امکان تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے شناخت کر لے گا۔ اگر وہ اپنی شناخت میں تبدیلی کر کے کسی کارروائی میں حصہ لینا چاہتا تو اس کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوتی۔ بہر حال، یہ سارے احتیاطی اقدامات تو صرف اس لیے کیے گئے تھے کہ اگر کبھی خدانخواستہ سلو سی الیف پی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو اس پر گرفت کرنے کے لیے کوئی تو سبیل بنے ورنہ تو اسے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی خفیہ نگرانی میں لے لیا گیا تھا۔

''بھارت میں میرا وقت اس حساب سے بہت تکلیف میں گزرا کہ میں اپنے گھر والوں سے دور تھا اور ہر لمحے مجھے ان کی یاد ستاتی رہتی تھی لیکن جہاں تک جیل میں مجھ پر سختی یا تشدد کی بات ہے تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ کم عمری کی وجہ سے مجھے بڑی رعایت دی جاتی تھی۔ کھیل اور تفریح کے مواقع بھی ملتے تھے لیکن قید تو بہر حال قید ہوتی ہے، جسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں خوش ہوں کہ بھارت نے خیر سگالی کے اظہار کے لیے مجھے اور میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی آزاد کر دیا ہے ورنہ معلوم نہیں ہمیں اور کتنے سال وہاں رہنا پڑتا۔'' سلو کے لب و لہجے سے بھارت کے لیے شکر گزاری ٹپک رہی تھی جو خاصی معنی خیز تھی ورنہ اس سے قبل جو بھی لوگ بھارتیوں کی قید سے آزاد ہو کر آئے تھے، وہ وہاں کی جیلوں میں خود پر روا رکھے گئے ظلم و ستم کا ہی ذکر کرتے تھے۔ بھارتی سورما بے ضرر و غریب ماہی گیروں پر بھی تفتیش کے نام پر ایسا ظلم و ستم کرتے تھے جیسے انہوں نے کسی بڑے دہشت گرد کو گرفتار کر رکھا ہو۔ غربت کے مارے یہ عام سے لوگ ان مظالم سے بے حد بری حالت کو پہنچ جاتے تھے اور اکثر کا تو ذہنی توازن ہی بگڑ جاتا تھا۔

''یہ دیکھو، اسے کہتے ہیں برین واشنگ۔ مجھے یقین ہے کہ واقعی وہاں اس لڑکے کو بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہو گا لیکن صرف اس لیے کہ بعد میں اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔'' عادل خان نے دانت بھینچتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی اتنی زبردست طریقے سے برین واشنگ کی گئی ہے کہ یہ اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنے کے باوجود چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا ہے۔'' جاوید علی نے اس سے اتفاق کیا۔ ادھر ٹی وی اسکرین پر اب سلو کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی دکھایا جا رہا تھا اور رپورٹر ان سے ان کے تاثرات معلوم کر رہی تھی۔ برسوں کے بعد بیٹے کی شکل دیکھنے والے والدین اسے سامنے پا کر اتنے خوش تھے کہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بار بار رونے لگتے تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے جاوید علی کو اپنے دل میں گہرا تاسف محسوس ہوا۔ سلیم عرف سلو جس حالت میں اور جن ارادوں کے ساتھ پاکستان آیا تھا، اس کا انجام اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ اپنے انجام کو پہنچتا تو برسوں بعد خوشی کی شکل دیکھنے والے اس کے والدین پر کیا گزرتی۔ جاوید علی کو لگا کہ اگر اسے سلو کے وجود میں گولیاں اتارنے کا کام انجام دینا پڑا تو ایک بار تو ضرور ہی اس کا ہاتھ کانپ جائے گا۔ صرف اور صرف ان دو بوڑھوں کی وجہ سے جو آج خوش تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اپنی سوچوں میں گھرے اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ٹی وی اسکرین پر چلنے والا منظر بدل چکا ہے اور سلو کے انٹرویو پر مشتمل رپورٹ کے اختتام پر چینل کے نیوز روم سے دوسری خبریں نشر کی جانے لگی ہیں۔

''کچھ نہیں سر! بس اس شخص کا چہرہ اپنے ذہن میں بٹھا رہا تھا۔'' اس نے عادل خان کے سامنے اپنے اصل احساسات کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اس نے بصد اصرار خود عادل خان کے اس مشن میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ عادل خان اس کی فٹنس کی وجہ سے تشویش کا شکار تھا اس لیے بہت مشکل سے راضی ہوا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ فی الحال وہ اس کے ساتھ رہ کر حالات پر نظر رکھے۔ فیلڈ میں اسے اتارنے یا نہ اتارنے کا فیصلہ وہ خود بعد میں اپنی صوابدید پر کرے گا۔ مشکل سے راضی ہونے والے عادل خان کے سامنے سلو کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والے نرم گوشے کا اظہار کر کے وہ خود کو اس مشن سے ڈراپ کر دیے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں ابھی اسپتال میں موجود شاز مین کا زخم زخم وجود اور اس کا آخری خط بالکل تازہ تھا اور بھارتی سورماؤں سے وطن عزیز کی خاطر ٹکرانے کے جذبے کے ساتھ ذاتی انتقام کی تپش بھی شامل ہو گئی تھی۔ یہ تپش اتنی شدید تھی کہ وہ اب کبھی بھی نہ تو خود چین سے بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی بھارتیوں کو بیٹھنے دے سکتا تھا۔

☆☆☆

''بیٹھو جوان! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ عام طور پر میں اتنی رات گئے کسی سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتا لیکن تم سے ملاقات ایسی جگہ سے طے کی گئی تھی کہ میرے لیے وقت کی کمی کے پیش نظر انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔'' قیمتی

سگار منہ میں دبائے ریاض انور نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اسے بیٹھنے کی پیشکش تو ضرور کی لیکن یہ جتانا ضروری سمجھا کہ وہ بے وقت آیا ہے۔

”مجھے بھی شوق نہیں ہے کہ ہر ایرے غیرے سے ملتا پھروں۔ اوپر والوں کا آرڈر تھا اس لیے ادھر آ گیا ہوں ورنہ دن بھر الابلا چینل والوں کو بھگتاتے بھگتاتے دماغ چٹنی ہو گیا ہے۔ اوپر سے آرڈر نہیں ہوتا تو اس وقت اپن بھی آرام سے اپنے گھر میں سو رہا ہوتا۔“ نوجوان نے اس کے رعب میں آئے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بغیر جواب دیا۔

”میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔“ ریاض انور اس کا انداز دیکھ کر ذرا محتاط ہوا۔ ”گزرے چند برسوں میں اتنے چینلز کھلے ہیں کہ ان کے نام بھی یاد رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن ہر ایک کا خیال رکھنا پڑتا ہے ذرا جو کسی کو نظر انداز کر دو تو وہ ناطقہ بند کر دیتا ہے۔ ہم سیاست داں تو ان کا خصوصی ٹارگٹ ہیں لیکن وہ صرف ہمارے متعلق کتنی خبریں دیں گے اس لیے جو بھی ایشو سامنے آ جائے، اسے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تم بھی اسی لیے گھیر لیے گئے۔“ اپنے تبصرے کے اختتام تک اس کا لہجہ بے حد دوستانہ ہو گیا تھا۔ وہ موقع پرست آدمی تھا اس لیے ضرورت کے مطابق اپنا لب و لہجہ تیزی سے بدل لیا کرتا تھا۔ نوجوان کے تیور دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ دبنے یا رعب میں آنے والا بندہ نہیں ہے اس لیے اس سے دوستانہ رویہ رکھ کر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

”کام کی بات کرو۔ ٹائم بچے گا تو اپن تھوڑی دیر سو بھی لے گا۔“ نوجوان نے جو جواب دیا، اسے سن کر ریاض انور کو احساس ہوا کہ اس کا کسی وکھری ٹائپ بندے سے واسطہ پڑ گیا ہے اس لیے گلا کھنکھارتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”تمہارے میرے درمیان دو طرح کے معاملات ڈسکس ہونے ہیں۔ پہلا معاملہ سیدھا اور مختصر ہے۔ مجھے تمہیں کسی معقول جگہ ملازمت دلوانے کا کہا گیا ہے۔ یہ کام سمجھو کہ ہو گیا۔ کل میں میڈیا پر اس سلسلے میں اعلان کرنے کے ساتھ تمہارے لیے مالی امداد کا بھی اعلان کر دوں گا۔“ ریاض انور اسے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے اس عمل کو کتنا سراہا جائے گا۔ لوگ تعریف کریں گے کہ برسوں بعد بھارتی جیل سے آزاد ہو کر آنے والے نوجوان کا کسی کو خیال آیا تو صرف ریاض انور کو ورنہ حکومت سے تو کسی کو کوئی اچھی امید تھی ہی نہیں۔

”ٹھیک ہے، دوسری بات بولو۔“ نوجوان جو کہ سلو تھا، اس پر ریاض انور کی مہربانی کا مطلق اثر نہیں ہوا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ملازمت یا مالی امداد کا اعلان کوئی بھی کرے، اصل ادائیگی تو اسے اس کے وہی آقا کریں گے جنہوں نے اس کے اندر نفرت اور لالچ بھر کر میدان میں اتارا تھا۔

”دوسرے معاملے میں تمہیں میری مدد کرنی ہو گی۔“ ریاض انور نے لہجہ دھیما کر کے اسے جواب دیا اور پھر وہ نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا جس پر جا بجا سنتھیا نے سرخ دائرے بنا رکھے تھے۔ نقشے کی مدد سے وہ سلو کو سمجھانے لگا کہ وہ وہاں کس قسم کی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس بار سلو سنجیدہ ہو گیا اور پورے انہماک سے اس کی بات سننے لگا۔

”اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟“ تفصیل سننے کے بعد اس نے سوال کیا۔ جواب میں ریاض انور اسے بتانے لگا کہ اس کے پاس کون کون سا اسلحہ کتنی تعداد میں موجود ہے۔

”اسلحے کی پوزیشن ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ ہی ٹائٹ ویژن گاگلز اور دھوئیں کے بموں کا انتظام بھی کر لینا تاکہ ہمارے آدمی اپنا کام صحیح طور پر مکمل کر لینے کے ساتھ ساتھ وہاں سے آسانی سے نکل بھی سکیں۔“ اس نے مشورہ دیا اور پھر مذکورہ علاقے کے ایک ایک چپے کے بارے میں اس طرح ہدایت دینے لگا کہ ریاض انور بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ سلو کی گفتگو سن کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ نہایت کم عمری میں یہاں سے چلا جانے کے بعد ابھی واپس آیا ہے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان گلی کوچوں میں ہی کھیل کود کر بڑا ہوا ہے۔ دراصل اسے دوران تربیت پاکستان کے مختلف شہروں کے بارے میں بہت تفصیل سے معلومات ذہن نشین کروائی گئی تھیں۔ خصوصاً بڑے شہروں کا تو مکمل نقشہ اسے ازبر تھا اس لیے اس وقت وہ ریاض انور سے بڑے اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے نقشے میں مزید دو ایسے مقامات کو نشان زد کیا تھا جنہیں سنتھیا نظر انداز کر گئی تھی۔ مقامات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ کن مقامات پر کس قسم کا اسلحہ اور کن صلاحیتوں کے افراد کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ غرضیکہ وہ گفتگو کے اختتام تک ریاض انور کو بری طرح متاثر کر چکا تھا اور وہ قائل ہو گیا تھا کہ سنتھیا نے اسے یونہی سلو سے ملاقات اور مشورے کے لیے نہیں کہا تھا۔

”کل تین منی ٹرکس اس علاقے میں قائم چیریٹی اسکولوں کے لیے میری طرف سے فرنیچر، کتابیں اور

اسٹیشنری وغیرہ لے کر جائیں گے۔ ان ٹرکوں میں ہی ہم ضروری اسلحہ بھی منتقل کر دیں گے۔ میری ساکھ ایسی ہے کہ کوئی بھی ان ٹرکس کی تلاشی لینے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ ہی بعد میں یہ شک کیا جائے گا کہ اس کام میں میرا ہاتھ تھا۔“ سلو کے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا تو اس نے اطمینان سے سر ہلایا اور ایک دو مزید مشورے دینے کے بعد جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس آپریشن میں اس کی حیثیت فقط ایک مشیر کی سی تھی اور وہ اس میں براہِ راست حصہ نہیں لے رہا تھا کیونکہ شروع کے چند دن اسے اس کے عزیز و اقارب کے ساتھ گزارنے کی اجازت دی گئی تھی۔ البتہ اس دوران اسے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہوئے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہنا تھا۔

☆☆☆

”ہیلو آفتاب! آج اتنی دیر سے جا رہے ہو؟“ وہ دو تین موٹی موٹی کتابیں سنبھالے لائبریری سے باہر آ رہا تھا کہ لارا سے ٹکراؤ ہو گیا جس نے اسے دیکھتے ہی خوش خلقی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ لارا تقریباً چوبیس پچیس سال کی ایک قبول صورت اور سنجیدہ مزاج لڑکی تھی جو اس لائبریری میں ہی ملازمت کرتی تھی اور یہیں مطالعے کی غرض سے مستقل آنے والے آفتاب کی اس سے دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ لارا کے سنجیدہ مزاج اور وسیع معلومات نے اس دوستی کو گہرا کرنے میں خاصی مدد دی تھی اور کبھی کبھار وہ دونوں فرصت ملنے پر ساتھ بیٹھ کر کافی یا موسم کی مناسبت سے کوئی دوسرا مشروب پی لیا کرتے تھے۔

”آج کام کچھ زیادہ تھا اور مجھے ہر حال میں اسے آج ہی نمٹانا تھا اس لیے میں اتنی زیادہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بس اب گھر ہی جا رہا تھا۔“ آفتاب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”تو پھر میرے ساتھ ہی چلو۔ میں بھی گھر ہی جا رہی ہوں۔“ لارا نے اسے پیشکش کی۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب کے پاس اپنی ذاتی سواری موجود نہیں ہے اور حسن اتفاق سے وہ آفتاب کے برابر والے اپارٹمنٹ میں ہی مقیم تھی۔ یہ حسن اتفاق بھی دراصل ان کی دوستی کا ہی نتیجہ تھا۔ اپنے موجودہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے سے قبل آفتاب کشور کے ساتھ جس اپارٹمنٹ میں مقیم تھا، اس کا کرایہ کافی زیادہ تھا جبکہ سہولیات قدرے کم۔ اس پر مستزاد اس کی لینڈ لیڈی خاصی ناک چڑھی عورت تھی جو ہر ہفتے کرایہ وصول کرنے خود آتی تھی اور ساتھ ہی اپارٹمنٹ کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد کوئی نہ کوئی اعتراض کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ اس کا یہ رویہ آفتاب سے زیادہ کشور کے لیے ذہنی کوفت کا باعث بنتا تھا۔ ایک دن لارا کے ساتھ کافی پیتے ہوئے اس نے اس سے اپنی لینڈ لیڈی کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے کسی اور معقول اپارٹمنٹ کی تلاش کا ذکر کیا تو لارا نے اسے اپنے پڑوس کا اپارٹمنٹ خالی ہونے کی اطلاع دی۔ یوں وہ اور لارا لائبریری کے دوست کے ساتھ ساتھ پڑوسی بھی بن گئے۔ کشور کو ان دونوں کی دوستی کا علم تھا لیکن لارا کے باوقار انداز نے اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے وہ اس دوستی پر معترض نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے خوش ہی تھی کہ اسے نیویارک جیسے شہر میں ایک معقول پڑوسن میسر آ گئی ہے۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔ سچ پوچھو تو مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی کہ اتنا تھکا ہوا ہو کر طویل واک کر سکوں۔ اپنے کام کا کچھ حصہ مجھے آج ہی گھر جا کر بھی مکمل کرنا ہے۔“ آفتاب نے اسے جواب دیا اور خوش خوش اس کے ساتھ ہو لیا۔ گاڑی میں لائبریری سے ان کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا راستہ چند منٹوں کا ہی تھا۔ ان چند منٹوں میں ان دونوں کے درمیان کوئی قابل ذکر گفتگو نہیں ہوئی، بس لارا نے اس سے کشور اور امید کی خیریت دریافت کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ فرصت ملنے پر وہ لوگ کسی ویک اینڈ پر ساتھ گھومنے چلیں گے۔ آفتاب نے بھی اس کے اس پروگرام کی تائید کی۔ اتنی دیر میں وہ لوگ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ پارکنگ میں گاڑی روکنے کے بعد وہ دونوں لفٹ کی مدد سے چھٹی منزل پر پہنچے اور پھر لارا اسے ”بائے“ کہتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ میں گھس گئی۔ اس نے بھی اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا جہاں کشور نے امید کو گود میں تھامے اس کا استقبال کیا۔ آفتاب کو اپنی ساری تھکن سیکنڈوں میں دور ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں ایک ریک میں رکھ کر فوراً ہی امید کو گود میں لے لیا اور اسے خوب پیار کرنے لگا۔ وہ بھی باپ کی گود میں آ کر خوب قلقاریاں مارنے لگی۔

”آج آپ نے بہت دیر لگا دی۔“ باپ بیٹی کو آپس میں لاڈ کرتے دیکھ کر کشور نے آہستہ سے شکوہ کیا۔

”میں نے بتایا تو تھا کہ آج کام زیادہ ہے اس لیے دیر ہو جائے گی۔ وہ تو شکر ہے کہ واپسی میں لارا مل گئی اور اس کی گاڑی میں آنے کی وجہ سے میرا تھوڑا سا وقت بچ گیا۔“ اس نے امید کے ساتھ لاڈ کو جاری رکھتے ہوئے کشور کو جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ میری فیلنگز کو سمجھ سکتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب سے مراد بھائی کے گھر پر اباجی سے سامنا ہوا ہے، میں بے حد خوف زدہ ہوگئی ہوں اور ہر وقت یہی لگتا ہے کہ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ جائیں گے۔" اس نے بے چارگی سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ آپ بیکار میں پریشان ہو رہی ہیں۔ چودھری صاحب کتنے ہی غصے والے سہی، نیویارک کی حدود میں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ نتیجے میں وہ خود بھی برے انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔" آفتاب مطمئن تھا اور اسے بھی دلاسا دے رہا تھا۔

"میں اباجی کو آپ سے بہتر جانتی ہوں آفتاب! وہ ہم دونوں کو قبر میں پہنچانے تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔" کشور اس کی تسلی کے باوجود خوف زدہ تھی۔

"اور میرا ایمان ہے کہ طے شدہ وقت سے پہلے ہمیں کوئی بھی قبر میں نہیں پہنچا سکتا اس لیے میں آپ کو ایک بار پھر یہی مشورہ دوں گا کہ پریشان ہونا چھوڑ دیں اور جلدی سے کھانا لگائیں۔ بھوک سے اس غریب کی جان نکلی جا رہی ہے۔" اس نے کشور کی ناک دباتے ہوئے جان بوجھ کر گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"کھانا تیار ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیں میں اتنی دیر میں ٹیبل پر کھانا لگاتی ہوں۔" حسب توقع وہ پچھلا موضوع بھول کر اس کے کھانے کی فکر میں مبتلا ہوگئی اور آگے بڑھ کر امید کو بھی اس کی گود سے لے لیا۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد آرام دہ شلوار قمیص پہن کر ٹیبل پر پہنچا تو کھانا لگ چکا تھا۔ اس نے نہایت رغبت سے کھانا شروع کر دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کشور کی کوکنگ کافی بہتر ہوتی جا رہی تھی اور وہ اچھا خاصا کھانا بنانے لگی تھی لیکن اس سے قبل جب وہ ڈھنگ کا کھانا نہیں بناتی تھی، تب بھی آفتاب اس کا پکایا ہوا کھانا اسی رغبت سے کھاتا تھا کہ کہیں کشور کی دل آزاری نہ ہو۔

وہ محلوں میں رہنے والی شہزادی جس نے شاید کبھی تنکا بھی دوہرا نہیں کیا تھا، جب اس کی خاطر اس کی محبت میں اپنا لائف اسٹائل بدل کر اتنی مشقت اٹھا رہی تھی تو کیا وہ ذرا سا بدذائقہ کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ اور اب تو کشور کی یہ خامی بھی خاصی حد تک دور ہوگئی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر اپنا کام لے کر بیٹھ گیا۔ کشور امید کو اس کے کھلونوں کے ساتھ مصروف کر کے کچن سمیٹنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ امید کو لے کر بیڈ روم میں آئی اور اسے سلاتے سلاتے خود بھی نیند کی وادی میں اتر گئی۔ اپارٹمنٹ میں چونکہ ایک ہی کمرا تھا، اس لیے آفتاب کو بیڈ روم میں ہی اپنا کام کرنا پڑتا تھا۔ کشور اور امید کے سو جانے پر اس نے لائٹیں بند کر دیں اور خود ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرنے لگا۔ کام مکمل ہوگیا تو اس نے فوراً ہی انٹرنیٹ کی مدد سے اسے پاکستان میل کر دیا۔ یہ سارا کام کرتے ہوئے وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کوئی معمولی سی آواز... پیدا ہو کر کشور اور امید کی نیند میں خلل ڈالنے کا سبب نہ بنے۔

احتیاط کے پیش نظر اس نے اپنا موبائل بھی سائلنٹ پر کر دیا تھا۔ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خود بھی سونے کے ارادے سے بیڈ کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی جس کی اسکرین روشن تھی اور کال آنے کا اشارہ مل رہا تھا۔ اس نے اتنی رات گئے کسی کے کال کرنے پر حیرت محسوس کرتے ہوئے موبائل اٹھا لیا۔ اسکرین پر لارا کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ چونک گیا۔ لارا کبھی بھی اسے اتنی رات کو فون نہیں کرتی تھی اور فون کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہے۔

"ہیلو لارا! خیریت تو ہے... تم نے اتنی رات گئے کیوں کال کی ہے؟" لارا کی طرف سے تشویش میں مبتلا اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کہاں تھے تم؟ میں کتنی دیر سے کال کر رہی تھی۔ تم شدید خطرے میں ہو۔ دو افراد تمہارے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور معلوم نہیں کیا کر رہے ہیں۔" لارا نے چیخنے والے لہجے میں اس سے کہا تو وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا۔ فوراً ہی اس کی نظر اس نیلگوں دھوئیں پر گئی جو کی ہول کے ذریعے آہستہ آہستہ اندر داخل ہو کر اپارٹمنٹ میں پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ دھواں کسی بے ہوش کر دینے والی دوا پر مشتمل تھا یا کسی زہریلی گیس کی مدد سے انہیں ہمیشہ کی نیند سلانے کا انتظام کیا جا رہا تھا، وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ اپارٹمنٹ سے نکاسی کا واحد راستہ وہی دروازہ ہے جس سے اندر دھواں پھینکا جا رہا تھا اور دوسری طرف یقیناً کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو کسی صورت انہیں باہر نہیں نکلنے دیتے۔ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ وہ بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ لیکن کوئی ترکیب سجھائی نہیں دی، الٹا پریشانی میں اسے یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ موبائل فون اب تک اس کے کان سے لگا ہوا ہے اور دوسری طرف لارا ہنوز موجود ہے۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

آخری ڈنر

مختار آزاد

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر خواب کا ساگمان ہوتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کا المیہ جس کے دل میں خواہشوں کی دکانیں سجی تھیں... مگر اچانک ہی اس کے حسین سپنے اور خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہوگیا...!

ایک خوبصورت و پرخلوص زندگی کا پروردہ... جس کی زندگی ایک پل میں ختم ہوگئی

میں اپنے دوست جیکی سے ملنے کے بعد اسکول پہنچا اور اب اسکول بس میں سوار ہو کر بیس میل سے زیادہ فاصلہ طے کرتا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔ جیکی بہت قابل لڑکا تھا مگر بہت ہی غریب۔ ان دنوں وہ اسکول کے بعد ایک پرنٹنگ پریس کے لیے جزوقتی طور پر گرافک ڈیزائننگ کر رہا تھا تاکہ گھر کے ساتھ تعلیمی اخراجات پورے کر سکے۔ میں اس کی ذہانت کا اعتراف سچے دل سے کرتا تھا۔ ہم نیویارک کے مضافات میں واقع مڈلٹن ٹاؤن میں رہتے تھے مگر چند ماہ پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی وہ ایڈورڈ ایسٹ منتقل ہوا تھا۔ والدین کے بعد اگر کوئی میرے قریب تھا تو وہ صرف جیکی ہی تھا۔ تقریباً سوا گھنٹے سے اسکول کی بے آرام بس میں لوہے کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ پاؤں بھی سن ہو رہے تھے۔ اس وقت لوہے کی بنی بس تنور کی طرح تپ رہی تھی مگر مجبوری تھی۔ کرائے کے پیسے بچانے اور جیکی سے ملنے کے لیے یہی سب سے سستا نسخہ تھا۔

میں میدان کے قریب بس سے اترا۔ سامنے موریسن ہاؤس نظر آ رہا تھا جسے تین سال سے میں اب اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں۔ والدین کے اچانک قتل کے بعد مجھے آنٹی موریسن نے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا، تب سے وہیں رہ رہا تھا۔ مجھے چھوٹا سا میدان پار کر کے گودام کے قریب سے ہوتے ہوئے گھر پہنچنا تھا۔ اس وقت میں گھر اور گودام سے لگ بھگ فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے مجھے انکل سام کے گھر کے سامنے خالی زمین پر لگی کالی اور زرد دھاریوں والا فیتہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پولیس نے فیتہ لگا کر اس مقام کو محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی، جہاں سے تین روز پہلے صبح سویرے ٹامی کی لاش ملی تھی۔ ٹامی قصبے کا معروف ریستوران چلاتا تھا۔ برٹ اس کا پارٹنر تھا۔ میری نظریں فیتے پر جمی ہوئی تھیں۔

ابھی میں چلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ عقب سے کسی گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا اور سمٹ کر ایک طرف کو ہو گیا۔ وہ سیارہ رنگ کی کار تھی جو چھوٹی سڑک سے ہوتی ہوئی آگے بڑھی اور دھاری دار فیتے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ گاڑی میں سے ٹامی کا بزنس پارٹنر برٹ اترا۔ پچھلی گرمیوں میں، میں نے اس کے ریستوران پر ڈیزائننگ کا کچھ کام کیا تھا۔ مجھے وہاں ٹامی لے کر پہنچا تھا۔ وہ اپنے ریستوران کا نیا مینیو ڈیزائن کرانا چاہتے تھے اور گرافکس ڈیزائننگ میں میری اچھی خاصی مہارت تھی۔ میں نے برٹ کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ فیتے کے پاس رک کر اس جگہ کو بغور دیکھ رہا تھا جہاں ٹامی کی لاش پڑی ملی تھی۔

”ہائے برٹ۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھنے کی کوشش کی۔ اس وقت میں کچھ فاصلے پر ذرا آڑ میں کھڑا تھا۔

”ہائے لیسے...“ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس نے بڑے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”کیسے ہو تم؟“

”بالکل ٹھیک۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا اور استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”یہاں کیسے؟“

”تم تو جانتے ہو کہ میں ٹامی کے کتنے قریب تھا۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میں کل بھی یہاں آیا تھا اور پرسوں بھی اِدھر کا چکر لگا کر گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں تو سیون برج روڈ تک ہو آیا ہوں، جہاں سے پولیس کو ٹامی کی کار لاوارث حالت میں ملی تھی مگر کوئی ثبوت نہیں مل سکا انہیں... نہ کار سے اور نہ وہاں سے۔ اُدھر تو صرف جنگل ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر ایسا کیوں ہوا... کس نے کیا ہوگا؟“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں ایک بار پھر فیتے کی حدود میں گھاس لگی زمین پر جم گئیں۔

”قابلِ افسوس ہے یہ واقعہ۔“ اس کے خاموش ہونے پر مجھے بھی کچھ تو کہنا تھا، سو میں نے رسمی جملہ کہہ دیا۔

”یہ تو ہے۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”خیر چھوڑو اسے۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”بہت عرصے بعد تمہیں دیکھا، کیسا چل رہا ہے سب کچھ؟“

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔“

”کافی بڑے ہو گئے ہو۔“ برٹ نے کہا۔ ”بالکل اپنے باپ پر گئے ہو۔ تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ پڑھائی میں بھی ٹھیک ٹھاک جا رہے ہو۔“

یہ سن کر میں مسکرا دیا۔ ”میرے لائق کوئی کام ہو تو بتانا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے پاس کرنے کو کچھ خاص کام نہیں ہوتا۔“

”شکریہ۔“ برٹ نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں لمحہ بھر کی دیر کیے بنا تمہاری پیشکش قبول کر لیتا مگر...“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔ ”سچ پوچھو تو ٹامی کے بعد اب ریستوران بھی باقی نہیں رہے گا۔ سمجھو اس کے بھی آخری دن ہیں۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”کیا...؟“ یہ سنتے ہی میرے منہ سے نکلا۔

”میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ ٹامی کے بغیر تمہارا ریستوران چلا سکوں۔“ وہ بدستور افسردہ تھا۔ ”وہ میرے لیے خوش قسمتی کا استعارہ تھا۔ گاہک اسے پسند کرتے تھے۔ اسی کی وجہ سے لوگ ہمارے ریستوران کو پسند کرتے تھے۔“ یہ کہہ کر وہ رکا۔ ”اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ ریستوران نہیں چل سکے گا۔ اس سے پہلے کہ خسارہ ہونے کے بعد بند ہو، میں اس سے پہلے ہی کاروبار ختم کر دوں گا، اس کے بغیر...“ برٹ نے بات ادھوری چھوڑی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے جیسا تم سوچ رہے ہو۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”مگر ابھی صرف دو دن گزرے ہیں۔ تمہیں اتنی جلدی دل برداشتہ ہو کر اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ اس کی موت کا اثر چلتے ریستوران پر بھی پڑے۔“

”جانتا ہوں۔“ برٹ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”ممکن ہے کہ تم درست کہہ رہے ہو مگر ہم دونوں نے چھبیس سال اکٹھے وہ ریستوران چلایا ہے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ تنہا اسے سنبھال سکوں۔“ وہ خاموش ہوا اور میری طرف دیکھا۔ ”اب تو میری عمر بھی ریٹائرمنٹ کی ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ ریستوران خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کئی سال سے وہ اس خواہش کا اظہار کرتے رہے تھے اور اب ٹامی...“ اس نے رک کر ٹھنڈی آہ بھری۔ ”تم تو جانتے ہو کہ تین برس پہلے میری بیوی اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اور کوئی نہیں ہے جسے اپنا کہہ سکوں۔ ایک ٹامی کا سہارا تھا، وہ بھی چلا گیا۔“ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”سوچ رہا ہوں کہ سب کچھ بیچ باچ کر لاس ویگاس چلا جاؤں۔ وہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ ویسے بھی وہاں میرے کافی واقف کار ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا۔ فیتے کے پار نظر ڈالی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے اندرونی کرب صاف نظر آ رہا تھا۔

میں اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ ”سیلی کے متعلق کیا خیال ہے؟“ کچھ دیر... سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسے تمہارے ساتھ ریستوران پر کام کرنا اچھا لگے گا۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوگا مگر...“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ”وہ کہتی ہے کہ ٹامی کے بعد اسے وہ جگہ کاٹنے کو دوڑے گی۔ وہ بھی اس حق میں ہے کہ ریستوران بند کر دینا چاہیے۔ کہہ رہی تھی کہ وہ کئی برس پہلے ہی ریستوران چھوڑ دیتی مگر ٹامی کی وجہ سے کام کرتی رہی۔ آخر وہ اس کا محبوب اور شوہر تھا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ ”بڑی محبت تھی دونوں میں۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ بے چاری کو اب باقی زندگی ٹامی کے بغیر بسر کرنا ہوگی۔“

”یہ تو ہے۔“

”بعض اوقات ہم نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر برٹ خاموش ہوا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”خیر، چھوڑو۔ ابھی تم چھوٹے ہو، یہ باتیں نہیں سمجھ سکو گے۔ بڑے ہو کر جب محبت کرو گے، تمہاری شادی ہوگی، تب یہ بات سمجھ آئے گی۔“

یہ سن کر میں شرما گیا۔

”میں نے ریستوران فی الحال بند کر دیا ہے۔“ برٹ نے انکشاف کیا۔

میں نے حیرت سے سر اوپر اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”تمام ملازمین کو بمع تنخواہ ایک ہفتے کی چھٹی دے دی ہے تاکہ اس دوران میں کسی فیصلے پر پہنچ سکوں۔“ برٹ نے میری طرف دیکھا۔ ”امید ہے کہ ویک اینڈ تک کسی حتمی فیصلے پر پہنچ جاؤں گا۔“

”مجھے یہ کمی محسوس ہوگی۔“ یہ سن کر مجھے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ ”میں اس ریستوران کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔“

”شکریہ لیسے...“ اس نے پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”اداس مت ہو، زندگی میں چیزیں اپنی جگہ بدلتی رہتی ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ کچھ بھی ہو مگر پھر بھی ہم زندہ رہنے کی جستجو کرتے رہتے ہیں۔“ میرا جذباتی ردِعمل دیکھ کر اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”گڈ لک برٹ۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کبھی کبھی ایک شخص کے نہ ہونے سے کئی لوگوں کی زندگیوں میں بہت بڑی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔“

”تم بہت ذہین ہو۔“ اس نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر فیتے کے اندر والی زمین پر نگاہ ڈالی۔

”میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں آگے بڑھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میری نظر اس کی کار کی عقبی نشست پر پڑی۔ وہاں ٹاؤن کلب کا گہرے نیلے رنگ والا کوٹ پڑا تھا۔ کوٹ کے کالر پر کلب کا مونوگرام بھی نظر آ رہا تھا۔ کوٹ کے برابر ریستوران کا وہ رنگین مینیو کارڈ رکھا تھا جو میں نے ٹامی اور برٹ کے مشورے سے پچھلے سال ڈیزائن کیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے رونا آ گیا۔ وہ میرا پسندیدہ ریستوران تھا۔ میں کبھی کبھار وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں کے سیخ کباب مجھے بہت پسند تھے۔ جب میں ٹامی کے ساتھ مینیو کارڈ کی ڈیزائننگ کر رہا تھا تب مجھے مفت میں دل بھر کر سیخ کباب کھانے کو ملے تھے۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہوا۔“ میں نے خود کلامی کی۔ میرا دل بھر آیا۔ ”چپ ہو جاؤ۔“ میں نے خود سے کہا۔ ”جانتے بھی ہو کہ اس صورتِ حال میں تم کچھ نہیں کر سکتے، کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی...“ میں نے خود کو سمجھایا اور قدم آگے

اٹھاتے ہوئے برٹ پر نظر ڈالی۔ وہ اب بھی اسی زمین پر نظریں گڑائے کھڑا تھا۔ میں موریسن ہاؤس جا رہا تھا۔

☆☆☆

میرے والدین وکیل تھے اور نیویارک ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ وہ بھی ٹاؤن کلب کے رکن تھے۔ یہ قصبے کا سب سے پرانا اور واحد کلب تھا۔ ٹامی، سیلی اور برٹ بھی اس کلب کے رکن تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو ممی پاپا مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اسی کلب میں کھیلتے ہوئے پہلی بار میں ٹامی اور برٹ سے متعارف ہوا تھا۔ وہ دونوں میرے دوست بن گئے تھے۔ ویسے میرے والدین سے بھی ان کی اچھی دوستی تھی۔ میں بارہ سال کا تھا جب پُراسرار طور پر گھر لوٹتے ہوئے انہیں کسی نے قتل کر دیا۔ آج تک قاتل نہیں پکڑا گیا تھا۔ ان کے بغیر میری زندگی ادھوری تھی مگر اس دور میں ٹامی نے اپنی باتوں سے میری بہت ہمت بندھائی۔ اکثر برٹ بھی مجھ سے ملتا رہتا تھا۔ والدین کے بعد دونوں کی کوشش تھی کہ میری زندگی کو غلط راستے پر چلنے سے بچائیں۔

والدین کی وفات کے بعد مجھے صدمے سے نکالنے کے لیے مقامی چرچ کے ایک پادری کو میرا کاؤنسلر مقرر کیا گیا تھا۔ ایک بار اس نے بڑی خوبصورت بات کہی تھی۔ اس کا کہنا تھا جب کسی سوال کا جواب نہ ملے تو پھر وہ سوال اپنی ذات سے کرو۔ میں آج بھی اپنے آپ سے سوال کرتا تھا کہ کلب سے واپس آتے ہوئے میرے والدین کو کس نے قتل کیا؟ اب تک مجھے اپنی ذات سے کیے گئے اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا مگر پھر بھی میں اس عادت پر عمل کرتا تھا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے خود سے سوال کیا۔ ''ٹامی کو کس نے قتل کیا؟ اس کے قتل سے کس کو فائدہ ہوسکتا ہے؟ کس نے اور کہاں پر اسے قتل کیا اور گودام کے سامنے اس کی لاش لاکر کیوں پھینکی؟'' مجھے یقین تھا کہ ان سوالوں کا جواب ضرور ملے گا اسی لیے خود سے سوال کرنے پر میرا بھروسا تھا۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ میں گھر کے باہر چہل قدمی کر رہا تھا کہ سامنے سے انکل سام آتے نظر آئے۔ وہ میری ماں کی سب سے قریبی دوست کے شوہر تھے۔ ان کی مسز کی وفات کو تین برس گزر چکے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میرے قریب پہنچ کر انہوں نے رسمی لہجے میں کہا۔

''بس! یونہی ٹہل رہا ہوں۔''

''کچھ پتا چلا ٹامی کے قاتلوں کا؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''بڑا ہی افسوسناک واقعہ ہے۔''

''اور خوفناک بھی۔'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

''مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ ٹامی اس دنیا سے چلا گیا۔'' ان کے لہجے سے افسوس جھلک رہا تھا۔ ''کچھ تم نے سنا کہ آخر اس پیر کی رات ہوا کیا تھا؟'' انہوں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

پیر کی شب آخری بار ٹامی کو کلب میں دیکھا گیا تھا، اس کے بعد سب نے اس کی لاش ہی دیکھی تھی۔ انکل سام جانتے تھے کہ میں ٹامی کے بہت قریب تھا، اسی لیے یہ سوال انہوں نے مجھ سے کیا۔ ویسے بھی وہ بڑھاپے کے باعث بہت کم ہی کہیں آتے جاتے تھے۔ ان کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''نہیں...'' کچھ دیر بعد میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ کے علم میں کوئی بات آئی ہے کیا؟'' میں نے الٹا انہی سے پوچھ لیا۔

''پولیس سارجنٹ ایڈی سے بات ہوئی تھی؟'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بتا رہا تھا کہ پولیس بھی چکرائی ہوئی ہے۔ انہیں بھی اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ یہ بات انہیں پریشان کیے ہوئے ہے کہ ٹامی کی کار کئی میل دور سیون برج سے ملی مگر لاش یہاں سے۔'' انہوں نے اپنی چھڑی سے میدان کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہیں بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ ٹامی کو قتل کرنے کے بعد لاش یہاں پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی پیغام بھی ہوسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ جس جگہ سے لاش ملی وہ ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ان کے بیڈ روم کی کھڑکی سے وہ مقام صاف نظر آتا تھا۔

''ممکن ہے کہ اس میں میرے لیے کوئی پیغام پوشیدہ ہو۔'' انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں مطمئن ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو کوشش کر لے، میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''سینڈی اور کارل کیا کہتے ہیں؟ لاش تو ان کی زمین پر پڑی ملی تھی۔''

''پریشان تو وہ بھی ہیں۔'' انکل سام نے جواب دیا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔''

''کل شام ریڈیو کی خبروں میں پولیس کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ وہ رات گئے ڈنر کے بعد کلب سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا مگر پہنچ نہیں سکا۔'' انکل نے کہا۔

''وہ خبر میں نے بھی سنی تھی، کوئی نئی بات نہیں تھی اس میں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سیلی نے پولیس کو بتایا کہ وہ کلب میں تھی لیکن ٹامی اسے چھوڑ کر نکل گیا تھا۔'' انکل نے کہنا شروع کیا۔ ''سیلی کہتی ہے کہ ایسا پہلی بار ہوا کہ وہ مجھے ساتھ لیے بغیر گھر کے لیے نکلا تھا۔ بعد میں سیلی کو کچھ دوستوں نے لفٹ دے کر گھر پہنچایا۔ جب وہ گھر پہنچی تو اسے سخت حیرت ہوئی۔ وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔''

''ہاں... وہ دونوں تو ہر جگہ ساتھ ہی نظر آتے تھے۔'' یہ سنتے ہی میں نے کہا۔ ''مما پاپا بھی مذاق میں کہتے تھے کہ وہ دونوں ہر وقت ایک دوسرے سے چپٹے رہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اُس رات آخر ایسا کیا ہوا کہ ٹامی اسے چھوڑ کر تنہا نکل کھڑا ہوا۔'' یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''کیا سیلی نے بتایا کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟''

''خبروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سیلی سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ اسے جلدی سونا ہے۔ دوسرے دن صبح اس کی ایک ملاقات طے تھی۔'' انکل نے کہا۔ ''سیلی کے مطابق وہ اپنے کچھ قریبی دوستوں کے ساتھ تھی۔ وہ رکنا چاہتی تھی اسی لیے وہ اسے کلب میں ہی چھوڑ کر خود چلا گیا۔ اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی کہ دوسرے دن اسے ڈاکٹر سے ملنا تھا جس کے لیے کئی روز پہلے ہی اس نے وقت لیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکے اور پھر کہنے لگے۔ ''اب یہ حیرت انگیز اتفاق ہی ہے کہ وہ پہلی بار سیلی کے بغیر نکلا اور قتل ہو گیا۔''

''کیا آپ ٹامی کو بہت قریب سے جانتے تھے؟''

''کیوں نہیں۔'' انکل سام بولے۔ ''میں مدتوں سے اس کے ریستوران پر ڈنر کرتا رہا ہوں۔ میرے لیے تو وہ ریستوران اپنے گھر کے ڈائننگ روم جیسا تھا۔ بڑی اچھی دعا سلام ہوگئی تھی اُس سے۔ رینا کی وفات سے پہلے تو ہم دونوں ہفتے میں تین چار بار اکٹھے ڈنر کے لیے وہاں جاتے تھے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''بڑا ذائقہ دار کھانا ہے اس ریستوران کا۔ کبھی گئے ہو وہاں پر؟''

''جی ہاں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''پچھلی گرمیوں میں اُن کا مینیو کارڈ ڈیزائن کیا تھا۔ اس سلسلے میں کئی بار وہاں گیا، کھانا کھایا۔ مجھے تو اُن کے سیخ کباب بہت مزیدار لگے۔''

''ہاں... وہ بھی اچھے ہیں۔''

''مگر سنا ہے کہ...''

''کیا؟'' انکل نے قطع کلامی کی۔

''برٹ ریستوران بیچ رہا ہے۔''

''یہ بات میرے علم میں بھی آئی ہے۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔ ''تم جانتے ہو، کئی سال پہلے ٹامی نے ریستوران کی توسیع اور آرائش کے لیے مجھ سے کچھ قرض لیا تھا۔ کئی ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ وہ قرض اب تک ادا نہیں ہوا۔ معاہدے کی رُو سے اگر ریستوران کا ایک پارٹنر مر جائے تو قرض کی ادائیگی دوسرے کے ذمے ہوگی مگر...'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوئے اور پھر گہری سانس لے کر بولے۔ ''مجھے رقم کی کوئی فکر نہیں، میں نے تو ٹامی سے ایک بار بھی اس بارے میں کوئی تقاضا نہیں کیا تھا۔ برٹ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ میری تو بس ایک ہی خواہش ہے...''

''وہ کیا؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''میرا پسندیدہ ریستوران چلتا رہے مگر...'' یہ کہہ کر وہ رکے اور کچھ دیر بعد حسرت سے کہنے لگے۔ ''پر اب نہیں لگتا کہ وہ چل سکے گا۔'' انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا۔ ''کئی ماہ پہلے سنا تھا کہ برٹ ریستوران بیچ رہا ہے اور خریداروں کو صرف اُس زمین میں دلچسپی ہے۔ وہ کچھ اور ہی چیز بنانا چاہتے ہیں وہاں پر۔''

''آپ رقم مانگ لیں گے نا اُس سے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''رقم مل گئی تو بہت اچھا ہوگا اور اگر نہ ملی تو یہ بُرا اتفاق ہوگا۔'' انہوں نے فلسفیانہ انداز میں بات کہی۔ ''اگر ریستوران بند ہو گیا تو یہ میرا قرض واپس نہ ملنے سے بھی زیادہ بُرا اتفاق ہوگا۔''

''ویسے کچھ پتا چلا آخر ٹامی مرا کیسے تھا؟'' میں نے گفتگو کا رخ واپس اسی موضوع کی طرف موڑ دیا جو ان دنوں میری دلچسپی کا محور تھا۔

''ہاں، پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی ہے۔'' انکل نے بتایا۔ ''لاش کا طبی تجزیہ کرنے والے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

''اوہ...''

''مقتول کے گلے سے ریشم کے کچھ ذرات ملے ہیں۔ پولیس کا خیال ہے کہ کسی اسکارف کا پھندا بنا کر ڈالا گیا تھا جس کی بنا پر شک ہے کہ قاتل کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے۔''

''مگر...'' میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑے۔

''پولیس کا شک اپنی جگہ پر... مجھے نہیں لگتا کہ قاتل عورت ہی ہے۔ کوئی مرد بھی ہو سکتا ہے۔ ریشم کا اسکارف تو مرد بھی گلے میں باندھتے ہیں۔''

''میں آپ کو ایک اور بری خبر سنانے والا ہوں۔''

''وہ کیا؟'' انکل سام چونک گئے۔

''آج دوپہر مجھے برٹ ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ کل سے وہ ایک ہفتے کے لیے ملازمین کو چھٹی دے کر ریستوران عارضی طور پر بند کر رہا ہے۔''

''کیا...؟'' یہ سن کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''اور کیا بتا رہا تھا وہ؟''

''کہہ رہا تھا ممکن ہے کہ ویک اینڈ تک ریستوران بک جائے۔'' یہ کہہ کر میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ''آج آپ کے پسندیدہ ریستوران کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔''

''تم مذاق کر رہے ہو؟'' انہوں نے بے یقینی سے کہا تو میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

میری بات سن کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ کچھ دیر تک وہ کھڑے سوچتے رہے اور پھر بنا کچھ کہے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ چند قدم آگے بڑھ کر وہ رکے اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ میں اسی جگہ پر کھڑا تھا۔ ''وہ تو تمہارا بھی پسندیدہ ریستوران ہے نا؟'' انہوں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''شام پونے سات بجے گھر آجانا۔ آج رات ہم دونوں وہیں ڈنر کریں گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گئے۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند جواب دیا۔

میں مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی انکل سام کے گھر پہنچ گیا۔ وہ پورچ میں تھے۔ ''میں تمہارا ہی منتظر تھا۔'' انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور گیراج کی طرف بڑھے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں کار میں سوار ہو کر ٹاؤن کے مضافات میں واقع ٹامی اور برٹ کے اس ریستوران کی طرف جا رہے تھے جہاں شاید آج آخری بار لوگ اپنے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کرنے والے تھے۔

ہم جب ریستوران پہنچے تو کم از کم دو بلاک پہلے ہمیں گاڑی پارک کرنا پڑی۔ ریستوران کے سامنے اندر داخل ہونے کے خواہش مند لمبی قطار میں کھڑے اپنی باری کے منتظر تھے۔ ''بہت شہرت ہے قصبے میں اس ریستوران کی۔ دور دور سے لوگ یہاں کھانے کے لیے آتے ہیں۔'' انکل نے قطار میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ میں ان کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ مسٹر ڈیل میکی اور اُن کی بیوی ایلی بھی میرے پیچھے آ کر قطار میں لگ گئے۔ وہ دونوں مجھے نہیں پہچانے مگر میں پہچان چکا تھا۔ میں نے انہیں آخری بار اپنے والدین کی تدفین میں دیکھا تھا۔ میں چھوٹا تھا تو اکثر ان کی بیٹی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ تب وہ ہمارے گھر سے کچھ گھر چھوڑ کر رہا کرتے تھے۔ ایما بھی میری ہم عمر تھی۔

''ہائے...!'' میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

''تم...؟'' مسز ڈیل نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''میں لیسے ہوں۔''

''ارے تم...'' انہوں نے اونچی آواز میں کہا۔

''کیسے ہو تم... اتنے عرصے کے بعد دیکھا۔ کافی بڑے ہو گئے ہو۔''

''وہ مسٹر ڈیل ہیں نا۔'' میں پہچان تو گیا تھا مگر پھر بھی تصدیق کے لیے ان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں... پہچانا نہیں؟'' مسز ڈیل نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''بڑے تیار لگ رہے ہیں۔''

یہ بات مسٹر ڈیل میکی نے بھی سن لی تھی، وہ مسکرا دیے۔ اسی دوران انکل سام بھی پلٹے۔ میں نے اس جوڑے کا تعارف ان سے بھی کرایا۔

''سیلی کہہ رہی تھی کہ ابھی آدھ گھنٹا اور لگے گا ریستوران کھلنے میں۔'' مسٹر ڈیل نے انکل کو بتایا۔

''اور کیا کہہ رہی تھی وہ؟'' یہ سنتے ہی میں نے استفسار کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتے، سامنے سے سیلی آتی نظر آئی۔ وہ قطار میں کھڑے لوگوں کو ٹیبل نمبر کے ٹوکن بانٹ رہی تھی۔ لوگ ٹوکن لے کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ قطار تیزی سے سکڑنا شروع ہو گئی۔ مسٹر ڈیل بھی میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مستعدی سے کھڑے ہو گئے۔

میں نے سیلی پر نظریں جمائیں۔ اس نے بالوں کو گوندھ کر جوڑا باندھ رکھا تھا۔ وہ سیاہ لباس میں تھی اور چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور خوش باش رہنے والی عورت تھی مگر اس وقت وہ غم کی ماری لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے افسردگی جھلک رہی تھی۔ ویسے بھی ٹامی کی موت کو ابھی صرف تین روز ہی تو گزرے تھے۔ میں اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اس نے پیار کرنے والا شوہر کھو دیا تھا

اور میں نے اپنے مشفق ماں باپ... اپنے پیاروں سے جدائی کا یہ دکھ ہم دونوں نے سہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میرے والدین کی موت کو کئی سال گزر چکے تھے مگر اس کا غم بالکل تازہ تھا۔ ''افسوس۔'' میں نے خود کلامی کی۔ ''شوہر چلا گیا اور اب روزی کا آسرا بھی ختم ہو رہا ہے۔'' میں نے خود کلامی کی۔

پھر وہ ہم تک بھی پہنچ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پیار سے گلے لگایا۔ اس وقت سیلی کی آنکھوں میں تیرتی ہلکی سی نمی میں نے دیکھ لی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہ ریستوران کا آخری دن تھا۔ ہمارے لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس شاندار ریستوران کے درد بھرے انجام سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں کا آخری ڈنر کریں۔ ہمیں ٹوکن دے کر وہ مسٹر ڈیل کی طرف بڑھی تو میں نے انکل سام کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''چلیں۔''

''مگر کہاں؟'' انہوں نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہم یہاں ڈنر نہیں کریں گے، بس چلیں!'' میری آواز بھرا گئی۔ وہ بھی شاید بات سمجھ گئے اور ہم اندر جانے کے بجائے واپس مڑے اور اس طرف بڑھے جہاں کار کھڑی کی تھی۔

''ہم جب بھی روڈ پر کوئی حادثہ دیکھتے ہیں تو تیزی سے اس طرف لپکتے ہیں... مدد کے لیے نہیں صرف تماشا دیکھنے کے لیے۔'' کار میں بیٹھتے ہی میں نے انکل سے کہا۔ ''آج یہاں ڈنر کرنے والے مجھے ایسے ہی تماش بین لگے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا۔'' انہوں نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا مگر بھوک...''

''کھانا تو کہیں اور بھی کھا سکتے ہیں۔'' میں نے قطع کلامی کی۔

''تمہاری یہ بات بھی درست ہے۔'' وہ مسکرائے اور کار کا رخ قصبے کے اس حصے کی طرف موڑ لیا جہاں کھانے پینے کی ان گنت دکانیں تھیں۔ ہم نے برگر کھایا اور بہت اچھا وقت گزارا۔ انکل سام مجھے سن پچاس، ساٹھ کی دہائی کے وہ واقعات سناتے رہے جب وہ جوان تھے۔ گھڑ دوڑ میں حصہ لیتے تھے، شکار پر جایا کرتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر کھانے کے دوران نہ تو انکل نے ٹامی کے قتل کا ذکر کیا اور نہ ہی ریستوران کی بندش کے حوالے سے کوئی بات کی۔

واپسی پر انہوں نے مجھے گھر کے دروازے پر اتارا۔

''لیسے... سچ پوچھو تو بڑا مزہ آیا۔'' جب میں نے انہیں بائے

جو ہنر چاہیں سیکھیں پر سیکھیں ضرور
معقول فیس میں ہنر مند بنیں
ہنر سیکھیے بہتر روزگار پائیے
Mob:0341-2930023
Mob:0322-2548400
موبائل سے SMS
داخلہ فیس اور رجسٹریشن فیس معاف
حرمین انسٹی ٹیوٹ
صبح 9 سے شام 5 بجے
پوسٹ بکس نمبر۔ 3349 گلبرگ کالونی سوسائٹی کراچی۔75080
فون:۔03002219514

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا تو وہ بولے۔ ”سنو... اتوار کو ہم پھر باہر چلیں گے ڈنر کے لیے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ میں اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ مجھے اتوار کو ویسے بھی تنہا رہنا پسند نہیں تھا۔

رات خاصی گزر چکی تھی مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی تو خنک ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ میں نے کرسی گھسیٹی اور آسمان کو دیکھنے لگا۔ چڑھتے چاند کی چاندنی میں منظر دھندلایا ہوا نظر آرہا تھا۔ آسمان بادلوں سے صاف تھا اور ننھے ننھے ستارے چمک رہے تھے۔ میں بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر نامی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میں اتفاقات پر یقین رکھتا تھا مگر مجھے لگا کہ وہ اتفاق نہیں سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے اور جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں اٹھا اور منتشر ذہنی حالت میں ہی بستر پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

نامی کی لاش ملنے کے کئی روز بعد پولیس نے ایک اور انکشاف کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لاش کے قریب سے کسی ایسے شخص کے قدموں کے نشان ملے ہیں، جس کے جوتے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پولیس نے اخبارات کو اس پاؤں کے نشان کی تصویر بھی جاری کردی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ نشان مبینہ قاتل کا ہوسکتا ہے۔ اخبار کے مطابق اس نشان کی فرانزک تفتیش مارگریٹ کررہی تھی۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ مجھ سے قد اور عمر میں بڑی تھی۔ سبز آنکھوں والی مارگریٹ اور میری اچھی خاصی دوستی تھی۔ جب میں نے قدموں کے نشان والی خبر پڑھی تو پولیس فرانزک لیب کی طرف چل دیا۔ میں مارگریٹ سے مل کر اس بارے میں مزید تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔ تقریباً گھنٹا بھر بعد میں مارگریٹ کے ساتھ لوہے کے اسٹول پر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمارے سامنے خوردبین رکھی تھی جس کے ذریعے ہم جائے وقوعہ سے ملنے والے پاؤں کے نشان کا ایک بار پھر جائزہ لینے والے تھے۔

”ابھی تک کوئی اہم چیز تو پتا نہیں چلی اس سے۔“ میں خوردبین کے ذریعے پاؤں کے نشان کا تجزیہ کررہا تھا، تب مارگریٹ نے کہا۔

”بہتر ہے کہ ہم اس کے تجزیے کے لیے کمپیوٹر استعمال کریں۔“ میں نے خوردبین پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے مشورہ دیا۔ ”ہم فوٹو شاپ کے ذریعے اسے بہت بڑا کرکے زیادہ بہتر انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔“

”افسوس کہ میں ایسا نہیں کرسکتی۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ ثبوت ہے اور ہم اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرسکتے اور فوٹو شاپ پر یہ ممکن ہے۔ اسی لیے ہمیں اس بات کی اجازت نہیں... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”مگر صرف ایک جوتے کا نشان؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”جوتے کا تلا گارے میں لتھڑا ہوا تھا، تبھی نشان بنا۔“ مارگریٹ نے کہا۔

”یہ نشان قاتل تک پہنچنے کے لیے مددگار ہے یا پھر بیکار؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ مارگریٹ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اگر پولیس نامی کے قتل کے الزام میں کسی کو گرفتار کرتی ہے تو ہم اس مبینہ قاتل کے ایک جوتے کا تلا گارے میں لتھڑ کر اسی طرح کی زمین پر اس کے جوتے کا نشان بنوائیں گے اور پھر اُن کا تقابلی جائزہ لیں گے۔ اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ نشان پولیس کا کیس مضبوط کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت تو دے سکتا ہے لیکن اس کی مدد سے یہ کیس حل کرنا میرے نزدیک ممکن نہیں۔“

مارگریٹ کی بات سن کر میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ”تم مجھے اس مٹی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو جو لاش یا پھر اس جوتے کے گرد پائی گئی ہے؟“

”اوہ... میری بات سن کر وہ چونکی۔ ”میں سمجھ گئی۔ تمہارا آئیڈیا اچھا ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”اس طرح ہم کم از کم یہ سمجھنے کی کوشش کرسکتے ہیں کہ جس قسم کی مٹی پائی گئی ہے، وہ کس جگہ کی ہوسکتی ہے۔ ویسے نامی کی گاڑی بھی تو جنگل میں نالے کے پاس پہاڑی علاقے سے ملی تھی۔“ میں نے مزید وضاحت کی۔

”بظاہر تو جوتا گارے میں لتھڑا تھا مگر وہاں سے چکنی مٹی یا ریت کے ذرات نہیں ملے تھے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”کم از کم اب تک تو میرے علم میں ایسی بات نہیں آئی ہے۔“

”اخبار میں پڑھا تھا کہ لاش کے گلے سے کچھ دھاگے بھی چپکے ملے تھے، کس قسم کے تھے وہ؟“

”بظاہر تو سرخ رنگ کے ریشم کے ذرات تھے۔“ مارگریٹ نے تصدیق کی۔ ”ممکن ہے کہ ریشم نہیں پولیسٹر فائبر ہو، تاہم اب تک تصدیق نہیں ہوئی اس بات کی کہ وہ کیا ہیں۔“

”کیا یہ کسی اسکارف کے ہیں؟“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔“ مارگریٹ نے جواب دیا۔

”معلوم نہیں، بس ایک خیال تھا، سو پوچھ لیا۔“ میں نے بات بنائی۔ ”ویسے ریشم کے ذرات ٹائی کے بھی ہوسکتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا وہ ٹائی باندھے ہوئے تھا؟“

”نہیں... اس رات نامی نے ٹائی نہیں باندھی تھی۔ سراغ رساں نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا تھا۔“

کچھ دیر بعد ہم لیب سے نکلے تو مارگریٹ نے کافی پینے کی دعوت دی۔ ”اب میں چلتا ہوں، مجھے ٹاؤن لائبریری جانا ہے۔“ میں نے اجازت چاہی۔

”واقعی...“ اس نے خوش مزاجی سے کہا۔ ”مجھے بھی وہیں جانا ہے میئر کے دفتر تک۔ اگر تم تھوڑا سا انتظار کرلو تو پھر ساتھ ہی نکلتے ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔“

”چلو اٹھو... تم کامن روم میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ وہاں نیٹ اور کمپیوٹر بھی ہے۔“

اس وقت کامن روم خالی پڑا تھا۔ کمپیوٹر آن تھا۔ میں نے ای میل اور فیس بک اکاؤنٹ چیک کرنے کے بعد وقت گزاری کے لیے ٹاؤن کلب کی ویب سائٹ کھول لی۔ اسے صرف چند گھنٹوں پہلے ہی اپ ڈیٹ کیا گیا تھا۔ پہلے ہی صفحے پر بڑی سی گروپ تصویر لگی تھی جس کے ساتھ کلب کے رکن نامی کی اندوہناک موت اور اب تک کی پولیس تفتیش کے بارے میں اخباری رپورٹس کے لنکس بھی موجود تھے۔ جو تصویر لگی تھی، وہ اس کی موت سے تھوڑی دیر پہلے ہی کھینچی گئی تھی۔ تصویر میں وہ ٹائی پہنے نظر آرہا تھا۔ میں نے تصویر فل سائز میں کرکے دیکھنا شروع کی۔ نامی نے ٹائی پن بھی لگائی ہوئی تھی۔ یہ کلب کی مخصوص ٹائی پن تھی جس کی پشت پر رکنیت نمبر کندہ ہوتی ہے۔ تصویر دیکھتے ہی مارگریٹ کی یہ بات ذہن میں دھماکے کی طرح گونجی کہ سراغ رساں کی رپورٹ کے مطابق نامی نے قتل کے وقت ٹائی نہیں پہن رکھی تھی اور یہ بات تو سب ہی جانتے تھے کہ نامی کلب سے جو نکلا تو پھر دوسری صبح اس کی لاش ہی ملی تھی۔ میرا ذہن مختلف سوچوں میں الجھ گیا۔ رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ اگر وہ ٹائی پہنے ہوئے کار میں سوار ہوا تو پھر وہ کہاں گئی؟ یہ خیال بھی آرہا تھا کہ کیا سراغ رساں کی رپورٹ جھوٹی ہے؟ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”اوہ میرے خدا! اصل ماجرا کیا ہے۔“

کچھ دیر تک میں نے اپنے حواس قابو میں کرنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر پوری صورت حال پر توجہ مرکوز کردی۔ تصویر میں نامی کے ساتھ سیلی، برٹ، ایلی اور اس کا شوہر ڈیل مسکراتے ہوئے کھڑے تھے۔ میں کچھ دیر تک نامی کی تصویر دیکھتا رہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا مگر سیلی... ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی مسکرانے پر مجبور کیا گیا تھا... جیسے تصویر کھینچنے سے پہلے فوٹو گرافر مسکرانے کو کہتا ہے۔ چند منٹ تک میں تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ میرے جذبات چہرے کے تاثرات سے عیاں تھے۔ حیرت سے میرا منہ کھلا تھا کہ اچانک مارگریٹ اندر داخل ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ میرے قریب پہنچ کر لمحہ بھر کے لیے اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر سوال کیا۔ ”ارے... یہ تم کیا چیز دیکھ رہے ہو؟“ اس نے کمپیوٹر پر نظر ڈالی۔

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ واردات کے وقت نامی نے ٹائی نہیں باندھی تھی؟“

SOLE DISTRIBUTOR
of U.A.E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books
and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں... ایسا ہی ہے۔"

"مگر یہاں دیکھو۔" میں نے تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "ٹائی بھی پہن رکھی ہے اور کلب کی مخصوص پن بھی اس میں لگی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ماؤس کے ذریعے تصویر کو اور بڑا کیا۔

مارگریٹ حیرت سے تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی اور گہری سوچ میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ واردات کے وقت ٹامی نے ٹائی باندھ رکھی تھی۔" میں نے خاموشی توڑی۔

وہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہی اور پھر نظریں میرے چہرے پر جماتے ہوئے بولی۔ "اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"شاید میں جان گیا ہوں کہ ٹامی کو کس نے قتل کیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" اس نے جلدی سے کہا اور دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "نہیں، نہیں... مجھے کچھ نہیں بتاؤ، مجھ سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی اور دیوار میں نصب فون اٹھا کر اپنے ساتھی کو بلایا۔ "مچل... تم فوراً کامن روم میں آؤ۔"

تھوڑی ہی دیر میں وہ تیز تیز چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور مارگریٹ کے پاس پہنچ کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم نے ابھی ابھی جو کچھ مجھ سے کہا تھا، وہ انہیں بتاؤ۔" مارگریٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر میں کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے کمپیوٹر مانیٹر کی طرف انگلی اٹھائی جہاں فل اسکرین سائز پر کلب کی ویب سائٹ پر لگی تصویر نظر آرہی تھی۔ "یہاں دیکھو..." میں نے ٹامی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے مچل کو مخاطب کیا۔ "تم نے پہلے یہ تصویر دیکھی تھی؟"

وہ خاموش رہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہ تصویر کلب میں پیر کی رات کھینچی گئی تھی۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "وہ کلب کوٹ پہنے ہوئے ہے اور ٹائی بھی، جس پر ٹائی پن لگی ہے۔ میں اس تصویر کو دیکھنے کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ اس رات کیا ہوا... ٹامی کیسے قتل ہوا۔" یہ کہہ کر میں لحہ بھر کے لیے رکا۔ "میں جان چکا ہوں کہ اسے کس نے مارا ہے۔ ویسے ٹامی لباس کے ساتھ ٹائی ضرور باندھتا تھا۔ کلب سے باہر نکلتے ہوئے بھی وہ ٹائی باندھے ہوئے ہوگا مگر حیرت انگیز طور پر پولیس کو اس کی لاش یا جائے واردات سے نہ تو ٹائی ملی اور نہ ہی ٹائی پن۔"

میں خاموش ہوا تو مچل غور سے تصویر کو دیکھنے لگا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو، البتہ ایک بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مارگریٹ کی طرف دیکھا۔ "لیسے جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ ہماری لیبارٹری کے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ میں اُس سراغ رساں سے رابطہ کرتا ہوں جو ٹامی قتل کیس پر کام کر رہا ہے۔ وہی لیسے کی بات سننے کا مجاز ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ مارگریٹ بدستور وہیں تھی۔ وہ بھی چہرے سے پریشان نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

ہم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے، وہ سامنے والی بڑی سی میز کے برابر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمارا ہی منتظر ہے۔ سراغ رساں وائن جیکسن نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ "کیسے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔" میں مسکرا کر دو قدم اور آگے بڑھا۔

جیکسن کا انداز دوستانہ تھا۔ لہجہ نیویارک والوں کے بجائے ٹیکساس کے لوگوں جیسا تھا۔ اس نے لباس بھی کچھ انہی جیسا ہی پہن رکھا تھا۔ میں اور انکل سام خاموشی سے آگے بڑھے اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ میری خواہش پر ساتھ آئے تھے۔ ویسے بھی میں اپنی مختصر سی زندگی میں پہلی بار کسی پولیس اسٹیشن میں آیا تھا۔ اس وجہ سے نفسیاتی طور پر کچھ دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ انکل سام ساتھ نہ آتے تو شاید میرا یہیں دم نکل جاتا۔

ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے، وہ خاصا کشادہ تھا۔ کھڑکی کے پٹ کھلے تھے جس کی وجہ سے ٹریفک کا شور بھی گونج رہا تھا۔ کمرے میں چار بڑی دھاتی میزیں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر رکھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ دو لوہے کی فائل الماریاں اور ریک لگے ہوئے تھے۔ کمرے کی ایک دیوار ہر قسم کے تکلفات سے عاری تھا ماسوائے ایک بڑے سے نوٹس بورڈ کے، جس پر مختلف چھوٹے بڑے کاغذوں کو پنوں کی مدد سے اُڑسا گیا تھا۔ کونے میں الیکٹرک واٹر کولر تھا۔ سراغ رساں کی میز کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میری اور انکل کی آنکھوں پر روشنی براہِ راست پڑ رہی تھی۔

والدین کی وفات کے بعد میری سرپرست مسز موریسن تھیں۔ وہ میری ماں کی رشتے میں بہن لگتی تھیں۔ اُن دنوں وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ چھٹیاں

لیپ ٹاپ

لڑکا نشے کی حالت میں چوری چھپے گھر میں داخل ہوا تو کہیں سے باپ کی آواز آئی۔ لڑکا ڈر گیا کہ اب اس کی سخت گوشمالی ہوگی۔ اس نے جھٹ لیپ ٹاپ کھولا اور ایک خط ٹائپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ذرا دیر بعد ہی باپ کمرے میں آگیا اور آتے ہی ڈپٹ کر بولا۔ "کیا تو نشے میں ہے؟"

"ن... نہیں ابا جان!" وہ بوکھلا کر بولا۔

"ابا جان کے بچے!" باپ دانت پیس کر غرایا۔ "پھر یہ سوٹ کیس کھول کر کیا ٹائپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟"

اسلام آباد سے خرم علیم کی عنایت

ہوئی تھیں۔ میری عمر پندرہ سال تھی۔ اس لیے میرا بیان لینے کے لیے پولیس کو سرپرست کی اجازت درکار تھی۔ سراغ رساں جیکسن نے مجھ سے آنٹی موریسن کا نمبر مانگا۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی ہوٹل اور موبائل کا عارضی نمبر مجھے ای میل پر بھجوا دیا تھا تاکہ کسی بھی ایمرجنسی میں مجھے ان سے رابطے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اس کے کہنے پر میں نے دونوں نمبر ایک چٹ پر لکھ کر اسے تھما دیے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے موبائل فون سے اُن کا نمبر ملا رہا تھا۔ میں نے اپنے موبائل فون پر نظر ڈالی اور وقت دیکھا۔ اُس وقت دن کے سوا گیارہ بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ اس وقت شنگھائی میں رات کے سوا گیارہ ہو رہے ہوں گے۔ اسی دوران سراغ رساں جیکسن کی کال مل گئی۔ آنٹی جلدی سونے کی عادی تھیں۔ اسی لیے کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد کال اٹینڈ ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں اٹھنے میں دیر لگی ہے۔ اپنے تعارف کے بعد اس نے آنٹی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے بیان لینے کی اجازت مانگی۔ کچھ دیر تک تو وہ پوری توجہ سے ان کی بات سنتا رہا اور پھر شکریہ کہہ کر فون میری طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو..." میں نے کہا۔

"تم ٹھیک تو ہو میرے بچے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ لہجے سے وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔

"جی ہاں... جی ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اٹکتے ہوئے محتاط انداز میں کہا۔ جیکسن کی موجودگی کے باعث میں الجھن محسوس کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ جو کہوں گا، وہ بات سراغ رساں بھی سنے گا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے اس وقت تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا مگر مجبوری ہے۔" ان کا لہجہ بدستور پُرتشویش تھا۔ "پولیس والے تم سے جو پوچھیں، انہیں سچ سچ بتا دینا۔" ان کا انداز نصیحت آموز تھا۔

"جی بالکل۔"

"ٹھیک ہے، تم بیان دو۔ میں نیویارک کے وقت کے مطابق شام سات بجے تمہیں فون کروں گی۔" وہ بدستور پریشان تھیں۔

"بائے۔" یہ کہہ کر میں نے کال منقطع کی اور فون جیکسن کی طرف بڑھا دیا۔ "شکریہ۔"

وہ مسکرایا اور فون کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالتے ہوئے کھڑا ہوا اور ہمارے عقب والی دیوار کی طرف بڑھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہاں دروازہ نظر آرہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کہا۔ "آپ دونوں ذرا یہاں آئیے۔"

میں اور انکل سام اٹھ کر آگے بڑھے۔ میں نے باہر سے اچٹتی ہوئی نظر اندر ڈالی۔ وہ تقریباً پندرہ ضرب آٹھ فٹ کا چھوٹا مگر روشن اور ہوادار کمرا تھا۔ اچانک میرے اندر درد کی ایک لہر اٹھی۔ میرے لیے یہ بہت سخت مرحلہ تھا کہ پولیس اسٹیشن میں تھا اور وہ بھی سنگین جرم میں بیان دینے کے لیے۔ ایک بار پھر میرے تخیل میں ٹامی کا چہرہ ابھر آیا۔

ٹامی کا قتل صرف ریستوران کی وجہ سے ہوا۔ وہ چھبیس برس سے برٹ کی پارٹنر شپ میں نہایت کامیابی سے ریستوران چلا رہا تھا۔ اتنے طویل عرصے تک کام کرنے کے باوجود وہ ریٹائرمنٹ نہیں لے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اسی سبب اسے دنیا سے جانا پڑا۔ وہ میرا دوست تھا اور اس کی اندوہناک موت کا کرب مجھے اس لیے بھی شدت سے محسوس ہوتا تھا۔

"اندر آؤ۔" جیکسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا تو میں اپنے خیالوں سے چونکا اور اندر بڑھا۔ انکل بھی میرے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے بیٹھنے کے لیے آرام دہ صوفے تھے۔ میں اور انکل ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر جیکسن کمرے سے نکل گیا۔

چند منٹ بعد جب سراغ رساں جیکسن دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ پولیس وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک عورت بھی تھی۔ اس نے بھی پولیس وردی پہنی ہوئی تھی۔
''یہ ہیں آفیسر ہیلسن۔'' جیکسن نے مسکرا کر گھنگرالے بال اور نیلی آنکھوں والی عورت کا تعارف کرایا۔
''ہائے۔'' آفیسر ہیلسن نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ ہمارے سامنے بیٹھ گئی اور جیکسن ویڈیو کیمرا سیٹ کرنے لگا۔
''معذرت چاہتا ہوں، تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔'' کیمرا سیٹ کر کے وہ پلٹا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''ہاں تو لیپے... اب بتاؤ، تم کیا کہنا چاہتے تھے تامی کے قتل کے بارے میں؟'' اس نے میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کیں۔
اس کی بات سن کر میں نے کیمرے کی طرف دیکھا۔ کیمرے کے اوپری حصے پر چھوٹی سی سرخ بتی جل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ کیمرا آن ہے اور میرے ہر لفظ کی ویڈیو ریکارڈنگ ہونے جارہی تھی۔ ''بات یہ ہے کہ میں آج فرانزک لیب گیا تھا، مارگریٹ سے ملنے۔'' میں نے کیمرے سے نظریں ہٹا کر جیکسن کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی اور پھر اس وقت تک کی ساری روداد سنا ڈالی جب لیب انچارج نے مارگریٹ کی بات سن کر سراغ رساں جیکسن کو فون کیا تھا۔ اس فون کے جواب میں ہی اس وقت میں انکل کو ہمراہ لے کر یہاں پہنچا تھا۔ مجھے یہاں پہنچنے کی ہدایت جیکسن نے ہی کی تھی۔
''تم نے کہا کہ یہ جانتے ہو کہ تامی کو کس نے قتل کیا تھا۔'' میں خاموش ہوا تو جیکسن نے استفساریہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کون ہے وہ؟''
میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے یہاں ہونے پر نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ مجھے لگنے لگا کہ مزید کچھ دیر یہیں رہا تو بیمار پڑ جاؤں گا۔ ''شاید میں غلطی پر ہوں۔'' کافی دیر بعد میں نے جیکسن کے سوال کا جواب دیا۔
''شاید تم غلطی پر نہ ہو۔'' جیکسن نے فوراً کہا۔
''ٹھیک ہے لیپے۔'' انکل سام نے مداخلت کی۔ شاید وہ میری کیفیت بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے میرا ادھ پتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔ ''تم جو کچھ جانتے ہو یا سمجھتے ہو، وہ سب کچھ سچ سچ انہیں بتادو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے حوصلہ بڑھانے کے لیے میرا شانہ تھپتھپایا۔
میں نے کچھ جواب نہیں دیا اور خالی خالی نگاہوں سے کیمرے کو تکنے لگا۔
''کیا خیال ہے؟'' جیکسن نے خاموشی توڑی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ''وہ ساری باتیں جو تم پہلے ہی ایک بار بتا چکے ہو، وہ سب کچھ ایک بار پھر شروع سے سنا دو۔ مجھے یقین ہے، ایسا کرنے میں تمہیں کوئی خاص دشواری نہیں ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''تم نے کہا تھا کہ ویب سائٹ پر تامی کا فوٹو دیکھا تھا۔ تمہیں اس تصویر میں کیا خاص بات محسوس ہوئی تھی؟''
یہ سن کر میں نے انکل سام کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میرا ہاتھ آہستہ سے تھپتھپایا۔ ''تصویر میں تامی نے ٹائی باندھ رکھی تھی مگر جب پولیس نے اس کی لاش دریافت کی تب اس کے گلے میں ٹائی نہیں تھی۔ حالانکہ وہ تصویر تب کھینچی گئی تھی جب وہ کلب سے جانے والا تھا۔ پولیس اور اس کی بیوی سیلی کا بھی موقف یہی ہے کہ وہ کلب سے نکلنے کے بعد نہ تو گھر پہنچا اور نہ ہی کہیں اور گیا بلکہ راستے سے ہی غائب ہو گیا تھا۔''
''تمہارا بنیادی نکتہ ٹائی ہے...''
''اور ٹائی پن بھی۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے لقمہ دیا۔
جیکسن نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''ممکن ہے اس نے کلب سے نکلتے ہوئے یا نکلنے سے پہلے ٹائی اتار دی ہو۔'' اس نے امکان پیش کیا۔
''ایسا ممکن ہی نہیں...'' میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''بیڈ روم، صبح اپنے باتھ روم، سوئمنگ پول، ٹینس کورٹ یا پھر کپڑے تبدیل کرتے وقت ہی وہ بنا ٹائی کے ہوتا تھا ورنہ وہ ہمیشہ رسمی لباس میں رہتا تھا۔ ٹائی اس کے لباس کا لازمی حصہ تھی۔'' یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''اس بات کی تصدیق ہر اس شخص سے کی جاسکتی ہے جو تامی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ رہی بات ٹائی اتارنے کی تو وہ اگر اتارتا تو اس کی کار میں ہوتی۔'' یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر کہا۔ ''کیا پولیس کو اس کی کار سے ٹائی اور پن ملی ہے؟''
میری بات سن کر جیکسن سوچ میں پڑ گیا۔ آفیسر ہیلسن کی پیشانی پر بھی بل پڑے ہوئے تھے۔ کافی دیر بعد اس نے نوٹ بک کھولی۔ ''تفصیل سے بتاؤ۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں جب تامی کلب سے نکلا تو پھر اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟''
''جب تامی گھر جانے کے لیے کلب سے نکلا تو برٹ نے اس کا پیچھا کیا۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ایک سنسان مقام پر وہ اپنی گاڑی اس کے برابر لے آیا اور شاید کھڑکی

سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور گاڑی روکنے کا کہا۔ جس جگہ تامی کو اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا، وہ کافی سنسان تھی۔ وہ مقام برٹ نے کافی سوچ بچار کے بعد منتخب کیا ہوگا۔ وہ جانتا ہوگا کہ انہیں یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں۔ جب تامی گاڑی روک کر باہر نکلا تو پھر ان کے درمیان بحث ہونے لگی۔''
''بحث...'' جیکسن نے قطع کلامی۔ ''مگر کس بات پر؟''
''پیسوں پر۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا اور پھر تفصیل سے بتانے لگا۔ ''برٹ ریستوران فروخت کرنا چاہتا تھا مگر تامی اس کے حق میں نہیں تھا...''
''مگر اسے پیسے کی اتنی شدید ضرورت کس لیے پڑ سکتی تھی کہ وہ اپنے پارٹنر کو رات کے اس پہر روکے اور پھر اس معاملے پر بحث کرے؟'' جیکسن نے پھر قطع کلامی کی۔
''وہ ایک عادی جواری ہے اور جوئے کی لت نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ممکن ہے کہ اسی لت کے باعث وہ کسی بہت بڑی مالی مشکل میں پھنسا ہو جس سے نکلنے کے لیے اس کے پاس ریستوران کی فروخت کے سوا کوئی اور راستہ نہ ہو۔ اب وہ ریستوران کا پورا مالک تو تھا نہیں اور تامی کی مرضی کے بغیر اسے فروخت کرنا ممکن نہیں تھا۔''
یہ سن کر جیکسن نے سر ہلایا اور نوٹ بک میں کچھ لکھنے کے بعد اس نے پھر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''اچھا تو ان کے درمیان بحث و تکرار ہونے لگی... اس کے بعد کیا ہوا ہوگا؟''
''وہ دونوں گاڑی سے باہر نکل کر بحث کررہے ہوں گے کہ ریستوران بیچا جائے یا نہیں مگر فیصلہ نہیں ہو پارہا ہوگا۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''بات آگے بڑھی اور تکرار سے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی ہوگی۔ برٹ نے غصے میں اس کی ٹائی پکڑ کر کھینچی ہوگی۔ جواب میں برٹ نے بھی اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہوگا۔ ممکن ہے کہ برٹ کی ٹائی یا پن اس کی مٹھی میں آگئی ہو۔'' یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رکا اور جیکسن کی طرف دیکھا۔ ''جس طرح اس روز وہ لاش ملنے والی جگہ کو غور سے دیکھ رہا تھا، اس سے لگا کہ وہ کسی شے کی تلاش میں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی ٹائی پن تلاش کررہا ہو، جو جھگڑے کے دوران یا پھر لاش ٹھکانے لگاتے وقت کہیں گر گئی ہو۔''
جیکسن غور سے میری بات سن رہا تھا۔

''تامی کی گردن پر ریشم کے ذرات پائے گئے ہیں۔'' جیکسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ یہ اسی ٹائی کے ذرات ہوں گے جو قتل کی شب کلب سے نکلتے ہوئے تامی نے پہن رکھی تھی۔ برٹ کی پن کے ساتھ ساتھ تامی کی ٹائی بھی تلاش کرو اور لاش کی گردن سے ملنے والے ریشم کے ذرات کا اس سے موازنہ کرو۔ میری بات سچ ثابت ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے گہری سانس لی اور خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔
جیکسن کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''یہ ٹائی پن کی بات تم کیسے جانتے ہو؟''
''تصویر کی مدد سے۔'' میں مسکرایا۔
''تم ذہین ہو۔'' وہ بھی مسکرا دیا۔ ''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ واردات کے وقت تامی نے ٹائی میں پن لگا رکھی تھی۔ وہ اس کی کار کے بریک پیڈل سے ملی ہے اور ایک پن لاش کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی مگر ہم نے جان بوجھ کر یہ بات اخبار والوں کو نہیں بتائی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر استفساریہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ برٹ قاتل ہے؟''
''ٹائی پن والی بات صرف پولیس جانتی ہے۔'' میری بات سن کر اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''کسی کو یہ معلوم نہیں کہ تامی نے ٹائی میں پن لگا رکھی تھی یا نہیں مگر برٹ جانتا تھا۔ اس نے ہی قتل کے بعد ٹائی سے پن نکال کر گاڑی میں پھینکی ہوگی تاکہ جائے واردات سے ثبوت نہ ملے۔''
''برٹ...'' وہ بڑبڑایا۔
''واردات کے تیسرے دن دوپہر کے وقت برٹ اس مقام پر پہنچا جہاں پر تامی کی لاش پولیس کو ملی تھی۔ وہ غور سے اس زمین پر کچھ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی گاڑی کے ٹائر بھی کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ریستوران سے نہیں بلکہ کسی ایسے علاقے کی طرف سے ہوتا ہوا وہاں پہنچا تھا جہاں مٹی، ریت، کیچڑ وغیرہ ہوسکتی ہے، ورنہ وہ ریستوران یا اپنے گھر سے آتا تو پختہ سڑک پر کیچڑ کا کیا کام...'' یہ کہہ کر میں رکا۔ ''وہ سیون برج کی طرف سے ہوتا ہوا آیا ہوگا۔ اسے اپنی ٹائی پن کی تلاش تھی۔ وہ اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہوسکتی ہے۔''
''ممکن ہے کہ وہ لاش والی جگہ پر ویسے ہی آیا ہو۔'' جیکسن نے بیچ میں لقمہ دیا۔
''نہیں...'' میں نے فوراً اس کی بات مسترد کی۔ ''برٹ کہہ رہا تھا کہ وہ تامی کی موت کا صدمہ برداشت نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر پا رہا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کا لہجہ لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے بھی نظریں ملانے سے کترا رہا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی نظریں بدستور اس جگہ جمی تھیں جسے پولیس نے دھاری دار فیتہ لگا کر محفوظ کیا ہے۔ اسے صرف ٹائی پن کی تلاش تھی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اسے صرف ٹائی پن کی ہی تلاش تھی؟"

"اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟" یہ کہہ کر میں مسکرایا۔ "برٹ جانتا ہے کہ اگر وہ پن اس سے پہلے آپ کو مل گئی تو پولیس اس تک بھی پہنچ جائے گی۔ اسی لیے وہ ثبوت مٹا کر جلد سے جلد یہاں سے رفوچکر ہونا چاہتا ہے۔" بات مکمل کر کے میں نے سب کے چہروں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ انکل، جیکسن اور ہیلسن دم بخود بیٹھے تھے۔

"ٹائی پن پر نمبر ہیں..." جیکسن نے کہا۔

"جانتا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "میرے والد بھی اُس کلب کے رکن تھے۔ ان کی ٹائی پن پر رکنیت نمبر 118 کندہ تھا۔ میرے پاپا، ٹامی اور برٹ نے ایک ساتھ کلب کی رکنیت حاصل کی تھی۔ برٹ کا ٹائی پن نمبر 119 اور ٹامی کا 120 تھا۔"

"تو بات یہ ہے کہ جس پن کی برٹ کو تلاش ہے وہ..."

"خود اس کی اپنی ہے، نمبر 119۔" میں نے قطع کلامی کی۔ "اس رات گروپ فوٹو میں برٹ بھی ٹائی پن لگائے کھڑا تھا۔ ممکن ہے جب برٹ اور ٹامی کا ویران مقام پر جھگڑا ہوا تو ٹامی نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور یوں اس کی پن ٹامی کی مٹھی میں آگئی۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے لاش کی مٹھی میں جس پن کو دریافت کیا، اس پر کندہ نمبر 119 ہے۔ برٹ کو حیرت ہوگی کہ نہ اُسے اور نہ ہی پولیس کو وہ ٹائی پن اب تک مل پائی ہے اسی لیے وہ اس کی تلاش میں ہے۔" وہ دونوں آفیسر منہ کھولے میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر تک خاموشی سے سوچنے کے بعد جیکسن نے گردن موڑی۔ "فرانزک لیب کو فون کرو۔" اس نے آفیسر ہیلسن کو ہدایت کی۔ وہ فوراً اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"ہاں تو لیے..." آفیسر ہیلسن کے جانے کے بعد جیکسن نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "ٹامی کی گاڑی رکی، وہ باہر نکلا، برٹ سے تکرار ہوئی، وہ آپس میں الجھ پڑے۔ برٹ کی ٹائی اس کے ہاتھ میں آگئی اور وہ پن ٹامی کی مٹھی میں دبی رہ گئی..." اس نے مختصراً ساری روداد کہہ ڈالی۔ "اس کے بعد تمہاری تھیوری کیا کہتی ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"برٹ نے اسے دھکا دیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبایا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "برٹ کی ٹائی پن ٹامی کی مٹھی میں تھی اور جب اس کا دم گھٹنے لگا تو اس کی مٹھیاں قدرتی طور پر بھنچ گئیں۔ اسی دوران وہ بے دم ہونے لگا۔ ٹامی کی قمیص کا کالر بے ترتیب ہو چکا تھا۔ برٹ نے ہانپتے ہوئے اسے چھوڑا مگر اس میں کچھ سانسیں باقی تھیں۔ برٹ نے اس کی ٹائی پکڑی۔ پن کھینچ کر علیحدہ کی، اسے گاڑی میں پھینک دیا اور پھر ٹائی کے سرے پکڑ کر کھینچے اور یوں اس کا دم گھٹ گیا۔ برٹ نے اس کی ٹائی کھولی، لاش کا معائنہ کیا۔ وہ مر چکا تھا۔"

"جب برٹ نے ٹامی کو قتل کر دیا تو اس کی لاش کو جائے واردات سے دور پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟" سراغ رساں جیکسن نے ایک اور سوال کیا۔

"اسے ڈر ہوگا کہ جس مقام پر قتل ہوا، اگر لاش وہیں سے ملی تو پولیس کو وہاں سے کئی اور ثبوت بھی مل سکتے ہیں مثلاً قاتل کے بال یا کچھ اور جس سے ڈی این اے ٹیسٹ ممکن ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "ایک بات ذہن میں رکھیے۔ قتل سیون برج کے اِردگرد ہی کہیں ہوا ہے۔"

"وجہ؟" اس نے کہا۔

قاتل واردات کے بعد اتنا گھبرایا ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے لیے بہت دور جانے کی نہیں سوچ سکتا۔"

جیکسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہاری بات میں وزن ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔

"ٹامی کی گاڑی سیون برج سے ہی ملی تھی۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "برٹ نے اس کی کار کے ذریعے ہی لاش لے جا کر پھینکی اور پھر واپس آکر ٹامی کی ٹائی سے کار پر اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے۔ ٹائی جائے واردات پر پھینکی یا گھر لے جا کر جلا دی، یہ بعد میں پتا چلے گا۔" میں نے بات مکمل کی۔ جیکسن غور سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میرا سوال پھر وہی ہے کہ آخر اس نے لاش کو گودام کے سامنے والے سرسبز میدان پر ہی کیوں پھینکا؟" جیکسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

میں نے انکل سام کی طرف دیکھا۔ "جس میدان سے لاش ملی ہے، اس کے سامنے ان کا گھر ہے۔" میں نے انگلی سے انکل کی طرف اشارہ کیا۔ "انہوں نے ٹامی کے ذریعے

کئی سال پہلے ریستوران میں کچھ سرمایہ کاری کی تھی۔ ممکن ہے کہ برٹ تفتیش کا رخ ان کی طرف موڑنا چاہتا ہو۔ ویسے بھی رقم کی لین دین پر تو عموماً قتل ہو جاتے ہیں یا پھر..." میں کچھ کہتے کہتے رکا اور گہری سانس لی اور انکل کی طرف دیکھا۔ وہ میری بات سن کر تائید میں سر ہلا رہے تھے۔

"پھر کیا؟" جیکسن نے بے تابی سے کہا۔

"ممکن ہے کہ وہ انکل کو پھنسانے کے ساتھ ساتھ انہیں دھمکا بھی رہا ہو کہ زبان بند رکھنا اور رقم نہ مانگنا، ورنہ یہی حشر تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایک بار پھر انکل کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "ویسے بھی معاہدے کی رُو سے ٹامی کے بعد اب برٹ انہیں رقم ادا کرنے کا پابند ہے۔" انکل سام نے ایک بار پھر تائید میں سر ہلا دیا۔

کمرے پر خاموشی کا راج تھا۔ میری نگاہیں جیکسن پر جمی تھیں۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں درمیان میں رکھی میز پر جمی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پلکیں جھپکنا بھی بھول گیا ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور میری طرف بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم نے جو تھیوری بیان کی، وہ صرف ایک گروپ فوٹو کی بنیاد پر ہے جس میں ٹامی بھی کھڑا تھا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میرا خیال یہی ہے کہ جو کچھ کہا، وہی درست ہے۔ برٹ، ٹامی پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ ریستوران فروخت کر دیا جائے مگر وہ اس کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ برٹ جواری ہے اور بری طرح جوئے کی لت کا شکار بھی۔ وہ ریستوران بیچ کر لاس ویگاس جانا چاہتا تھا۔ دو تین دن پہلے اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا کہ وہ سودا ہوتے ہی لاس ویگاس نکل جائے گا۔ ٹامی کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ برٹ کو اس کا حصہ ادا کر کے ریستوران کو فروخت ہونے سے بچا سکے۔ اب ایسے میں برٹ کے پاس یہی راستہ تھا کہ اسے ہی بیچ سے نکال دے۔ ویسے بھی برٹ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ٹامی کے بعد سیلی کو ریستوران میں کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اکیلا اسے نہیں چلا پائے گا۔" میں نے تفصیل سے اُن امکانات کو بیان کیا جس سے برٹ کو ٹامی کا قاتل ثابت کرنے کی دلیل مزید مضبوط ہوتی۔ "مگر یہ ٹائی پن..." میں مسکرا دیا۔

"اب وہ نہیں بچ سکتا۔"

"ٹامی اور ٹائی پن..." جیکسن مسکرایا۔ "تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہو لڑکے۔" پہلی بار اس کے چہرے پر اطمینان نظر آیا تھا۔

"شکریہ۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کرو گے؟" اس نے اپنائیت سے کہا۔ "ہائی اسکول مکمل کر کے پولیس میں سراغ رساں کی ملازمت کے لیے درخواست دو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"واقعی..." میری آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔

"کیوں نہیں۔" جیکسن مسکرایا۔ "تم اس ملازمت کے لیے نہایت موزوں ہو گے۔ یہ بات تم ثابت کر چکے ہو۔"

میں نے انکل سام کی طرف دیکھا۔ میری ذہانت کے اعتراف پر وہ بھی بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆☆

وہ اتوار کی شام تھی۔ میں وقت گزاری کے لیے انکل سام کی طرف چلا آیا۔ ویسے اس اتوار کو انہوں نے مجھے ڈنر کی دعوت کئی روز پہلے دے دی تھی۔ انہوں نے مجھے شام ساڑھے چھ بجے آنے کا کہا تھا مگر میں چھ بجے ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے اورنج جوس پی رہے تھے۔

"آخر ٹامی کا خون رائگاں نہیں گیا، قاتل پکڑا ہی گیا۔" انکل سام نے باتوں باتوں میں کہا۔ "آج اخبار میں تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ برٹ کہتا ہے کہ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ بس، غصے میں سب کچھ ہو گیا۔"

"جھوٹ بولتا ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "سب منصوبہ بندی سے ہوا۔ سیلی بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔"

"کیا...؟" وہ چونکے۔ "برٹ نے تو اس کا نام بھی نہیں لیا۔"

"کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ وہ عدالت میں یہ بات ثابت کر سکتا ہے اور نہ ہی پولیس کے سامنے اسی لیے منہ بند کر رکھا ہے۔"

"مگر سیلی..."

"وہ بھی چاہتی تھی کہ ٹامی ریستوران فروخت کر کے نیویارک کے اس مضافات کو چھوڑ دے اور کسی پُرفضا مقام پر ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارے۔ وہ بھی اس کام سے اکتا گئی تھی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" انکل نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ ٹامی کی موت سے دو ہفتے پہلے انہوں نے کنگز شاپنگ مال سے گھر تک مجھے لفٹ دی تھی۔ راستے بھر وہ دونوں یہی باتیں کر رہے تھے۔ ٹامی انکار کر رہا تھا اور وہ اسے رضامند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ برٹ کے فیصلے کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درست کہہ رہی تھی۔“

”مگر یہ بات تم نے سراغ رساں سے تو نہیں کی؟“

”کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا جو وقت بتایا گیا ہے، اس وقت سیلی کلب میں تھی...“

”کلب میں تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس رات نامی کا قتل ہونے والا ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ انکل نے پوچھا۔

”سیلی بہت خوش مزاج عورت ہے مگر نامی کے ساتھ اس کی آخری تصویر کو غور سے دیکھو، وہ نروس اور اعصابی دباؤ میں نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے سے اندرونی کیفیت ظاہر تھی۔ ویسے بھی وہ جان بوجھ کر کلب میں رکی اور نامی کو اکیلے جانے دیا۔ برٹ اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر نامی نہ مانے تو اسے قتل کرنا ہی بہتر ہوگا۔ شوہر کی موت کے بعد وہ ریستوران میں نصف حصے کی مالک بن جاتی۔ اسی کی رضامندی سے برٹ اس کے قتل کے ہفتہ دس دن کے اندر اندر ریستوران فروخت کر کے لاس ویگاس نکلنا چاہتا تھا۔“

”بڑا شیطانی دماغ ہے تمہارا...“ انکل مسکرائے۔

اسی دوران میں میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نمبر دیکھا۔ کال سراغ رساں جیکسن کے نمبر سے آرہی تھی۔ ”ہیلو۔“ میں نے فون اٹینڈ کیا۔

”نامی قتل کیس کی تفتیش مکمل ہوگئی ہے۔“ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

”بہت ہی اچھا ہوا۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا اور اسپیکر آن کر دیا تاکہ انکل بھی سن لیں۔

”آگے سنو...“ جیکسن نے کہا۔ ”ہم نے نامی کی بیوہ کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ وہ اس قتل کی ماسٹر مائنڈ تھی۔“

”مگر کیسے؟“ یہ سن کر میں بری طرح چونک گیا۔

”قتل اور لاش ٹھکانے لگانے کے بعد برٹ نے اسے فون کر کے کام ہو جانے کی اطلاع دی تھی۔“ جیکسن بتا رہا تھا۔ ”جب ہم نے برٹ کے موبائل پر تفتیش کی تو پتا چلا کہ پوسٹ مارٹم میں قتل کا وقت اور فون کال کے درمیان صرف پچیس منٹ کا وقفہ تھا۔ یہ فون اس نے سیلی کو اطلاع دینے کے لیے کیا۔ یہی نہیں، دس منٹ بعد اس نے سیلی کو ایس ایم ایس بھیجا کہ اس کی نائی پن شاید جائے واردات پر کھو گئی ہے۔ اس پر نمبر کندہ تھا جس کی مدد سے پولیس اس تک پہنچ سکتی ہے۔ اس نے دو ایس ایم ایس سیلی کو بھیجے۔ ایک پن کھونے کا اور دوسرے میں جائے واردات پر پن کی تلاش میں ناکامی کی بات کہی گئی تھی۔“

”اس روز بھی وہ پن کی ہی تلاش میں وہاں آیا ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔“ جیکسن نے جواب دیا۔ ”سیلی نے اعتراف کر لیا کہ وہ شریک جرم تھی مگر اس نے اپنے ہاتھوں سے واردات میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔“

”خیر... اب جو کہے، جانے والا تو گیا۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔“ جیکسن نے کہنا شروع کیا۔ ”میئر نے اس قتل کیس میں مدد کرنے پر تمہارے لیے تعریفی سند، نقد انعام اور تعلیم مکمل کرنے پر نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت دینے کا اعلان کیا ہے۔ کل صبح اخبار میں پڑھ لینا... بائے... پھر ملتے ہیں۔“

جیکسن کا انکشاف سن کر جیسے میرا دل اچھل کر حلق سے باہر آگیا۔ تین سال قبل قتل ہونے والے میرے والدین کے قاتلوں کا سراغ تو نہ مل سکا مگر اب مجھے یقین تھا کہ کم از کم کوئی قاتل میرے ہاتھ سے نہیں بچ پائے گا۔ میں نے انکل سام کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بہت خوش نظر آرہے تھے۔

”اس روز ہم نامی کے ریستوران کا آخری ڈنر تو نہیں کر سکے مگر...“ انہوں نے کچھ توقف کیا اور پھر بولے۔ ”تمہاری زندگی کی سب سے پہلی اور بڑی کامیابی کی خوشی میں کہیں چل کر پہلا ڈنر کرتے ہیں۔“

”بہت اچھی تجویز ہے۔“

”تو پھر اٹھو۔“

وہ کھڑے ہوئے اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”شام کے سوا سات بج رہے ہیں اور میرے ڈنر کا بھی وقت ہو رہا ہے۔“

کچھ دیر بعد ہماری کار نہایت تیزی سے نامی اور برٹ کے ریستوران کے سامنے سے گزری۔ میں نے نظر ڈالی۔ ریستوران... جہاں کبھی اس وقت روشنیاں جگمگاتی تھیں، پارکنگ کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی، آج وہاں ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ برٹ کے جوئے کی لت نے تین زندگیاں ہی تباہ نہیں کیں بلکہ لوگوں کے پسندیدہ ریستوران کو بھی ویران کر دیا تھا۔ میں نے انکل کی طرف دیکھا۔ وہ بیک ویو مرر میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں بھی افسردگی تھی۔ میں ان کے دل کی بات بن کہے ہی سمجھ چکا تھا۔ آخر وہ ریستوران ان کا پسندیدہ جو تھا۔

منظر امام

موسیقی کی مار

فی زمانہ ہر شخص موسیقی سے شغف رکھتا ہے... ہلکے پھلکے دھیمے سُروں والی موسیقی دل کے نرم و نازک احساسات کو معطر و جاودان کر دیتی ہے... آپ کے جانے پہچانے کردار کی جھلک... اس دفعہ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کو چھیڑنے کا قصد کر لیا تھا...!

دلوں دماغ کو جھنجوڑ دینے والے شور و ہنگامے... استاد محترم کے نئے کارنامے

ویسے تو استاد کے سارے ہی کارنامے کمال کے ہوتے ہیں کسے یاد رکھیں اور کسے بھول جائیں۔ استاد کو ان دنوں کلاسیکی سیکھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ اس شوق کا سبب انہوں نے یہ بتایا تھا۔ ”گزشتہ شب مژگان سے یہاں تان سین بقدر شہود وجود میں عالم تاب تشنہ ہیں۔“

”استاد ذرا ہلکا ہاتھ رکھیں۔ میرا مطلب ہے ذرا آسان کر دیں۔“

”گفتگو آسیان میاں تان سین ہے۔ اس لیے فیل بدن پاپوش راگ ملہار و بھیروی ہے جو اس ناچیز آخری مغل فرمانروا کو تجویز لامکان و تیمور گل گان ہوئی ہے۔“

”استاد برا نہ مانیں تو یہ عرض کروں کہ اب اور زیادہ مشکل ہوگئی ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استاد نے اس بات پر مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ یہ استاد کی عادت تھی جب میں یہ عذر پیش کرتا کہ میں ان کی بات نہیں سمجھ پایا ہوں تو وہ اسی طرح مجھے برا بھلا کہتے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اردو ادب سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔

بہرحال اس دن کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ استاد کلاسیکل سیکھنا چاہتے تھے کیونکہ میاں تان سین نے ان کے خواب میں آکر انہیں بہت ڈانٹا ڈپٹا تھا۔

میاں تان سین مرحوم کا یہ کہنا تھا کہ چونکہ ہر مغل بادشاہ نے کلاسیکی کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی ہے۔ اسی لیے استاد پر بھی لازم ہے کیونکہ استاد مغلوں کے آخری چشم و چراغ ہیں۔

بس استاد پر دھن سوار ہو گئی تھی۔ انہیں میاں تان سین کے حکم پر عمل کرنا تھا ورنہ بقول ان کے ”آسیب گوشہان برنگ انگیزی ہو جائے گا۔“

اب پتا نہیں یہ کیا تھا۔ بہرحال میں نے اس کا مطلب جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اب سوال یہ تھا کہ استاد کو کلاسیکل کون سکھائے گا۔ میں نے اس بارے میں جب دریافت کیا تو استاد مسکرا کر بولے۔ ”تلاشِ بے حجاب کارگرِ بے فتنہ کر چکا ہوں۔ استاد ببن خان سے شرف مریدی کرنے کا امتزاج ذہن یادسا کر رہا ہوں۔“

اس جملے سے بس اتنا سمجھ میں آیا کہ استاد نے کسی استاد ببن خان کو تاڑ لیا ہے اور وہ ان سے کلاسیکل سیکھنی چاہتے ہیں اب یہ ببن خان کون تھے، یہ خود میں بھی نہیں جانتا تھا۔

بہرحال ایک دن جب میں استاد کے محل میں پہنچا تو وہاں ایک تماشا لگا ہوا تھا۔ استاد کے کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف دو عدد گاؤ تکیے تھے۔ ایک پچاس پچپن کی عمر کے بڑے میاں ہارمونیم سنبھالے بیٹھے تھے۔ ان کے برابر میں ایک مریل سا طبلچی تھا۔ جس نے طبلہ سنبھال رکھا تھا۔ استاد ان دونوں کے سامنے تھے اور ان دونوں سے پرے محلے والے تھے جو مفت کا یہ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

میں بھی ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔

”چلیں استاد بذلہ فرمائیں۔“ استاد نے استاد ببن خان سے کہا۔

”بھائی خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔“ استاد ببن خان نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”چشمک بازگان آل تیمور ہوں میں۔“ استاد نے فرمایا۔ ”انقلاب نوکرد تازہ افکار کی نمود بے جا سے سرفراز اور دور باز کرو۔“

اس دوران استاد ببن خان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ شاید اس مجمع میں ایک میں ہی اسے کچھ معقول آدمی دکھائی دیا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔

”بھائی جان ذرا میری بات سنیں۔“

”جی فرمائیں۔“ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔

”خدا کے لیے اس آدمی سے میری جان چھڑوا دیں۔“ اس نے استاد کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے میری زندگی عذاب کر دی ہے۔ یہ کیا بولتا ہے، میرے باپ کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا۔“

استاد اس دوران خاموش بیٹھے رہے تھے۔

”استاد یہ بے چارے آپ کی فارسی سے پریشان ہو گئے ہیں۔“ میں نے استاد سے کہا۔ ”آپ ان کے لیے ذرا آسان ہو جائیں۔“

”یہ تو عذرِ بے محالہ ہے۔“ استاد نے فرمایا۔ ”بہرحال استاد سے یہ گزاشت کرو کہ چرخ نانہجار کو داش و دانہ کر دیں۔ دیوانہ کر دیں اور رنگ بھیرویں مانند کیمرغ کر جائیں۔“

”مقصد یہ تھا کہ استاد ببن خان اپنے کلاسیکی موسیقی کا جادو جگانا شروع کر دیں کیونکہ لوگ بے تاب بیٹھے ہیں۔ استاد ببن خان نے ہارمونیم اور طبلے کو چومتے ہوئے استاد سے کہا۔ ”اب میں کلیان کا سر لگاتا ہوں اس پر دھیان دو۔“

استاد ہمہ تن گوش ہو گئے۔

استاد ببن خان نے الاپنا شروع کر دیا لیکن فوراً ہی استاد نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا تھا۔

”بس۔ بس۔ یہ کلیان مغالطہ اور محاسبہ ہے۔ اصل کلیان آل قلقان کے طفیل یوں ہے۔“

اتنا کہہ کر استاد نے اپنی بے سری آواز میں نہ جانے کیسی تان لگائی کہ استاد ببن خان غصے سے کھڑے ہو گئے۔ ”بس میں اس نانہجار کو کچھ نہیں سکھا سکتا۔ یہ کلاسیکی کی توہین کر رہا ہے۔“

بس اتنا سننا تھا کہ استاد نے غصے سے کانپتے

ہوئے تقریر شروع کر دی۔ ”اے ناسپاس درخواست کنندہ موت عالم تجھے کیا پتا کہ رنگِ موسیقی بہ طفیل بربط دھنگ ہے، دبنگ ہے، آہنگ ہے اور سرنگ ہے۔ تو شب خون کی اولاد نادہندہ ہے جوئے بقر ہے دار تباہ ہے۔ بقائے بے دھڑک ہے اونچی سڑک ہے تجھے کیا آبروئے ملت بیغار ہوئی ہے۔“

استاد تقریر کرتے ہوئے اتنے جوش میں تھے کہ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ استاد ببن خان اپنے طبلے والے اور ساز و سامان کو لے کر وہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔

بہرحال یہ تھا استاد کے کلاسیکل سیکھنے کا واقعہ۔ اس کے بعد میاں تان سین پھر کبھی استاد کے خواب میں نہیں آئے۔ اگر آئے بھی ہوں گے تو استاد نے تذکرہ نہیں کیا۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی۔ استاد کا کارنامہ کچھ اور تھا۔

اور وہ کارنامہ یہ تھا کہ استاد نے ایک دھوبی کی لڑکی سے عشق کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ یہ بہت انوکھی بات تھی۔ استاد کے مزاج اور کردار کے بالکل خلاف۔

دھوبی کی اس لڑکی کا نام ارشاد تھا۔

پتا نہیں دھوبی نے اپنی بیٹی کا ایسا نام کیوں رکھ دیا تھا بہرحال ارشاد ایک بدصورت لڑکی تھی اور اس عشق کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ یا سولہ برس کی ہوگی۔

اور استاد نے اس پر عاشق ہو جانے کا باقاعدہ اعلان کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ انوکھا اعلان اپنی خطرناک شاعری کے ذریعے کیا تھا۔

ایک شام استاد محلے کے چوراہے پر کھڑے ہو کر زور زور سے اپنی نظم سنانے لگے..... استاد کی وہ نظم کچھ یوں تھی۔

”دل گیر فنا فنی رخسار ہے ارشاد
وہ دھوبی ہم نظراں کی بیٹی ہے لوگو درِ شہوار
اس محلہ کم خلق پہ بھرمار ہے ارشاد۔“

اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ ارشاد دھوبی کی بیٹی کا نام ہے اور وہ اس سے عشق کرنے لگے ہیں بس پھر کیا تھا۔ دھوبی اپنا ڈنڈا سنبھالتا ہوا استاد کے پاس آ گیا۔ ”مردود۔ میں تیرا سر پھاڑ دوں گا۔ تو میری بیٹی کو کیوں بدنام کر رہا ہے؟“

”اس لیے کہ ماہ لقا ہے، عبرت کشا ہے، عالیجاہ

شادی سے پہلے

شیر کی شادی ہو رہی تھی۔ برات روانہ ہونے لگی تو ایک چوہا برات کے آگے ناچنے لگا۔ شیر نے پوچھا۔ ”تم چوہے ہو، شیر کی شادی سے تمہارا کیا تعلق؟“

چوہے نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”شادی سے پہلے میں بھی شیر تھا۔“

(مرسلہ: وسیم احمد، کراچی)

ہے۔“ استاد نے فرمایا۔ ”میں اس پر دم نہ کشیدم ہو گیا ہوں۔ میری سانسیں بس اس کے لیے مربوط طولان اور سیلان ہیں۔“

”لعنت ہو تجھ پر تو اپنی عمر دیکھ اور میری بیٹی کو دیکھ۔“

”اس سے کوئی فرق پردہ پوشی نہیں ہوتی۔“ استاد نے فرمایا۔

بہرحال دھوبی انہیں گالیاں دیتا رہا اور استاد اس کی بیٹی سے اپنے عشق کا اعلان کرتے رہے کچھ عجیب صورتِ حال ہو گئی تھی۔ لوگوں نے بڑی مشکلوں سے بیچ بچاؤ کیا تھا۔

دھوبی کو میرے بارے میں معلوم تھا کہ میں استاد کے بہت سے معاملات میں دخیل ہوں۔ اسی لیے وہ فریاد کرتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔

”ارے دیکھیں نا صاحب وہ تو میری بٹیا کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ کم بخت اپنی عمر بھی نہیں دیکھ رہا۔“

”کمال ہے۔“ مجھے یہ سن کر واقعی حیرت ہوئی۔ ”استاد تو اس مزاج کے آدمی نہیں ہیں۔“

”پاگل ہو گیا ہے بڈھا۔“ دھوبی نے کہا۔ ”ہم تم سے بولتے رہے ہیں کہ جا کر سمجھاؤ اس کو ورنہ ہم سالے کا بھیجا باہر کر دیں گے۔“

”ہاں ہاں تم فکر مت کرو میں استاد سے بات کر لیتا ہوں۔“

میں نے استاد سے جب پوچھا تو استاد مسکرا دیے۔ ”ہاں اے گوشہ نشین مجھے عاشق صبر طلب ہو گئی ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”وہ تو ٹھیک ہے استاد لیکن یہ تو بہت نامناسب بات ہے۔ وہ تو بچی ہے۔“

”خارزارِ عشق میں صحرانوردی کو آہن گری مت بناؤ۔“ استاد چیخ کر بولے۔ ”پیمانہ ترازو لے کر مت ابتلائے ہوش کرو۔“

مطلب یہ تھا کہ عشق کے معاملات کو عمر کے ترازو میں مت تولو۔

”نہیں استاد۔ تمہارے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔“ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”سب مناسب احوالِ درست اقدام ہے۔“ استاد نے فرمایا۔

نہ جانے کیوں استاد اس معاملے میں بالکل اڑے ہوئے تھے حالانکہ اس سے پہلے کئی بار ایسا ہو چکا تھا کہ جب میں نے استاد کو کسی معاملے میں سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے فوراً میری بات مان لی تھی لیکن اس بار وہ اڑ کر رہ گئے تھے۔

”استاد، دھوبی تمہیں جان سے مار دے گا۔“ میں نے عاجز آ کر کہا۔

”عشقِ دارِ سکون ہے۔ بے ستون ہے، زندگی بعد مرگ فنا اور بعد الموت ہے کیونکہ یہ عالم لاہوت ہے۔ روزگار فقیر ہے، درویش ہے۔“

مطلب یہ کہ عشق میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ اس میں زندگی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ عشق کرنے والے اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس قسم کی نہ جانے کتنی باتیں انہوں نے ایک سانس میں کہہ ڈالیں۔

میں سمجھ گیا کہ اس بار ان کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ تو ایک عام سی لڑکی تھی۔ لڑکی کیا بچی تھی جو اپنی ہم جولیوں کے ساتھ محلے میں کھیلتی پھر رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس دور کا ایک انوکھا انسان اس پر تن من دھن سے قربان ہو چکا ہے۔

میں نے ایک بار پھر استاد کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن استاد کچھ سننے کے موڈ ہی میں نہیں تھے۔ اس لیے میں ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

استاد پر مجھے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ میں نے ان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا لیکن ان کے حوالے سے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ آج استاد نے سرِعام اس لڑکی سے اپنے عشق کا اظہار کر دیا۔

یہ اور بات ہے کہ وہ بے چاری ان کے جناتی اظہار کو سمجھ نہ سکی ہو لیکن استاد نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا پھر یہ خبر ملی کہ استاد اور دھوبی کے درمیان پھر جھگڑا ہوا ہے۔

بات اتنی بڑھی کہ دھوبی اپنی برادری والوں کو لے آیا۔ وہ استاد کو دھمکی دے گئے کہ اگر استاد نے ایسی حرکتیں بند نہیں کیں تو وہ پولیس میں رپورٹ کروا دیں گے۔

صورتِ حال واقعی خراب ہو گئی تھی اسی لیے میں استاد کو سنبھالنے اور سمجھانے کے لیے ایک بار پھر ان کے پاس پہنچ گیا اور وہاں میں نے جو کچھ دیکھا اس سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ استاد کا دماغ ہی خراب ہو چکا ہے۔

استاد کے گلے میں ایک تختی پڑی ہوئی تھی۔ جس پر موٹا موٹا ”ارشاد“ لکھا ہوا تھا۔ ارشاد دھوبی کی لڑکی کا نام تھا اور استاد اس تختی کو گلے میں لٹکائے گھوم رہے تھے۔

استاد نے اپنی اس بے تکی حرکت سے پورے محلے میں تناؤ کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

شروع شروع میں سب یہی سمجھتے رہے کہ یہ دو چار دنوں کا مذاق ہے خود ہی ختم ہو جائے گا لیکن استاد تھے کہ سیریس ہی ہوتے چلے جا رہے تھے۔

خود میں نے استاد سے پوچھا۔ ”استاد، آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔“

”استغفار عشق کا شیدائی ہوں۔“ استاد نے فرمایا۔

”لیکن اتنی چھوٹی بچی سے کیوں عشق کر رہے ہیں۔“

”کیونکہ یہ دستور ہے کم نہاد اور بے فریاد ہے۔“ استاد نے کہا۔

”استاد، آپ کی اس حرکت سے لڑکی بدنام ہو رہی ہے۔“

”بدنام زمانہ فرومایہ بہا گر ہے۔“ استاد نے فرمایا۔

اندازہ ہو گیا کہ استاد کی کیفیت اب دوسری ہو چکی ہے۔

نہ جانے ان پر کیسے عشق کا بخار چڑھ گیا تھا۔ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک نظم بھی لکھ ڈالی تھی۔ جس کی ابتدا سیدھی سادی تھی یعنی ”برباد کر و ارشاد کرو۔“

پتا نہیں استاد کا کیا مطلب تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ انہوں نے اس بے چارے دھوبی کو ضرور برباد کر دیا تھا۔ وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر کسی اور محلے میں جانے کا پروگرام بنانے لگا۔

ایک بار خود اس کی لڑکی نے بھی استاد پر پتھر برسائے لیکن استاد کو ایسی باتوں کی کیا پروا ہو سکتی تھی وہ اپنے عشق کے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔

ایک دن میں ان پر برس پڑا۔ استاد آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت غلط ہے۔ آخر آپ کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی۔“

”اس لیے کہ یہ تحریک دھوبی ہے۔“ استاد نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

”یہ راہِ پُرخار دشمن زار اور منت کش تابہ شنیدین ای دھوبی ہے۔“

استاد کی اس بے تکی بات سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ استاد یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اس دھوبی نے ان کو یہ راستہ دکھایا ہے۔

”استاد میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔ ”وہ دھوبی خود آپ کو راستہ کیوں بتانے لگا۔“

”اس لیے کہ خود وہی بانیِ ستم ایجاد عشق ہے۔“ استاد نے فرمایا۔

”استاد آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تم سلسلۂ جنبان دھوبی کرو اور اسے حاضر آبی تیور کرو پھر فرمودات عالیہ کا تماشا دیکھو۔“

مطلب یہ کہ میں اس دھوبی کو ان کے پاس لے کر آؤں پھر استاد بتائیں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے دھوبی سے جا کر کہا تو وہ پہلے ہی سے بھنایا بیٹھا تھا۔ اپنا ڈنڈا سنبھال کر استاد کی شان میں قصیدے پڑھتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا۔

”ہاں رے اب بتا ہم کیا کیا ہے۔“

”تم غریق عشق ذخار اور پیدا کنار ہے۔“ استاد نے فرمایا۔ ”تم نے موسم گل میں آب پاشی فرمائی۔ منجاب اس خیمہ کم دوش و ہوش کے ساتھ کہ نارنگ زمانہ بیت آشکار ہو گیا۔

”خدا کے لیے استاد کچھ ہلکا۔“ میں نے آواز لگائی۔

”اس ناسپاس دھوبی۔ مردار یدکرو کہ اس نے صلاحیان توقیر خان کی دختر بے پروا حسن آرا کے ساتھ کیا ناوک افشانی کی ہے۔“

میں حیران رہ گیا استاد نے اپنی جناتی زبان میں ایک بندے کا نام بتایا تھا توقیر خان جو اس محلے کا تھا اس کی ایک بچی تھی جو ذہنی معذور تھی۔ وہ دن بھر محلے میں گھومتی پھرتی تھی۔

”ہاں بتاؤ استاد کیا ہوا تھا؟“

پھر استاد نے بتانا شروع کر دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ استاد نے ایک دن اس دھوبی کو اس ذہنی معذور بچی کے ساتھ نازیبا حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

میں نے جب استاد کی یہ بات دھوبی کو سمجھائی تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ہکلانے لگا۔ ”او تو ہم ویسے ہی اس کے سنگ مذاق کیے رہے۔“

”تو بس اے بلند فشار خون۔ جب تو ایک بچی کے ساتھ مذاق آشنا ہو سکتا ہے تو پھر ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔“

مطلب یہ تھا کہ جب تو کسی کی بچی کے ساتھ ایسی حرکتیں کر سکتا ہے تو کوئی تیری بچی کے ساتھ بھی کر سکتا ہے کیونکہ بقول استاد یہ کافران بے محابہ و انصاف فرومایہ اور ہمسایہ تھا۔

دھوبی کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اس نے استاد کے سامنے اپنے کان پکڑ لیے۔ ہاتھ جوڑ لیے وہ رونے لگا تھا کہ اس سے واقعی غلطی ہو گئی ہے۔

استاد نے فرمایا کہ انہیں اس کی بچی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے صرف اس دھوبی کو احساس دلانے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا۔

اس دن کے بعد سے استاد نے ارشاد، ارشاد کی پکار ختم کر دی۔ دھوبی بھی شرمندگی کی وجہ سے زیادہ دنوں تک محلے میں نہیں رہ سکا وہ محلہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

لوگوں کا یہ خیال تھا کہ شاید وہ دھوبی استاد کی زیادتیوں کی وجہ سے محلہ چھوڑ کر چلا گیا ہے لیکن استاد کو ایسی باتوں کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔

وہ اپنی دنیا میں مگن تھے اور پھر سے ان کی زندگی اسی ڈھرے پر آ گئی تھی جس پر وہ چلتے رہے تھے۔ میں نے اس واقعے کو استاد کا ایک بڑا کارنامہ بتایا ہے تو کیا یہ بڑا کارنامہ نہیں تھا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آفت ناگہانی

سرور اکرام

آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی ایسا دن نہیں گزرتا کہ کوئی نئی بات سامنے نہ آتی ہو... ہر گزرتے وقت کے ساتھ جدیدیت میں اضافے کا عمل مسلسل جاری ہے... اس جدید اور ایٹمی دور میں کہیں نہ کہیں... کوئی ایسا واقعہ ضرور سامنے آجاتا ہے جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے... سائنس کی کرشمہ سازیوں میں سے ایک کرشمہ... جو ایک انسان کی قابلیت کو ظاہر کرتا ہے... اسے عروج کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے... اسی کرشمے کا دوسرا رخ... کسی الجھے شخص کو پستیوں میں دھکیل دیتا ہے... ذہن کو الجھا دینے والی کہانی کے تانے بانے... جو آپ کو طلسم کدہ کا قیدی بنا دیں گے...

وطن کے رکھوالوں کا گھناؤنا کھیل جو اپنے وطن کو رہن رکھنے کے درپے تھے...

ذیشان نے آج پھر وہی دیکھا کہ اس کی جیپ ایک ویران مندر کے سامنے آکر رک گئی ہے۔ جیپ میں اس کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا ہے لیکن اس کے خدوخال واضح نہیں ہیں۔ ایک دھندلا سا تاثر ہے۔ یہ مندر بہت قدیم دکھائی دیتا ہے۔ اس کی دیواروں پر خشک بیلیں لپٹی ہوئی ہیں۔ کسی زمانے میں شاید اس کا دروازہ آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا ہوگا لیکن اس وقت اس کے سامنے اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ مندر کے پیچھے اور اس کے آگے ہر طرف ویرانی تھی۔

جہاں اس کی جیپ آکر کھڑی ہوئی تھی، وہ ایک ویران سا راستہ تھا۔ بالکل اجاڑ۔ ایک پودا، ایک جھاڑی تک نہیں لیکن حیرت انگیز طور پر مندر کے پیچھے اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے۔

ذیشان کو اس وقت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پھر مندر کے بوسیدہ دروازے کے پٹ کھلتے ہیں اور ایک آدمی اندر سے نکلتا ہے۔ اس نے ایک کمبل اوڑھ رکھا ہے جس سے اس کا جسم دکھائی نہیں دے رہا۔ اس کا چہرہ بھی چھپا ہوا ہے۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی ہیں اور ان آنکھوں میں شعلے دہک رہے تھے۔ وہ آنکھیں آہستہ آہستہ جیپ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں ذیشان کے پورے وجود پر محیط ہوتی جارہی تھیں۔

وہ جیسے ان آنکھوں میں سماتا جارہا ہو۔ اچانک کچھ ہوا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے ذیشان کو زور سے جھنجھوڑ دیا۔ وہ چونک اٹھا۔ وہ آنکھیں غائب ہوگئیں۔ وہ مندر غائب ہوگیا۔ ویرانہ غائب ہوگیا۔

اب ذیشان اپنے کمرے میں تھا۔ اپنے بستر پر تھا اور اس کی بیوی مشعل اس کے پاس تھی۔ اس نے ذیشان کو جھنجھوڑ

کر جگا دیا تھا۔ ”ارے کیا ہوگیا تھا آپ کو؟“ اس نے پوچھا۔ ”آپ ایسی ڈری ڈری آوازیں کیوں نکال رہے تھے؟“

”مشعل! پھر وہی خواب۔“ ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں نے پھر وہی خواب دیکھا تھا۔ وہی ویران مندر اور ایک ایسا آدمی جس کی آنکھیں بہت روشن ہیں۔“

”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ ہارر فلمیں نہ دیکھا کریں۔“ مشعل نے کہا۔ ”وہی فلمیں آپ کے ذہن پر نقش ہوگئی ہیں۔“

”نہیں یار! میں نے پچھلے دنوں ایسی کوئی ہارر موودی نہیں دیکھی جس میں اس قسم کا کوئی منظر ہو۔ پھر خواب ایک بار آئے، دوبار آئے... یہ بار بار کیوں آتا ہے؟“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ پچھلے جنم میں اس مندر کے پجاری رہ چکے ہوں؟“ مشعل نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔

”ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔“ ذیشان بھی مسکرا دیا۔

وہ یہ خواب پچھلے کئی دنوں سے بلاناغہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے لاشعور میں اس مندر سے متعلق ایسا کون سا واقعہ وابستہ ہے۔

ذیشان ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ وزارت دفاع میں اس کی حیثیت بہت اہم تھی۔ ایک بہت اچھا عہدہ تھا اس کے پاس۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صحت بھی شان دار تھی۔

ذیشان ایک آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔ مشعل اس کی محبت بھی تھی اور بیوی بھی۔ ایک خوب صورت دبلی پتلی پڑھی لکھی لڑکی جو ذیشان کے دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔

یہ خوب صورت مکان ان کا اپنا تھا۔ زندگی میں کسی کو اچھی زندگی گزارنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب ان کے پاس تھیں۔

ان کی شادی کو ابھی صرف ایک سال ہوا تھا۔ ابھی انہوں نے بچوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ پہلے بھرپور انداز سے زندگی انجوائے کرلینا چاہتے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ذیشان نے مشعل سے کہا۔ ”آج میں دفتر نہیں جاؤں گا۔“

”کیوں؟“

”بس یونہی۔ دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ گھٹن سی ہو رہی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ آج ہم دل بھر کر شہر کی سیر کریں گے۔“

”یونہی... میرا مطلب ہے بغیر کسی مقصد کے؟“

”ہاں یار! بغیر کسی مقصد کے۔ کیا ضروری ہے کہ ہر وقت یہ کم بخت ہمارے ساتھ رہے۔“

”لیکن میں نے ایک مقصد نکال لیا ہے۔“ مشعل نے کہا۔ ”ہم پہلے سپر اسٹور جائیں گے۔ وہاں سے کچھ لینا ہے۔ اس کے بعد سیر ہوگی۔“

”چلیں، جیسے آپ کی مرضی۔“ ذیشان کو اسٹورز وغیرہ کے ماحول اور بھیڑ بھاڑ سے وحشت ہوتی تھی اس لیے وہ باہر ہی کھڑا رہا۔ مشعل اس کی اس عادت سے واقف تھی اس لیے اس نے ضد بھی نہیں کی۔

ذیشان آنے جانے والے لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔ زندگی کبھی کبھی کتنی رواں دواں محسوس ہونے لگتی ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ہو۔ لیکن سب کچھ ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ اندر ہی اندر ایک ہلچل مچی رہتی ہے۔ ایک طوفان سا انگڑائیاں لیا کرتا ہے۔

اچانک ذیشان کے سامنے سے ایک شخص اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر گزر گیا۔ وہ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ صرف ایک لمحہ لیکن اس ایک لمحے نے ذیشان کو احساس دلادیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے۔ وہی اس کے خوابوں والا۔

وہی آنکھیں تھیں۔ وہی شعلے برساتی دہکتی ہوئی آنکھیں... جو پورے وجود پر محیط ہوجاتی تھیں۔ وہ آدمی اپنی شان دار گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔

وہ اچھی صحت کا ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے بہت قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور سر بالوں سے خالی تھا... یعنی گنجا تھا۔ ذیشان پر جنون سا سوار ہوچکا تھا۔ اگر یہ وہی آدمی تھا تو پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون ہے یہ؟ اس کی آنکھیں اسے خواب والے شخص کی آنکھیں کیوں محسوس ہوئی تھیں؟

وہ آدمی اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ ذیشان نے بھی اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس نے اس کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

امجد مائک ہاتھ میں لیے کیمرے کی طرف دیکھ کر بول رہا تھا۔ ”سب جھوٹ ہے۔ اپنے آپ کو بہلانے اور دھوکے دینے کی باتیں ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہمارا ملک اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا؟ نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ بہت بھیانک ہے۔ زرمبادلہ کے ذخائر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کرپشن اپنی انتہا کو ہے۔ سیلاب اور دہشت گردی نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قیادت کا خوفناک بحران۔ سچی اور اچھی قیادت کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔“

اس کے سامنے بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ یہ ایک چینل کا ٹاک شو تھا۔ اس میں آڈینس کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور گفتگو میں حصہ لینے والے کچھ دانشور بھی تھے۔ کچھ صحافی اور کچھ دوسرے شعبوں کے لوگ۔

کسی نے امجد سے کہا۔ ”کیا آپ اپنی باتوں کے ذریعے قوم میں مایوسی نہیں پھیلا رہے؟“

امجد ہنس پڑا۔ بہت تلخ ہنسی تھی اس کی.... اس نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔ ”چلیں، تو پھر آپ ہی بتا دیں کہ قوم میں امید کا کوئی امکان ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے، کس طرف ہے؟“

اس سوال کا کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔ امجد نے ایک صحافی سے پوچھا۔ ”جناب! آپ ایک سینئر صحافی ہیں۔ پچھلے دنوں آپ پورے پاکستان کا دورہ کر کے واپس لوٹے ہیں۔ یہ بتائیں آپ نے کیا دیکھا؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ صحافی نے کہا۔ ”مجھے تو کسی طرف سے کوئی پازیٹو بات دکھائی نہیں دی۔ کوئی اچھا اشارہ سامنے نہیں آیا۔“

”تو پھر، آپ کے خیال میں اب کیا ہونا چاہیے؟“

”اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ قوم کی باگ ڈور کسی اور کے حوالے کر دی جائے۔“

”کس کے حوالے کر دی جائے۔ اس کی وضاحت فرمائیں؟“

”نہیں، میں اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا۔“ صحافی نے کہا۔ ”سمجھنے والوں کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔“

وہ ٹاک شو اسی طرح جاری رہا۔ ٹاک شو کے خاتمے پر امجد نے سب کا شکریہ ادا کیا اور اسٹوڈیو سے باہر آ گیا۔ اس کو یہ ٹاک شو ہفتے میں تین دن دکھایا جاتا تھا۔ اس کی گاڑی کے پاس ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ اس نوجوان نے آگے بڑھ کر امجد کا راستہ روک لیا۔ ”امجد صاحب! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی فرمائیں۔ ویسے میں آپ کو نہیں جانتا۔“

”لیکن میں تو جانتا ہوں نا۔“ نوجوان نے کہا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کس کے اشارے پر ایسی باتیں کرتے ہیں؟ کون سی لابی ہے آپ کی؟ کس کے لیے کام کر رہے ہیں؟“

”نوجوان! تم بہت پُرجوش ہو رہے ہو۔ میری کوئی لابی نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ دکھائی دیتا ہے، وہ بتا دیتا ہوں۔ یہی میرا فرض ہے۔“

”لیکن آپ ہمیشہ منفی پہلو ہی کیوں سامنے لاتے ہیں؟ کچھ اچھائیاں بھی تو ہوں گی؟“

”مجھے کہیں نظر نہیں آتیں۔“ امجد نے کہا۔ ”اب تم میرا راستہ چھوڑو، مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

نوجوان ایک طرف ہٹ گیا۔ امجد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ اسے اس قسم کی مخالفتوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ اس کے باوجود لوگ نہ جانے کیوں اس کے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔

راستے میں اسے یاد آیا کہ اسے اپنی بیوی کے لیے میک اَپ کا سامان لینا تھا۔ اس نے ایک بڑے اسٹور کے سامنے گاڑی روک دی اور اسی وقت اسے وہ دکھائی دے گیا۔ وہ... جس کے بارے میں امجد کچھ نہیں جانتا تھا لیکن وہ شخص اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر تندرست آدمی تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، سوائے اس کی آنکھوں کے۔ بہت ہی دہکتی ہوئی آنکھیں تھیں اس کی۔ شعلے برساتی ہوئی۔ وہ آدمی کئی بار امجد کے سامنے آ چکا تھا اور امجد کو ہر بار ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی آنکھیں اس پر محیط ہوتی جا رہی ہوں۔

وہ آدمی کچھ کہتا نہیں تھا۔ صرف دیکھتا ہوا برابر سے گزر جاتا تھا اور امجد کو خلفشار میں مبتلا کر جاتا۔ اس کے اعصاب پراگندہ ہو جاتے۔ یہ کیفیت چند لمحوں تک رہتی۔

پھر وہ اپنی اس کمزوری پر خود کو لعنت ملامت کرتا ہوا زور زور سے اپنا سر جھٹکنے لگتا۔

اس وقت بھی وہی ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر بیدار کیا اور اسٹور میں داخل ہو گیا۔ وہ آدمی اسٹور ہی میں موجود تھا۔

امجد کے ذہن میں سانپ سے رینگنے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ آدمی اسے دوسری بار دکھائی دیا تھا۔ نہ صرف دکھائی دیا تھا بلکہ امجد کو اپنی طرف آنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

امجد غیر ارادی طور پر اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ ”کیا تم اسٹور سے کچھ لینے آئے ہو؟“ اس آدمی نے امجد سے پوچھا۔

”ہاں۔“ امجد نے اپنی گردن ہلا دی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی قوتِ ارادی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہو۔

”جو لینا چاہو وہ بعد میں لینا۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔“ اس آدمی نے کہا۔

امجد نے اپنے آپ کو سنبھال کر انکار کرنا چاہا لیکن وہ انکار نہیں کر سکا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں چل رہا ہوں۔“

”تو پھر اپنی گاڑی میری گاڑی کے پیچھے لگا دینا۔“

دونوں اسٹور سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

وہ ایک ادھیڑ عمر باوقار اور بردبار شخص تھا۔ فنانس کے شعبے میں اس نے اعلیٰ تعلیم کے بعد کافی مہارت حاصل کی تھی۔ اسی لیے وہ اتنے اہم محکمے کا سربراہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس کا نام قادر تھا۔

اس وقت حکومت کے اعلیٰ عہدے داران کی ہنگامی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ملک زبردست معاشی بحران میں مبتلا ہو گیا تھا۔ افراطِ زر نے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ قیمتیں آسمان کو پہنچ رہی تھیں۔ کئی طرح کی تجاویز پر غور ہو رہا تھا۔

آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، دوست ممالک سے تعاون، یا خود اپنے وسائل پر بھروسا کرتے ہوئے اس آسیب پر قابو پانے کی باتیں۔ ہر شخص کے سامنے فائلیں تھیں۔ لیپ ٹاپ تھے۔ اعداد و شمار کا ایک پیچیدہ انبار تھا۔

قادر نے ایک بڑی انوکھی تجویز پیش کر دی تھی۔ اس کی تجویز کے مطابق ہر شخص پر ایمرجنسی ٹیکس نافذ کر دیا جائے۔ اس کے مطابق اٹھارہ کروڑ کی آبادی میں سے کم از کم دس کروڑ ایسے لوگ ضرور ہوتے جو ایمرجنسی ٹیکس ادا کرنے کے قابل ہیں۔ مختلف معاشی طبقے کے لحاظ سے ٹیکس کی شرح بھی مختلف تھی۔

”سر!“ اس کے محکمے کے ایک آدمی نے اسے مخاطب کیا۔ ”اس طرح پورا ملک ایک اور بحران کا شکار ہو جائے گا۔“

”وہ کیوں؟“

”لوگ چیخ اٹھیں گے سر۔“ اس نے کہا۔ ”ہر طرف احتجاج کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

”لیکن پریشانیوں سے نکلنے کے لیے قوموں کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔“ قادر نے کہا۔ ”اور قوم کو اس قربانی کے لیے تیار کرنے والے سیاست داں ہوں گے کیونکہ ہم تو صرف تجویز دے سکتے ہیں۔ عوام کو راضی کرنے کا کام سیاست دانوں کا ہے۔“

”سر! آپ تجویز دینے کے لیے خودمختار ہیں لیکن میرے خیال میں یہ قدم انتہائی نامناسب ہو گا۔“

قادر مسکرا دیا۔ ”میں نے کل کی میٹنگ میں وزیراعظم صاحب کو یہ تجویز دے دی ہے۔ بہت جلد ہی پی ایم صاحب سے میری میٹنگ ہونے والی ہے۔ اس کے بعد صدارتی آرڈیننس آ جائے گا۔“

بات ختم ہو گئی تھی۔ قادر نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ کچھ لوگ اس پروپوزل کے خلاف تھے اور کچھ لوگوں کے خیال میں ان حالات میں اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

میٹنگ ختم ہونے کے بعد قادر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی میز پر رکھے ہوئے اس فون کی گھنٹی بول اٹھی جو صرف اس کے گھر کے لیے مخصوص تھا۔

اسے یاد آیا کہ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی اور وہ ابھی تک گھر نہیں گیا تھا۔ اس کی بیوی نے یاددہانی کے لیے فون کیا تھا۔ دوسری طرف اس کی بیوی ہی تھی لیکن وہ کچھ اور کہہ رہی تھی۔ بہت گھبرائی ہوئی آواز تھی۔ ”سنیں، آپ فوراً گھر آ جائیں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے نا؟“

”فون پر نہیں بتا سکتی۔ گھر آ جائیں اور کسی کو بتائیے گا نہیں کہ آپ کو اس طرح گھر بلایا جا رہا ہے۔“

”خدا کے لیے بتاؤ تو سہی، کیا مسئلہ ہے؟“

”نہیں، فون پر نہیں بتاؤں گی۔ آپ آ جائیں۔ جلدی کریں۔“

وہ آدھے گھنٹے کے اندر گھر پہنچ چکا تھا۔ اس کی بیوی کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ”جامی اغوا ہو گیا ہے۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا۔

”کیا؟“ قادر کے ہوش اڑ گئے۔ جامی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ابھی اس کی عمر صرف بارہ تیرہ برس تھی۔ ”یہ کیا بکواس کررہی ہو؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے... کس نے اغوا کیا ہے اس کو؟“

”یہ میں نہیں جانتی۔ اس کا فون آیا تھا جامی پچھلے دو گھنٹوں سے غائب ہے۔ وہ اپنے کسی دوست کے یہاں گاڑی لے کر گیا تھا۔ راستے میں ایک اسٹور پر اس نے گاڑی رکوالی۔ اسے شاید کچھ خریدنا تھا۔ ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لیے کہہ کر وہ اندر چلا گیا لیکن جب اس کی واپسی نہیں ہوئی تو ڈرائیور نے پورا اسٹور چھان مارا۔ جامی کہیں نہیں دکھائی دیا۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ اسٹور سے کیسے غائب ہو گیا؟“

”اس اسٹور میں کئی دروازے ہیں۔“ اس کی بیوی نے بتایا۔ ”ڈرائیور نے واپس آکر یہ خبر سنائی اور اسی وقت کسی کا فون آگیا۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”کہہ رہا تھا کہ جامی اس کے قبضے میں ہے اور وہ آپ سے بات کرے گا۔“

”میرے خدا!“ قادر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ جو کچھ ہوا وہ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کی بیوی نے ریسیور اٹھا کر کچھ سنا اور ریسیور قادر کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ اسی کا فون ہے۔“

قادر نے جھپٹ کر ریسیور لے لیا۔ ”کون ہو تم؟ میرے بیٹے کو کہاں لے گئے ہو... تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟“

”میں سب جانتا ہوں قادر صاحب۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”آپ اطمینان سے میری باتیں سن لیں۔“

”ہاں کہو۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ مجھے ٹریس نہیں کر پائیں گے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے بول رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کسی کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ یہ آپ کی عقل مندی ہوگی۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کا بیٹا بالکل خیریت سے ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا ہے۔“

”لیکن کیوں... کیوں اغوا کیا ہے اس کو؟“

”آج آپ نے میٹنگ میں جو تجویز رکھی ہے اسے ہر حال میں منظور ہو جانا چاہیے۔“

”کیوں، تمہارا ہمارے معاملات سے کیا تعلق؟“

”میں یہ سب نہیں بتا سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”بس یہ منظور ہو جانا چاہیے۔“

”دیکھو، میں نے تجویز تو دے دی ہے۔ اب منظور کرنا یا نہ کرنا اوپر والوں کا کام ہے۔ اتنا تو تم بھی جانتے ہو گے۔“

”ہاں، یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کا کام یہ ہے کہ ہر طرح اوپر والوں کو یہ یقین دلا دیں کہ موجودہ حالات میں اس سے بہتر راستہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔“

”اس سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟“

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ اس کے بعد آپ کا بچہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔“

☆☆☆

دلشاد انجم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے ساتھ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

وہ اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کئی لوگ تھے جو گولیاں چلا رہے تھے اور وہ ایک اجاڑ میدان میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا۔

وہ معمول کے مطابق اپنے دفتر سے روانہ ہوا تھا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے وہ کچھ ضروری کاغذات بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ آج اسے دیر ہوگئی تھی اس لیے ہر طرف اندھیرا تھا۔

وہ جس علاقے سے گزر رہا تھا، یہ اس کے راستے میں آتا تھا۔ ایک طرف دور تک پھیلا ہوا میدان اور دوسری طرف کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس علاقے سے گزر جانے کے بعد پھر شہری آبادی شروع ہوتی تھی۔

وہ اٹامک ڈپارٹمنٹ میں جاب کرتا تھا۔ بہت اہم اور حساس ادارہ تھا اس کا... لیکن اس کے ساتھ آج تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

وہ کاغذات کے معائنے میں مصروف تھا کہ اچانک ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک لی۔ اس نے سنبھلنے کے بعد سامنے کی طرف دیکھا۔ ایک بڑی سی وین اس طرح کھڑی ہوئی تھی کہ اس کی گاڑی کے لیے نکلنے کا راستہ نہیں تھا۔

پھر اس گاڑی سے تین چار مسلح افراد اتر آئے۔ گاڑیوں کی روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نقاب پوش تھے۔ اچانک اس کے ڈرائیور نے آواز لگائی۔ ”صاحب بھاگ جائیں۔“

اور اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندھیرے میں چھلانگ لگا دی اور میدان میں دوڑتا چلا گیا۔ اس نے گولیوں کی آوازیں بھی سن لی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ڈرائیور کے ساتھ کیا گزری ہے۔

وہ بس دوڑتا جا رہا تھا۔ میدان میں اونچے نیچے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن شاید اس وقت اس سے ایک اضطراری فعل سرزد ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ خوف زدہ تھا۔ اندھیرا اتنا گاڑھا تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک اسی اندھیرے میدان میں ایک روشنی سی نمودار ہوگئی۔ وہ کسی ٹارچ کی روشنی تھی جو اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کررہی تھی۔ دلشاد ایک جھٹکے سے رک گیا۔ کون ہوسکتا تھا یہ؟ اس ویرانے میں اس طرح اسے بلانے والا کون ہوسکتا تھا؟

وہ ٹارچ کی روشنی کی زد سے باہر تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ واپس ہو جائے یا کسی اور طرف رخ کرے۔ اچانک اس نے کسی کی آواز سنی جیسے ٹارچ والے نے اس کے خیالات بھانپ لیے ہوں۔ ”بے وقوفی مت کرنا۔ وہ لوگ ہر طرف پھیل کر تمہیں تلاش کررہے ہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ آؤ میرے پاس... جلدی۔“

دلشاد ایک تذبذب میں تھا۔ کیا کرنا چاہیے اسے؟ ٹارچ والا بظاہر دشمن معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے فیصلے کے بعد ٹارچ والے کی طرف دوڑ لگا دی۔

قریب آنے کے بعد ٹارچ والے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو آؤ میرے ساتھ۔ گھبراؤ نہیں۔“ اس نے اپنی ٹارچ بھی آف کر دی تھی۔ ”وہ لوگ روشنی دیکھ کر ہماری طرف بھی آسکتے ہیں۔ اس لیے میں نے ٹارچ آف کر دی ہے۔“

وہ دلشاد انجم کو لیے چلتا رہا۔ دلشاد کی کلائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت اچھی خاصی مضبوط تھی۔ وہ اسے ٹیلوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بچاتا ہوا لے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد یہ سفر ختم ہو گیا۔ اب وہ ایک منزلہ مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ ٹارچ والے نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ اندر کی طرف کھل گیا۔ اس نے دلشاد کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”اب آ جاؤ، یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

اندر کمرے کی روشنی میں دلشاد نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک مہذب اور پڑھا لکھا ادھیڑ عمر کا انسان تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کی آنکھیں بہت روشن تھیں۔ ایسی آنکھیں جیسے شعلے سے دہک رہے ہوں۔ ان آنکھوں کی طرف دیکھا بھی نہیں جاتا تھا جبکہ اس کی آواز بہت نرم اور ہمدردانہ تھی۔ ”میں اسی مکان میں رہتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”ویسے تو یہاں تک آنے کا راستہ دوسرا ہے لیکن میں عام طور پر اسی میدان کے پاس اتر کر میدان کراس کرتا ہوا یہاں تک آجاتا ہوں۔ یہ میرا معمول ہے۔ آج بھی میں اپنے راستے میں تھا کہ میں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں۔ پھر اندھیرے میں تمہیں بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے ہو۔ پھر میں نے انسان ہونے کا فرض ادا کیا اور تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ اب تم یہاں محفوظ ہو۔“

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“ دلشاد نے کہا۔ ”کیا میں اپنے مہربان کا نام معلوم کرسکتا ہوں؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”میرا نام ساحر ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ساحر۔“ دلشاد نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بھئی، والدین نے یہی نام رکھا تھا۔ اب تم بتاؤ تمہارے ساتھ کیا گزری؟ کون لوگ تھے وہ؟“

”میں ان کو نہیں جانتا۔“ دلشاد نے پورا واقعہ بتا دیا۔ ”وبس انہوں نے اچانک ہی گھیر لیا تھا۔“

”کس محکمے سے تعلق ہے تمہارا؟“

”اٹامک انرجی کمیشن میں ہوں۔“ دلشاد نے بتایا۔

”بہت ہی حساس محکمہ ہے تمہارا۔ ہوسکتا ہے اسی لیے تمہیں گھیرا گیا ہو۔“ اس نے کہا۔

”میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے۔“

”اب تم چاہو تو اپنے موبائل سے فون کر کے مدد لے سکتے ہو۔“

دلشاد نے اپنی ساری جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ اس کا موبائل راستے میں کہیں گر چکا تھا۔ ”لگتا ہے میرا موبائل کہیں گر چکا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ۔“ اس آدمی نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ”پھر تو تمہیں صبح تک انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ مجھے موبائل رکھنے کی عادت نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ دلشاد نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر اس کی نگاہ اس آدمی سے ملی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس اجنبی کی آنکھیں اس پر محیط ہوتی جارہی ہوں یا وہ ان آنکھوں میں ڈوبتا... جارہا ہو۔

☆☆☆

چاروں طرف پہاڑیاں تھیں اور وہ گیروے رنگ کی عمارت انہی پہاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی تھی۔ یہ انتہائی ممنوعہ عمارت تھی۔ اس کے آس پاس دور دور تک تاروں کی باؤنڈری بنادی گئی تھی اور کچھ فاصلوں پر واچ ٹاورز بنے ہوئے تھے جن پر مستعد محافظ ہر وقت پہرا دیتے تھے۔

حکومت کے بھی بہت سے آدمیوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس عمارت میں کیا ہوتا ہے۔ اس کے مقصد کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا۔ فائلوں اور دوسرے کاغذات میں اگر تذکرہ بھی ہوتا تو پروجیکٹ نائن کہا جاتا تھا۔ اور یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ پروجیکٹ نائن کیا ہے۔

راج نارائن نے یہ آئیڈیا ایک مضمون سے حاصل کیا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ آئندہ کی جنگیں ذہنی محاذ پر لڑی جائیں گی جن میں ہتھیاروں کا استعمال نہیں ہوگا۔

جیسے ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، اسی قسم کے دوسرے ذہنی علوم۔ اس کے خیال کو تقویت ایک بدھ راہب سے ملاقات کے بعد ملی تھی۔

وہ ایک سیلانی قسم کا راہب تھا جو تبت سے ہوتا ہوا نہ جانے کس طرف جارہا تھا۔ راج نارائن نے ان دنوں دہلی یونیورسٹی سے واراسٹریٹجی میں ماسٹر کیا تھا۔ یہ بھی ایک اہم شعبہ تھا اور پہلے دو چار برسوں میں متعارف کروایا گیا تھا۔ شاید راج نارائن اس گروپ کا سب سے ذہین طالب علم ثابت ہوا تھا اس لیے اسے فوراً ڈیفنس سینٹر میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ اسی دوران اس کی ملاقات اس بدھ راہب سے ہوئی تھی۔

اس نے بدھ راہب کو اپنے گھر مدعو کیا جہاں دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ باتوں کے درمیان راہب نے جوش میں آکر کہا۔ ”نوجوان! تم دیکھ لینا، یہ دنیا بھر میں جو اسلحے کے ڈھیر لگائے جارہے ہیں، یہ سب بیکار ہو جائیں گے۔“

”نہیں مہاراج! دشمن کو قابو میں کرنے کے لیے ہتھیار تو ضروری ہیں نا۔“

”ہرگز نہیں، دشمن کو ہم صرف اپنی ذہنی قوت سے قابو میں کرسکتے ہیں۔“ راہب نے کہا۔

”اپنی روحانی طاقت سے؟“ راج نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، روحانی طاقت سے۔“ راہب نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ روحانی طاقتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو پیدائشی ہوتی ہے جو درویشوں اور دیوی وغیرہ میں ہوا کرتی ہے اور دوسری تربیت اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہے جس طرح ہم کیا کرتے ہیں۔“

”اور آپ لوگ کیا کرتے ہیں مہاراج؟“

”ہم بچے کی پیدائش کے ساتھ اس کام کے لیے اس کا انتخاب کرلیتے ہیں۔“ راہب نے بتایا۔ ”اور جب وہ کچھ سال کا ہوجاتا ہے تو اس کی پیشانی کے درمیان ایک چھوٹا سا گڑھا کیا جاتا ہے اور پہلے سے تیار شدہ صندل کی لکڑی کا ایک ٹکڑا اس گڑھے میں رکھ کر اس زخم کو سی دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد زخم بھر جاتا ہے اور وہ ٹکڑا اس کے اندر ہی رہتا ہے۔ جب وہ جوان ہوجاتا ہے تو اس ٹکڑے کو نکال دیا جاتا ہے۔ یعنی اس کی تیسری آنکھ اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ پھر ہم اسے ٹیلی پیتھی کے لیے تیار کرتے ہیں اور چند برسوں کے بعد اس میں دوسروں پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر آپ لوگ پوری دنیا پر حکومت کیوں نہیں کرنے لگتے؟“ راج نے پوچھا۔

”اس لیے کہ یہ ہمارے اصول اور فلسفے کے خلاف ہے۔“ راہب نے بتایا۔ ”ہمارے پاس زندگی گزارنے کے آٹھ راستے ہوتے ہیں۔ ہم ان راستوں سے ہٹ کر نہیں چلنا چاہتے۔“

راج نارائن کو اس مضمون میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے طور پر تحقیقات شروع کردیں۔ ہندوستان ویسے بھی پُراسرار علوم کے ماہرین سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اوکلٹ سائنسز کے بارے میں بہت کچھ جان لینے کے بعد اس نے ایک تحقیقی مقالہ تحریر کردیا اور اعلیٰ حکام کو پہنچادیا۔

حکام کئی مہینوں تک غور کرتے رہے۔ بالآخر راج نارائن کا یہ منصوبہ منظور کرلیا گیا اور اس محکمے کا سربراہ اسے مقرر کردیا گیا۔

فنڈز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے خصوصی مقام پر یہ عمارت پسند کی۔ ملک بھر سے ایسے مضامین اور علوم کے ماہرین بلوائے گئے اور تربیت کا مرحلہ شروع ہوگیا۔

پہلے گروپ میں تین آدمی اس کے پاس بھیجے گئے۔ ان تینوں کا انتخاب بھی منسٹری آف ڈیفنس نے کیا تھا۔ اس میں سے ایک رام گوپال تھا۔

ادھیڑ عمر کا باوقار آدمی۔ نہ جانے اسے ایسا کون سا شوق ہوا تھا کہ وہ اس قسم کی تربیت لینے چلا آیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رام گوپال کو ان علوم کے سیکھنے کا بے پناہ جنون تھا۔ اس نے خود اپنے طور پر کئی مشقیں ایجاد کی تھیں جن کے ذریعے وہ کم سے کم وقت میں ان علوم پر دسترس حاصل کرسکتا تھا۔

اس عمارت میں ان علوم کی ریاضت کے علاوہ سائنسی انداز سے بھی سکھایا جاتا تھا۔ راج نارائن نے پورے سیٹ اپ پر بہت محنت کی تھی۔ ارتکاز کے لیے بھی ایک مشین موجود تھی۔ اس کے علاوہ جدید انداز کے کارڈز بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ راج نارائن نے اس سلسلے میں روس جاکر کچھ دنوں کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔

پورے سیٹ اپ کو قائم کرنے کے لیے روسی ماہرین کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ خود روس میں اس لائن پر بہت جدید انداز سے کام ہورہا تھا۔

رام گوپال نے بہت کم عرصے میں بہت کچھ حاصل کرلیا تھا۔ راج نارائن کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ ”سر! میں اپنے طور پر اپنے دیس کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے کہ تم دیس کی سیوا کررہے ہو لیکن ایسا لگتا ہے جیسے تمہارا ذاتی مقصد بھی ہو۔ میں نے اتنا جنون اور اتنی لگن آج تک نہیں دیکھی۔“

رام گوپال نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ہاں سر! دیس کی سیوا کے ساتھ ساتھ میں اپنا ذاتی انتقام بھی لینا چاہتا ہوں۔ میرے تن من میں ایک آگ سی دہک رہی ہے۔“

”آخر کیوں؟ کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے؟“

”یس سر! میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“ رام گوپال نے کہا۔ ”یہ کہانی ایک ایسے لڑکے کی ہے جس نے تعلیم حاصل کی۔ دن رات محنت کی۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنی محبت کو حاصل کرسکے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ شخص تم ہی ہو۔“

”یس سر! وہ میں ہی ہوں۔ مالتی نام ہے اس کا۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ بہت خوب صورت لڑکی ہے سر۔ وہ خوبیوں کا مجموعہ اور خصوصاً ٹینس کی بہت اچھی پلیئر تھی۔ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ میری یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی سر۔ وہ بھی مجھ سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ میں بھی ٹینس کا بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ ہم دونوں کی جوڑی بہت مشہور تھی۔ ہم دو دفعہ ایشین چیمپئن اور تین دفعہ بھارتی چیمپئن بھی رہ چکے ہیں۔“

”اوہ گاڈ! یاد آرہا ہے۔“ راج نارائن نے کہا۔ ”تو وہ تم تھے؟“

”یس سر! وہ میں تھا اور میرے ساتھ مالتی تھی۔“

”تم دونوں نے شادی بھی تو کرلی تھی؟“ راج نارائن کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں، ہماری شادی ہوگئی تھی۔ اصل کہانی تو شادی کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔“ رام گوپال نے کہا۔ ”ہمارے گھر والوں نے یہ منت مانگی ہوئی تھی کہ ہمیں شادی کے بعد کٹاس کی یاترا کے لیے بھیج دیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا سر کہ ہمارے ہاں کٹاس کی کتنی اہمیت ہے۔ کٹاس کی جھیل آنسو کا وہ قطرہ ہے جو شِو کی آنکھوں سے ٹپکا تھا۔“

”ہاں، ایک قطرہ اجمیر میں ہے اور دوسرا کٹاس میں۔“ راج نارائن نے کہا۔

جی سر! اور یہ کٹاس پاکستان میں ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ہمارا ایک پوتر استھان پاکستان کے حصے میں چلا گیا ہے۔ خیر، تو ہم دونوں اپنے اس سفر کے تصور سے بہت خوش تھے۔ ہماری شادی کو ابھی صرف ایک مہینا ہوا تھا۔ یہ گویا ہم دونوں کا ہنی مون بھی ہوتا۔ کٹاس کا سالانہ میلہ شروع ہونے والا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ اس میلے میں ہندوستان سے کتنے یاتری جایا کرتے ہیں۔ ویزا وغیرہ بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ تو ہم نے بھی ساری تیاریاں کرلیں اور کٹاس کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہمارے ساتھ دو سو یاتری اور بھی تھے۔“

”لیکن تمہاری اس کہانی کا ان حالات سے کیا تعلق ہے؟“ راج نارائن نے پوچھا۔

”میں وہی بتا رہا ہوں سر۔“ رام گوپال نے کہا۔ ”کٹاس جانے کا ایک موقع یہ بھی تھا کہ اگر وہاں سے بھی مجھے روحانی علم کا کوئی راستہ مل جائے تو میں وہ بھی حاصل کرلوں گا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ کٹاس میں بھی کئی جٹادھاری سادھو ہوا کرتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ خیر تو ہم کٹاس پہنچ گئے۔ یہ شہر پاکستان کے شہر چکوال کے قریب ہے۔“

”میں نے پاکستان نہیں دیکھا۔ اس لیے نہیں بتا سکتا۔“

”میں بتا رہا ہوں سر! ہم بہت خوش تھے۔ ہم لاہور سے کٹاس کے لیے روانہ ہوگئے۔ کٹاس میں ہمارا سواگت کیا گیا۔ وہاں ہمارے رکنے اور ٹھہرنے کا بھی انتظام تھا۔ بہت خوب صورت جگہ تھی سر۔ دل خوش ہوگیا... پھر یہ ہوا کہ مجھے ایک سادھو مہاراج مل ہی گئے۔ میں نے ان کے پاس وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزارنا شروع کر دیا اور مالتی سے کہہ دیا کہ وہ اپنے طور پر سیر کرتی رہے اور جب تھک جائے تو پھر مندر کی طرف واپس آجائے۔ وہ گھومنے نکل جاتی اور میں سادھو مہاراج کے پاس بیٹھ جاتا۔ پھر یہ ہوا سر کہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے مالتی کچھ کھوئی کھوئی اور پریشان سی رہتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے میرا وہم کہہ دیا یا پھر تھکان کا بہانہ کر دیا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

''ایک خاص بات میں نے یہ نوٹ کی کہ وہ ایک خاص وقت میں بے چین ہو جایا کرتی تھی اور اٹھ کر سیر کرنے چلی جاتی۔ ایک دن میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس کا پیچھا کر کے دیکھوں گا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ اس دن میں نے سادھو مہاراج کے پاس جانے کا بہانہ کیا اور راستے میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ دیر بعد میں نے مالتی کو دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے ایک طرف چلی جا رہی تھی۔ اس کا انداز سیر کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ کسی خاص مقصد سے کسی طرف جا رہی تھی۔ وہ ایک سرسبز ٹیلے کے پاس پہنچ گئی۔ اس ٹیلے کے پاس ایک جیپ کھڑی تھی سر! اور اس جیپ کے پاس ایک نوجوان تھا۔ مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مالتی اس نوجوان سے جا کر لپٹ گئی۔ پھر وہ دونوں جیپ میں جا کر بیٹھ گئے اور جیپ وہاں سے روانہ ہو گئی۔''

''یہ تو بہت عجیب بات بتائی تم نے۔'' راج نارائن نے کہا۔

''جی ہاں، کتناس جا کر میری محبت لٹ گئی تھی۔ میری زندگی برباد ہو گئی تھی۔'' رام گوپال کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ''میں نے مالتی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس سے یہ نہیں کہا کہ میں کیا تماشا دیکھ چکا ہوں۔ خاموش رہا۔ البتہ میں نے واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں نے سوچا کہ یہی بہتر ہو گا کہ یہاں سے واپس ہو جاؤں اور جب مالتی کو یہ اندازہ ہوا کہ میں نے واپسی کا ارادہ کر لیا ہے تو اس نے ہندوستان واپس آنے سے انکار کر دیا۔''

''کیا کہا... اس نے صاف انکار کر دیا؟''

''یس سر! اس نے مجھ سے... رام گوپال! میرا اور تمہارا سفر یہیں پر ختم ہو رہا ہے۔ میں اب تمہارے ساتھ واپس نہیں جاؤں گی... میں اس کی وجہ تو جانتا تھا لیکن اس حد تک اندازہ نہیں تھا کہ وہ واپس جانے ہی سے انکار کر دے گی۔ یہ ایک ناممکن سی بات تھی جناب۔ میں نے غصے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا... مالتی! یہ کیا مذاق کر رہی ہو۔ یہ کیسی بات ہے کہ تم میرے ساتھ واپس نہیں جاؤ گی؟''

''ہاں رام گوپال! مجھے معاف کر دینا۔'' اس نے کہا۔ ''اب ہم دونوں کے راستے الگ ہو رہے ہیں۔''

''آخر کیوں؟'' میں غصے سے پاگل ہونے لگا۔ ''کیوں الگ ہونے لگے ہیں؟ کیا کوئی اور ہمارے درمیان آگیا ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''راشد نام ہے اس کا۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔''

''کون ہے یہ کم بخت راشد! یہ پاکستان میں تمہارا چاہنے والا کہاں سے پیدا ہو گیا؟''

''اس سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی تھی۔'' مالتی نے بتایا۔ ''رام گوپال! تم یقین نہیں کرو گے کہ پہلی بار ہی اسے دیکھ کر میرے سینے میں طوفان اٹھنے لگا تھا۔ ایسا لگا جیسے کوئی قوت مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہو اور خود اس کا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ محبت ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ بہت طاقت ہوتی ہے اس میں۔ اس سے ملنے کے بعد مجھے اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ اب میں اس کے لیے پوری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔''

''میں نے اسے ڈرایا، دھمکایا، سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس نے اس کی خاطر مجھے چھوڑ دیا۔ اپنے ماتا پتا کو چھوڑ دیا۔ اپنا دھرم چھوڑ دیا اور اپنا ملک چھوڑ دیا۔''

''اور اس نے... میرا مطلب ہے اس آدمی نے کیا کیا؟''

''اس نے بھی پورے دل و جان کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔'' رام گوپال نے بتایا۔ ''میں نے تو مالتی کو طلاق دے دی تھی۔ اس آدمی نے مالتی کو مسلمان بنایا اور اس سے شادی کر لی اور اب وہ دونوں ایک شادی شدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ مالتی کو پاکستان کی نیشنلٹی بھی مل گئی اور میرے سینے میں اب تک وہ آگ بھڑک رہی ہے۔''

''اور وہ آدمی اس وقت کہاں ہے؟''

''وہی آدمی پاکستان کے فارن ڈپارٹمنٹ کا سیکریٹری ہے سر۔'' رام گوپال نے بتایا۔ ''راشد عطاء اللہ۔''

☆☆☆

ذیشان کا طبی معائنہ کیا جا چکا تھا۔ اور اب وہ ایک نفسیاتی ماہر کے سامنے بیٹھا اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

یہ سارے مرحلے بہت خاموشی سے طے ہوئے تھے

کیونکہ ذیشان کا تعلق ایک انتہائی اہم حساس ادارے سے تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے طور پر اپنے ایک دوست کی خدمات حاصل کی تھیں تا کہ وہ اس کا نفسیاتی تجزیہ کر سکے۔ وہ دوست ایک ماہر نفسیات ہی تھا۔ ان تمام مراحل میں مشعل اس کے ساتھ رہی تھی۔

اس کی محبوبہ، اس کی بیوی جس کو ذیشان کی اس ذہنی کیفیت نے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کے لاشعور کی گرہیں کھولنے کی کوششیں کیں لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی۔ پھر ذیشان ہی نے بتایا۔ ''میں نے ایک بار اس آدمی کا تعاقب بھی کیا تھا۔''

''کس آدمی کا؟'' ماہر نفسیات نے پوچھا۔

''اسی کا جس کی آنکھیں مجھے خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔'' ذیشان نے بتایا۔ ''میں نے اس کے مکان کا پتا بھی چلا لیا لیکن پھر بہت شرمندگی ہوئی کیونکہ وہ رانا صاحب نکلے۔''

''کون رانا؟ وہ مشہور سماجی شخصیت؟''

''ہاں وہی جو ایک بادشاہ گر قسم کے انسان ہیں۔'' ذیشان نے کہا۔ ''بلکہ اپنے شبے کو دور کرنے کے لیے میں نے ان سے براہِ راست ملاقات بھی کر لی اور اپنی ساری بات بھی بتا دی۔ وہ بہت دیر تک ہنستے رہے۔''

''تم نے تو قریب سے دیکھ لیا ہو گا۔ کیا یہ وہی آدمی ہے جو تمہیں دکھائی دیتا ہے؟''

''پتا نہیں کیونکہ اس کا چہرہ چھپا ہوتا ہے۔ صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔''

''بھائی! یہ ان خوابوں کے چکر میں روز بروز نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔'' مشعل نے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذہن کو پرسکون رکھنے کے لیے میں چند دوائیں تجویز کر رہا ہوں، وہ استعمال کراتی رہیں۔''

گھر کی طرف جاتے ہوئے مشعل کو اچانک ایک بات یاد آگئی۔ ''سنیں، کیا آپ کو وہ اکرم شیخ کی پارٹی یاد ہے؟''

''ہاں یاد تو ہے... بہت اچھی پارٹی تھی لیکن تمہیں کیسے یاد آگئی؟''

''اس وقت یاد آیا ہے۔'' مشعل نے بتایا۔ ''اس میں ہم دونوں بھی تھے اور وہاں وہ رانا صاحب بھی تھے۔''

''کیا؟'' ذیشان چونک پڑا۔ ''کیا تم جانتی تھیں ان کو؟''

''نہیں، میں نہیں جانتی تھی۔ شاید کسی نے ان کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ یہ رانا صاحب ہیں۔''

''یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے مشعل! ظاہر ہے وہ پارٹیز میں شریک ہوتے ہوں گے۔ اسی شہر میں رہتے ہیں۔ اس سے کوئی بات سامنے نہیں آتی۔''

''آپ ذرا اس پوائنٹ آف ویو سے سوچیں۔'' مشعل نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اس پارٹی میں آپ نے ان کو دیکھا ہو۔ خاص طور پر ان کی آنکھوں کی طرف اور وہ آنکھیں آپ کے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہوں اور آپ نے ان کے حوالے سے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہوں۔''

''اوہو، تم تو خود بھی ماہرِ نفسیات بنتی جا رہی ہو۔'' ذیشان نے کہا۔ ''ویسے تمہارا یہ پوائنٹ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔''

وہ دونوں گھر پہنچ گئے۔ رازداری کے خوف سے وہ ڈرائیور کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ تھے گھر پر ایک آدمی ذیشان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ یہ اس کے محکمے کا سیکشن آفیسر تھا۔

ذیشان کو دیکھ کر وہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' ذیشان نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ ''ہاں، اب بتاؤ کیا خبر لائے ہو؟'' ذیشان نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے جناب! ہمارا ڈیلی گیشن پرسوں ہتھیاروں کی خریداری کے لیے جا رہا ہے۔''

''اور وہ ماہر؟''

''وہ بھی ساتھ ہے جناب! اسے سب کچھ سمجھا دیا گیا ہے، وہ ناکارہ ... میٹریل پر زور دے گا۔''

''اسے نہ صرف زور دینا ہے بلکہ اس کا اگیری منٹ بھی کروانا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔ ''اور اس سے کہہ دینا کہ اس کا کمیشن سوئس بینک میں اس کے نام سے جمع ہو جائے گا۔''

''ایسا ہی ہو گا جناب۔''

اس دوران میں ملازم ناشتے کا سامان لے آیا تھا۔ ناشتے کے دوران میں دونوں کے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد سیکشن آفیسر اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ذیشان جانے کیوں کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا۔ ایک بے نام سا خوف۔ حالانکہ بظاہر خوف زدہ ہونے والی کوئی بات سامنے نہیں تھی پھر بھی...

اس کے محکمے نے ہتھیاروں کا بہت بڑا سودا کیا تھا۔ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سودا فرانس سے ہوا تھا۔ اس سودے کے تحت انہیں کئی عدد آبدوزیں اور ایٹمی ہتھیار ملنے والے تھے۔

ڈیلنگ کی ذمّے داری ذیشان کے سپرد تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایک دن اسے احساس ہوا کہ وہ کیوں خوامخواہ اتنا بے وقوف بن رہا ہے۔ کروڑوں ڈالرز کے اس معاہدے میں کچھ حصہ اس کا بھی ہونا چاہیے۔ نہ جانے کیوں، اس کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے رینگ آیا تھا۔

اس سے پہلے اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ وہ ایک نیک نام، فرض شناس اور ایماندار آدمی تھا۔ ہمیشہ ملک اور قوم کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ لیکن اس خیال نے اس کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

پھر ایک دن سیکشن آفیسر نے اس سے خفیہ طور پر ملاقات کی۔ ”جناب! یہ تو ہم نے آپ کی بھلائی کے لیے سوچا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہتھیاروں کی جانچ پڑتال کے لیے جو ماہر جا رہا ہے، وہ ہمارا اپنا آدمی ہے۔ وہ بھی ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔“

”لیکن سوچ لو، یہ بہت نازک معاملہ ہے۔“ ذیشان نے بتایا۔ ”دو ملکوں کے تعلقات کی بات ہے۔“

”ملکوں کے تعلقات تو متاثر ہی نہیں ہوں گے جناب۔“

”وہ کس طرح؟“

”وہ اس طرح کہ ہم فرانس کی ایک پرائیویٹ کمپنی سے معاہدہ کر رہے ہیں۔“ آفیسر نے بتایا۔ ”اور کمپنی کے کاروبار کی ذمّے داری حکومت پر عائد نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اس کمپنی کو بند کر دیا جائے گا اور وہ ویسے بھی بند ہی ہونے والی ہے۔“

”اور یہاں... یہاں کی کیا پوزیشن ہوگی؟“

”یہاں کی پوزیشن بھی ٹھیک ہی ہوگی۔“ آفیسر نے بتایا۔ ”کیونکہ جو کچھ خریدا جا رہا ہے، وہ ایسا نہیں ہے کہ دیکھنے سے پتا چل جائے۔ دو چار بار کے استعمال کے بعد اس کی خرابیاں سامنے آنی شروع ہوں گی۔ اس سے پہلے بالکل پتا نہیں چلے گا۔ میں نے یہ ساری انفارمیشن حاصل کر لی ہیں جناب۔“

ذیشان اپنے طور پر خود بھی تیار تھا۔ اس کے ذہن میں کئی دنوں سے اس قسم کے خیالات گونج رہے تھے۔ اس کے سامنے بہت سے لوگوں کے ریکارڈز تھے۔ بہت نامور اور معزز سمجھے جانے والے لوگ جنہوں نے اس قسم کی حرکتیں کی تھیں اور کروڑوں ڈالرز حاصل کر لیے تھے اور آج... وہ ایک بھرپور زندگی کا لطف اٹھاتے گھوم رہے تھے۔ ان کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔

لیکن دو چار دنوں سے اسے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ سارے معاملات طے ہو چکے تھے، اس کے باوجود اس کے ذہن کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

وہ اس معاملے میں کسی کو اعتماد میں بھی نہیں لے سکتا تھا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اور حساس معاملہ تھا۔ اگر یہ اسکینڈل سامنے آجاتا تو اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔

بالآخر جب اس کی بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس نے سیکشن آفیسر کے موبائل کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کسی عورت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”میں ذیشان حمید بول رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”پلیز! حنیف صاحب سے میری بات کروا دیں۔“

”سر! کیا آپ تک نیوز نہیں پہنچی؟“ دوسری طرف سے سوال کیا گیا۔

”نیوز... کیسی نیوز؟“

”میرے شوہر کا مرڈر ہو گیا ہے سر! میں ان کی بیوی بول رہی ہوں۔“ پھر وہ عورت رونے لگی۔

☆☆☆

امجد نے جو کتابچہ تحریر کیا تھا، اس کا عنوان تھا۔ ”ہمارا کیا ہوگا؟“

اس کتابچے میں وہی باتیں تھیں جو وہ عام طور پر کیا کرتا تھا۔ وہ آدمی اس دن اپنے ساتھ اسے ایک شان دار سے مکان میں لے آیا تھا۔ امجد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر اس آدمی کے پیچھے پیچھے کیوں چلا آیا ہے۔ جس طرح کسی کو زنجیروں سے باندھ کر لایا جائے۔ وہ تو اس آدمی کو جانتا بھی نہیں تھا پھر بھی وہ اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہ آدمی اپنی گاڑی میں تھا اور امجد نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا رکھی تھی۔ اگر امجد چاہتا تو کسی اور طرف بھی نکل سکتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر پایا۔

اس کی گاڑی اس آدمی کی گاڑی کے پیچھے لگی رہی۔ بالآخر یہ سلسلہ ایک عالی شان مکان پر آ کر ختم ہوا۔ دونوں شان دار ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

امجد اس آدمی کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ایک نفیس آدمی تھا۔ ہلکی فرنچ کٹ داڑھی نے اس کی شخصیت میں اور جاذبیت پیدا کر دی تھی لیکن سب سے خاص بات اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں، حکم دے رہی

تھیں، اپنا غلام بنا رہی تھیں۔ بہت کچھ تھا ان آنکھوں میں۔

پھر اندر سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ مغربی لباس والی یہ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ وہ امجد کو دیکھ کر چونک اٹھی۔

”جولی! کیا تم جانتی ہو ان کو؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”یس سر! یہ بہت مشہور ٹی وی پرسنالٹی ہیں۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”مسٹر امجد۔“ اس نے مصافحے کے لیے امجد کی طرف اپنا خوب صورت ہاتھ بڑھا دیا۔

اس لڑکی کے آنے کے بعد امجد نے اپنے آپ کو کسی حد تک ریلیکس محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اب تک تناؤ کی جو کیفیت تھی، وہ بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ ایک خوش گوار سا احساس تھا۔

”امجد صاحب! آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا پسند کریں گے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”کچھ بھی... لیکن لائٹ ہو۔“ امجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”او کے، میں خود لے کر آتی ہوں۔“ وہ لڑکی جس کا نام اس آدمی نے جولی بتایا تھا، وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”نہیں... میں کچھ نہیں جانتا۔ بس ایک بے خودی کے عالم میں کھنچا ہوا آپ کی طرف آ گیا ہوں۔“ امجد نے کہا۔ ”اور اب یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھ سے یہ کیسی حرکت سرزد ہوئی۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔“

”تم بالکل ٹھیک آئے ہو۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”تمہیں تو یہاں آنا ہی چاہیے تھا۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تمہاری پیشانی پر تمہارے آنے والے دنوں کی نشانیاں دیکھ رہا ہوں۔“ اس آدمی نے بتایا۔ ”کیا تم نے کبھی پروفیسر باقر کا نام سنا ہے؟“

”پروفیسر باقر!“ امجد چونک گیا۔ ”کیوں نہیں جناب۔ مشہور منجم، نفسیات داں، پامسٹ... اوہ... اب یاد آیا کہ آپ شاید وہی پروفیسر باقر ہیں۔“

”ہاں۔ میں وہی ہوں۔“

”اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں آپ کے پیچھے پیچھے یہاں تک کیوں آ گیا ہوں۔“ امجد نے کہا۔ ”کئی بار میری خواہش آپ کو اپنے پروگرام میں بلانے کی رہی ہے کیونکہ میں آپ کا زبردست مداح ہوں۔ آپ کی علمیت اور مہارت کا قائل رہا ہوں۔ لیکن موقع نہیں مل پایا۔ ویسے تو میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں۔ کئی چینلز پر آپ کے انٹرویوز بھی دیکھے تھے اس لیے جب آپ پر نظر پڑی تو غیر ارادی طور پر آپ کے پیچھے ہو لیا۔“

”اور جب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہارے ماتھے کی روشن لکیروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور میں نے تمہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور تم میرے پیچھے یہاں تک چلے آئے۔“

”تو دو اور دو چار سے یہ پتا چل گیا کہ میں یہاں کیوں موجود ہوں۔“ امجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اب اس کی وحشت بالکل ختم ہو گئی تھی بلکہ وہ بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔

اسی دوران میں جولی ٹرے میں مشروبات لے آئی۔ امجد نے گلاس لیتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”ہاں بھئی، اب اصل بات ہو جائے۔“ پروفیسر باقر نے کہا۔ ”تم جس ٹائپ کی باتیں کر رہے ہو، ویسی سچائی بہت کم سننے میں آتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ میں خود تمہارا مداح ہو گیا ہوں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہی ہونا ہے۔ اس ملک میں اب کچھ نہیں رہا۔ اگر ہوا بھی تو ایک طویل خون ریزی اور اس کے بعد ایک مضبوط قیادت جو پورے ملک کو بدل کر رکھ دے گی اور تمہارے ماتھے کی لکیریں یہ بتا رہی ہیں کہ وہ قیادت تمہاری ہوگی۔ تم حکومت کرو گے۔“

”میں؟“ امجد پہلو بدل کر رہ گیا۔ ”ارے صاحب میں... میں کیا کر سکتا ہوں؟ میری کیا حیثیت ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ پروفیسر صاحب کی کوئی بات آج تک غلط نہیں ہوئی۔“ جولی نے کہا۔ ”میں نے خود ناقابلِ یقین باتیں ہوتے ہوئے دیکھی ہیں۔“

”اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے۔“ امجد الجھ کر بولا۔ ”لیکن میں، ایک معمولی اینکر پرسن۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ میرا حلقہ ہی کتنا ہے؟“

”تم اپنا حلقے خود بناؤ گے۔“ باقر نے کہا۔ ”تمہیں عملی طور پر جدوجہد کرنی ہوگی اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ تم اپنے نظریات کا زیادہ سے زیادہ پرچار کرو۔ ہر حلقے میں پھیلا دو۔ مایوس لوگ خود بخود تمہارے گرد جمع ہوتے جائیں گے۔“

امجد اس کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ ”اور پرچار کا طریقہ کیا ہونا چاہیے جناب؟“

”دیکھو، تم ٹی وی اسکرین کے ذریعے باتیں تو کر رہے ہو لیکن یہ وقتی تاثر ہوتا ہے۔ لوگ چینل بدل لیتے ہیں یا پھر بھول جاتے ہیں۔ اصل تاثر تحریر کا ہوتا ہے۔ تم اپنے تمام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظریات اور باتوں کو یکجا کر کے کتابچے کی صورت میں شائع کروا دو۔ اس طرح تمہاری باتیں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گی۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔“

”بس تم پھر خود دیکھ لینا کہ اس کے بعد تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے۔“ پروفیسر باقر نے کہا۔

”پروفیسر! پھر تو یہ ہم لوگوں کو بھول جائیں گے۔“ جولی مسکراتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں، ایسا کیسے ہوگا۔“

”ایک بات اور۔ یہ سارے نظریات تمہارے اپنے ہیں۔ یہ باتیں تمہاری اپنی ہیں۔ اس لیے تم کسی مرحلے پر میرا نام نہیں لو گے۔ میں خود ان معاملات سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔“

”جی جناب! آپ بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔“

امجد کے جانے کے بعد جولی نے پوچھا۔ ”پروفیسر! آپ نے اس کو کس کام پر لگا دیا... اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“

”میں کئی محاذوں پر لڑنے کا عادی ہوں جولی۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”تاکہ کامیابی کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوں۔“

وہ کتابچے اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس کتابچہ کی تقسیم کے لیے باقاعدہ ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کئی ہزار کتابچے چھپوائے گئے تھے۔ امجد کو خود اپنے ہاتھوں سے وہ کتابچہ لوگوں میں تقسیم کرنا تھا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ اسی صبح اسے اس کے فلیٹ سے گرفتار کر لیا گیا۔ کسی خفیہ ایجنسی کے لوگوں نے اسے اٹھا لیا تھا۔

☆☆☆

قادر نے فنانس سیکریٹری کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ ”میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ کم بخت یہ کہتا ہے کہ اس تجویز... کو ہر حال میں منظور ہو جانا چاہیے۔“

”لیکن کیوں؟ اس آدمی کو اس تجویز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ اس نے تمہارے بیٹے کو اغوا کر لیا؟“

”یہی بات تو سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔“

”فرض کرو۔ اگر ان تجویز... پر سنجیدگی سے غور بھی ہوتا ہے اور اس کی منظوری کے اشارے بھی دیے جاتے ہیں تو اسے کیسے معلوم ہوگا؟ کیا تمہارا بیٹا اس وقت تک اس کے قبضے میں رہے گا؟“

”نہیں جناب! اس نے کہا ہے کہ ذرا سی بھی پیش رفت ہوئی تو اسے پتا چل جائے گا۔“

”اب سمجھا۔“ فنانس سیکریٹری نے ایک گہری سانس لی۔ ”یعنی اس کی جڑیں ہمارے محکمے تک پھیلی ہوئی ہیں۔“

”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے جناب! وہ بہت منظم لوگ ہیں۔“ قادر نے کہا۔ ”یہ کوئی عام واردات نہیں ہے۔ میں نے اپنے طور پر فون نمبر ٹریس کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔“

”بہت ہی الجھا ہوا معاملہ ہے۔“ سیکریٹری نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اسے معلوم ہو جاتا ہے تو پھر اس کی جڑیں ہمارے محکمے میں بھی ہیں۔“

”جی ہاں، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“

”ٹھہرو، میں کچھ دیر بعد میٹنگ طلب کر لیتا ہوں۔“ سیکریٹری نے بتایا۔ ”اس میں ہم لائحہ عمل طے کر لیں گے۔“

”کچھ کریں جناب! مجھے اپنے بیٹے سے بہت پیار ہے۔“

”سمجھتا ہوں میں۔“

میٹنگ بھی ہوگئی اور اس میٹنگ میں یہ طے پایا کہ قادر کے تجویز کردہ فارمولے کو آگے بڑھا دیا جائے گا اور یہ کوشش ہوگی کہ باقاعدہ کوئی آرڈیننس منظور ہو جائے۔

سیکریٹری نے قادر سے کہا۔ ”مسٹر قادر! تم نے جو تجویز پیش کی ہے، وہ ایسی تو نہیں تھی کہ اس پر غور کیا جاتا۔ لیکن ہم نے اس میٹنگ میں اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی دھیان دیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمہاری اس تجویز پر عمل ہو سکتا ہے۔“

”شکریہ جناب!“ قادر کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ”اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرا بیٹا رہا ہو جائے گا۔“

”ہاں، جب اس کا فون آئے تو اسے یہ بتا دینا۔“ سیکریٹری نے کہا۔

گھر پہنچ کر قادر نے اپنی بیوی کو یہ خوش خبری سنائی۔ بیٹے کے اغوا کے بعد پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر نظر آیا تھا۔ ایک امید سامنے آگئی تھی کہ اب اس کے بچے کی رہائی ہو سکے گی۔

حکومت اس کا مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اب اسے اور کیا چاہیے تھا۔

جب سے جامی اغوا تھا قادر بری طرح الجھا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخر کیوں؟ اس آدمی نے ایسا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ ملک کے معاشی مسائل سے اس کا کیا واسطہ ہو سکتا تھا؟

اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ خود قادر نے اس قسم کی تجویز پیش کی تھی۔ اگر اس آدمی کا مطالبہ یہی تھا تو پھر اسے قادر کو سپورٹ کرنا چاہیے تھا نا کہ الٹا اس کے بچے کو اغوا کر لیا تھا۔

پھر ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آئی کہ اس نے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالنے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا تھا۔ قادر نے اپنے طور پر اپنے بیٹے کا پتا چلانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔

وہ کسی کال آفس سے فون کرتا تھا۔ اس کے ایس پی دوست شمیم نے بھی اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ریکارڈنگ ڈیوائس لگا دی تھی۔ آواز سے ٹریس کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس آواز کا پولیس کے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ ایک بھرائی ہوئی آواز تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شخص اپنی آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کے ایس پی دوست شمیم کا فون آگیا۔ وہ بتا رہا تھا۔ ”قادر! ایک پیش رفت تو ہوئی ہے۔ ہم نے اس کال آفس کا پتا لگا لیا ہے جہاں سے وہ فون کرتا ہے۔“

”پھر تو شاید وہ قابو میں آجائے گا کیونکہ وہ صرف ایک ہی وقت یعنی شام کو پانچ بجے فون کرتا ہے۔“

”ابھی چار بجے ہیں۔ اگر تم میرے پاس آسکتے ہو تو آجاؤ۔“

قادر پندرہ منٹ میں ایس پی کے پاس پہنچ گیا۔ ”میں نے سادہ لباس والوں کو آس پاس بٹھا دیا ہے۔“ شمیم نے بتایا۔ ”اور ہم خود بھی اسی طرف چل رہے ہیں۔“

وہ کال آفس ایک چلتی ہوئی مارکیٹ میں تھا۔ پانچ بجے اس سینٹر میں تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

قادر اور شمیم کچھ فاصلے پر تھے۔ ”اب یہ کیسے پتا چلے گا کہ کس کیبن سے پانچ بجے فون کیا گیا ہے؟“ قادر نے پوچھا۔

”فون میں ڈیوائس لگی ہوئی ہے۔ اس سے پتا چل جائے گا۔“

ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ میں کیبن میں موجود چاروں افراد کو پکڑ لیا گیا لیکن وہ سب غیر متعلق لوگ تھے کیونکہ اس شام پانچ بجے اس آدمی کی کوئی کال ہی نہیں آئی تھی۔

”آدمی بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔“ شمیم نے کہا۔ ”اسے شاید اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس لیے وہ دور ہی سے دیکھ کر چلا گیا۔ اس نے فون کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

اس رات کو اس کا پھر فون آگیا۔

”سنو۔“ قادر نے اس سے کہا۔ ”میرا پروپوزل منظور ہونے کے لیے چلا گیا ہے۔ اب تو میرے بیٹے کو رہا کر دو۔“

”ہم نے تمہارے بچے کو پہلے ہی رہا کر دیا ہے۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”تم آکر اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔“

”کک... کیا مطلب؟“ اس کے لہجے نے قادر کو پریشان کر دیا۔

”کچھ نہیں، ہمیں یہ معلوم ہے کہ تمہاری تجویز ایک سازش کے تحت منظور کی جا رہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور وہ سازش یہ ہے کہ جب بچہ رہا ہو جائے تو پھر یہ آرڈر کینسل کر دیا جائے۔ کیوں یہی بات ہے نا؟“

قادر سناٹے میں رہ گیا۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”سنو! تم جب یہ جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ بچے کے اغوا سے پہلے ہی میں نے یہ پروپوزل پیش کر دیا تھا۔ تم اسی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کتنا سنجیدہ ہوں۔“

”ہاں، اس بات کا تو ہمیں احساس ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس لیے انعام کے طور پر ہم تمہارے بیٹے کی لاش تمہارے حوالے کر رہے ہیں۔“

”کیا؟“ قادر چیخ پڑا۔ ”نہیں... تم یہ نہیں کر سکتے... کمینے کتے...“

”اب تو یہ ہو چکا ہے۔“ وہ ایک قہقہے کے ساتھ بولا گیا۔ ”جہاں سے کیاڑی کا پل شروع ہوتا ہے، وہاں ہم نے اس کی لاش ڈال دی ہے۔ جا کر لے آؤ۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ قادر کی چیخ سن کر اس کی بیوی کمرے میں آگئی۔ قادر کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ ”کیا ہوا بتائیں؟ کیا بات ہو گئی؟“

”کچھ نہیں... کچھ نہیں۔“ قادر نے اپنی بیوی کے شانے پر تھپکی دی۔ ”میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔ ابھی واپس آرہا ہوں۔“

”آپ بتاتے کیوں نہیں؟“

”میں نے کہا نا کہ میں واپس آرہا ہوں۔ کوئی بات نہیں ہوئی۔“

ڈرائیور اس وقت گھر پر ہی تھا۔ قادر نے گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور شمیم کا نمبر ملانے لگا۔ اندر سے بیوی کے زور زور سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔

قادر اور ایس پی شمیم دونوں کی گاڑیاں ایک ساتھ مِل کے پاس پہنچیں... اور جامی وہاں موجود تھا۔ زندہ اور صحیح سلامت۔

''میرے خدا! یہ کیا؟''

جامی دوڑتا ہوا قادر سے لپٹ گیا۔ دونوں باپ بیٹے بری طرح رو رہے تھے۔

''شمیم! اس آدمی نے ایسا کیوں کیا؟'' قادر نے راستے میں پوچھا۔

''شاید وہ تمہیں اعصابی طور پر توڑ دینا چاہتا ہے۔'' شمیم نے کہا۔ ''یہ اس کا نفسیاتی گیم ہو سکتا ہے۔ اس نے تمہارے اعصاب کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ خطرناک ترین انسان ہے۔''

جب یہ قافلہ گھر پہنچا تو جامی کو دیکھ کر قادر کی بیوی جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی۔ کسی کو بھی جامی کی زندگی کی توقع نہیں رہی تھی لیکن اس کی واپسی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔

دوسری صبح قادر کے پاس پھر فون آیا۔ ''مبارک ہو۔ تمہارا اپنا بیٹا تمہارے پاس واپس آ گیا ہے۔''

''لیکن یہ سب کیا تھا؟''

''صرف ایک ذہنی جھٹکا۔ اور اس بات کا یقین دلانا کہ ہم جب چاہیں تمہارے بچے کو اسی طرح اٹھا بھی سکتے ہیں اور اس بار کیماڑی کے پل کے پاس سے وہ زندہ بھی نہیں ملے گا۔ بس یہ بات یاد رکھنا۔''

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟''

''بھول جاؤ پچھلے پروپوزل کو۔'' اس نے کہا۔ ''ایک نیا پروپوزل دینا ہوگا تمہیں اور وہ تم خود دو گے۔''

☆☆☆

دلشاد انجم دوسری صبح گھر واپس آ گیا۔ اس کے ڈرائیور کا قتل ہو چکا تھا۔ اس کی گاڑی وہیں کھڑی ہوئی ملی تھی جہاں سے اس رات اسے نامعلوم حملہ آوروں کے خوف سے میدان کی طرف دوڑ لگانا پڑی تھا۔

ڈرائیور کی لاش گاڑی کے پاس ہی تھی اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ جس مکان میں اسے پناہ دی گئی تھی، وہ مکان بہت دنوں سے بند تھا اور آس پاس رہنے والے کسی ساحر نام کے آدمی کے وجود سے واقف نہیں تھے۔ نہ جانے وہ کون تھا اور اس پر حملہ کرنے والے کون تھے؟

دلشاد ایک اہم آدمی تھا کیونکہ اس کا تعلق ایک اہم ادارے سے تھا۔ اس لیے اس کیس کی تفتیش کے لیے پولیس کے کئی حکام اس کے پاس دوڑے چلے آئے۔

ان میں ایک ایس پی شمیم بھی تھا۔ وہ اس وقت دلشاد انجم ہی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ''حیرت انگیز بات ہے جناب! اس قسم کی وارداتیں کسی گہری سازش ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ کون تھے وہ لوگ... اور آپ کو پناہ دینے والا وہ پراسرار آدمی کون تھا؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' دلشاد نے کہا۔ ''میں تو سوچ سوچ کر تھک چکا ہوں۔''

''پچھلے دنوں میرے ایک دوست کے ساتھ بھی ایک حیرت انگیز بات ہو چکی ہے۔'' شمیم نے بتایا۔ ''اور یہ اتفاق ہے کہ اس کا تعلق بھی حکومت کے ایک اہم ادارے سے ہے۔ خیر، آپ یہ بتائیں آپ سے کسی قسم کا مطالبہ وغیرہ تو نہیں کیا گیا ہے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' دلشاد انجم نے جواب دیا۔ ''ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے۔''

''بہرحال آپ کو اب بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ پولیس نے آپ کی حفاظت کے لیے گارڈز مقرر کر دیے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔''

ایس پی کے جانے کے بعد دلشاد انجم نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سی بے چینی اور خطرے کا احساس ہو رہا ہے۔''

''کیسا خطرہ؟'' اس کی بیوی نے پوچھا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جس آدمی نے مجھے پناہ دی تھی، اس کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ وہ آدمی میرے اعصاب پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔''

دلشاد انجم کی بیوی اسے تسلی دینے لگی۔ ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ نے اس واقعے کو اپنے ذہن پر حاوی کر لیا ہے۔''

''ردا! میں کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جانا چاہتا ہوں۔'' دلشاد نے بتایا۔

''غائب ہو جانا چاہتے ہیں... کہاں؟''

''میرے ذہن میں اپنا پرانا مکان ہے۔'' دلشاد نے بتایا۔ ''وہ کئی برسوں سے خالی بھی پڑا ہوا ہے۔''

''تو پھر... وہاں آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں اپنے محکمے کو بتا دوں گا کہ ہفتہ دس دنوں کے لیے چھٹی لے رہا ہوں۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ وہاں میں اپنی دیکھ بھال خود کر سکتا ہوں۔ کسی کو بھی اس مکان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تم آنا چاہو تو دوسرے تیسرے دن آ کر کوکنگ وغیرہ کر جایا کرنا اور وہ بھی بہت خاموشی کے ساتھ۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ آپ دس بارہ دن تو یہاں بھی گزار سکتے ہیں۔''

''نہیں ردا! مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں یہاں شاید محفوظ نہیں ہوں۔'' دلشاد نے کہا۔ ''پھر مجھے خاموشی سے ایک پروجیکٹ پر کام بھی کرنا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہو سکے گا۔''

''مرضی ہے آپ کی... لیکن آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔''

''میں نے بہت سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔'' دلشاد نے بتایا۔ ''آج رات خاموشی سے نکل جاؤں گا۔''

''اور ملازمین... محافظ وغیرہ...؟''

''کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' دلشاد نے کہا۔ ''میں ایک عام آدمی کی طرح گھر سے نکلوں گا۔ لکھنے پڑھنے کا کچھ سامان لے کر تاکہ میں اطمینان سے اپنا کام کر سکوں۔ اور میں وہاں بس کے ذریعے جاؤں گا یا کوئی رکشا یا ٹیکسی کر لوں گا لیکن تمہارا کام یہ ہوگا کہ تم کسی کو بھی میرے بارے میں نہیں بتاؤ گی کہ میں کہاں ہوں۔ تم میرے کمرے کے دروازے کو لاک رکھو گی اور یہ ظاہر کرو گی کہ میں گھر میں ہی ہوں اور میں نے سختی کے ساتھ منع کر رکھا ہے کہ کسی کو میرے پاس نہ آنے دیا جائے۔''

''دیکھیں، آپ اس طرح خود اپنے لیے شکوک پیدا کر دیں گے۔'' ردا نے کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ میرے دفتر والے میری اس عادت سے واقف ہیں۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اس لیے کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

''آخر وہ کون سا پروجیکٹ ہے جس پر آپ اس طرح کام کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔ یہ محکمے کا راز ہے۔''

ردا نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ دلشاد اسی شام عام سے لباس میں ایک بیگ لے کر پچھلے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا۔

کچھ دور سفر کے بعد اسے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ''ہاکس بے۔'' اس نے اپنا بیگ پچھلی نشست پر رکھتے ہوئے بتایا۔

''وہ تو بہت دور ہے صاحب۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ آنے جانے کا کرایہ لے لینا۔''

دلشاد نے وہ مکان اب سے دس سال پہلے بنوایا تھا۔ ہاکس بے کے سنسان ساحل پر بھی بہت دور جا کر سڑک سے اتر کر ایک راستہ اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ مکان اسی راستے پر بنا ہوا تھا۔

یہ ایک خوب صورت دو منزلہ مکان تھا جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے ایک جنریٹر بھی تھا۔ صاف پانی کی لائن بھی تھی۔

اس مکان کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی دونوں میاں بیوی یہاں آ کر رکتے تھے۔

دلشاد نے اپنی ٹیکسی مکان سے کچھ فاصلے پر رکوائی اور جب کرایہ ادا کر کے اپنا بیگ اٹھا کر اندھیرے میں آگے بڑھا تو اس وقت ٹیکسی ڈرائیور نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

دلشاد کو اس وقت کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بے پروائی سے اس مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس مکان میں کوئی ہے جو اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔

اس نے مین گیٹ کو دھکا دیا۔ گیٹ کھل گیا۔ چھوٹے سے لان سے گزر کر وہ برآمدے میں آ گیا۔ اس دروازے کو کھولنے کے لیے جیب سے چابی نکالی ہی تھی کہ دروازہ خودبخود کھل گیا۔

اندر سے دروازہ کھول کر اس کا استقبال کرنے والا ساحر تھا۔ وہی ساحر جس نے اس اندھیری رات میں دلشاد کو پناہ دی تھی۔

کمرے میں جنریٹر کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ساحر اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ''خوش آمدید۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

''اور یہ دیکھ لیں کہ میں پوری طرح تیار ہو کر آ ہی گیا ہوں۔'' دلشاد نے اپنے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

☆☆☆

امجد کو راشد عطاءاللہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

''معاف کرنا امجد صاحب کہ ہم نے تمہیں اس طرح بلا لیا۔'' راشد عطاءاللہ نے کہا۔ ''ویسے تو تم جو کچھ کر تے پھر رہے ہو اس سے ہمارے محکمے کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ تمہارا معاملہ داخلی ہے اور میں وزارتِ خارجہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود تم ہمارے لیے بھی اہم ہو گئے ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ کس طرح جناب؟"

"وہ اس طرح کہ تمہارے نظریات ہماری فارن پالیسی پر اثر انداز ہونے لگے ہیں۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "کئی ملکوں سے ملنے والی معاونت تمہارے ان نظریات کی وجہ سے روک دی گئی ہے کیونکہ کسی کو اندازہ نہیں کہ تمہاری باتوں کی روشنی میں آنے والا دن اس ملک کے لیے کیسا ہو۔"

"جناب! میں تو جو کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں، محسوس کر رہا ہوں، وہی بیان کر رہا ہوں۔" امجد نے کہا۔

"لیکن تمہارا انداز بالکل نیگیٹو ہے۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "تم مایوسیاں پھیلا رہے ہو۔ اس لیے تم پر پابندی لگائی جارہی ہے کہ تم تین مہینوں کے لیے اس قسم کا کوئی پروگرام نہیں کرو گے۔"

"یہ تو میرے ساتھ زیادتی ہوگی جناب۔"

"اور اگر تم پر پابندی نہیں لگی تو پھر پورے ملک کے ساتھ زیادتی ہوگی۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "میں نے خود تمہارے گزشتہ کئی پروگرامز دیکھے ہیں۔ تمہاری باتیں بہت خوب صورت ہوتی تھیں۔ تم نے ہمیشہ روشن پہلو دکھایا۔ مثبت باتیں کرتے رہے۔ لوگوں کو حوصلہ دلاتے رہے۔ تمہارا ہر پروگرام امیدیں دلاتا ہوا ہوتا تھا۔ پھر اچانک کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہو؟ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے مسٹر امجد!"

"نہیں جناب! کوئی وجہ نہیں ہے۔"

"کیا کسی نے تمہیں خرید لیا ہے یا تم کسی کے دباؤ میں ہو؟" راشد عطااللہ نے پوچھا۔

"دباؤ۔" امجد کچھ بے چین سا ہوگیا۔ "مجھ پر کیا دباؤ ہوسکتا ہے؟"

"کبھی کبھی انسان لاشعوری طور پر بھی کسی کے دباؤ میں آجاتا ہے۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "یا کسی ایسے شخص کے اثر میں آجاتا ہے جس کو وہ اپنا آئیڈیل سمجھتا ہو۔ خود غور کرو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا آدمی تمہارے ذہن میں ہو۔ بہر حال، تم پر تین مہینوں کی پابندی ہے۔ اس کے آرڈرز تمہیں جلد ہی مل جائیں گے۔"

"ایک بات یاد آرہی ہے جناب۔" امجد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"میں جو کچھ کہتا ہوں یا جو کچھ پیش کرتا ہوں، اس کی حوصلہ افزائی صرف ایک شخص نے کی ہے۔" امجد نے بتایا۔ "بلکہ اس حوصلہ افزائی کے بعد میرے نظریات میں اور شدت آگئی ہے۔"

"اوہ..." راشد عطااللہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

"وہ ایک مشہور شخص ہے جناب! ملک کا بہت مشہور منجم... پامسٹ... نفسیات داں... پروفیسر باقر۔"

"اوہ۔ میں نے بھی اس کا نام سن رکھا ہے۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "کیا کہا تھا، اس نے تم سے؟"

"اس نے جو کچھ کہا تھا وہ تو مجھے یاد نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس سے ملنے کے بعد میں نے اپنا کتابچہ مرتب کیا ہے۔"

"اور تم سے اس کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی؟"

امجد نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے آہستہ آہستہ راشد عطااللہ کو سب کچھ بتا دیا۔ "حیرت انگیز۔" راشد عطااللہ نے تبصرہ کیا۔ "اس کا مطلب ہوا کہ اس آدمی نے تم پر اثر ڈالا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تم اس کے ٹرانس میں آگئے ہو۔"

"شاید ایسا ہی ہو جناب! لیکن میں یہ سب تو اس سے ملاقات سے پہلے سے کر رہا ہوں۔" امجد نے بتایا۔

"مسٹر امجد! میرا خیال ہے کہ ہمیں نئے انداز سے اس پورے معاملے کی چھان بین کرنی ہوگی۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "بلکہ ایسا کرو، تم اپنی سرگرمیاں جاری رکھو۔"

"جی؟" امجد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"جاری رکھوں؟"

"ہاں تاکہ اس شخص کو اطمینان ہو جائے کہ تم اب تک اسی لائن پر چل رہے ہو۔" راشد عطااللہ نے کہا۔ "اس دوران میں ہماری ایجنسیاں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیں گی۔"

"اب میں آپ کو ایک مشورہ دیتا ہوں جناب!" امجد نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتا کہ میں یہ سب کیوں کرتا ہوں اور اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ آئندہ یہ سب نہیں کروں گا... کیونکہ میں اپنے خیال کے مطابق جہاد کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی سچ ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ مجھ پر پابندی لگا دی جائے۔"

"کیسی پابندی؟"

"بہت ہی سخت قسم کی۔ مجھے کسی کمرے میں بند کر دیا جائے۔ میں کسی سے ملاقات نہ کر سکوں۔ کوئی میرے پاس نہ آئے۔ میرے پاس لکھنے پڑھنے کا کوئی سامان نہ ہو۔ موبائل تک نہ ہو۔ فون کی سہولت بھی نہیں ہو۔ یعنی مجھے پورے معاشرے سے کاٹ کر رکھ دیا جائے۔ مجھے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑے گا۔ مجھ پر پہرے لگا دیے جائیں۔"

"مسٹر امجد! کیا تم یہ سب برداشت کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں... اگر مجھے اپنے محکمے کے لیے مفید ثابت ہونا ہے اور اس کی بھلائی دیکھنی ہے تو پھر مجھے ہر حال میں یہ کرنا ہوگا۔ ورنہ ایسا نہیں ہوا تو پھر میں وہی لکھوں گا، وہی کہوں گا جسے میں سچ سمجھ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" راشد عطااللہ نے ایک گہری سانس لی۔ "اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

امجد کے ساتھ یہی کیا گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اسے ایک خفیہ مقام پر پہنچا دیا گیا۔ راشد عطااللہ نے اس دن بہت سکون محسوس کیا۔ امجد کے نظریات اور خیالات صرف داخلی سطح پر نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی پریشانیاں پیدا کرنے لگے تھے۔ کئی ممالک نے وزارت خارجہ سے اس کی وضاحت طلب کر لی تھی۔

اور اب امجد کے حوالے سے ایک نام سامنے آیا تھا۔ پروفیسر باقر! ایک پُراسرار شخص جس کے یہاں سیاست دانوں کا آنا جانا تھا۔ جو ستارہ شناس تھا، پامسٹ تھا اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

امجد کی طرف سے فارغ ہو کر اس نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کو فون کیا۔ "آپ ذرا پروفیسر باقر کے بارے میں تحقیقات کروائیں۔ یہ کون ہے... کیا چاہتا ہے۔ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔"

"وہ تو بہت مشہور آدمی ہے جناب!"

"اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے اس شخص میں کچھ گڑبڑ دکھائی دے رہی ہے۔"

"او کے، پھر تو یہ کام ضرور ہوگا۔"

راشد گھر واپس آیا تو اس کی بیوی شہناز اس کے انتظار میں تھی۔ "آج آپ نے بہت دیر لگا دی۔" اس نے شکایت کی۔ "آپ کو میرے ساتھ کہیں چلنا تھا۔"

"ہاں یاد تھا مجھے۔" راشد نے کہا۔ "لیکن میں ایک معاملے میں الجھ گیا تھا۔"

"چلیں، کوئی بات نہیں۔" شہناز مسکرا دی۔ "میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کی ذمے داریوں نے آپ کا راستہ روک لیا ہوگا۔"

راشد کو اس بات پر فخر تھا کہ قدرت نے اسے بے پناہ محبت کرنے والی بیوی دی ہے۔ شہناز نے کبھی کسی بات کے لیے اس پر دباؤ نہیں ڈالا تھا یا اس کے خلاف جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو جوان اولادیں تھیں۔ اس کے باوجود شہناز کی تازگی اور خوب صورتی آج تک برقرار تھی۔ وہ بے پناہ ذہین بھی تھی۔ راشد کو اعتراف تھا کہ اس کے مشورے بہت مناسب ہوا کرتے تھے۔

یہ معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے چائے پینے کے دوران امجد کے حوالے سے ساری داستان سنادی۔

"اوہ، یہ تو بہت ہی ہے دلچسپ صورت حال ہے۔"

"ہاں اور ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی ہے۔" راشد نے کہا۔ "نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے امجد کسی کے قبضے میں ہو اور جو کچھ یہ کہہ رہا ہے یا لکھ رہا ہے، یہ اس کے اپنے خیالات نہیں ہیں بلکہ اس سے کہلوایا جارہا ہے یا لکھوایا جارہا ہے۔ تمہیں یاد ہے۔ ہم نے لندن میں ایک بار ماہر ہپناٹسٹ بیکر سے ملاقات کی تھی اور اس کے شو میں بھی شریک ہوئے تھے؟"

"ہاں یاد ہے مجھے۔ وہ شخص برسوں تک سی این این سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔"

"اور ہم نے اس آدمی کو بھی دیکھا تھا جس کو بیکر نے اپنے ٹرانس میں لے رکھا تھا۔" راشد نے کہا۔ "مجھے اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں بہت مختلف دکھائی دی تھیں۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ بہت سپاٹ چہرہ تھا اس کا اور وہی حال اس کی آنکھوں کا تھا۔ پوری شخصیت سے غیر متعلق آنکھیں۔ تو ایسی ہی کیفیت امجد کی دکھائی دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بات یہ تھی کہ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ذرا سی دیر کے لیے ٹرانس سے نکل آیا ہو۔ پھر ایسا لگتا جیسے دوبارہ ٹرانس میں چلا گیا ہو۔ آتی جاتی لہروں کی طرح۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ پروفیسر باقر نے اس کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کی ہے؟"

"یہ ہوسکتا ہے۔ ہمیں امجد کے رویے کا ہر پہلو سے جائزہ لینا ہوگا۔" راشد نے کہا۔

"اگر آپ کہیں تو میں پروفیسر باقر سے مل لوں؟"

"وہ کیوں؟"

"میں نے اس کا بہت نام سنا ہے۔ اپنا ہاتھ دکھانے کے بہانے اس کے پاس جاؤں گی اور یہ کوئی خاص بات اس لیے نہیں ہوگی کہ اس کے پاس خواتین جاتی رہتی ہیں۔"

"اور تمہیں اسے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن ایک خطرہ ہے۔ کہیں تم ہی اس کے ٹرانس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ آجاؤ۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی کیونکہ میں تو پہلے ہی آپ کے ٹرانس میں آچکی ہوں۔"

راشد مسکرا کر رہ گیا۔ شہناز نے باقر کا فون نمبر ٹریس کر کے اسے فون کر کے دوسری شام کا وقت لے لیا۔ اس نے ایک عام عورت بن کر اس سے گفتگو کی تھی۔ راشد کا حوالہ نہیں دیا تھا۔

اس نے راشد کو بتا دیا۔ "کل شام چھ بجے مجھے اس سے ملاقات کرنی ہے۔"

"بہت سوچ سمجھ کر جانا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اتنی آسان شکار نہیں ہوں گی۔"

دوسری شام راشد نے خود اسے پروفیسر باقر کے مکان تک پہنچایا۔ احتیاطاً ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیا۔ راشد نے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاؤ۔ وہ سامنے والا مکان پروفیسر باقر کا ہے۔"

"اور آپ؟"

"میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"اگر مجھے دیر لگ گئی تو؟"

"کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرتا ہوا ملوں گا۔ اب تم جاؤ۔"

لیکن شہناز نے واپسی میں دیر نہیں لگائی۔ وہ دو تین منٹ بعد ہی واپس آ گئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ جیسے اندر گر پڑی۔

"ارے کیا ہوگیا... خیریت تو ہے؟ تم نے اس سے ملاقات نہیں کی؟"

"نہیں، وہ برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ میں دور سے دیکھ کر واپس آ گئی۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔"

"پہچان لیا ہے... کیا مطلب؟"

"وہ رام گوپال ہے راشد... رام گوپال۔" شہناز نے بتایا۔ اس نے کار کی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

نام۔ باقر حسن۔

عمر۔ پینتالیس اور پچاس کے درمیان۔

شہریت۔ پاکستانی۔ پہلے یہ شخص انگلینڈ میں تھا۔

وجہ شہرت۔ مشہور پامسٹ۔ ستارہ شناس۔

بیک گراؤنڈ۔ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔

ذریعۂ معاش۔ بڑے بڑے صنعت کار اور دولت مند اس کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں، شان دار زندگی گزارتا ہے۔

خاندان۔ کوئی نہیں۔ اس ملک میں اکیلا ہے۔ جولی نام کی ایک لڑکی اس کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔

انٹیلی جنس نے باقر کے بارے میں رپورٹ دی تھی۔

رپورٹ سے راشد نے شہناز کو آگاہ کر دیا تھا۔ "شہناز! شاید تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہو۔ یہ باقر تو کوئی اور آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شہناز نے کہا۔ "میں رام گوپال کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ بہت وقت گزارا ہے۔ اس کا چہرہ، خاص طور پر اس کی آنکھیں تو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"اگر وہ رام گوپال ہی ہے تو پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"پھر تو اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خاص ارادے سے یہ سب کر رہا ہے۔" شہناز نے بتایا۔ "کوئی بہت بڑی پلاننگ لے کر آیا ہے۔ اور خدا جانے امجد جیسے کتنے اس کی گرفت میں ہوں گے اور وہ ان سے نہ جانے کیسے کام لے رہا ہوگا۔"

"پھر تو اس کو فوراً گرفتار کر لینا چاہیے۔" راشد نے کہا۔ "لیکن ایک بات یہ کھٹک رہی ہے کہ اگر وہ صرف باقر ہی ہوا، رام گوپال نہیں ہوا تو ہم جواب نہیں دے پائیں گے۔"

"وہ بعد کی باتیں ہیں۔" شہناز نے کہا۔ "اس سے کوئی نہ کوئی بہانہ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔"

راشد نے انٹیلی جنس والوں کو فوراً ہی باقر کو گرفتار کرنے کی ہدایت کر دی۔ آدھ گھنٹے بعد ایک آفیسر کا فون آ گیا۔ وہ بتا رہا تھا۔ "سر! ایک بہت ہی بھیانک حادثہ ہو گیا ہے۔"

"کیسا حادثہ؟"

"پروفیسر باقر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "پوری کوٹھی جل کر راکھ ہو گئی ہے۔"

"او گاڈ... اور خود پروفیسر باقر؟"

"وہ بھی جل کر راکھ بن چکا ہے سر! اس کی لاش اس کی قیمتی انگوٹھیوں کی وجہ سے پہچانی گئی ہے۔"

☆☆☆

دلشاد انجم اس ویران مکان میں بہت محنت کا کام کر رہا تھا۔

وہ ایک نقشہ بنا رہا تھا۔ نہایت باریک بینی سے۔ پوری جزئیات کے ساتھ۔ ایک ایک موڑ۔ ایک ایک ستون۔ دروازے کھڑکیاں، تہ خانے، حساس مقامات۔

سارا نقشہ اس کے ذہن میں تھا اور وہ پورے دھیان کے ساتھ اس نقشے کو کاغذ پر اتار رہا تھا۔ اس کا مہربان دوست ساحر اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے دن میں ایک بار اس کے پاس آجاتا تھا۔

اس وقت بھی ساحر اس کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کی دہکتی ہوئی آنکھیں دلشاد پر مرکوز تھیں۔ "شاباش۔" اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم بہت اچھے جا رہے ہو۔"

"ہاں ساحر صاحب! مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہی میری زندگی کا سب سے بڑا مشن ہے۔" دلشاد نے کہا۔ "اور شاید اس کے علاوہ مجھے اور کچھ کرنا بھی نہیں ہے۔"

"ہاں، اس کے علاوہ تمہیں اور کچھ نہیں کرنا۔" ساحر نے کہا۔ "تم نے اپنے گھر والوں کو کیا بتایا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" دلشاد نے جواب دیا۔ "صرف بیوی یہ جانتی ہے کہ میں کہاں ہوں لیکن اسے نہیں معلوم کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔"

"اسی میں تمہاری کامیابی ہے۔"

چار دن ہو گئے تھے۔ ان چار دنوں میں دلشاد نے اچھا خاصا کام کر لیا تھا۔ ہر دوسرے دن اس کی بیوی ردا آکر اس کے لیے کھانے بنا جایا کرتی۔

ردا نے بتایا تھا کہ دلشاد کے اس طرح غائب ہو جانے سے بہت ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ کئی اخبار والے بھی اس حادثے کے حوالے سے اس کا انٹرویو لینے کے لیے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

"ارے یار! اخبار والوں کو تو بس ایک چٹ پٹی سی نیوز مل جانی چاہیے۔"

"آپ کے محکمے کے اعلیٰ افسران بھی آپ سے ملنا چاہتے تھے لیکن میں نے کسی طرح انہیں ٹال دیا ہے۔ آخر آپ کا کام کب ختم ہوگا؟"

"بس دو چار دن اور..." دلشاد نے بتایا۔ "میں اندازے سے بہت پہلے ہی اپنا کام مکمل کر لوں گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

ردا ہر حال میں دلشاد کا ساتھ دینے والی بیوی تھی۔ جس وقت اس کی شادی ہوئی تھی، اس وقت دلشاد نیوکلیئر سائنس کی تعلیم ہی حاصل کر رہا تھا لیکن چونکہ ذہین طالب علم رہا تھا اس لیے حکومت نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس بھیج دیا تھا۔ واپس آکر اس نے اٹامک انرجی کمیشن جوائن کر لیا تھا۔

وہ شروع ہی سے ایک فرض شناس اور محبِ وطن قسم کا شخص تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں اس نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھا تھا۔ حکام کے نزدیک اس کی بہت اہمیت تھی اور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

اس شام ردا گھر واپس آئی تو میجر شوکت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میجر شوکت اس کا بڑا بھائی تھا۔ پچھلے ہی دنوں وہ کسی خاص قسم کی ٹریننگ کے لیے ملک سے باہر گیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ "بھائی! آپ نے اپنے آنے کی خبر بھی نہیں دی۔" ردا نے شکوہ کیا۔

"ردا! اس طرح اچانک ملنے میں زیادہ خوشی ہوتی ہے نا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ دلشاد آپ کو بہت مس کرتے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تاش کی بازی کا لطف تو شوکت بھائی کے ساتھ آتا ہے۔"

"یہ بتاؤ تم نے اسے کمرے میں کیوں بند کر رکھا ہے؟"

"بس، یونہی... وہ چاہتے ہیں کہ انہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو ڈسٹرب کروں گا۔ کس کمرے میں ہے؟"

"بھائی! بات یہ ہے کہ..." ردا ہچکچانے لگی۔

"ہاں، بتاؤ کیا بات ہے؟" شوکت نے اس کی طرف دیکھا۔

"بھائی! وہ اپنے ہاکس بے والے مکان میں ہیں۔" ردا نے بتایا۔

"ہاکس بے والے مکان میں... وہ وہاں اکیلا کیا کر رہا ہے؟"

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" ردا نے کہا۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ وہ کسی پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔"

"کمال ہے پروجیکٹ پر کام تو دفتر میں ہوتا ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟" شوکت الجھ کر بولا۔ "پھر ابھی اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ قاتلانہ حملہ ہوا تھا اس پر۔ اس کے باوجود وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟"

"شوکت بھائی! آپ ان کو واپس لے آئیں۔" ردا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔ ”وہ آپ کا احترام بھی کرتے ہیں اور آپ کی بات بھی مانتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی اس کے پاس جا رہا ہوں۔“

شوکت کے باس بے کے مکان تک پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گئی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس اندھیرے میں صرف ایک مکان میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دلشاد انجم کا مکان تھا۔ روشنی اس کی ایک کھڑکی سے باہر آ رہی تھی۔

شوکت نے اپنی گاڑی ایک طرف پارک کی اور مکان کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والا دلشاد ہی تھا جو شوکت کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”ارے شوکت بھائی! آپ... آپ کب آئے؟“

”آج ہی آیا ہوں۔“ شوکت نے کہا۔ ”لیکن تم یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں شوکت بھائی۔ میں بس یونہی ریلیکس ہونے کے لیے یہاں آ گیا ہوں۔“

”لیکن ردا تو یہ بتا رہی تھی کہ تم شاید یہاں کسی پروجیکٹ پر کام کر رہے ہو۔“

”پروجیکٹ؟ نہیں تو... میں یہاں کیا کروں گا۔“

دلشاد کی بوکھلاہٹ اور اس کے انداز نے شوکت کو چوکنا کر دیا۔ ”سچ سچ بتاؤ دلشاد! کیا بات ہے؟“ شوکت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں، آپ تو بلاوجہ...“

شوکت اسے ایک طرف ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں تھا کمرے میں۔ البتہ ایک طرف ایک ایزل پر ایک پیپر، پن کیا ہوا لگا تھا۔ اس پیپر پر کسی جگہ کا مکمل نقشہ بنا ہوا تھا۔

شوکت کی نگاہیں اس ایزل پر جمی ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں حیرت سے وا ہوتی چلی گئیں۔ ”میرے خدا! دلشاد... یہ تو ہمارے ایٹمی پلانٹ کا نقشہ ہے۔ پوری جزئیات سمیت۔ کیا تم اسی پروجیکٹ پر کام کر رہے ہو؟“

دلشاد خاموش رہا۔ کمرے میں اب گہری خاموشی تھی۔ شوکت کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے کچھ کہا نہیں جا رہا تھا۔ بالآخر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”دلشاد! یہ انتہائی حساس اور خفیہ نقشہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ بنانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ کیا تم یہ نقشہ کسی کے حوالے کرنے جا رہے ہو؟“

”نہیں، میں اسے اپنی یادداشت کے لیے بنا رہا ہوں۔“ دلشاد نے کہا۔

”لاؤ ادھر... یہ نقشہ مجھے دو۔“

”نہیں شوکت بھائی! میں نے اس پر بہت محنت کی ہے۔“ دلشاد غرا کر بولا۔ ”آپ اسے نہیں لے جا سکتے۔ یہ کسی کی امانت ہے۔“

”کس کی امانت ہے؟ کیا تم نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”سوری شوکت بھائی! میں یہ نقشہ کسی بھی حال میں نہیں لے جانے دوں گا۔“ دلشاد نے اچانک پستول نکال لیا۔ ”میری محنت ضائع نہیں ہو سکتی۔“

”دلشاد! تم شاید پاگل ہو گئے ہو۔“

”ہاں، میں پاگل ہو گیا ہوں۔“ دلشاد نے شوکت پر گولی چلا دی۔

لیکن اس کا نشانہ خطا گیا۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بعد شوکت نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ دلشاد پر قابو پانا شوکت کے لیے مشکل نہیں تھا۔

ذرا سی دیر میں اس نے دلشاد کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ پھر ایک بے پناہ دکھ کے ساتھ اس نے ردا کو فون کیا۔ ”ردا! میری بہن... بدقسمتی سے تمہارا شوہر دلشاد وطن کا غدار ثابت ہوا ہے۔ میں اسے آرمی انٹیلی جنس کے حوالے کر رہا ہوں۔“

☆☆☆

ذیشان کے لیے سب کچھ بہت مختلف ہو گیا تھا۔ سیکشن آفیسر کے قتل کے بعد اسے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک ایسی بے چینی اور بے قراری جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ کیا کرنے جا رہا تھا یا شاید جو کچھ بھی وہ کرنے کے لیے سوچ رہا تھا، وہ ٹھیک نہیں تھا یا پھر اس نے جو سوچا وہی ٹھیک تھا۔ وہ کیوں گڑبڑا کر رہ گیا تھا؟

اس کام میں اس کا جو ساتھی تھا جس کے شہ دلانے پر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا، اس کا قتل ہو چکا تھا تو ایسی صورت میں خود اسے کیا کرنا چاہیے؟

پیچھے ہٹ جائے یا اپنے مشن کو جاری رکھے؟ بات تو اب بہت آگے تک جا چکی تھی۔ باہر کے کئی ادارے بھی اس کام میں اس کے ساتھ ہو گئے تھے پھر وہ (پیچھے کیسے ہٹ سکتا تھا) کیسے ہو سکتا تھا۔

ایسی کشمکش اچانک ہی پیدا ہوئی تھی۔

اب سے پہلے وہ بہت سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا تھا۔ اس نے پوری پلاننگ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کی تھی پھر اچانک کیا ہو گیا تھا؟

اس نے سوچا کہ وہ اپنی بیوی مشعل سے بات کرے۔ اس سے مشورہ کرے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایسی بے چینی کیوں ہو گئی ہے اس کو۔

دفتر میں اس کے پاس مختلف لوگ آتے رہے تھے۔ وہ سب سیکشن آفیسر کے قتل کی بات کر رہے تھے۔ طرح طرح کے تبصرے ہو رہے تھے۔ شاید ان ہی تبصروں نے ذیشان کی ذہنی کیفیت ایسی کر دی تھی۔ اس کے تعلقات ابھی تک برقرار تھے۔ ساری ڈیل ہو چکی تھی۔ سیکشن آفیسر کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا پھر وہ کیوں پریشان ہو رہا تھا؟

اس نے گھر فون کر کے مشعل سے کہا۔ ”مشعل! آج میں جلدی گھر واپس آ رہا ہوں۔“

”خیریت تو ہے نا؟“

”پتا نہیں کیوں کچھ الجھن سی ہو رہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آج لانگ ڈرائیو پر جانے کو دل چاہ رہا ہے۔ شام کی چائے پی کر نکلیں گے۔“

”او کے۔“ مشعل بھی خوش ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ کو بھی ذہنی تفریح کی ضرورت ہے۔ میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ سیکشن آفیسر کے قتل نے آپ پر کچھ برا اثر ڈالا ہے۔“

”ہاں یار! نہ جانے کیوں دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا ہے۔“ ذیشان نے کہا۔ ”خیر، تم تیار رہنا۔ میں آ رہا ہوں۔“

ٹھیک پانچ بجے دونوں گھر سے نکل پڑے۔ انہوں نے ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔

”ہاں تو جناب! کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟“ مشعل نے پوچھا۔

”کسی طرف بھی لیکن شہر کے شور سے دور... کسی پُرسکون جگہ۔“

”چلیں پھر حب کی طرف نکل لیتے ہیں۔“ مشعل نے کہا۔ ”وہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہے۔“

پندرہ منٹ کے بعد ان کی گاڑی حب کے راستے پر تھی۔ ہر طرف سکون اور سناٹا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ٹرک یا ٹرالر گزرتا تو ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا۔ اس کے گزر جانے کے بعد پھر وہی خاموشی۔

ائر کنڈیشنڈ گاڑی میں ہلکی ہلکی موسیقی چل رہی تھی۔ ذیشان اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کرنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد اس نے اپنے لیے فرصت کے لمحات نکالے تھے۔

”کیا ہم ان راستوں پر کبھی آئے ہیں؟“ ذیشان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم ادھر کبھی نہیں آئے۔“ مشعل نے کہا۔

”تو پھر یہ راستہ جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے؟“ ذیشان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”جیسے میں پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ آئے ہوں، میں تو نہیں آئی۔“

”نہیں مشعل! کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔“ ذیشان نے کہا۔ ”مائی گاڈ! یہ تو وہی راستہ ہے۔“

”کون سا راستہ؟“

”وہی جسے میں خواب میں دیکھتا رہا ہوں۔“ ذیشان نے کہا۔ ”بالکل وہی راستہ ہے۔ ویسا ہی ہے۔ اجاڑ... ویران۔“

”وہم ہے آپ کا۔ چلیں اب واپس چلتے ہیں۔“

”نہیں مشعل! ابھی نہیں۔ آج اس راز کے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم واپس نہیں جائیں گے۔“

”میں پھر کہہ رہی ہوں کہ یہ آپ کا وہم ہے۔ خود بتائیں یہاں مندر کہاں دکھائی دے رہا ہے آپ کو؟“

”ہاں، مندر تو نہیں ہے لیکن ہونا چاہیے۔“

”زبردستی ہونا چاہیے؟“

”ہاں کیونکہ میرے خوابوں میں یہی راستے آتے رہے ہیں۔“ ذیشان نے کہا۔ ”وہ دیکھو، وہ ایک آدمی پیدل چلا جا رہا ہے۔ اس سے پوچھتے ہیں۔“

ذیشان نے اپنی گاڑی اس شخص کے پاس روک لی۔ وہ ایک مقامی آدمی تھا جو بہت حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”بھائی! کیا یہاں آس پاس کوئی مندر ہے؟“ ذیشان نے دریافت کیا۔

”مندر؟“ اس آدمی نے چونک کر ذیشان کی طرف دیکھا۔

”ہاں بھائی، جہاں ہندو اپنی پوجا کرتے ہیں۔“ ذیشان نے بتایا۔ ”کوئی پرانا مندر۔“

”نہیں، مجھے نہیں معلوم۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔ ”یہاں کوئی مندر نہیں ہے۔“

”دیکھا، میں نے کہا تھا نا کہ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ واپس چلیں۔“

”نہیں مشعل! یہ وہی میرے خوابوں والی جگہ ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذیشان نے کہا۔ ''میں اسے نہیں بھول سکتا۔ اس آدمی کو نہیں معلوم ہوگا۔ کسی اور سے پوچھتے ہیں۔''

کچھ فاصلے پر بھیڑیں چراتا ہوا ایک گڈریا مل گیا۔

''جی صاحب! یہاں ایک مندر ہے۔ بہت پرانا۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن اب وہ ویران ہو چکا ہے۔''

''ہمیں اسی طرف جانا ہے۔'' ذیشان نے بتایا۔

''سامنے جو درخت نظر آرہے ہیں۔ ادھر چلے جائیں۔ بیچ سے ایک راستہ جاتا ہے، اس پر چلیں گے تو ایک میدان ہے۔ میدان کے بعد وہ مندر ہے۔''

''میرے خدا! بالکل وہی۔'' ذیشان بڑبڑایا۔ ''میدان... میدان کے بعد مندر۔''

''ذیشان! واپس چلو۔'' مشعل نے کہا۔ ''مجھے نہ جانے کیوں خوف محسوس ہورہا ہے۔''

''اب یہاں تک آکر واپس کیا جانا۔'' ذیشان نے درختوں کی طرف گاڑی بڑھادی۔ ''اپنے خوابوں کا بھید تو معلوم کرلوں۔ دیکھوں تو سہی، یہ سب مجھے کیوں دکھائی دیتا تھا۔''

مشعل نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ذیشان نے ضد پکڑلی ہے۔ وہ دیکھے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ گاڑی چلتی رہی۔ درختوں کے درمیان ایک راستہ سا بنا ہوا تھا۔ وہ اسی راستے پر بڑھتے رہے۔ راستہ ختم ہوگیا۔ ایک میدان... اور اس میدان کے بعد ایک مندر۔

بہت قدیم جس کی دیواریں خستہ ہو چکی تھیں۔ اس مندر کے عقب میں درختوں کا سلسلہ تھا۔ ''بالکل وہی۔'' ذیشان نے کہا۔ ''سامنے میدان اور مندر کے پیچھے پھیلا ہوا درختوں کا سلسلہ۔''

''ذیشان!'' مشعل کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''اب دیکھ لیا نا، اب چلو واپس۔''

''کم از کم یہ تو پتا چلنے دو کہ میں اس مندر کے خواب کیوں دیکھتا ہوں۔ اس سے کیا تعلق ہے میرا۔''

''خدا کے بندے کس سے پتا کرو گے؟ یہاں تمہیں کون دکھائی دے رہا ہے؟''

''وہ دیکھو، مندر کے پیچھے سے ایک آدمی نکل کر ہماری طرف آرہا ہے۔'' ذیشان نے اشارہ کیا۔

واقعی ایک آدمی اسی طرف آرہا تھا۔ اس نے شہری لوگوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک قدآور انسان تھا اور جب وہ ان کے قریب آیا تو ذیشان حیران رہ گیا۔ ''رانا صاحب! آپ...''

''ہاں میں۔'' رانا مسکرادیا۔ ''خوش آمدید۔ میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔''

☆☆☆

رام گوپال کی شناخت کرلینے کے بعد شہناز کی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ وہ پروفیسر باقر بن کر اس ملک میں کیا کررہا تھا؟ کیوں آیا تھا یہاں؟ پھر وہ اچانک جل کر مر بھی گیا تھا۔ اس کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ آخر کیوں... کس طرح؟

''راشد! مجھے تو باقر یا رام گوپال کی موت ایک ڈراما لگ رہی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔''

''لیکن اس کی جلی ہوئی لاش تو مل چکی ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ لاش کسی اور کی ہو۔ اس کو انگوٹھیاں پہنادی گئی ہوں۔''

''یہ بھی ایک اہم بات ہے اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ پروفیسر باقر بن کر یہاں کیا کررہا تھا؟'' راشد نے کہا۔ ''امجد کے ذریعے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا؟''

''کام تو سمجھ میں آگیا ہے۔ میڈیا کے ذریعے ملک میں انتشار پھیلانا۔''

''امجد کو اس نے کس طرح قابو میں کیا ہوگا؟''

''یہ خود امجد ہی بتا سکے گا۔''

''اس کا تو یہ کہنا ہے کہ اس قسم کے نظریات اور خیالات خود اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھے۔ اگر ہم مان بھی لیتے ہیں کہ امجد اس کے ٹرانس میں تھا تو یہ کتنا طاقت ور ٹرانس تھا اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے امجد ہی کی طرح کچھ اور بھی ہوں جن کے بارے میں ابھی ہمیں پتا نہیں چل پایا ہو۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں تو بہت خطرہ محسوس کررہی ہوں۔'' شہناز نے کہا۔ ''رام گوپال ہم لوگوں کو بھولا تو نہیں ہوگا۔ اس نے یہ معلوم کرلیا ہوگا کہ آپ کس پوزیشن میں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سارا جال اس نے آپ ہی کے لیے پھیلایا ہو۔''

''اب تو سب کچھ ممکن ہے۔''

فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کے محکمے کے ایک آفیسر کا فون تھا۔ ''سر! امجد نے اپنے آپ کو بری طرح زخمی کرلیا ہے۔ ہم نے اسے اسپتال پہنچا دیا ہے اور وہ فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''اوہ گاڈ... میں ابھی آرہا ہوں۔''

اس نے شہناز کو صورتِ حال بتائی اور دس منٹ کے اندر اسپتال پہنچ گیا۔ امجد کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ راشد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''سر! میں نے نہ جانے کیوں اپنے آپ کو زخمی کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ خیال میرے ذہن میں کیوں آیا تھا۔''

''خیر، کوئی بات نہیں۔'' راشد نے اسے تسلی دی۔ ''اب تم ٹھیک ہو۔''

''نو سر! بات کچھ اور ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے ہوں۔'' امجد نے کہا۔ ''بہت کچھ یاد آنے لگا ہے۔ پروفیسر باقر سے میری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔''

''اوہ، کہاں؟''

''رانا صاحب کے گھر پر۔'' امجد نے بتایا۔ ''میں رانا صاحب کا انٹرویو لینے گیا تھا۔ رانا صاحب مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلے گئے تھے۔ پھر پروفیسر باقر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ لیکن سر! ایک حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے یاد کیوں نہیں آیا کہ میں اس شخص سے مل چکا ہوں؟ میری یادداشت کیوں غائب ہوگئی تھی؟''

''اور اب تمہیں یاد آرہا ہے؟''

''ہاں، ایسا لگتا ہے کہ میرے سر کی چوٹ مجھے اپنی دنیا میں واپس لے آئی ہے۔ میں شاید کہیں اور تھا۔''

''بھول جاؤ اس بات کو۔ پروفیسر باقر ایک ماہر ہپناٹسٹ تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، ہوسکتا ہے کہ اس نے تمہارے ذہن کو واش کردیا ہو۔''

''بالکل یہی ہوسکتا ہے سر... اور اب مجھے ایک بات اور یاد آرہی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے سر۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''سر! رانا اور پروفیسر باقر دونوں ایک ہی ہیں۔''

''کیا؟'' راشد اچھل پڑا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر! اب میرے ذہن کے دریچے کھل رہے ہیں۔'' باقر نے کہا۔ ''رانا مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر چلا گیا تھا پھر باقر کمرے میں داخل ہوا۔ فرق تھا سر کہ رانا کی مونچھیں تھیں جبکہ باقر کی نہیں تھیں۔ لیکن آنکھیں اور چہرے کی بناوٹ دونوں کی ایک جیسی ہے سر۔ وہی آنکھیں، خدا کی قسم دونوں ایک ہیں... ایک ہیں دونوں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پروفیسر باقر مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔'' راشد نے اپنے آپ سے کہا۔ ''شہناز کا اندیشہ صحیح نکلا۔''

☆☆☆

دلشاد انجم کی وجہ سے ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اٹامک پاور پلانٹ کا نقشہ تیار کرنے کی ذمے داری اس کی نہیں تھی۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیا فائدہ ہوتا اس کو؟ اس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ اس نے کسی غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں اپنے آپ کو فروخت کردیا ہے۔

یہ معاملہ چونکہ بے حد حساس تھا اسی لیے خصوصی طور پر تشکیل دی ہوئی ٹیم اس سے سوالات کررہی تھی۔ ''تم یہ نقشہ کس کے لیے بنا رہے تھے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کس نے کہا تھا تم سے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''اپنی ملازمت کے دوران میں تم کتنے لوگوں سے ملتے رہے ہو؟''

''میں نے کہا نا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''

تفتیش کرنے والے عاجز آچکے تھے۔ اس کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔

دلشاد کا ریکارڈ بے داغ رہا تھا۔ اس نے نیوکلیئر سائنسز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ معاشرے میں بھی اسے اچھی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ایک حساس ترین اہم محکمے کی ایک ذمے دار پوسٹ پر تھا۔ اس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کبھی وطن فروش بھی ہوسکتا ہے۔

لیکن حقیقت سامنے تھی۔ وہ نقشہ بناتے ہوئے پکڑا گیا تھا جبکہ اس نقشے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا اور اب اس کی سوئی ایک جگہ آکر اٹک گئی تھی کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔

ردا نے رو رو کر خود کو بے حال کرلیا تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کا محبوب، پیار کرنے والا شوہر وطن کا غدار بھی ہوسکتا ہے۔

اس کے بھائی شوکت نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ ''نہیں، مجھے یقین نہیں آتا۔ دلشاد ایسے ہو ہی نہیں سکتے۔''

''میں خود بھی جانتا ہوں کہ دلشاد ایسا نہیں ہوسکتا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایسا ہی ثابت ہوا ہے۔''

''شوکت بھائی! ہوسکتا ہے کہ جو کچھ سامنے ہے اس کی حقیقت کچھ اور ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے ردا۔ دیکھو، اگر وہ بے گناہ ہوا تو پھر سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

''ایک بات پر غور کریں۔ اگر وہ مجرم ہوتے تو پھر ان پر قاتلانہ حملہ کیوں ہوتا؟''

''ہاں، یہ بات غور طلب ہے اور اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ جو شخص ان سے کام لے رہا ہے، اس نے صرف خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے کام میں تیزی پیدا کرے۔''

''اور وہ آدمی کون تھا جس نے انہیں پناہ دی تھی؟''

''وہ کوئی بھی ہو۔ اگر وہ مل بھی گیا تو ہمیں بتا دے گا کہ ہاں اس نے ایک آدمی کو پناہ دی تھی اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''

''آپ اس آدمی سے تو ملیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ جانتا ہو۔''

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ وہ آدمی کیا جانتا ہوگا؟''

''آپ جائیں تو سہی۔ میری خاطر۔''

ردا کے کہنے پر شوکت خود سادہ لباس میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں کے بارے میں ردا نے اسے بتایا تھا۔

دلشاد نے ردا کے دریافت کرنے پر اس رات کی پوری کہانی ردا کو سنا دی تھی اور دو چار دنوں کے بعد خود ردا اس آدمی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دلشاد کے ساتھ وہاں پہنچی تھی۔ لیکن وہ آدمی اسے نہیں مل سکا تھا۔

شوکت نے اس پُراسرار آدمی کے بارے میں پڑوسیوں سے بات کی لیکن کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ پھر ایک آدمی نے اسے مشورہ دیا۔ ''صاحب! آپ ایسا کریں۔ مالک مکان سے مل لیں۔ وہ آپ کو صحیح صورتِ حال بتا دے گا۔''

یہ مشورہ معقول تھا۔ ''کہاں رہتا ہے مالک مکان؟''

''دو گلی چھوڑ کر۔ سیدھے ہاتھ کا دوسرا مکان ہے۔''

مالک مکان سے مل کر شوکت کو محسوس ہوا جیسے وہ شخص سب کچھ بتا دینے کے لیے تیار ہی بیٹھا ہو۔ ''ارے جناب! کیا بتاؤں، وہ کیسا آدمی تھا۔ اگر اس نے دگنا کرایہ نہیں دیا ہوتا تو میں کبھی اسے مکان نہیں دیتا۔''

''کیوں... کیا خاص بات تھی اس میں؟''

''خاص بات تو کوئی نہیں تھی صاحب! بس اس کی آنکھیں بہت خوف ناک تھیں جیسے چراغ جل رہے ہوں۔ میں نے ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔''

''اور کوئی خاص بات؟''

''دوسری خاص بات یہ تھی جناب کہ وہ یہاں رہتا نہیں تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ گھنٹے کے لیے آجاتا تھا۔ لیکن خیر، مجھے اس سے کیا لینا دینا۔''

''کیا وہ جاتے ہوئے کچھ کہہ کر گیا تھا؟''

''نہیں جناب! وہ اچانک ہی چلا گیا۔ اس کے پاس سامان بھی کوئی خاص نہیں تھا۔''

''آپ لوگ زیادہ کرائے کے لالچ میں یہ نہیں دیکھتے کہ کس کو مکان دینا چاہیے اور کس کو نہیں دینا چاہیے۔'' شوکت نے کہا۔ اس کی یہ کوشش بیکار ہی گئی تھی۔ اس آدمی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ جس کا نام ساحر بتایا گیا تھا۔

☆☆☆

رام گوپال کی ڈائری۔

'میرے استادوں نے مجھے اپنے ہنر میں یکتا کر دیا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں خود بہت محنت کر رہا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف تین گھنٹوں کی نیند اور کھانا بہت کم۔ اس پر دنیا بھر کی ریاضتیں۔

میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ ان علوم پر مکمل دسترس اور ان کے ذریعے اپنے دشمنوں سے انتقام لینا۔

ایک سال کی کڑی محنت کے بعد مجھے اس قابل قرار دے دیا گیا کہ میں اپنی ذہنی طاقت سے بھرپور کام لے سکتا ہوں۔ مجھے ایک عدد بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ اس بورڈ میں بھارتی انٹیلی جنس کے لوگوں کے علاوہ خفیہ اداروں کے لوگ بھی شامل تھے۔

مجھ سے کہا گیا۔ ''مسٹر رام گوپال! کیا آپ اپنی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہیں؟''

''جی ہاں، پوری طرح۔''

''مسٹر گوپال! آپ کے ذہن میں نفرت کا کیا معیار ہے؟ یعنی آپ کسی سے کس حد تک نفرت کر سکتے ہیں؟''

''اپنی انتہا تک۔'' میں نے جواب دیا۔

''مثال کے طور پر آپ کی نفرت کا ٹارگٹ کون ہے؟''

''راشد اور اس سے وابستہ اس کا ملک پاکستان۔'' میں نے بتایا۔

''ہمیں افسوس ہے مسٹر رام گوپال کہ پھر آپ اپنے ملک کے لیے کام نہیں کریں گے کیونکہ آپ کسی شخص سے اپنے طور پر بدلہ لینا چاہتے ہیں اور ہمارے کاز کے لیے یہ جذبہ خطرناک ہے۔ آپ کو صرف اپنے ملک کے دشمن ملک سے بدلہ لینا ہے۔ آپ کا انفرادی دشمن آپ کے لیے اہم ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے لیے نہیں۔ ہاں، اگر آپ کے مشن کی راہ میں وہ اتفاقاً آجائے تو پھر آپ جو چاہے کر سکتے ہیں۔''

''یس سر! میں سمجھ گیا۔ میں واقعی اپنی محبت کو دیس کی محبت پر ترجیح دے رہا تھا۔''

''تو جائیں۔ آپ کو ابھی اور وقت درکار ہے۔ جب تک آپ اپنے ذہن سے اپنی ذاتی دشمنی کو کھرچ نہیں دیتے، ہم آپ سے کوئی کام نہیں لے سکتے۔''

اس کے بعد ایک بار پھر میری تربیت کے مراحل شروع ہو گئے۔ یہ بھی بہت سخت مرحلے تھے۔ صرف اپنے ٹارگٹ پر دھیان دیا تھا۔ ارتکاز کی ان مشقوں نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میں چیلنج قبول کر سکتا ہوں تو ایک بار پھر بورڈ کے سامنے تھا۔

اس بار مجھے پاس کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بتایا گیا۔ ''مسٹر گوپال! اب آپ پوری طرح تیار ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب آپ کو ایک ذمے داری دی جا رہی ہے۔''

''میں حاضر ہوں جناب۔''

''پلاننگ یہ ہے کہ آپ ایک عام شہری کی طرح بھارت سے انگلینڈ جائیں گے۔ وہاں آپ باقاعدہ ایک پلاننگ کے ذریعے آہستہ آہستہ مسلمانوں اور اسلام کے قریب ہوتے جائیں گے پھر آپ لندن کی جامع مسجد کے مولانا کے سامنے اسلام قبول کر لیں گے۔''

''یہ تو میرے لیے بہت مشکل ہوگا جناب۔''

''یہ تو آپ کو کرنا ہوگا۔ یہ صرف ظاہر میں ہوگا۔ اندر سے آپ اپنے دھرم پر ہی رہیں گے۔ پھر آپ خود کو ستارہ شناس اور پامسٹ وغیرہ کے طور پر مشہور کریں گے۔ ہمارے ایجنٹ آپ کی اس شہرت کو ہوا دیں گے پھر آپ پر قاتلانہ حملے کیے جائیں گے۔''

''وہ کیوں سر؟''

''آپ کے کیس کو مضبوط بنانے کے لیے۔'' اس سے کہا گیا۔ ''پھر آپ پاکستان کی شہریت حاصل کر لیں گے، ہم نے اس کے بھی انتظامات کر لیے ہیں۔ آپ کا اصل کام پاکستان پہنچ کر شروع ہوگا۔''

''وہ کیا ہوگا سر؟''

''مختلف محاذوں پر اسے کمزور کرنا۔ جیسے فنانس کا محاذ... ہتھیاروں کا محاذ کہ وہ مضبوط نہ ہونے پائے۔ پروپیگنڈے کا محاذ اور سب سے بڑھ کر ایٹمی پاور پلانٹ کو کمزور کرنے کی کوشش۔''

''سر! ان سب کے لیے تو بہت سورسز اور رقم کی ضرورت ہوگی۔''

''وہ سب مل جائیں گے۔ پیسے بھی اور لوگ بھی۔ اس وقت بھی ہمارے بہت سے ایجنٹس وہاں کام کر رہے ہیں۔ وہ سب آپ کے انڈر میں آجائیں گے۔''

''پھر تو یہ چیلنج میں منظور کرتا ہوں سر۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ کتنے آدمیوں کی ضرورت ہوگی؟''

''کسی کی نہیں سر! میں یہ سارے کام اکیلے رہ کر کروں گا۔'' رام گوپال نے کہا۔ ''میں ہر محاذ پر جنگ کی صلاحیت رکھتا ہوں۔''

''پھر بھی آپ کو اسسٹ کرنے کے لیے لوگ تو چاہئیں۔''

''یس سر! لیکن آپ کے ایجنٹس ہی میرے کام آئیں گے۔''

اس کے بعد میٹنگ ختم ہو گئی۔ اور ایک نئی تربیت کا مرحلہ شروع ہوا۔ میری تربیت تھی پاکستان اسٹڈیز کی۔ اس کی سیاست۔ بنیادی اسٹرکچر۔ وہاں پائے جانے والے فرقے۔ مختلف زبانیں۔ مختلف کلچر، فنانس پوزیشن۔ اس کے شہر۔ اہم لوگوں کے نام اور عہدے وغیرہ۔ یعنی دو ہفتوں کی

عقل مند

غلام محمد کچھ عرصہ انگلستان میں رہ کر آیا تو وہ تھوڑی بہت انگریزی بولنے لگا جو دیہی لوگوں کے لیے کافی تھی۔ ایک دن ایک انگریز سیاح راستہ بھٹک کے اس گاؤں کی طرف نکل آیا۔ وہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان سے ناواقف تھا۔ اس لیے انگریزی میں ہی دیہی لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس موقع پر غلام محمد کو بلا لیا گیا۔ وہ اپنی بڑپن کو قائم رکھنے کے لیے انگریز سیاح کی ہر بات پر ''یس یس'' یا پھر ''نو نو'' میں جواب دینے لگا۔ پہلے سے جھنجلایا ہوا سیاح مزید جھنجلا گیا اور تاؤ کھاتے ہوئے غلام محمد کے ایک تھپڑ مار کر وہاں سے چلا گیا۔ غلام محمد سے گاؤں والوں نے تھپڑ کا سبب پوچھا تو غلام محمد ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہونا کی ہے... انگریز بابو کہتا ہے کہ تو اتنا عقل مند ہو کے بھی ان جاہلوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔''

(مرسلہ: خلیل احمد انجم، دھنی سیداں، کھاریاں)

ٹریننگ کے دوران مجھے پاکستان جیسے گھول کر پلا دیا گیا تھا۔

پھر میں رام گوپال ہی کے نام سے لندن آگیا۔

میری حیثیت طالب علم کی تھی۔ یہاں آکر میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ پاکستانیوں سے دوستیاں کیں اور یہ ظاہر کیا کہ میں اسلام کی طرف راغب ہوتا جا رہا ہوں۔

میں نے خود کو آسٹرولوجر اور پامسٹ ظاہر کیا۔ لندن میں میرے ایجنٹس میری پیش گوئیوں کو پورا کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔ پھر پلاننگ کے تحت میں نے اسلام قبول کر لیا۔

اب میرا نام محمد باقر تھا۔ نام کی تبدیلی کے ساتھ ہی میں نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ مجھ پر بہت دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ طرح طرح کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ بالآخر ایک دن اسکیم کے تحت مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی ہو گیا۔ ہاں، اس سے پہلے میں نے ایک کتابچہ بھی تحریر کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ ''میں کیوں مسلمان ہوا؟''

وہ حملہ اس کتابچے کے بعد ہی ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں اور خاص طور پر پاکستانیوں کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ لندن ہی میں مجھے جولی سے ملوایا گیا۔ ایک خوب صورت اور ذہین لڑکی جس کی وجہ سے میرے مسائل حل ہوتے رہے۔ مختصر یہ کہ میں پاکستان آگیا۔ مجھے پاکستان کی شہریت مل گئی تھی۔ میں اب یہاں کا ایک معزز شخص تھا۔

اب میری اصل جدوجہد یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں کے بااثر حلقوں تک رسائی، دوستیاں، ان کو اپنے علم سے مرعوب کرنا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پاکستان کے مختلف شعبوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔

میرے پاس روپوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن اب بھی کچھ کام باقی تھا اور اس کے لیے میری نگاہ رانا صاحب پر گئی۔ ایک مشہور سماجی شخصیت۔ جاگیردار۔ والدین نے بچپن ہی میں تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا تھا جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد بھی بیس برسوں تک باہر ہی رہے۔ واپس آنے سے پہلے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ عزیز رشتے دار کوئی نہیں تھا۔ شادی بھی نہیں کی تھی۔ یار باش قسم کے آدمی تھے۔ اسی لیے پاکستان آتے ہی ایک وسیع حلقۂ احباب کے مالک ہو گئے تھے۔

سب سے اچھی بات یہ تھی کہ رانا صاحب کا قد اور جسم میری طرح تھا۔ چہرے کے نقوش بھی بہت ملتے تھے۔ صرف آنکھیں مختلف تھیں لیکن آنکھوں پر کون اتنا دھیان دیتا ہے۔

رانا بہت آسان شکار ثابت ہوا۔ میرے آدمیوں نے انہیں ٹھکانے لگا دیا۔ پھر اس کی لاش بھی غائب کر دی گئی۔ اب میری دو حیثیت تھیں۔ میں ایک طرف باقر تھا تو دوسری طرف رانا بھی تھا۔

ان کے قریبی دوستوں کو بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ رانا کے روپ میں کوئی اور ہے۔ میری بے پناہ ذہنی تربیت یہاں میرے کام آ رہی تھی۔

میں نے باقر کے روپ میں امجد اور قادر کو ٹرانس میں لیا۔ امجد میڈیا کا آدمی تھا اور قادر کا فنانس سے تعلق تھا۔ رانا کی حیثیت سے میں نے ذیشان کو اپنے اثر میں لیا۔ وہ اسلحے کی خریداری کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ اور ہاں، میری ایک تیسری حیثیت بھی تھی۔ ساحر کی۔ دلشاد انجم سے میں ساحر کی حیثیت سے ملا تھا۔

ان سب پر دباؤ بڑھانے کے لیے میں نے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے۔ دلشاد انجم پر حملہ میں نے ہی کروایا تھا اور اسے گھیر کر ویران میدان کی طرف لایا گیا۔

قادر کے بچے کا اغوا بھی میری ہی سازش تھی اور یہ سب اس لیے کیا جا رہا تھا کہ ہر انداز سے دباؤ برقرار رہے۔ لیکن نہ جانے کیوں بازی پلٹتی چلی گئی۔

سب سے پہلے مجھے باقر کو مارنا پڑا۔ اس کے لیے میرے آدمیوں نے ایک آدمی کا قتل کر کے اسے میری انگوٹھیاں پہنا دی تھیں۔ امجد نہ جانے کس طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ اس کی نشان دہی پر حساس ادارے باقر کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

پھر ساحر کو روپوش ہو جانا پڑا کیونکہ دلشاد انجم کے حوالے سے لوگ ساحر تک پہنچ گئے تھے۔ صرف رانا زندہ رہا تھا۔

ہاں رانا... باقر اور ساحر کے علاوہ میری ایک اور شخصیت بھی تھی۔ اور وہ تھی رام گوپال کی۔

رانا، باقر اور ساحر کا مسئلہ، قادر، امجد، ذیشان یا دلشاد انجم وغیرہ تھے۔ لیکن رام گوپال کا مسئلہ صرف ایک تھا، مالتی... صرف مالتی۔ اور راشد... جو راشد عطاء اللہ تھا۔

☆☆☆

ذیشان اور مشعل رانا کی قید میں تھے۔ رانا بہت آسانی سے ان دونوں کو اس خستہ پرانے مندر میں لے آیا تھا جس کی طرف نہ جانے کتنے برسوں سے کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ لیکن رانا اب اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

یہاں ایک تہ خانہ بھی تھا۔ ان دونوں کو اس تہ خانے میں لایا گیا۔ رانا کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ یہ دونوں رانا یا رام گوپال ہی کے ایجنٹ تھے۔

''رانا صاحب! آخر یہ سب کیا ہے؟'' ذیشان نے پوچھا۔ ''آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟''

''اپنی ناکامی کا ماتم کرنے۔'' رانا نے کہا۔

''کیسی ناکامی؟''

''پوری تھیوری غلط ہو گئی۔ میری برسوں کی محنت بیکار گئی۔ اب پتا چلا ہے کہ انسانی ذہن کو زیادہ دنوں تک قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس پر ہپناٹائز کر کے فوری طور پر تو اس سے کام لے سکتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس اثر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جس طرح تم ہوتے جا رہے ہو۔''

''رانا صاحب! آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔''

''کہانی یہ ہے کہ تم ایک بار مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' رانا نے بتایا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم کون ہو اور حکومت کی نگاہوں میں تمہاری کتنی اہمیت ہے۔ اس لیے میں نے تم سے دوستی کر لی اور سیر کے بہانے ایک دن تمہیں اس مندر میں لے آیا۔''

''اوہ، اب سمجھا۔'' ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔ ''شاید اس لیے مجھے وہ خواب آتے رہے تھے۔''

''ہاں کیونکہ میں اس مندر کو پوری طرح تمہاری یادداشت سے غائب نہیں کر سکا تھا۔'' رانا نے کہا۔ ''تمہارا لاشعور خواب میں تمہیں اس مندر کی جھلکیاں دکھاتا رہا تھا۔ ویسے تم یہ بھول گئے تھے کہ تمہیں یہاں کون لایا تھا اور میں نے تم سے کیا کہا تھا... تمہیں کیا ہدایات دی تھیں۔''

''خیر بتاؤ کہ اب کیا چاہتے ہو تم؟'' ذیشان نے پوچھا۔

''اس منصوبے کی کامیابی جس کے لیے میں نے تم پر محنت کی ہے۔'' رانا نے کہا۔

''لیکن کیوں؟ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟''

''مجھے فائدہ ہو یا نہ ہو، میرے دیس کو ضرور فائدہ ہو گا۔''

''رانا! تم کس دیس کی بات کر رہے ہو، تم تو اسی ملک کے ہو۔'' ذیشان نے کہا۔

''نہیں، میں اس ملک کا نہیں ہوں اور میں رانا بھی نہیں ہوں۔'' اس نے اپنی مونچھیں اپنے چہرے سے ہٹا دیں۔

مشعل نے بڑی سختی کے ساتھ ذیشان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دونوں بہت حیرت سے اس آدمی کی طرف دیکھ رہے تھے جو مشہور سماجی اور سیاسی شخصیت رانا کی طرح تو تھا لیکن رانا نہیں تھا۔

''حیران ہو گئے نا مجھے دیکھ کر؟'' اس نے کہا۔ ''خیر، اب یہ سن لو کہ میں رانا نہیں رام گوپال ہوں۔ اور میرے نام سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میرا تعلق کس ملک سے ہے۔''

''ہاں، اندازہ ہو گیا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

''تو بس کوشش کرو کہ میں نے تمہارے ذہن میں جو کچھ فیڈ کیا تھا، وہ کر جاؤ۔ ہتھیاروں کے معاہدے پر سائن ہو جانے چاہئیں۔''

''رانا یا رام گوپال، تم چاہے جو بھی ہو... میں تمہارے ٹرانس میں آ کر وہی سب کچھ کرتا رہا جس کی تم نے ہدایت دی تھی۔ لیکن اب میں تمہارے ٹرانس سے نکل آیا ہوں۔ اس لیے میں ایسا کیوں کروں گا؟''

''میں جنگ لڑتے ہوئے ہر پہلو اور ہر مہرے کو اپنے سامنے رکھتا ہوں۔'' رام گوپال نے کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ ہو سکتا ہے میں زیادہ دنوں تک ذہنوں پر کنٹرول کی پچویشن کو قابو میں نہ رکھ سکوں۔ اس لیے میں نے دوسری طرف بھی دھیان دیا تھا۔ دوسرا مہرہ بھی میرے سامنے تھا۔ اور وہ مہرہ ہے تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی تمہاری بیوی۔''

''کیا؟'' ذیشان نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''میری بات غور سے سنو۔'' رام گوپال نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں ذیشان پر مرکوز کر دیں۔ ''تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔ تم میری کسی بات سے انکار نہیں کر سکتے۔''

اسی وقت مشعل نے ایک جھٹکے کے ساتھ ذیشان کی گردن پکڑ کر اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کر لیا۔ ذیشان جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔

''اوہ، کوئی بات نہیں۔'' رام گوپال دانت پیسنے لگا تھا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ دوسرا حربہ میرے پاس ہے۔ تمہاری بیوی اس وقت تک میری قید میں رہے گی جب تک ایگریمنٹ نہیں ہو جاتا۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''اس کے بعد ہم اسے آزاد کر دیں گے۔'' رام گوپال نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا میں دنیا کو نہیں بتادوں گا کہ تم کون ہو، تمہاری کیا اصلیت ہے؟"

رام گوپال ہنس پڑا۔ "بے وقوف انسان... جب یہ پتا چلے گا کہ تم نے جان بوجھ کر ناکارہ ہتھیاروں کے سودے کیے ہیں تو اس وقت خود تمہاری کیا پوزیشن ہوگی؟ کیا تم نے اس پر غور کیا ہے؟ پورا ملک تم پر لعنت کر رہا ہوگا۔ تم اپنے ملک کے غدار اور مجرم کہلاؤ گے۔ تمہاری ایسی ذلت ہوگی کہ تم جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

ذیشان کانپ کر رہ گیا۔ "اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟"

"تو پھر تمہاری خوب صورت بیوی زندہ حالت میں تم سے کبھی نہیں مل سکے گی۔" رام گوپال نے کہا۔ "یا تو تم اس کی لاش دیکھو گے یا پھر یہ بھارت کے کسی بازارِ حسن میں دوسروں کے کام آرہی ہوگی۔"

☆☆☆

شہناز سے اپنے شوہر کی حالت نہیں دیکھی جارہی تھی۔ راشد صرف اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ اس کا محبوب بھی تھا۔ اس کا دوست بھی تھا۔

بہت دنوں پہلے وہ شہناز نہیں مالتی تھی۔ رام گوپال کی محبت... اس نے رام گوپال کو پاکر یہ سمجھ لیا تھا کہ دنیا یہاں آکر ختم ہو چکی ہے۔ اب رام گوپال کے علاوہ اس کائنات میں اور کوئی نہیں ہے۔

وہ یاترا کے لیے کتاس آئی تھی، رام گوپال کے ساتھ۔ دونوں بہت خوش تھے۔ رام گوپال تو یہاں کے سادھوؤں اور جوگیوں سے ملتا رہتا۔ اس کا شوق کچھ اس قسم کا تھا جبکہ مالتی پورے کتاس کی سیر کرتی پھر رہی تھی۔ اسے یہ جگہ بہت پسند آئی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ یہ جگہ بہت خوب صورت تھی۔ پھر اس منظر کی خوب صورتی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

یہ راشد تھا۔ ایک نوجوان فوجی جو خود بھی کتاس کی سیر کے لیے آیا تھا۔ مالتی کی اس سے پہلی ملاقات جھیل کنارے ہی ہوئی تھی۔ اور پہلی نظر، پہلی ہی دفعہ اس کے دل نے اپنے آپ کو راشد کے آگے سرنڈر کر لیا تھا۔ یہی کیفیت راشد کی بھی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔

ایسے طوفانی اور اچانک عشق کی مثال ذرا کم ہی ملتی ہے۔ اس کا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ دونوں کا پس منظر کتنا مختلف ہے۔ مالتی ہندو تھی اور ہندوستان سے یاترا کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس کا ایک محبوب اس کے ساتھ تھا۔ اس کے باوجود اس نے راشد کو اپنی دھڑکنوں میں بسا لیا تھا اور یہی کیفیت راشد کی تھی۔ وہ مسلمان اور پاکستانی تھا اور اس کا تعلق ایک حساس ادارے سے تھا۔ اس کے باوجود اس نے مالتی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ دشواریاں راشد کو پیش آئی تھیں کیونکہ وہ حساس ادارے سے وابستہ تھا۔ طرح طرح کے سوالات ہو رہے تھے۔ مالتی کہیں جاسوسہ نہ ہو۔ کہیں اس کا تعلق بھارت کی کسی خفیہ ایجنسی سے نہ ہو۔ ہزاروں دشواریاں تھیں۔

اس کے علاوہ مالتی بھارتی شہریت رکھتی تھی۔ اس کو پاکستانی بنانا۔ یہ ایک اور دشوار مرحلہ تھا لیکن محبت کامیاب ہوتی گئی۔

مالتی نے اپنی محبت کے لیے اپنا دیس چھوڑ دیا۔ اپنا دھرم چھوڑ دیا۔ اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ دیا اور اپنی پہلی محبت رام گوپال کو بھول گئی۔

محبت کامیاب ہوگئی۔ مالتی اب شہناز ہو گئی تھی۔ راشد عطاءاللہ اب ایک اہم ترین عہدے پر تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری اور محبت کی مثال قائم کر دی تھی۔

ایک بیٹا تھا جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مالتی یا شہناز کے لیے زندگی ٹھہرے ہوئے جھیل کی طرح پُرسکون تھی۔ اب ایک ہی آرزو تھی کہ اپنے محبوب یعنی راشد کی بانہوں میں اسے موت آجائے۔ اس نے زندگی سے سب کچھ حاصل کر لیا تھا کہ اچانک... اچانک، رام گوپال اس کے سامنے آگیا۔

اس نے پروفیسر باقر کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ صرف ایک جھلک اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ رام گوپال کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

پھر پروفیسر باقر کی موت کی خبر آئی لیکن وہ زندہ تھا۔ راشد ہی نے بتایا تھا کہ پروفیسر باقر اور رانا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔

راشد ان دنوں بہت الجھا ہوا تھا۔ ابھی صرف امجد کا کیس سامنے آیا تھا جس کی برین واشنگ کر دی گئی تھی۔ خدا جانے اس قسم کے اور کتنے لوگ ہو سکتے تھے اور کون کون سے محکموں میں ہو سکتے تھے۔

دوسرا کیس اس کے سامنے دلشاد انجم کا آیا تھا۔ جو اٹامک پاور پلانٹ کا نقشہ بناتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور خیال کیا جارہا تھا کہ وہ بھی امجد ہی کے انداز کا کیس ہے۔

راشد اسی لیے بہت مصروف تھا۔ پالیسیوں کا جائزہ لیا جارہا تھا۔ یہ دیکھا جارہا تھا کہ رام گوپال نے کہاں کہاں ضرب لگائی ہوگی۔ شہناز کا یہ خیال تھا کہ رام گوپال انتقام میں اندھا ہو کر بدلہ لینے کے لیے یہاں آیا ہے۔ اور اس نے یہاں آکر اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ باقر کی صورت میں اور رانا کی صورت میں۔ باقر کو تو اس نے مصنوعی موت دے دی تھی لیکن رانا کہاں تھا؟

اب وہ اپنے طور پر رانا کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ رانا کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ پُراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اس کی شان دار کوٹھی میں اس کے ملازمین تھے جنہیں خود اپنے مالک کے غائب ہو جانے سے پریشانی ہو رہی تھی۔

شہناز نے رانا کے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ لیکن انہیں بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ رانا اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے۔ ان لوگوں پر اب تک رانا کا دہرا یا تیسرا روپ کھل نہیں پایا تھا۔

پھر اچانک امید کی ایک کرن اس کے سامنے آگئی۔ وہ رانا کی کوٹھی پر کام کرنے والا جمعدار موہن لال تھا۔ شہناز نے اس سے بھی رانا کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ پھر اس نے شہناز کو جو بات بتائی اس نے شہناز کو چونکا کر رکھ دیا۔

"بی بی جی! رانا صاحب کالی کے مندر کے پاس دکھائی دیے تھے۔" اس نے بتایا۔

"کالی کے مندر کے پاس؟"

"ہاں جی، میں نے تو یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ غریب آدمی ہوں۔ نہ جانے کون کیا سمجھے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ پتا نہیں میں نے جس کو دیکھا، وہ رانا صاحب تھے یا کوئی اور تھا۔"

"تم مجھے پوری بات بتاؤ۔ کہاں دیکھا تھا ان کو؟"

"کالی کے مندر میں۔" اس نے بتایا۔

"اور یہ مندر کہاں ہے؟"

اس نے پھر ایک طویل داستان چھیڑ دی جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ خود بھی کبھی اس مندر کی زیارت کے لیے جایا کرتا تھا۔ وہ مندر حب کے راستے میں ایک ویران مقام پر ہے۔ اب وہ کھنڈر جیسا ہو گیا ہے۔ موہن لال بس دور سے درشن کر کے چلا آتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ جب درشن کے لیے گیا تھا، اس نے رانا صاحب کو اس مندر کے پاس دیکھا تھا۔

اس نے کسی سے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ لوگ اس کی بات کا مذاق اڑاتے۔ بھلا رانا صاحب کا کسی مندر میں کیا کام؟ لیکن شہناز جانتی تھی کہ یہ غلط نہیں ہو سکتا۔ رانا صاحب رام گوپال ہیں اور رام گوپال مندر ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب اس کے سامنے دو راستے تھے... یا تو اپنے شوہر کو یہ اطلاع دے دے یا پھر خود ہی اس مندر کی طرف روانہ ہو جائے۔ اسے یقین تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے رام گوپال اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

لیکن وہ رام گوپال سے مل کر کیا کرے گی؟ کیا کہے گی اس سے؟ یہی کہ وہ اس کے ملک سے چلا جائے۔ اس کی وجہ سے اس کا شوہر بہت پریشان ہے۔ وہ اس ملک کے خلاف سازشیں کر رہا ہے اور خود شہناز یعنی مالتی کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔

تو پھر اسے خود ہی جانا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرے گی۔

☆☆☆

ذیشان ایک بار پھر اپنے آدمیوں کے درمیان تھا لیکن مشعل کے بغیر۔ اب اس کے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے جو پلاننگ کی ہے، وہ ملک کے خلاف کتنی خطرناک ہے۔

اگر پلاننگ کامیاب ہوگئی تو ناکارہ ہتھیاروں کے ڈھیر لگ جائیں گے اور ملک کو اربوں روپے کا نقصان ہو جائے گا لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی چہیتی بیوی مشعل رام گوپال کے قبضے میں ہے۔

وہ رام گوپال کے سحر سے نکل تو آیا تھا لیکن مشعل کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ رام گوپال نے اسے جتا دیا تھا کہ اس کے آدمی خود اس کے محکمے میں بھی موجود ہیں اور وہ اس کی پروگریس کی رپورٹ رام گوپال کو دیتے رہیں گے۔ اس کی ایک مثال خود سیکشن آفیسر تھا جس کا قتل رام گوپال کے آدمیوں نے کر دیا تھا۔

ذیشان ذہنی طور پر بہت الجھا ہوا تھا۔ اس نے خاندان والوں کو مشعل کے بارے میں کچھ بتا کر وقتی طور پر مطمئن تو کر دیا تھا لیکن کب تک؟ وہ کب تک یہ چھپا سکتا تھا؟ اپنے دفتر پہنچ کر اس نے اس ماہر کو طلب کیا جو وفد کے ساتھ جانے والا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ذیشان نے اس ماہر سے بات کی تھی۔

"مسٹر خرم! آپ کو معلوم ہے نا کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یس سر! میں یہ جانتا ہوں۔" ماہر مسکرا کر بولا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ سب کام آپ کی مرضی کے مطابق ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگا۔"

ذیشان کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے۔ نہیں، تم یہ سب نہیں کرو گے۔ تم ناکارہ ہتھیاروں کو ریجیکٹ کردو گے۔ یہ ایک غریب ملک ہے۔ یہ ملک اتنا بڑا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ تم وہی ہتھیار خریدو گے جو کارآمد ہوں جو ہماری فوجی قوت بڑھا سکیں۔

لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکا۔ اس کی مشعل کسی کے قبضے میں تھی۔ دوسرا خوف یہ بھی تھا کہ ممکن تھا کہ یہ ماہر بھی رام گوپال کا آدمی ہو۔ اگر ذیشان نے رام گوپال کی توقع کے برعکس کوئی بات کی تو رام گوپال کو فوراً پتا چل جائے گا۔

اس لیے اس نے اپنے سینے پر بوجھ لیتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں، مسٹر خرم! آپ کو سارا کام بہت ہوشیاری سے اور احتیاط سے کرنا ہے۔"

"فکر نہ کریں سر! میرے ذہن میں پوری پلاننگ ہے۔"

"اوکے، آپ جائیں۔ گڈلک۔"

ماہر کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ ذیشان نے اسے کس لیے بلایا تھا۔ اگر صرف یہی کہنے کے لیے تو یہ سب کچھ تو اسے پہلے سے معلوم تھا۔

ماہر کے جانے کے بعد اس نے اپنے سر میں دھمک سی محسوس کرنی شروع کردی۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بہت غلط تھا۔ اس نے انٹرکام پر کافی کے لیے کہا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ فی الحال کسی سے نہیں ملے گا اور نہ کوئی کال اٹینڈ کرے گا۔

اس کی میز پر ایک اخبار پڑا تھا۔ یہ آج ہی کا اخبار تھا۔ وہی معمول کی خبریں۔ عام انداز کی۔ سیاست کی، ہنگاموں کی، کھیلوں کی اور ان ہی کے درمیان ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ بہت عام انداز کی۔ لیکن اس خبر نے ذیشان کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اس نے اس خبر کو کئی بار پڑھا۔ پھر اس نے ایک اہم فیصلہ کرلیا۔

وہ خبر ایک بچے کی تھی۔ اسے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے تاوان وصول کرنے کے باوجود اس کا خون کردیا تھا۔

معاہدے کے باوجود رانا نے مشعل کو نہیں چھوڑا۔ مار دیا اس کو۔ معاہدے کے باوجود مشعل کو رہا نہیں کیا گیا۔ تاوان کے باوجود بچے کا خون ہو گیا تھا۔ معاہدے کے باوجود مشعل رانا کی قید میں رہی تھی۔

اس خبر نے اس کے ذہن کے دریچے کھول دیے تھے۔ اسے قربانی دینی تھی... یا تو ملک کے مفاد کی یا پھر اپنی محبت کی۔ اس نے محبت کی قربانی دینے کا فیصلہ کرلیا۔

اس نے انٹرکام پر ہدایت دی۔ "فوری طور پر ملٹری انٹیلی جنس سے بات کرواؤ۔"

انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر بریگیڈیئر فرقان اس کے دوستوں میں شامل تھا۔ ذیشان کی آواز سن کر اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ "خیر تو ہے جوان آدمی... کیا آج پھر کوئی پارٹی ہے؟"

"فرقان! تم اپنے دو چار آدمیوں کو لے کر فوری طور پر میرے پاس آجاؤ۔" ذیشان نے کہا۔

"کیوں بھائی خیریت؟"

"تم آؤ گے تو بتادوں گا... لیکن جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرا ارادہ بدل جائے۔"

"اوکے! ہم ابھی آرہے ہیں۔"

ذیشان نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ بہت تھکا تھکا سا اور بوڑھا نظر آرہا تھا جیسے وہاں بیٹھے بیٹھے صدیاں گزر گئی ہوں۔ جیسے وقت نے اسے اندر سے کھوکھلا اور نڈھال کردیا ہو۔

فرقان اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ ان میں میجر شوکت بھی تھا۔ ذیشان نے بہت پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

"فرقان! ہمارے محکمے میں ایک انجینئر ہے خرم! فوری طور پر اسے قبضے میں لے لو اور خاموشی سے اسے کہیں پہنچادو۔"

"قبضے میں لینے سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"اسے گرفتار کرلو۔ اس کے بعد مجھے گرفتار کرلو۔" ذیشان نے کہا۔

"کیوں مذاق کررہے ہو؟"

"سچ کہہ رہا ہوں بھائی۔ ورنہ اس ملک کو بہت بڑا نقصان ہوجائے گا۔"

"آخر بات کیا ہے... مجھے بتاؤ؟"

ذیشان نے اسے پوری کہانی سنادی۔ وہ سب حیرت سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"مائی گاڈ! اب میری سمجھ میں آرہا ہے۔" شوکت اچھل پڑا۔ "میرے بہنوئی دلشاد کے ساتھ بھی یہی ہوا ہوگا۔"

"لیکن تم نے تو اس سلسلے میں کسی ساحر کا نام لیا تھا۔" فرقان نے پوچھا۔

"سب کچھ ممکن ہے سر... جب رام گوپال رانا اور پروفیسر باقر بن سکتا ہے تو ساحر بھی بن سکتا ہے۔"

"اب کیا حالت ہے دلشاد کی؟"

"بہت بری ہے سر۔ اسے اب کچھ بھی یاد نہیں ہے۔" شوکت نے بتایا۔ "لگتا ہے اس کی یادداشت مکمل طور پر غائب ہوگئی ہے۔"

"خطرناک... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں فوری طور پر رانا پر ہاتھ ڈال دینا چاہیے۔" فرقان نے کہا۔ "ذیشان! تم نے بہت اچھا کیا جو ہمیں خبر کردی۔ اب اس معاملے کو ہم سنبھال لیں گے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ میری بیوی اس شخص کے قبضے میں ہے۔"

"تو پھر ہمیں جلدی کرنا چاہیے... بہت جلدی۔"

☆☆☆

ساکو نام تھا اس گڈریے کا جس کی بکریاں گھومتی پھرتی اس مندر کے پیچھے چلی گئی تھیں۔

ساکو اس علاقے کا رہنے والا ایک غریب شخص تھا۔ اس کے پیروں میں چپلیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ چپلوں کی جگہ اس نے خود سے گھاس پھوس کی چپلیں بنالی تھیں۔

وہ ان ہی چپلوں کو پہن کر دن بھر اپنی بکریاں لیے ان علاقوں میں گھومتا رہتا۔ یہی بکریاں اس کا کل اثاثہ تھیں۔ ان کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس نے اپنی برادری میں شادی بھی کر رکھی تھی۔ دو چھوٹے بچے بھی تھے اور وہ سب اس کی طرح غربت زدہ تھے۔ اس نے اپنی زندگی کو قناعت سے گزارنا سیکھ لیا تھا۔

اللہ جو بہتر سمجھتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس کے علاقے کی طرف کبھی کبھی کوئی گاڑی آنکلتی تو وہ حیران ہوکر اس کی طرف دیکھتا رہتا۔

وہ بھی ساکو ہی جیسے لوگ تھے۔ دو ہاتھوں اور دو ٹانگوں والے جن کے پاس گاڑیاں ہوا کرتی تھیں اور ایک وہ تھا کہ جس کی قسمت ان بکریوں کے ساتھ لکھ دی گئی تھی۔

اس کی وہی بکریاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑتی ہوئی اس ویران مندر کے پیچھے آگئی تھیں۔ اس طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ جنگلی جھاڑیاں اور بیلیں تھیں۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ایک بکری دیوار کے ساتھ والے ایک سوراخ میں گھس گئی۔ ساکو کو یہ سوراخ پہلی دفعہ دکھائی دیا تھا۔ حالانکہ وہ روزانہ اس طرف سے گزرتا تھا۔

وہ بکری کو برا بھلا کہتا ہوا اس کی تلاش میں خود بھی اسی سوراخ میں داخل ہوگیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ تو ایک اچھا خاصا راستہ بنا ہوا تھا اور اس راستے کے آخر میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ پتا نہیں یہ کیسی روشنی تھی۔

پھر اس نے اپنی بکری کی آواز سنی۔ وہ شاید اسی روشنی کے پاس تھی۔ ساکو دل ہی دل میں خوف زدہ ہوتا ہوا اس روشنی کی طرف بڑھتا رہا۔ اگر اس کی بکری کا معاملہ نہیں ہوتا تو وہ کبھی اندر آنے کی ہمت نہیں کرتا۔

پھر اس نے خود کو ایک تہ خانے میں پایا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت حیران اور خوف زدہ کرنے والا تھا۔ اس تہ خانے کی ایک دیوار کے پاس ایک ہولناک صورت کا بت تھا اور اس بت کے پاس ایک عورت رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ ساکو کی بکری اس عورت کے پاس کھڑی شور کررہی تھی۔

وہ عورت ساکو کو دیکھ کر بول پڑی۔ "بھائی! مجھے یہاں سے نکالو۔ میری رسیاں کھول دو۔"

"کون ہے تو؟" ساکو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ایک مظلوم عورت ہوں۔ مجھے ڈاکو اٹھا کر لائے ہیں۔" عورت نے بتایا۔ "جلدی کرو بھائی! ورنہ وہ لوگ آجائیں گے۔"

ساکو ایک غریب اور بزدل قسم کا انسان تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں یہ ہمدردی اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ اگر ڈاکوؤں نے اسے پکڑ لیا تو وہ اس کی ساری بکریاں بھی چھین لیں گے اور اسے بھی جان سے ماردیں گے۔ اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ چپ چاپ وہاں سے نکل جائے۔

اس نے اپنی بکری کے کان پکڑے اور اسے کھینچتا ہوا اس طرف لے جانے لگا جس طرف سے آیا تھا پھر اس نے عورت کی آواز سنی۔ "خدا کے لیے بھائی! مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ تم میری یہ چوڑیاں لے لو۔ سب سونے کی ہیں۔ بس مجھے یہاں سے نکال دو۔"

ساکو جاتے جاتے پلٹ آیا۔ سونے کی چوڑیاں نہ جانے کتنی قیمتی ہوں گی۔ اس کے تو حالات ہی بدل جائیں گے۔ وہ بکریاں چرانا چھوڑ کر ایک بڑی سی دکان کھول لے گا پھر عیش سے زندگی گزرے گی۔

☆☆☆

دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ برسوں کے بعد۔ رام گوپال اور مالتی یا رانا اور شہناز۔

شہناز اس ویران مندر تک پہنچ ہی گئی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی پھر پیدل چلتی ہوئی مندر تک آئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ابھی وہ مندر سے کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ اسے پکڑ لیا گیا۔ اسے پکڑنے والے پوری طرح مسلح تھے اور صورت ہی سے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟" ایک نے دریافت کیا۔

"میں رانا سے ملنے آئی ہوں۔" اس نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

اسے پکڑنے والے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ پھر ایک نے کہا۔ "کون رانا! یہاں کوئی رانا نہیں ہوتا۔"

"وقت برباد مت کرو۔ مجھے رانا کے پاس لے چلو۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ۔"

اسے مندر کے اندر پہنچا دیا گیا۔ مندر کے خستہ کمرے کو باقاعدہ آپریشن روم بنا دیا گیا تھا۔ ایک طرف ایک میز کرسی رکھی تھی اور رام گوپال کسی نقشے پر جھکا ہوا نشانات لگا رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ مالتی یا شہناز کو دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گیا۔

"سر! یہ آپ سے ملنا چاہتی تھیں۔" شہناز کو لانے والے نے بتایا۔

"ہاں، تم لوگ جاؤ۔"

شہناز کو وہیں چھوڑ کر وہ لوگ باہر چلے گئے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ برسوں کے بعد۔

"مالتی۔" رام گوپال نے ایک گہری سانس لی۔

"مالتی نہیں... شہناز۔" شہناز نے کہا۔ "مالتی تو برسوں ہوئے دفن ہو چکی ہے۔"

"لیکن میرے لیے تو تم مالتی ہی ہو۔"

"نہیں رام گوپال۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ جسے ہمیں قبول کر لینا چاہیے۔"

"مالتی! جانتی ہو میں نے اتنی پریشانیاں کیوں اٹھائی ہیں؟ اتنے دکھ جھیلے ہیں صرف تمہارے لیے۔"

"یہ کہو کہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے۔"

"تم سے نہیں، تمہارے شوہر سے۔" رام گوپال نے کہا۔ "میں نے سوگند اٹھائی تھی کہ میں اس کے ملک کو کھوکھلا کر دوں گا۔ ہر طرح سے برباد کر دوں گا تاکہ مجھ سے میرا پیار چھین لینے والا اپنے بال نوچتا رہے۔ جانتی ہو، میں نے اس دوران میں کتنی شکتی، کتنی طاقت حاصل کر لی ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ میں نے تمہارے یہاں کے ذہین لوگوں کو اپنے کنٹرول میں کر لیا ہے۔ وہ پوری طرح میرے قابو میں ہیں۔"

"قابو میں تھے رام گوپال لیکن اب وہ آہستہ آہستہ نکلتے بھی جا رہے ہیں۔"

"اوہ... کیا تم یہ جانتی ہو؟"

"ہاں کیونکہ میں راشد عطاء اللہ کی بیوی ہوں۔" شہناز نے کہا۔ "رام گوپال! تم یہاں جو مقصد لے کر آئے ہو، وہ پورا نہیں ہوگا... چلے جاؤ یہاں سے۔"

"میری زندگی کا بس یہی تو مقصد ہے۔" رام گوپال مسکرا کر بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ کچھ غلطیوں کی وجہ سے کچھ لوگ میرے قابو میں نہیں رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری طاقت ختم ہو چکی ہے۔ میں یہاں اس مندر کی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے آپ کو دوبارہ جمع کر رہا ہوں اور اس بار پوری قوت سے حملہ کروں گا۔ تمہارے ملک کی مشینری پر۔ اور جب یہ دیکھوں گا کہ تمہارا شوہر بے بس ہو کر خودکشی کرنے کی سوچ رہا ہے تو اس وقت پھر تمہارے پاس آؤں گا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا رام گوپال۔" شہناز نے کہا۔ "تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"پاگل مت بنو۔ میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔"

اسی وقت کسی نے آ کر اطلاع دی۔ "سر! آپ نے جس عورت کو تہ خانے میں بند کیا تھا، وہ بھاگ گئی ہے۔"

"کیا؟" رام گوپال بوکھلا کر دروازے کی طرف لپکا۔

رام گوپال کا پستول میز پر تھا۔ صرف ایک لمحے میں شہناز نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا تھا اور وہ یہ موقع ہرگز ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

یکے بعد دیگرے کئی گولیاں رام گوپال کے بدن میں پیوست ہو گئیں۔

اسی وقت باہر کئی گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں آئیں اور کچھ گولیاں چلیں۔ پھر خاموشی چھا گئی اس کمرے میں بہت سے لوگ داخل ہوئے۔

ان میں راشد، شوکت، فرقان اور ذیشان شامل تھے۔

رام گوپال کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ شہناز کے ہاتھوں میں پستول تھا اور نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

تاریخ کا انتقام

کاشف زبیر

انتقام ایک بھیانک جذبہ ہے... سر پر سوار ہو جائے تو روح تک میں سما جاتا ہے... ظلم و بربریت کا بازار گرم کرنے والے طاقت اور شیطانی جذبوں کے نشے میں چور ہو کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ جسے نرم و نازک وجود سمجھ کر شکار کر رہے ہیں، اس میں ساری کارفرمائی اس طاقت ور روح کی ہے جو نکل جائے تو دیوہیکل وجود بھی مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ جاتے ہیں... وجود منوں مٹی تلے دب کر ناموجود ہو جاتا ہے لیکن اس وجود سے وابستہ، نادیدہ قوتیں سرگرم رہتی ہیں... جو عموماً کمزور لیکن کبھی کبھی بہت شہ زور اور منہ توڑ ثابت ہوتی ہیں... آپس کی آویزش سے جنم لینے والی کہانی... جس میں وجود بے بس ہوئے تو ایک بے وجود نے میدان سنبھال لیا...

ایک ستم گزیدہ خاندان کی داستان جس کے مکینوں کی تعداد لحہ بہ لحہ کم ہو رہی تھی... سرورق پر دوسری کہانی

"ٹکٹ پلیز۔" کاؤنٹر پر موجود نوجوان عورت نے کہا تو اس نے ٹکٹ آگے بڑھا دیا۔ عورت نے نام پڑھا۔ "رمل خان۔"

"بٹ آئی ایم ناٹ اے ٹیررسٹ۔" بے ساختہ اس کے ذہن میں اس فلم کا نام گونجا جو اس نے چند دن پہلے شکاگو کے ایک سنیما میں دیکھی تھی۔ اس فلم کی خاصی دھوم تھی اور وہ عائشہ کے اصرار پر دیکھنے چلی گئی تھی۔ بچپن سے اب تک عائشہ اس کی واحد دوست اور ہمراز تھی۔

"ٹیک پلیز۔" عورت نے اس کا بورڈنگ پاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ چونکی۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرائی تو عورت بھی جواباً مسکرا دی۔

فلائٹ براہِ راست ہونے کے باوجود بہت طویل تھی۔ اسے تیرہ گھنٹے اسی طیارے میں گزارنے تھے اور اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت تھا۔ اس نے طیارے کے ٹیک آف کے بعد سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے پشت سے سر ٹکایا اور سوچ میں گم ہو گئی۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنے باپ سجاد خان کے بارے میں بس اتنا معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی اور مسلمان ہے۔ وہ رمل کی پیدائش سے چھ سال پہلے امریکا آ گیا تھا اور دوبارہ پاکستان نہیں گیا تھا۔ سجاد نے اسے کبھی اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ پانچ چھ سال کی عمر میں رمل جان گئی تھی کہ اس کے باپ کو دنیا میں جو بات سب سے زیادہ ناپسند ہے، وہ اپنے پس منظر کے بارے میں بات کرنا ہے۔ البتہ کبھی کبھی وہ اپنی بیوی مومنہ سے اس بارے میں ایک دو لفظ کہہ دیتا تھا جس سے رمل کو اندازہ ہوا کہ اس کے باپ کا تعلق پاکستان کے شمال میں بسنے والی ایک جاگیردار خان فیملی سے ہے اور وہ کسی وجہ سے اپنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاندان اور اپنا ملک چھوڑ کر ہزاروں میل دور امریکا آبسا ہے۔

سجاد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے پاکستان میں سول انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی اور امریکا آکر اس سلسلے میں مزید کچھ کورس کیے تھے۔ وہ ایک بڑی تعمیراتی فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔ اس کی تنخواہ بہت اچھی تھی اور اس وجہ سے وہ اپنی فیملی کو ایک پُرآسائش زندگی دے سکا تھا۔ وہ جھیل مشی گن کے ساتھ ایک خوب صورت علاقے میں رہتے تھے۔ یہاں ان کا شاندار گھر تھا۔ ان کے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ رمل نے ایک مقامی اسلامک اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ رمل نے اسی اسلامک اسکول سے ہائی اسکول کی سند حاصل کی اور پھر کالج میں آگئی۔

مومنہ کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا۔ اس کا باپ پناہ گزین بن کر یہاں آیا تھا اور پھر یہیں آباد ہوگیا۔ وہ پاکستانیوں سے نفرت کرتا تھا لیکن اس کی بیٹی نے شادی کے لیے ایک پاکستانی کا انتخاب کیا تو اس نے مومنہ سے ہر تعلق توڑ لیا اور پھر خاموشی سے اپنی بیوی اور دوسرے بچوں کو لے کر شکاگو سے کہیں اور چلا گیا۔ مومنہ ساری زندگی اسی غم میں گھلتی رہی۔ وہ پہلے بھی خاموش طبع تھی۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے رویے نے اسے مزید دکھی کر دیا تھا۔ سجاد کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ بجھ کر رہ گئی تھی۔ جن دنوں رمل ہائی اسکول کے آخری سال میں تھی، اچانک ہی منکشف ہوا کہ مومنہ کو کینسر ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ ایک سال زندہ رہی اور یہ ایک سال بھی اس نے صبر اور خاموشی سے گزارا۔ پہلی تھراپی کے بعد اس نے مزید تھراپی کرانے سے انکار کر دیا اور صرف درد کش دوائیں لیتی رہی۔ سجاد نے تھراپی کے لیے اصرار کیا تو اس نے کہا۔ ”سجاد! میرے لیے کینسر کی تکلیف ہی بہت ہے، میں علاج کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتی۔“

اس کے علاج کی تکلیف سجاد اور رمل کو بھی برداشت کرنی پڑتی تھی کیونکہ پہلی تھراپی کے بعد اس کی جو حالت ہوئی تھی وہ اس سے زیادہ ان دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ خاص طور سے رمل تو روتے روتے بے حال ہو جاتی۔ سجاد مرد تھا اس لیے صبر و برداشت پر مجبور تھا۔ ان کی تکلیف دیکھتے ہوئے مومنہ نے مزید تھراپی کرانے سے انکار کر دیا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ خاموشی سے برداشت کرتی رہی اور اسی خاموشی سے دنیا سے گزر گئی۔

رمل نے امتحان ماں کی بیماری کے دوران میں دیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لیا۔ کالج سے آکر اس کا سارا وقت گھر میں گزرتا تھا، اس نے ماں کی جگہ سنبھال لی تھی۔ مومنہ مکمل ہاؤس وائف تھی۔ وہ تو گھر کا سودا لینے کے سوا کسی اور کام سے باہر بھی نہیں جاتی تھی۔ اب رمل صبح اٹھ کر اپنے اور باپ کے لیے ناشتا بناتی تھی۔ کالج سے واپسی پر وہ گھر کے دوسرے کام نمٹاتی تھی اور اپنے لیے کوئی ہلکی پھلکی چیز بنا لیتی تھی۔ پھر رات کا کھانا وہ دل لگا کر بناتی۔ سجاد کو اچھا کھانے کا شوق تھا اور بہت کم چیزیں اس کے معیار پر پورا اترتی تھیں۔ رمل کو شروع میں کھانا بنانے سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مومنہ اسے کچھ کرنے نہیں دیتی تھی لیکن اس کی بیماری کے دوران میں رمل نے کچن سنبھال لیا تھا۔ اب اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

کھانے کی طرح وہ باپ کے کپڑوں اور دوسری چیزوں کا خیال رکھنے لگی تھی جیسے مومنہ رکھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے گھر پوری طرح سنبھال لیا اور اپنی تعلیم پر بھی پوری توجہ رکھی تھی۔ اس نے سول ڈرافٹنگ کا شعبہ چنا تھا۔ رمل کو شروع میں آرٹ سے دلچسپی تھی مگر سجاد کو فائن آرٹ پسند نہیں تھا۔ باپ کی ناپسندیدگی محسوس کرتے ہوئے رمل نے شعبہ بدل لیا اور سول ڈرافٹنگ اور آرکیٹیکٹ کی طرف آگئی۔

تین سال بعد ڈگری حاصل کرنے کے بعد رمل نے سجاد کی فرم میں اپرنٹس شپ کی اور پھر اس کے کام سے متاثر ہوکر فرم نے اسے مستقل ملازمت کی پیش کش کر دی۔ تنخواہ کم تھی لیکن سجاد نے مشورہ دیا کہ وہ قبول کرلے کیونکہ یہ بڑی کمپنی تھی اور یہاں ترقی کے امکانات روشن تھے۔ رمل نے باپ کا مشورہ مان لیا۔ اسے یہ فائدہ بھی تھا کہ باپ کی پوزیشن کی وجہ سے اسے سپورٹ حاصل تھی اور کوئی اسے تنگ نہیں کرتا تھا۔ دوسرے وہ دونوں ایک ہی گاڑی میں آتے جاتے تھے اور رمل طویل سفر کی بوریت سے بچ جاتی۔ سفر کے دوران میں ہی ان دونوں کی آپس میں کچھ بات ہو جاتی تھی۔ گھر پہنچ کر سجاد تازہ دم ہوکر رمل کے ساتھ ڈنر کرتا، کچھ دیر ٹی وی دیکھتا اور پھر سونے چلا جاتا۔ اسے شروع سے جلدی سونے اور صبح جلدی اٹھنے کی عادت تھی۔

لیکن رمل کئی دن سے دیکھ رہی تھی کہ سجاد چپ رہنے لگا ہے۔ وہ زیادہ تر سوچ میں گم رہتا اگر رمل اس سے پوچھتی تو اسے ٹال دیتا۔ کھانے کے بعد وہ حسبِ معمول ٹی وی تو دیکھتا تھا لیکن اس کے بعد اپنے بیڈ روم میں دیر تک جاگتا رہتا۔ اس کے کمرے کی لائٹ آن رہتی تھی۔ رمل نے محسوس کیا کہ اس کا باپ کسی وجہ سے فکرمند ہے اور اسے نہیں بتا رہا۔ یہ

مسئلہ فرم یا جاب سے متعلق نہیں تھا ورنہ رمل کو ضرور پتا چل جاتا۔ جب مسلسل چار دن وہ باپ کو اسی طرح فکرمند اور سوچوں میں گم دیکھتی رہی تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس سے بات کرے گی۔ رات ڈنر کے بعد جب وہ ٹی وی لاؤنج میں آئے تو رمل نے کہا۔ ”بابا! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

سجاد نے چونک کر اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کس بارے میں بات کرے گی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے اس کی ضرورت...“

”بابا پلیز۔“ رمل نے التجا کی۔ ”میں آپ کو اس طرح فکرمند اور پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ میرا دنیا میں آپ کے سوا کون ہے۔ کیا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”تب آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ ٹھیک ہے آپ مجھ سے بڑے ہیں اور مجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ ممکن ہے میں آپ کو کوئی مشورہ نہ دے سکوں لیکن تسلی تو دے سکتی ہوں۔ بابا! میں ہر مشکل میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

سجاد سوچ میں پڑ گیا۔ رمل اسے پُرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر سجاد نے سر ہلایا لیکن اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے بیڈ روم سے ایک لفافہ لاکر اس کے حوالے کیا۔ رمل نے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے بابا؟“

”دیکھ لو پھر بات کرتے ہیں۔“

لفافے پر پاکستان کا پتا لکھا تھا اور کوریئر سے آیا تھا۔ اندر سے ایک کاغذ نکلا جس پر مختصر سا خط تھا۔ ”سجاد... بی بی جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے... یوں سمجھ لو کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں... تمہیں معلوم ہے اس سال اگست کی گیارہ تاریخ کو بدھ ہے... زرینہ۔“

خط پڑھ کر رمل نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ ”بی بی جان کون ہیں؟“

”میری ماں اور تمہاری دادی۔“ سجاد نے دھیمے لہجے میں کہا لیکن اس کی بات دھماکے کی طرح گونجی۔

”میری دادی۔“ رمل نے بے یقینی سے کہا۔ ”وہ زندہ ہیں؟“

”ہاں، میری ماں زندہ ہیں۔“

”اور آپ اتنے سالوں میں ایک بار بھی ان سے ملنے نہیں گئے؟“

”نہیں۔“

”لیکن کیوں بابا؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ سجاد نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے جانا چاہیے یا نہیں؟“

”آپ کو جانا چاہیے۔“ رمل نے جلدی سے کہا۔ ”بلکہ میں...“

”نہیں، تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ سجاد کا لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ پھر رمل کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے مزید کوئی سوال کرسکے۔ یہ بات اس کے لیے انکشاف انگیز تھی۔

”تب آپ جا رہے ہیں؟“

”ہاں، میں کئی دن سے سوچ رہا تھا۔ تم سے بات کر کے میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔“

رمل جھجک رہی تھی لیکن اس نے ایک سوال کر ہی لیا۔ ”بابا! یہ گیارہ اگست بدھ کے دن والی بات کا کیا مطلب ہے؟“

”یہی دن تو سارے فساد کی جڑ ہے، ہمارے خاندان کی تباہی کا ذمے دار ہے۔“ سجاد نے دکھی لہجے میں کہا پھر وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ رمل سوچتی رہ گئی کہ وہ باپ سے اس بارے میں مزید کچھ معلوم کرے یا نہیں۔ وہ زرینہ کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ کہاں تو سجاد نے سوچنے میں چار دن لگا دیے تھے اور کہاں اس نے صرف دو دن میں پاکستان کے لیے ٹکٹ بک کرالیا اور دو دن بعد اس کی روانگی تھی۔ وہ تیاری میں لگ گیا۔ وہ برسوں بعد وطن جا رہا تھا۔ جب وہاں سے نکلا تھا تو تر و تازہ نوجوان تھا اور اب وہ پچاس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس کی صحت برقرار تھی لیکن جوانی والی بات نہیں رہی تھی۔ دو دن بعد رمل نے جب باپ کو شکاگو ائرپورٹ پر سی آف کیا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ آخری بار اپنے باپ کو دیکھ رہی ہے۔ وہ اگست کی دو تاریخ کو پاکستان کے لیے روانہ ہوا تھا اور اس نے وہاں سے رمل کو تقریباً روزانہ فون کیا۔ آخری فون اس نے دس اگست کے دن کیا اور اس دن وہ بہت عجیب موڈ میں تھا۔ رمل سے بہت طویل بات کرنے کے بعد اس نے آخر میں کہا۔ ”رمل! میری ایک بات مانو گی؟“

”جی بابا... میں ہمیشہ آپ کی بات مانتی ہوں۔“

”اگر مجھے کچھ ہو جائے اور میں واپس نہ آسکوں تو وعدہ کرو کہ تم وہیں رہو گی۔“

”بابا...“ وہ چلا اٹھی لیکن سجاد بولتا رہا۔

”کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرو گی کہ مجھے کیا ہوا؟“

”بابا۔“ وہ رو دی۔ ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رمل! مجھ سے وعدہ کرو۔''
''بابا! آپ فوراً واپس آجائیں۔''
''میں نہیں آسکتا۔ کل گیارہ اگست ہے اور بی بی جان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''
''بابا! یہ کیا معما ہے؟''
''میری جان... میں آکر بتاؤں گا۔'' سجاد نے بہت محبت سے کہا۔ وہ رمل سے اس طرح بہت کم بات کرتا تھا حالانکہ وہ اسے جنون کی حد تک چاہتا تھا۔ ''مجھ سے وعدہ کرو... پلیز۔''
''آپ یوں مت کہیں۔'' رمل بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں لیکن بابا آپ بھی وعدہ کریں کہ واپس ضرور آئیں گے۔''
''ہاں اگر زندہ رہا تو۔'' اس نے جواب دیا اور اس کے بعد اس نے فون بند کر دیا یا لائن کٹ گئی۔ رمل نے کال ملانی چاہی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ سجاد کا خاندان جہاں آباد تھا، وہ پہاڑی علاقہ تھا اور وہاں موبائل سگنل نہیں تھے۔ لینڈ لائن تھی اور سجاد اسی سے کال کرتا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ کبھی کبھی لائن خراب بھی ہو جاتی ہے۔ وہاں تین فون تھے۔ رمل نے دوسرے نمبر پر کال ملائی، اس پر بیل جاتی رہی مگر کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ اسی طرح تیسرے نمبر پر بھی بیل جا رہی تھی۔ رمل بہت دیر تک کوشش کرتی رہی اور پھر تھک ہار کر اس نے کوشش ترک کر دی۔ اس رات اسے بہت مشکل سے نیند آئی۔ اگلی صبح وہ دفتر جانے کے لیے بے دلی سے تیار ہوئی.... یہ سارا دن عجیب سا گزرا تھا۔ اسے رہ رہ کر باپ کا خیال آرہا تھا اور وہ بار بار اس کی جاگیر کا نمبر ملا رہی تھی مگر تینوں نمبرز میں سے کسی پر بھی کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ وہ رات تک کوشش کرتی رہی اور اس رات بھی اسے مشکل سے اور بے چین نیند آئی۔ صبح کے قریب اس نے سجاد کو خواب میں دیکھا۔ یہ بہت عجیب سا خواب تھا۔
اس نے دیکھا کہ سجاد شطرنج کی ایک بساط کے کنارے کھڑا ہے۔ رمل نے محسوس کیا کہ اسے لازمی دوسرے سرے تک جانا ہے لیکن بساط پر مہروں کی عجیب و غریب اور بھیانک شکلوں والے ہیولے کھڑے تھے۔ سجاد ڈر رہا تھا لیکن اسے دوسری طرف بھی جانا تھا۔ پھر اس نے ہمت کر کے بساط پر قدم رکھا۔ وہ ایک ایک کر کے خانے پار کرتا رہا اور دوسری طرف کے قریب ہوتا گیا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے قدم غلط رکھ دیا۔ یک دم ہی تمام ہیولے جو اب تک ساکت کھڑے تھے، حرکت میں آگئے اور انہوں نے سجاد کو گھیر لیا۔ رمل نے بھاگ کر باپ تک جانا چاہا لیکن اسے سجاد کی چیخ سنائی۔ اس نے رمل سے کہا تھا۔ ''رمل! بھاگ جاؤ یہاں سے... یہاں ہرگز مت آنا۔''
اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت دیر تک اس عجیب خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ شاید جس طرح سجاد نے اسے پاکستان آنے سے منع کیا، یہ خواب اسی کا ردعمل تھا۔ صبح قریب تھی۔ اسے پھر نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور ہاتھ لے کر دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ ناشتے میں ایک کپ چائے لے کر وہ دفتر کے لیے روانہ ہونے والی تھی کہ سیل فون کی بیل بجی۔ کال پاکستان سے اور جاگیر کے نمبر سے آرہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسیو کی۔ ''بابا...''
''میں زرینہ بات کر رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے ایک سرد ترین نسوانی آواز نے کہا۔ ''مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہے کہ گزشتہ رات سجاد کا انتقال ہو گیا ہے۔''
''کیا؟'' رمل چیخ اٹھی۔
''وہ باتھ ٹب میں نہا رہا تھا کہ پانی میں ڈوب گیا۔'' زرینہ اس کی چیخ کا اثر لیے بغیر بولتی رہی۔ رمل رونے لگی۔ زرینہ کچھ دیر سنتی رہی پھر اس نے پہلے کی طرح سرد لہجے میں کہا۔ ''لڑکی... غور سے سنو۔ یہ سب اچانک ہوا اور آج ہم نے کچھ دیر پہلے اس کی تدفین کر دی ہے۔''
رمل نے خود کو سنبھال لیا تھا، اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ یہ کیسے کر سکتے ہیں مجھ سے پوچھے بغیر...''
''کیونکہ خود سجاد نے وصیت کی تھی۔'' زرینہ نے کہا۔ ''اس نے تمہیں یہاں آنے سے منع کر دیا تھا اور اس کی تحریری وصیت بھی کی ہے۔ میں نے اس کی وصیت ایکسپریس کوریئر سے بھجوا دی ہے، کل تک تمہیں مل جائے گی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اسے ضرور پڑھ لینا اور اگر کوئی بات پوچھنی ہو تو اس نمبر پر کال کر لینا لیکن حویلی کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں کوئی تمہاری کال ریسیو نہیں کرے گا۔''
زرینہ نے ایک لینڈ لائن نمبر بتایا اور کال منقطع کر دی۔ رمل نے غیر ارادی طور پر نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ ورنہ وہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ اسے شدید شاک لگا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ اتفاق سے عائشہ اسے کال کر رہی تھی اور جب اس نے کال ریسیو نہیں کی تو وہ خود اس کے گھر چلی آئی۔ عائشہ اور اس کی فیملی بھی اسی علاقے میں رہتی تھی۔ اسے بے ہوش پا کر عائشہ نے

ایمرجنسی کو کال کی اور دس منٹ میں ایمبولینس مع ڈاکٹر کے آگئی۔ اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں اس کا مکمل معائنہ ہوا۔ اسے ہلکا ذہنی صدمہ پہنچا تھا لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ چند گھنٹے بعد اسے ہوش آگیا تھا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر عائشہ نے سکون کا سانس لیا۔
''رمل! کیا ہوا تھا؟''
عائشہ کو سامنے پا کر وہ پھوٹ کر رو دی۔ سجاد کے بارے میں سن کر عائشہ کو بھی یقین نہیں آیا۔ اس نے رونے سے گریز کیا اور فوری طور پر اپنے والد اور سجاد کے سب سے قریبی دوست نذیر حسین کو کال کی۔ نذیر حسین فوراً اسپتال پہنچ گیا۔ اسے بھی یقین نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے پاکستان سے کال کر کے رمل کو پریشان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن رمل نے اسے بتایا کہ کال حویلی سے آئی تھی اور اسی زرینہ نے کال کی تھی جس نے سجاد کو خط بھیجا تھا۔ اس نے رمل کو جو نمبر بتایا تھا، وہ رمل کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس نے نذیر حسین کو وہ نمبر بتایا تو اس نے اس پر کال کی۔ کال کسی دلاور خان نے ریسیو کی۔ اس نے کھردرے لہجے میں بات کی لیکن جب نذیر حسین نے سجاد کا حوالہ دیا تو وہ نرم پڑ گیا۔
''مجھے افسوس ہے۔ آپ کا سجاد سے کیا تعلق ہے؟''
''ہم دونوں ایک ہی سال امریکا آئے اور اس کے بعد سے ہمارے درمیان گہری دوستی اور فیملی ٹرمز رہے ہیں۔'' نذیر حسین نے کہا۔ ''مجھے اب تک یقین نہیں آرہا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ...''
''جس طرح آپ امریکا میں سجاد کے دوست ہیں، اسی طرح میں یہاں سجاد کا بچپن کا دوست ہوں۔ ہم نے بیس سال تقریباً ساتھ گزارے۔ اس کے بعد وہ امریکا چلا گیا۔ میں بھی اسی علاقے میں رہتا ہوں۔''
''رمل نے مجھے جو بتایا یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہے۔ آخر ایسی کسی بھی صورتِ حال میں سجاد کی واحد وارث رمل کو پہلے کیوں مطلع نہیں کیا گیا اور تدفین کے مراحل اس کی مرضی سے کیوں طے نہیں کیے گئے؟''
''سجاد کے خاندان کی طرف سے یہ ذمے داری میرے سپرد کی گئی ہے کہ میں رمل یا امریکا سے کسی بھی رابطے کی صورت میں وضاحت کروں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ سب سجاد کی پہلے سے تیار وصیت کے مطابق ہو رہا ہے۔''
''کیا آپ نے وہ وصیت دیکھی ہے؟''
''بالکل بلکہ اس کی ایک کاپی رمل کو روانہ کی جا چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سجاد کا ایک خط بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے آپ لوگوں کی تسلی ہو جائے گی۔''
''ٹھیک ہے، اگر کوئی بات وضاحت طلب ہو تو ہم دوبارہ آپ سے رابطہ کریں گے۔''
''میں ہر وقت دستیاب ہوں۔'' دلاور خان نے خلوص سے کہا۔
نذیر حسین کے لیے بھی سجاد کی موت سانحہ تھی لیکن اس وقت مسئلہ رمل کو سنبھالنے کا تھا۔ نذیر حسین نے اسے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ عائشہ اس کے بہت قریب تھی اور اس مشکل وقت میں وہ اسے سنبھال سکتی تھی۔ سجاد اور اس کی فیملی کی یہاں زیادہ لوگوں سے جان پہچان نہیں تھی۔ لیکن نذیر حسین جن سے بھی واقف تھا انہیں کال کر کے اطلاع دی اور وہ سب باری باری رمل کو کال کر کے یا نذیر حسین کے گھر آکر اس سے مل کر تعزیت کرنے لگے۔ فرم کے اعلیٰ عہدے دار بھی رمل سے آکر ملے اور انہوں نے اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ انہیں حیرت تھی کہ ایک امریکی شہری کی موت کی تحقیقات کیے بغیر اسے کس طرح اس کے آبائی ملک میں دفن کر دیا گیا۔ رمل نے بتایا کہ ایسا سجاد کی وصیت کے مطابق کیا گیا ہے اور موت حادثاتی تھی۔ رات تک لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا پھر نذیر حسین اور اس کی بیوی نے اسے زبردستی سونے کے لیے عائشہ کے کمرے میں بھیج دیا۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ دیر تک عائشہ سے باپ کی باتیں کرتی رہی۔ آج اسے اپنی ماں بھی یاد آرہی تھی۔ بالآخر عائشہ نے اسے نیند کی دوا دی تو وہ سوئی۔
اگلی صبح وہ گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ نذیر حسین اور عائشہ تیار نہیں تھے کہ وہ ابھی گھر جائے۔ بڑی مشکل سے اس صورت میں راضی ہوئے کہ عائشہ بھی اس کے ساتھ جائے گی۔ نذیر حسین نے انہیں گھر چھوڑا۔ رمل گھر کو مس کر رہی تھی، دوسرے اسے پاکستان سے آنے والے پارسل کا.... بے تابی سے انتظار تھا۔ وہ اپنے باپ کی وصیت دیکھنا چاہتی تھی۔ گھر آتے ہی اسے باپ کی یاد آئی تو وہ رونے لگی۔ نذیر حسین نے اچھا کیا جو عائشہ کو اس کے ساتھ بھیج دیا ورنہ وہ پھر بکھر جاتی۔ عائشہ بڑی حکمتِ عملی سے اسے سنبھالتی رہی۔ شام کے وقت کوریئر پارسل دے گیا۔ یہ خاصا بڑا پارسل تھا۔ گتے کے مضبوط پیک میں سجاد کی تمام چیزیں تھیں جو وہ پاکستان ساتھ لے گیا تھا۔ اس کا پاسپورٹ، سوشل سیکیورٹی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور دوسری دستاویزات کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو لفافے بھی تھے۔ ایک میں اس کے ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت تھی اور یہ وصیت اس نے اپنی موت سے صرف دو دن پہلے لکھی تھی۔ وصیت مختصر اور جامع تھی۔

''میں سجاد خان ولد اکبر خان، وصیت کرتا ہوں کہ پاکستان میں قیام کے دوران میں انتقال کی صورت میں مجھے میرے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔ میری بیٹی اور وارث رِمل خان کو اس کی اطلاع دی جائے لیکن اسے پاکستان آنے اور میری تدفین میں شرکت کی اجازت نہیں ہو گی۔ نہ ہی وہ بعد میں یہاں آئے۔

سجاد خان ولد اکبر خان۔''

رِمل نے کئی باران الفاظ کو پڑھا۔ وہ اپنے باپ کی ہینڈ رائٹنگ پہچانتی تھی۔ اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ اس کے باپ کی تحریر نہیں ہے لیکن اس نے یہ وصیت کیوں کی؟ رِمل نے کئی بار یہ سوال خود سے کیا، اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ سارا معاملہ بہت پُراسرار لگ رہا تھا۔ اس نے عائشہ سے کہا تو اس نے رِمل کی بات مسترد کر دی۔ ''اس میں کوئی... پُراسراریت نہیں ہے۔ انکل اتنے عرصے بعد اپنے وطن گئے اور اپنے گھر والوں سے ملے اس لیے وہ جذباتی ہو گئے اور انہوں نے یہ وصیت کر دی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وصیت پر عمل کیا گیا۔''

''لیکن بابا نے مجھے وہاں آنے سے کیوں منع کیا؟''

''آج کل پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ خاص طور سے شمالی علاقے میں تقریباً جنگ چل رہی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے تمہیں وہاں آنے سے منع کیا ہو گا۔''

عائشہ کی وضاحت قابلِ قبول تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل کو نہیں لگی۔ رِمل نے اس سلسلے میں مزید بحث نہیں کی۔ اس نے دوسرا لفافہ نہیں کھولا تھا جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ اس کے بجائے اس نے کال کر کے ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے کال کر کے یا مل کر اس سے سجاد کی تعزیت کی تھی۔ اس نے دفتر کال کر کے اطلاع دی کہ اب وہ پیر کے دن دفتر آئے گی۔ اس کے باس جان جیمسن نے اسے ہفتے کی چھٹی کی پیشکش کی لیکن اس نے مسترد کر دی۔ ''نہیں جان! دو دن کی چھٹی بھی میں نے بعض کام نمٹانے کے لیے لی ہے ورنہ گھر کے مقابلے میں دفتر میں زیادہ اچھا فیل کروں گی۔''

''ہم پیر کے دن تمہارا انتظار کریں گے۔'' جان نے خلوص سے کہا۔ ''میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو صرف ایک کال کر دینا اور سجاد کے لیے ایک بار پھر میری تعزیت قبول کرو۔ وہ سچ مچ بہت نفیس آدمی تھا۔''

باپ کے ذکر پر رِمل کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''شکریہ جان۔''

عائشہ سارا دن اس کے ساتھ رہی۔ وہ کالج میں پڑھنے کے ساتھ شام کے وقت ایک آئی ٹی فرم میں جز وقتی کام بھی کرتی تھی۔ اس نے سافٹ ویئر انجینئرنگ کا شعبہ منتخب کیا تھا۔ رِمل کو احساس تھا کہ اس کے دو دن نکل گئے تھے اس لیے اس نے اصرار کر کے عائشہ کو اس کے گھر چھوڑ دیا۔ اس نے عائشہ کو یقین دلایا۔ ''اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور خود کو سنبھال لوں گی۔''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''تب تم جمعے کی شام کو آ جانا۔'' رِمل نے تجویز پیش کی۔ ''لیکن ابھی تمہارا دو دن کا نقصان ہو چکا ہے۔''

عائشہ کو گھر چھوڑ کر وہ واپس آئی تو کچھ دیر کے لیے اسے اکیلا گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ ماں کے بعد باپ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ اکیلی تھی۔ اس شام اس نے صحیح سے باپ کا غم آنسوؤں سے منایا۔ جب اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے اپنے لیے چائے بنائی۔ اسے کافی پسند نہیں تھی اس لیے چائے پیتی تھی جبکہ سجاد کو صرف کافی پسند تھی۔ امریکا آنے کے بعد اس نے ایک بار بھی چائے نہیں پی تھی۔ وہ باپ کے بیڈ روم میں آئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ یہاں اسے باپ کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل بھر آیا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور وہ لفافہ کھولا جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ اندر سے ایک صفحہ نکلا جس پر سجاد کی تحریر میں اس کے لیے خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''رِمل میری جان... میری بیٹی! تم یہ خط پڑھ رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔ تم حیران ہو گی کہ میں نے تمہیں اپنی موت کی صورت میں پاکستان آنے سے کیوں منع کیا ہے۔ میری بچی، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارے خاندان کی بدقسمتی تھی۔ آج سے تینتیس سال پہلے پے در پے سانحات کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ کوئی بلا ہے، یا بدقسمتی ہے یا پھر ہمارے اعمالوں کی سزا ہے جو ایک ایک کر کے اس خاندان کے لوگوں کو نگل گئی۔ اس بدقسمتی سے بچنے کے لیے میں ستائیس سال پہلے وطن چھوڑ کر امریکا آ گیا۔ مگر ایسا لگ رہا ہے بالآخر اس نے مجھے کھینچ کر یہاں بلا لیا ہے۔ اگر میں کل کے بعد بھی زندہ رہا تو تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا اور ایسا نہ ہو سکا تو تم اپنے باپ کو معاف کر دینا اور اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔ آخری بات... تم جاننے کی کوشش نہیں کرو گی اور نہ ہی پاکستان آؤ گی۔ میں چاہتا ہوں تم محفوظ رہو۔ تمہیں ذرا بھی تکلیف ہوئی تو مرنے کے بعد میں سکون سے نہیں رہوں گا۔

تم سے محبت کرنے والا... تمہارا باپ۔''

رِمل ساکت بیٹھی رہی۔ یہ کیا معما تھا؟ اس کے باپ نے اسے پوری بات کیوں نہیں بتائی؟ اس نے تشنگی کیوں چھوڑ دی؟ وہ بہت دیر سوچتی رہی لیکن ان سوالوں کا کوئی جواب اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ اس نے خط اور باپ کی چیزیں سنبھال کر رکھ دیں۔ قانونی کارروائیوں سے گزرنے میں چند مہینے لگے۔ اس کے بعد امریکا میں سجاد خان کے تمام اثاثے اور بینک اکاؤنٹ رِمل کو مل گیا۔ مکان اس کا اپنا تھا۔ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک اس کے استعمال میں رہتی تھی اور دوسری سجاد کی تھی۔ باپ والی گاڑی اس نے نشانی کے طور پر رکھ لی تھی۔

وقت گزرتا رہا، رِمل نے اپنے شعبے سے متعلق مزید کورسز کیے اور اسے ترقی ملتی گئی۔ اب وہ جان کے بعد دوسرے نمبر پر تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی کمپنی اور کولیگ بہت اچھے تھے۔ عائشہ کی شادی ہو گئی تھی۔ اس کا کزن پاکستان سے تعلق رکھتا تھا اور عائشہ سے شادی کے بعد وہ بھی امریکا آ گیا تھا۔ عائشہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ رِمل سے اس کا تعلق برقرار تھا مگر دونوں طرف مصروفیات کی وجہ سے میل ملاقات کم ہو گئی تھی۔ عائشہ اب اس پر زور دینے لگی تھی کہ اسے شادی کا فیصلہ کر لینا چاہیے مگر اوّل تو رِمل کا دل شادی کی طرف مائل نہیں تھا، دوسرے اس کی نظر میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو اسے پرپوز کرتا اور وہ اس سے شادی کے لیے تیار ہو جاتی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ کسی مسلمان سے ہی شادی کرتی...

☆☆☆

عائشہ اپنے دو ہنگامہ خیز بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو انہیں گھر چھوڑ کر آتی لیکن رِمل کی طرف سے وارننگ تھی کہ اس نے بچوں کے بغیر آنے کی کوشش کی تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ آج رِمل نے عائشہ کو ڈنر پر بلایا تھا۔ اس کا شوہر اسد اپنی فرم کی طرف سے اٹلانٹا گیا ہوا تھا۔ وہ دونوں کچن میں تھیں اور دونوں بچے لاؤنج میں ہنگامہ آرائی میں مصروف تھے۔ انہوں نے پورے لاؤنج کا حشر نشر کر دیا تھا۔ جب ہنگامہ آرائی زیادہ ہی بڑھی تو عائشہ اقوامِ متحدہ کا کردار ادا کرنے گئی اور دونوں کی مناسب گوشمالی کے بعد بھناتے ہوئے واپس آئی۔ ''اس لیے تم انہیں بلاتی ہو کہ ایک لمحہ سکون کا نہ ملے مجھے؟''

رِمل ہنسی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ یہ جو وقت اس گھر میں گزار کر جاتے ہیں، وہ آنے والے کئی دنوں تک میری تنہائی کے احساس کو ختم کر دیتا ہے۔''

''اسی لیے کہتی ہوں کہ شادی کر لو۔''

''کس سے؟'' رِمل نے سوال کیا۔ ''کسی راہ چلتے کو پکڑ کے کر لوں؟''

''نہیں لیکن تم نیت تو کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری نیت ہی نہیں ہے۔ تم کسی سے ملتی نہیں ہو لیکن مسلم کمیونٹی میں پاپا کے واقف کار ہیں۔ تمہاری شخصیت اتنی پُرکشش ہے، جاب ہے اور اپنا گھر ہے۔ تمہیں رشتہ ملنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔''

''میں کسی ایسے فرد سے شادی نہیں کر سکتی جو میرا گھر یا جاب دیکھ کر شادی پر آمادہ ہو۔'' رِمل نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ''پاپا طے کرتے تو الگ بات تھی لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔''

عائشہ نے گہری سانس لی۔ ''بی بی! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اب تو خالص محبت کی شادی یہ گورے بھی نہیں کرتے۔ دیکھ بھال کر شادی کرتے ہیں ورنہ اس کے بغیر ہی گزارہ کرتے ہیں۔''

''تب میں شادی کے بغیر ہی بھلی۔'' رِمل نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

عائشہ سمجھ گئی کہ وہ مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتی اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ باتوں کے دوران میں عائشہ کی نظر کچن میں لگے کیلنڈر پر گئی۔ جولائی کا آغاز تھا۔ صفحے پر اگست کا مہینا بھی موجود تھا۔ اس نے رِمل سے پوچھا۔ ''اس بار انکل کی برسی پر تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

رِمل نے بے ساختہ کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ سجاد کا انتقال 2004ء میں ہوا تھا اور یہ 2010ء تھا۔ یعنی سجاد کی چھٹی برسی ہوتی۔ ''وہی جو ہر سال کرتی ہوں۔'' رِمل نے بے خیالی میں جواب دیا۔ اسے کیلنڈر میں کوئی بات عجیب سی لگی تھی لیکن اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ ہر گیارہ اگست والے دن عائشہ اور چند دوسرے افراد کو گھر بلا کر قرآن خوانی کرتی اور ماں باپ کے لیے دعا کرتی تھی۔ کھانا تیار تھا اس لیے وہ سب باتیں بھول کر اس میں لگ گئے۔ بڑی مشکل سے عائشہ کے دونوں شراراتی بچوں نے کھانا کھایا اور اس سے زیادہ ان دونوں کا سر کھایا لیکن رِمل ان سے بہت خوش ہوتی تھی اور وہ رِمل آنٹی سے خوش تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیونکہ وہ کبھی ان کی کسی بات یا شرارت کا بُرا نہیں مناتی تھی۔

ڈنر کے بعد وہ رخصت ہوئے تو رِمل نے سب سے پہلے گھر سمیٹا جو بُری طرح بکھرا ہوا تھا۔ پھر وہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ برتن دھوتے ہوئے اس کی نظر پھر کیلنڈر کی طرف گئی اور اسے وہی عجیب سا سمجھ میں نہ آنے والا احساس ہوا۔ کام نمٹا کر وہ کچن کی لائٹ بند کرنے لگی۔ کیلنڈر سوئچ بورڈ کے پاس ہی تھا۔ تب اس نے دیکھا گیارہ اگست کی تاریخ بدھ کے دن کی تھی۔

سجاد کے بعد رِمل اس کی وصیت کے مطابق اس معاملے کو نظر انداز کر رہی تھی۔ شروع میں اسے بہت مشکل پیش آئی اور کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ کسی طرح سے اس معمے کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔ رفتہ رفتہ وہ بھولنے لگی۔ اب یہ اس کے لیے ماضی کا قصہ ہو گیا تھا۔ لیکن آج چھ سال بعد اس کیلنڈر نے اسے چونکا دیا تھا۔ چھ سال پہلے جب سجاد کا انتقال ہوا تو وہ بھی گیارہ اگست اور بدھ کا دن تھا۔ پاکستان سے بلاوے کے لیے آنے والے خط میں بھی اس تاریخ کا حوالہ تھا اور سجاد نے بھی اشارتاً بتایا تھا کہ یہ تاریخ اور بدھ کا دن ان کے خاندان کے لیے سانحات لاتا رہا ہے۔ وہ سونے کے لیے لیٹی تو تھکن کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر وہی چھ سال پرانے سوال گردش کرنے لگے جنہیں وہ اپنی دانست میں بھول گئی تھی لیکن صرف ایک تاریخ نے اسے سب یاد دلا دیا تھا، وہ بھولی کچھ نہیں تھی۔ وہ سوچتی رہی کہ کیا اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کے باپ پر کیا گزری؟ وہ پہلے سے اپنی موت کی بات کیوں کر رہا تھا اور اسی تاریخ کو دنیا سے گزر گیا تھا۔

☆☆☆

طیارے نے رن وے چھوا تو اس نے پہلی بار اس سرزمین کو آنکھوں سے دیکھا جہاں سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ یہ اس کے باپ کا ملک تھا مگر اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ وہ امریکا میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔ بے شک اس نے مسلم اقدار کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اسی کے مطابق زندگی گزار رہی تھی لیکن وہ امریکا کو ہی اپنا وطن سمجھتی تھی۔ پاکستان اس کے آباؤ اجداد کا ملک ضرور تھا لیکن اس کا ملک نہیں تھا۔ وہ یہاں امریکی شہری کی حیثیت سے آئی تھی۔ وہ سب کی مخالفتوں کے باوجود یہاں آئی تھی۔ سب سے پہلے عائشہ نے مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا کہ اتنے عرصے کے بعد وہ کچھ جان بھی لے تو اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ ممکن ہے اس کے دکھ میں اضافہ ہو جائے۔

پھر اس نے برسوں بعد پہلے دلاور خان سے رابطہ کیا اور اس نے رِمل کی بات سنتے ہی اس کی مخالفت کی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ تم گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش مت کرو۔“

”انکل! میں جاننا چاہتی ہوں کہ بابا کن حالات میں موت کا شکار ہوئے؟“

”تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ دلاور خان کے لہجے میں سختی تھی۔ ”تم سجاد کی اکلوتی اولاد ہو اور اس نے تمہاری بہتری کی خاطر تمہیں منع کیا تھا۔“

”میں بابا کا احترام کرتی ہوں لیکن حقیقت جاننا میرا حق ہے۔ میں نے اس لیے کال کی ہے کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں یا نہیں؟“

دلاور خان نے اس کے لہجے سے اندازہ کر لیا کہ وہ اس کی یا کسی کی بات نہیں مانے گی۔ ”ٹھیک ہے تمہاری مرضی... اگرچہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گردوں کا مسئلہ ہے اور شاید مجھے ٹرانسپلانٹ کرانا پڑے لیکن میں سجاد کی خاطر تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ البتہ میرا مشورہ ہے کہ یہاں آنے سے پہلے ایک بار حویلی کال کر لو۔“

رِمل نے اس مشورے پر عمل کیا۔ وہاں کال زرینہ نے ریسیو کی۔ رِمل نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مخصوص سرد لہجے میں بولی۔ ”میں پہچان گئی ہوں۔ کہو کیوں فون کیا ہے؟“

”میں پاکستان آنا چاہتی ہوں اور آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”کیوں؟“

”میں بابا کی موت کے حالات جاننا چاہتی ہوں۔ اس کے پسِ پردہ حقیقت...“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ زرینہ بولی۔ ”اب یہاں کال مت کرنا۔“

”ایک منٹ۔“ رِمل نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں میرے بابا اس جاگیر کے وارثوں میں سے ایک ہیں اور میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ اس حیثیت سے مجھے کوئی بھی وہاں آنے سے نہیں روک سکتا۔“

رِمل کی بات نے زرینہ کو خاموش کرا دیا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم چاہتی کیا ہو؟“

”میں حویلی آنا چاہتی ہوں۔“

”اگر میں انکار کر دوں تو؟“

”میں آپ کو صرف نام سے جانتی ہوں، آج تک آپ کا تعارف نہیں ہوا ہے۔“

”میں سجاد کے چچا امیر خان کی بیٹی ہوں۔“

”اس لحاظ سے آپ میری پھوپی ہوئیں۔ کیا آپ وضاحت کریں گی کہ آپ مجھے وہاں آنے سے کیوں روک رہی ہیں؟“

”تمہارے باپ...“

”ان کا چھ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا اور میں اب تک ان کی قبر نہیں دیکھ سکی اور نہ ہی جان سکی ہوں کہ ان کا انتقال کن حالات میں ہوا۔“

”اس کے باوجود میں تمہیں یہاں آنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔“

”اس صورت میں مجھے امریکی سفارت خانے کی مدد سے مقامی انتظامیہ سے رابطہ کرنا ہو گا اور میں اس کیس کو ری اوپن کراؤں گی۔ اپنی وراثت کے لیے عدالت میں جاؤں گی۔“ رِمل نے دوسری صورت سامنے رکھ دی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بعد اسے انکار نہیں ہو گا اور ایسا ہی ہوا۔ مجبوراً اسے حویلی آنے کی اجازت دے دی گئی۔ اگرچہ زرینہ نے اسے خبردار کیا تھا کہ یہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے اس کے لیے لیکن رِمل نے اس وارننگ پر کوئی توجہ نہیں دی...... وہ ہر صورت جانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اب وہ پاکستان میں تھی۔ ائرپورٹ پر ارائیول لاؤنج میں ایک شخص تختے پر اس کا نام انگریزی میں لکھے ہوئے کھڑا تھا، اس نے شوفر کی وردی پہن رکھی تھی۔ رِمل اس کے پاس پہنچی اور اردو میں بولی۔

”میں رِمل سجاد ہوں۔“

”مجھے زرینہ بی بی نے بھیجا ہے۔“ ڈرائیور نے شائستگی سے کہا۔ ”آپ کا سامان کہاں ہے؟“

رِمل مختصر سامان کے ساتھ آئی تھی۔ ایک شولڈر بیگ تھا جس میں اس کا لیپ ٹاپ بھی تھا اور ایک درمیانے سائز کے ہینڈ کیری میں اس کا سارا سامان موجود تھا۔ وہ چند جوڑے لے کر آئی تھی۔ ڈرائیور فضل اللہ اتنا سا سامان دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ خاصے پرانے ماڈل کی کیڈی لاک کار میں آیا تھا۔ پرانی ہونے کے باوجود وہ بہترین حالت میں تھی۔ وہ ائرپورٹ سے نکلے تو رِمل نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”حویلی تک کتنی دیر کا سفر ہے؟“

”ہمیں ایبٹ آباد سے ذرا پہلے جانا ہے۔“ فضل اللہ نے بتایا۔ ”تقریباً چار گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“

رِمل اپنے سیل نمبر کی رومنگ کرا کے آئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے عائشہ کو کال کر کے اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔

”میں حویلی کی طرف جا رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ دیر میں سگنل ختم ہو جائیں گے اس لیے اب تم سے حویلی سے بات کروں گی۔“

فضل اللہ خاموشی اور توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ فضل اللہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہاں گاڑی کی رفتار تیز رکھنی ہے اور کہاں محتاط ہو جانا ہے۔ تقریباً ساڑھے چار گھنٹے بعد وہ چھوٹی سی وادی میں داخل ہوئے جس کے آغاز میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور آخری بلند حصے میں ایک شاندار حویلی تھی۔ اس کے بعد بلند ہوتے پہاڑ پر گھنا جنگل تھا۔ فضل اللہ نے بتایا۔

”یہاں ساری زمین آپ کے خاندان کی ملکیت ہے۔“

”تو یہ لوگ؟“ رِمل نے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ زمینوں پر کام کرتے ہیں۔“

یہاں پکی سڑک تھی جو گاؤں سے ہوتی ہوئی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ وادی کافی بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور رِمل نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا خاندان اتنا بڑا لینڈ لارڈ ہو گا۔ گاؤں کم سے کم سو گھروں پر مشتمل تھا یعنی وہاں کئی سو افراد رہتے تھے جو یہاں زمین پر کام کرتے تھے۔ زرعی رقبہ بہت وسیع تھا۔ ڈھلانوں پر پھل دار درختوں کے باغات تھے اور نیچے وادی میں ہموار تختوں پر فصلیں کاشت کی جاتی تھیں۔ زمین کو بہت مہارت اور صفائی سے استعمال کیا گیا تھا۔ باغات میں شہد کی مکھی کے بکس رکھے نظر آئے اور کناروں پر شہتوت کے بے شمار درخت لگے تھے جن سے ملازمین پتے توڑ رہے تھے۔ فضل اللہ نے بتایا۔ ”یہاں ریشم کے کیڑے بھی پالے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مویشیوں، مرغیوں اور مچھلی کے فارمز بھی ہیں۔“

رِمل حیران رہ گئی، یہ سب بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا اور جدید طریقوں سے کیا جا رہا تھا۔ اس نے فضل اللہ سے پوچھا۔ ”ان سب کاموں کو کون دیکھتا ہے؟“

”سجاد صاحب کے بڑے بھائی عماد خان جی کے بیٹے صمد خان ہیں۔ وہی سارے کاموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اب وارثوں میں آپ کے علاوہ وہی رہ گئے ہیں۔“

رِمل کے لیے یہ ایک اور حیرت ناک بات تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ سجاد خان کے کئی بھائی تھے۔ ”بابا کے کتنے بھائی ہیں؟“

”ان سمیت پانچ بھائی تھے۔“ فضل اللہ نے بتایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اب کوئی زندہ نہیں ہے۔ سب سے بڑے زاہد خان تھے۔ ان کے بعد ریاض خان، پھر عماد خان، ان کے بعد شہباز خان اور سب سے چھوٹے سجاد خان تھے۔''

''پانچ بھائیوں کی صرف ایک اولاد زندہ ہے؟''

''بیٹا صرف ایک ہے یعنی صمد خان، البتہ دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی شہباز خان جی کی ہے اور دوسری آپ ہیں۔''

''زرینہ پھوپی کی اولاد نہیں ہے؟''

''انہوں نے شادی نہیں کی ہے۔'' فضل اللہ دبے انداز میں بولا۔ ''حویلی کا انتظام بڑی خانم نے ان کے سپرد کر رکھا ہے۔''

یہ رِمل کے لیے تیسرا دھچکا تھا۔ ''دادی جان زندہ ہیں؟''

''جی بی بی جی، وہ زندہ ہیں لیکن کئی سال سے ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ حویلی سے باہر نہیں جاتی ہیں، زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی ہیں۔''

فضل اللہ پرانا ملازم تھا اس لیے محرم راز تھا۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس تھی اور وہ نوعمری سے یہاں کام کر رہا تھا۔ اس کا باپ بھی حویلی کا ملازم تھا۔ کچھ دیر میں کار حویلی کے شاندار پھاٹک کے سامنے رکی۔ دربان نے گیٹ کھولا اور کار ایک ایسے راستے سے پورچ تک پہنچی جو دونوں طرف سے دیواروں سے بند تھا اور سیدھا پورچ میں جا کر نکلتا تھا۔ پورچ میں ایک خادمہ اس کی منتظر تھی۔ اس نے رِمل سے اس کا سامان لینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے زرینہ کے بارے میں پوچھا۔ ''چھوٹی خانم آپ سے دوپہر کے کھانے کے وقت ملیں گی۔'' ملازمہ نے کہا۔ ''میں آپ کو کمرا دکھاتی ہوں، آپ اتنی دیر میں تازہ دم ہو جائیں۔''

وہ ڈیڑھ بجے حویلی پہنچی تھی اور کھانا دو بجے لگتا۔ ملازمہ اسے دوسری منزل پر واقع ایک کمرے میں لائی۔ یہ مہمان خانہ نہیں تھا...... کہیں بھی مہمان خانہ دوسری منزل پر نہیں ہوتا ہے۔ ایک طویل گیلری کے دونوں طرف چار چار کمرے تھے اور یہ بڑے بڑے کمرے تھے۔ ملازمہ اسے جس کمرے میں لائی تھی، اس کے ساتھ اٹیچ باتھ اور ایک چھوٹا سا وارڈ روب بھی تھا لیکن کمرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے کوئی استعمال نہیں کرتا۔ وہ تھکن محسوس کر رہی تھی۔ راستے میں وہ بہت کم سوئی تھی اور زیادہ تر سوچتی رہی تھی مگر ابھی اسے نیچ پر چھوٹی خانم سے بھی ملنا تھا۔ استقبال کا یہ انداز توہین آمیز تھا مگر وہ اس کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدلے۔ وہ جینز اور مشرقی انداز کی لانگ شرٹ میں تھی۔ واش روم جانے سے پہلے اس نے ملازمہ کو شلوار قمیص استری کرنے کے لیے دیا۔ جب تک وہ واش روم سے آئی، ملازمہ نے کپڑے استری کر کے ہینگ کر دیے تھے۔ وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

''بی بی! میں باہر موجود ہوں۔''

رِمل نے کپڑے تبدیل کیے اور بالوں میں ہلکا سا برش کر کے تیار ہو گئی، اس نے لپ اسٹک لگا کر آئینہ دیکھا۔ اتنی تیاری کافی تھی۔ وہ دوپٹا لے کر باہر آئی تو ملازمہ منتظر تھی۔ وہ اسے لے کر ایک دوسرے راستے سے حویلی کے اندر نچلے فلور پر آئی۔ یہاں ایک عالی شان ڈائننگ ہال میں میز کے سرے پر چھوٹی خانم اس کی منتظر تھی۔ وہ تقریباً پچاس برس کی لیکن بہت خوب صورت اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے خدوخال شاہانہ اور آنکھیں بہت پُرکشش براؤن رنگ کی تھیں۔ اس نے سرد لہجے میں رِمل کے سلام کا جواب دیا اور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''تم سجاد کی بیٹی ہو؟''

''آپ کو اس میں شک ہے؟''

''نہیں، تمہارا رنگ و روپ ذرا الگ ہے۔''

رِمل کسی قدر دبے رنگ کی، موٹی آنکھوں اور چھوٹی سی پُرکشش ناک والی خوب صورت لڑکی تھی۔ ''میری امی بنگلہ دیش سے تعلق رکھتی ہیں۔''

زرینہ نے سر ہلایا۔ ''میں جانتی ہوں...... بیٹھو۔''

رِمل اس کے سامنے آ گئی۔ ''دادی جان نہیں آئیں؟''

''انہیں فالج ہے اور وہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھاتی ہیں۔'' زرینہ نے جواب دیا۔ اسی اثنا میں ایک جوان آدمی وہاں آیا۔ وہ رِمل کو دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر اس نے سوالیہ نظروں سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''یہ رِمل ہے، سجاد کی بیٹی۔''

''سجاد چچا کی بیٹی......'' وہ گرم جوشی سے بولا۔ ''میں صمد خان ہوں، عماد خان کا بیٹا۔''

''اور ہمارے خاندان کا اکلوتا وارث۔'' زرینہ بولی۔

رِمل نے وارث والی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

صمد کھانے میں شریک ہوا اور کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد رِمل نے زرینہ سے کہا۔ ''میں دادی جان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ آرام کر رہی ہیں۔''

''میں صرف ایک نظر دیکھوں گی۔'' رِمل جلدی سے بولی۔ ''میں نے آج تک آپ میں سے کسی کو نہیں دیکھا ہے۔''

''اس میں حرج نہیں ہے۔'' صمد نے تائید کی۔

زرینہ کھڑی ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے تم دکھا دینا، میں اب آرام کروں گی۔''

زرینہ کے جانے کے بعد صمد نے کہا۔ ''آپ بُرا مت منائیے گا، پھوپو عادت کی ایسی ہی ہیں۔''

صمد اسے اوپر لے کر آیا۔ اسی راہداری میں رِمل کا کمرا بھی تھا۔ صمد نے شروع کے ایک دروازے پر دستک دی۔ دستک بہت ہلکی تھی۔ چند لمحے بعد ایک نوجوان ملازمہ نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ ''جی خان جی؟''

''بڑی خانم جاگ رہی ہیں؟''

''جی لیکن طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لیٹی ہوئی ہیں۔''

''ہم ایک نظر انہیں دیکھنے آئے ہیں۔'' صمد بولا اور رِمل کے ساتھ کمرے کے اندر آیا۔ یہاں نہایت شاہانہ قسم کا لکڑی کا فرنیچر تھا۔ چھپر کھٹ قسم کے بڑے سائز کے بیڈ پر بڑی خانم آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ فالج کی وجہ سے چہرے کا نصف حصہ ڈھلک گیا تھا۔ خدوخال میں کرختگی اور سختی تھی۔ جسم لمبا چوڑا اور اس عمر میں بھی صحت اچھی تھی۔ ان کی باقاعدگی سے دیکھ بھال اور علاج کیا جاتا تھا۔ رِمل نے اندازہ لگایا کہ وہ کم سے کم اسّی برس کی تھیں۔ رِمل کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر صمد کے ساتھ باہر آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''جب چھوٹی خانم نے بابا کو خط لکھ کر بلایا تھا تو اس میں لکھا تھا کہ بڑی خانم کی طبیعت بہت خراب ہے اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے؟''

''یہ درست ہے۔ اس وقت ان کی طبیعت سچ مچ اتنی خراب ہو گئی تھی کہ ہم نے آبائی قبرستان میں قبر کی تیاری کا بھی کہہ دیا تھا۔ مگر اس کے بعد بڑی خانم نے حیرت انگیز سنبھالا لیا۔ ان کے لیے جو قبر تیار ہوئی تھی، اس میں سجاد چچا کو دفن کیا گیا تھا۔''

باپ کے ذکر پر رِمل بے چین ہو گئی۔ ''بابا کی موت کیسے ہوئی تھی؟''

''وہ رات کو باتھ روم کے ٹب میں بیٹھے تھے کہ کسی وجہ سے ڈوب گئے۔ شاید وہ سو گئے تھے اور اسی دوران میں ان کا سر پانی میں چلا گیا یا کسی وجہ سے ان کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ بے ہوش ہو کر ڈوب گئے۔ موت بہرحال ڈوبنے سے واقع ہوئی تھی۔''

''میں ان کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

صمد اسے حویلی کے عقب میں واقع چھوٹے سے قبرستان میں لایا۔ ڈھلان پر ایک چھوٹی سی چار دیواری تھی۔ یہاں دس قبریں تھیں۔ ایک اکبر خان کی، پانچ اس کے بیٹوں کی اور چار بہوؤں کی قبریں تھیں۔ رِمل نے خود پر قابو رکھا لیکن اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کے خیال میں بڑی خانم بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھیں جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے پانچ جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ برداشت کیا تھا۔ وہ واپس آئی تو صمد اسے نشست گاہ میں لایا۔ ''آپ کی آمد میرے لیے غیر متوقع ہے۔''

''میں نے آنے سے پہلے چھوٹی خانم کو کال کر کے اطلاع دی تھی۔''

''میں حویلی سے باہر کے معاملات دیکھتا ہوں۔ حویلی کے اندر چھوٹی خانم مختارِ کل ہیں۔''

''کس حیثیت سے؟ کیا وہ دادا جان کے وارثوں میں شامل ہیں؟''

''نہیں...... وہ وارث نہیں ہیں لیکن انہیں یہ حیثیت بڑی خانم نے دی ہے۔''

''آپ یہ مت سمجھیے گا کہ مجھے جاگیر یا وراثت سے کوئی دلچسپی ہے۔ میں یہاں صرف یہ جاننے آئی ہوں کہ بابا کی موت کن حالات میں ہوئی اور یہ گیارہ اگست بدھ کے دن میں کیا پُراسراریت ہے؟''

صمد کچھ دیر اسے یوں دیکھتا رہا جیسے رِمل کی بات اس کے سر پر سے گزر گئی ہو۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا طویل قامت اور خوش شکل مرد تھا۔ ''میں آپ کی بات سمجھا نہیں؟''

''میں نے بہت سادہ الفاظ میں سوال کیا ہے۔ اس میں نہ سمجھنے والی بات کون سی ہے؟''

صمد نے تعجب سے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟''

''جی میں کچھ نہیں جانتی کیونکہ بابا نے یہاں آنے سے پہلے مجھے اپنے خاندان کے بارے میں کبھی نہیں بتایا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اس بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب وہ یہاں سے بلاوے پر آئے تو دس اگست کے دن اپنی موت سے ایک دن پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تب بھی میں یہاں نہ آؤں اور نہ ہی اس بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔''

''لیکن آپ یہاں چلی آئیں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں کیونکہ میں اس خاندان کی ایک فرد ہوں اور اس کے بارے میں سب جاننا میرا حق ہے۔"

"سجاد چچا یا کسی اور نے آپ کی حق تلفی نہیں کی ہے۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ سجاد چچا آپ کو کسی ممکنہ خطرے سے بچانا چاہتے تھے۔"

"کیسے خطرے سے؟"

اس سوال پر صمد کسی قدر بے چین ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک سے تو میں بھی نہیں جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب بھی گیارہ اگست کی تاریخ بدھ کے دن آئی، حویلی کے کسی فرد کی پراسرار موت ہوئی۔"

رمل کے بدن میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ "اب تک کتنے لوگ موت کا شکار ہوئے ہیں؟"

"نو افراد۔" صمد نے جواب دیا۔

"میرے خدا۔" رمل حیران ہوئی۔ "کیا تمام اموات حادثاتی تھیں؟"

"نہیں، کچھ طبعی بھی کہی جا سکتی ہیں لیکن وہ بھی گیارہ اگست بدھ کے دن ہوئی تھیں۔"

رمل دم بہ خود تھی، اس نے بمشکل کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی، آپ لوگوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں اس کا پس منظر نہیں جانتا۔" صمد نے گہری سانس لی۔ "صرف حالات و واقعات سے واقف ہوں۔ اگر کوئی پوری بات جانتا ہے تو وہ بڑی خانم ہیں یا ان کے بعد چھوٹی خانم ہیں۔"

رمل اس سے اور بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسی دوران میں ایک ملازمہ نشست گاہ میں آئی اور اس نے صمد کو اطلاع دی کہ زمین پر کام کرنے والے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس نے رمل سے معذرت کی۔ "یہ زمین سے متعلق ایک اہم معاملہ ہے، اسے نمٹانا ضروری ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" رمل نے خوش دلی سے کہا۔ "ویسے بھی میں تھک گئی ہوں۔ سفر میں بہت کم سوئی تھی اس لیے اب کچھ دیر آرام کروں گی۔"

وہ اپنے کمرے میں آئی۔ زرینہ نے گل نامی ملازمہ کو مستقل رمل کے لیے وقف کر دیا تھا اور وہ اس کے کمرے کے باہر موجود تھی۔ اس نے رمل سے کہا۔ "بی بی! آپ کو کوئی ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجیے گا۔"

رمل نے منہ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ کر ٹشو سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

اچانک اسے لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہے۔ اس کے سر کے اوپر کسی عورت کے سر کا بالوں والا حصہ نظر آیا تھا۔ وہ بری طرح چونک کر پلٹی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ کچھ دیر تو وہ اپنے دل کی دھڑکنیں سنبھالتی رہی۔ پھر لیٹ گئی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ سوچوں کے درمیان کب وہ سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی اور تاریکی چھا رہی تھی۔ دن میں موسم خوشگوار تھا لیکن اس وقت ہلکی سی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ شام سے ذرا پہلے اٹھ کر وہ حویلی کے باہر وادی کا معائنہ کرے گی لیکن یہ وقت سونے میں نکل گیا تھا۔ اتفاق سے اس کے کمرے کی بالکونی وادی کے رخ پر تھی اور یہاں سے تقریباً پوری وادی کا منظر بہت اچھی طرح دکھائی دیتا تھا۔ وہ اٹھ کر بالکونی میں آ گئی۔ پہاڑوں کے اوپری حصوں میں کسی قدر روشنی تھی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا، اتفاق سے وہ درمیانی کمرے میں تھی اور اس کے دائیں بائیں دو بالکونیاں تھیں۔ رمل نے بائیں طرف دیکھا تو اسے آخری بالکونی میں کوئی حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ جھلک صرف چند سیکنڈ کی تھی، اسے یوں لگا جیسے کوئی عورت تیزی سے اندر گئی ہو۔ رمل نے زیادہ توجہ نہیں دی، وہ کوئی ملازمہ بھی ہو سکتی تھی جو کسی کام سے بالکونی میں آئی ہو۔

جب وادی کے اوپری حصے بھی تاریکی میں ڈوبنے لگے تو وہ اندر آ گئی... اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے گل کو طلب کر کے اسے چائے لانے کو کہا۔ گل نے وضاحت چاہی کہ اسے کس قسم کی چائے پسند ہے اور پھر چلی گئی۔ دس منٹ بعد وہ چائے اور کچھ ہلکے پھلکے لوازمات لے کر آ گئی۔ اس نے سلیقے سے چائے بنا کر رمل کو سرو کی۔ رمل نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "گل! حویلی میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"آپ کا مطلب ہے مالکوں میں کتنے رہتے ہیں تو بس تین ہی لوگ ہیں۔ بڑی خانم، چھوٹی خانم اور خان جی۔"

"صمد خان؟"

"جی، انہیں سب خان جی کہتے ہیں۔"

گل کے مطابق حویلی میں کوئی بیس کے قریب مستقل ملازم تھے۔ ان میں نو عورتیں تھیں جو سب کی سب اندر کے کام کرتی تھیں جبکہ مرد ملازموں کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ باہر ہوتے تھے۔ رمل نے اس فلور کے بارے میں پوچھا۔ "اس جگہ کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"اس فلور پر دو کمرے آباد ہیں، ایک میں بڑی خانم رہتی ہیں اور دوسرے میں چھوٹی خانم رہتی ہیں، باقی سب

خالی رہتے ہیں۔"

"صمد کہاں رہتا ہے؟"

"وہ نیچے مردانے میں رہتے ہیں، ان کا کمرا وہیں ہے۔"

رمل کو خیال آیا۔ "میرے کمرے کی لائن کا آخری کمرا کس کا ہے؟"

گل کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ "وہ جی... یہ کمرا بڑی خانم کے سب سے بڑے بیٹے زاہد خان کا ہے۔"

"اس میں کوئی رہتا ہے؟"

"نہیں جی، یہ کمرا تو چالیس سال سے خالی پڑا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ کوئی ملازمہ وہاں اکیلے جانے کو تیار نہیں ہوتی۔"

"کیوں؟"

گل ذرا قریب آئی اور رازدارانہ انداز میں بولی۔ "بی بی جی! بات خود تک رکھیے گا۔ وہ کمرا آسیب زدہ ہے۔ ہم نوکرانیوں نے ادھر ایک عورت کو دیکھا ہے، اچانک نظر آتی ہے اور اچانک غائب ہو جاتی ہے۔"

رمل چونک گئی۔ اسے اس کمرے کی بالکونی میں کسی عورت کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس نے گل کو بتایا۔ "کوئی خادمہ ہو سکتی ہے؟"

"توبہ کریں جی، ہم تو اس کمرے کے قریب بھی نہیں جاتے، اندر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور ویسے بھی وہ بند ہوتا ہے۔ چھوٹی خانم سال میں دو تین بار کھلوا کر صفائی کرواتی ہیں تب بھی کوئی نوکرانی اکیلے نہیں جاتی، ہمیشہ دو تین جاتی ہیں۔"

رمل کو یقین تھا۔ اس نے جس بالکونی میں عورت کی جھلک دیکھی تھی، وہ آخری تھی اور گل بتا رہی تھی کہ آخری بالکونی والا کمرا بند رہتا ہے اور سال میں دو تین بار صرف صفائی کے لیے کھولا جاتا ہے۔ رمل بذات خود آسیب جیسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ لیکن یہاں گزشتہ اکتالیس برسوں میں نو اموات ہو چکی تھیں اور وہ بھی ایک مخصوص دن جب کسی سال میں گیارہ اگست بدھ کو پڑتی تھی... حویلی کا کوئی فرد اس جہانِ فانی سے گزر جاتا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ مرنے والے تمام ہی افراد اکبر خان اور بڑی خانم کے بیٹے اور ان کی بیویاں تھیں۔ صرف سجاد خان کی بیوی بچ گئی کیونکہ ایک تو اس کا حویلی سے کوئی تعلق نہیں تھا، دوسرے وہ پہلے ہی وفات پا گئی تھی۔ رمل کو خیال آیا کہ اگر وہ بھی اس کے باپ کے ساتھ یہاں ہوتی تو شاید وہ بھی نہ بچ پاتی۔

'یہ میں کیا سوچ رہی ہوں!' اس نے سر جھٹکا۔ 'یہ کوئی آسیب نہیں ہے بلکہ کوئی دوسرا چکر ہے۔'

رمل اپنے یقین کو جھٹلا رہی تھی۔ ابھی پوری بات اس کے علم میں نہیں تھی اور جتنی آئی تھی، اس نے اس کا تجسس مزید بڑھا دیا تھا۔ رمل نے پیالی پرچ میں رکھی۔ "مرنے والے تمام افراد حویلی سے تعلق رکھتے تھے؟"

گل دکھی نظر آنے لگی۔ "جی بی بی... پتا نہیں کیا چیز یہاں کے لوگوں کے پیچھے پڑ گئی۔ ایک ایک کر کے بڑی خانم کی ساری اولادیں اس کا نشانہ بن گئیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، یہ کوئی آسیبی چیز ہے؟ کوئی جن یا بھوت یا ایسی ہی کوئی چیز؟"

گل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تو بی بی اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپ خود سوچو... کسی گھر میں اس طرح لوگ مرتے ہیں، ایک خاص دن اور خاص تاریخ کو... اور پھر ہم ملازموں نے خود دیکھا ہے۔ جس رات خان جی کے والد عماد خان جی کی موت ہوئی، اس رات میری بڑی بہن... نے خود ان کے کمرے کے پاس اس عورت کو کھڑے دیکھا تھا۔"

"کون سی عورت؟"

"کوئی نہیں جانتا جی لیکن جس سال گیارہ اگست بدھ کے دن آنے والی ہوتی ہے، اگست کے مہینے کے شروع سے وہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس کی بس ایک دو لمحے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

گل کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ صحت مند اور گوری چٹی تھی۔ نقوش واجبی سے تھے لیکن لہجے سے پڑھی لکھی اور تمیز دار لگ رہی تھی۔ وہ بھی نوجوانی سے حویلی میں ملازم تھی اور اس کا شوہر حویلی میں مالی تھا۔ رمل اس کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بہت مشکل بھی لگ رہا تھا۔ اس نے چائے ختم کی تو گل برتن سمیٹ کر رخصت ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نہا لے مگر اس کے پاس زیادہ لباس نہیں تھے اور یہاں تو دن میں کئی بار لباس تبدیل کرنے والا ماحول تھا۔ رمل کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے باپ کا خاندان اتنا زیادہ امیر ہو گا۔ وہ جس کمرے میں تھی، یہ اس کے مکان کے نصف رقبے سے کچھ بڑا تھا۔ وہ نہانے کا سوچ رہی تھی کہ گل دستک دے کر اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تہ کیے ہوئے کچھ سوٹ تھے۔

"یہ چھوٹی خانم نے آپ کے لیے بھیجے ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں پہن کر دیکھ لیں اگر فٹ نہ ہوئے تو ٹھیک کر دیا جائے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ تینں سوٹ تھے، بہت خوب صورت اور بیش قیمت۔ ریڈی میڈ نہیں تھے بلکہ انہیں سلوایا گیا تھا۔ رمل کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے سوٹ بستر پر رکھنے کو کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گی۔''

اس نے شاور لے کر کپڑوں کا معائنہ کیا۔ تینوں مقامی طرز کے لیکن جدید تراش کے تھے۔ اتفاق سے تینوں سوٹ بالکل فٹ آئے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک منتخب کر کے پہن لیا۔ کچھ دیر بعد گل آئی۔ ''بی بی! کھانا لگ گیا ہے۔ چھوٹی خانم آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

زرینہ کھانے کی میز پر موجود تھی۔ آج صمد نہیں تھا۔ رمل نے اس کا شکریہ ادا کر کے صمد کے بارے میں پوچھا تو زرینہ نے اپنے مخصوص سرد لہجے میں کہا۔ ''وہ مصروف ہے۔ آج کل زمینوں پر کام جاری ہے۔''

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ زرینہ کی خاموشی اور سرد مہری دیکھ کر رمل کا جوش و خروش جو ملبوسات دیکھ کر اٹھا تھا، ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ زرینہ نے شاید رشتے داری کا حق ادا کیا تھا اور بس، اس میں کسی جذبے کا عمل دخل نہیں تھا۔ کھانے کے بعد اس نے زرینہ سے کہا۔ ''میں ابھی تک دادی جان سے نہیں ملی ہوں۔''

''انہیں یہاں سب بڑی خانم کہتے ہیں۔'' زرینہ نے اسے ٹوکا۔

''میرا یہاں سے تعلق محدود ہے اس لیے میں انہیں اسی رشتے سے پکاروں گی جو ہے۔'' رمل کا لہجہ بھی روکھا ہو گیا۔ ''میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''انہیں تمہاری آمد کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ جب وہ مناسب سمجھیں گی تمہیں بلا لیں گی۔'' زرینہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

رمل واپس اپنے کمرے میں آئی، اس نے گل کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ خوش ہو گئی۔ ''شکریہ بی بی... لیکن آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو...''

''نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' رمل نے منع کر دیا تو وہ چلی گئی۔ رمل دوپہر میں سو چکی تھی اس لیے نیند نہیں آ رہی تھی' اس نے کپڑے بدلے اور نائٹ سوٹ پہن لیا۔ رمل کو مطالعے کا شوق تھا لیکن صرف فارغ اوقات میں پڑھتی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے اس نے بیگ سے ایک ناول نکال لیا۔ اتفاق سے ناول کچھ پر اسرار اور ماورائی تھا۔ وہ اس میں کھو گئی۔ اچانک کسی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ آواز کس طرف سے آئی ہے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا، وہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس کی نظر بالکونی کے دروازے کی طرف گئی۔ یہ دروازہ شیشے کا تھا اور رمل نے اس کا پردہ برابر نہیں کیا تھا۔ کمرے کی روشنی باہر تک جا رہی تھی اس لیے رمل نے بہ آسانی اس عورت کو دیکھ لیا جو ریلنگ کی طرف منہ کر کے کھڑی تھی۔ اس نے مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے لمبے سیاہ بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ رمل کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے وہ بالکونی والا دروازہ اندر سے بند کرنے گئی تھی اور اس نے دیکھا تھا' بالکونی خالی تھی۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی پھر یہ عورت کہاں سے آ گئی؟

وہ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی اور رمل اسے نظروں کا دھوکا سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے ہمت کی اور ناول رکھ کر آہستہ سے بستر سے اتری۔ اس نے سلیپر نہیں پہنے اور دبیز قالین پر دبے قدموں بالکونی کی طرف بڑھی۔ لکڑی کے فریم والے دروازے میں اوپر نیچے تین حصوں میں شیشے لگے تھے اور دروازے کے دائیں بائیں بالکونی کی چوڑائی کے لحاظ سے کھڑکیاں تھیں۔ کھڑکیوں پر پردے تھے۔ دروازے کے پاس آ کر رمل نے دیکھا۔ عورت ننگے پاؤں تھی اور رمل چونکی کیونکہ اس کی ایڑیوں سے خون بہہ بہہ کر بالکونی کے فرش پر جمع ہو رہا تھا۔ رمل نے جلدی سے دروازہ کھولا اور عورت کو آواز دی۔ ''تم کون ہو... تم زخمی ہو۔''

عورت نے کوئی حرکت نہیں کی اور نہ رمل کو جواب دیا۔ رمل باہر آئی، اس نے عورت کے پاس جاتے ہوئے کہا۔ ''تم زخمی ہو، تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔''

اس بار بھی عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رمل نے ڈرتے ڈرتے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف گھمایا۔ عورت اس کی طرف مڑی۔ اس کا چہرہ ورم آلود اور زخموں سے سجا ہوا تھا۔ سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ اس کی آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے۔ رمل کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی تو فرش پر گر پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو خود کو بستر پر پا کر حیران رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ لیٹی ہوئی تھی اور ناول اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

'میں سو گئی تھی۔' اس نے سوچا۔ 'یہ خواب تھا۔'

اس نے بالکونی کی طرف دیکھا اور اسے خالی پا کر سکون کا سانس لیا۔ ناول پڑھتے پڑھتے اسے نیند آ گئی اور اسی دوران میں اس نے یہ خواب دیکھا تھا۔ رمل کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بستر کے برابر میں موجود تپائی کی طرف

دیکھا لیکن وہاں پانی کا جگ نہیں تھا۔ وہ گل سے کہنا بھول گئی تھی اور گل بھی رکھنا بھول گئی تھی۔ وہ اٹھی اور کمرے سے باہر آئی۔ راہداری خالی اور خاموش تھی۔ رمل کو پھر خوف محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ واپس کمرے میں چلی جائے لیکن خشک حلق نے اسے مجبور کیا۔ یہاں نشست گاہ کے ساتھ ایک فریج رکھا تھا۔ اس نے ڈرتے ہوئے پانی نکالا... وہ پانی پی کر واپس آ رہی تھی کہ بڑی خانم کے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا پایا لیکن اسے دروازے سے آتی سسکیوں کی آواز نے متوجہ کر لیا۔ کوئی عورت رو رہی تھی۔ رمل کو ایک بار پھر رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کھلے دروازے سے اندر جھانکا تو اس نے زرینہ کو بڑی خانم کے بستر کے ساتھ قالین پر بیٹھے پایا۔ اس کا سر بستر سے لگا ہوا تھا اور اس کا ہلتا ہوا جسم بتا رہا تھا، وہ رو رہی ہے۔ بڑی خانم کا ہاتھ اس کے سر پر تھا اور وہ اسے تھپک رہی تھیں۔ رمل نے سسکیوں کے درمیان ایک نام سنا۔ زرینہ نے یہ نام کئی بار لیا تھا۔ رمل خاموشی سے وہاں سے پلٹ آئی۔ کمرے میں آ کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا ذہن پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔

☆☆☆

ناشتے کے بعد رمل نے گل سے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو، میں وادی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

گل فکر مند ہو گئی۔ ''چھوٹی خانم سے پوچھ لوں بی بی؟''

رمل کو غصہ آ گیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس خاندان سے ضرور ہوں لیکن اس حویلی سے میرا تعلق نہیں ہے جو میں کسی کام کے لیے چھوٹی یا بڑی خانم سے اجازت لوں۔ اگر تمہیں مجبوری ہے تو میں خود چلی جاتی ہوں۔''

''نہیں بی بی... میں چلتی ہوں۔'' گل جلدی سے بولی۔ ''پر یہاں عورتیں پردہ کر کے نکلتی ہیں، آپ چادر لے لیں۔''

رمل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس کے پاس کوئی چادر نہیں تھی۔ گل اس کے لیے ایک خوب صورت سیاہ چادر لے آئی جس پر چھوٹے ستارے لگے ہوئے تھے۔ وہ باہر نکلیں تو آسمان پر ہلکے بادل تھے اور موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ رمل وادی کا حسن دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ نیچے بستی کھلونے کا شہر لگ رہی تھی۔ گھر بہت ترتیب سے تھے اور صاف ستھرے لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں پلاننگ سے بنایا گیا ہو۔ اس نے گل سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی۔ ''جی بی بی! یہ پوری بستی صمد صاحب نے دوبارہ بنوائی ہے اور سارا خرچ بھی خود اٹھایا ہے۔''

اسی وجہ سے اس میں ٹاؤن پلاننگ نظر آ رہی تھی۔ گل بتا رہی تھی کہ یہاں صرف جاگیر کے ملازمین رہتے تھے۔ ان کے علاوہ کسی کو رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ دونوں طرف کے پہاڑوں سمیت پوری وادی اسی خاندان کی ملکیت تھی جبکہ جس پہاڑ پر حویلی تھی، اس کا حویلی والا حصہ تو جاگیر کا حصہ تھا لیکن اس کا عقبی حصہ اکبر خان کے بھائی امیر خان کو ملا تھا اور اب وہاں اس کی اولاد آباد تھی۔ امیر خان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ وہ سب حیات تھے، اس کے کئی پوتے پوتیاں بھی تھے۔ ایک بیٹی کی کئی اولادیں تھیں لیکن زرینہ نے شادی نہیں کی تھی اور یہاں آ گئی تھی۔ رمل نے پوچھا۔ ''چھوٹی خانم نے شادی کیوں نہیں کی؟''

گل نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ کو نہیں معلوم؟''

''نہیں۔'' رمل نے مختصر جواب دیا۔

گل ہچکچائی جیسے بولتے ہوئے ڈر رہی ہو۔ ''بی بی جی... چھوٹی خانم، سجاد خان جی کی منگ تھیں اور وہ انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہاں کوئی اپنی منگ نہیں چھوڑتا ہے اور اگر چھوڑ دے تو کوئی دوسرا اسے نہیں اپناتا ہے۔ بڑی خانم تو انہیں شہباز خان جی کے لیے لے رہی تھیں لیکن چھوٹی خانم نے انکار کر دیا۔''

رمل سن رہ گئی۔ اس کے لیے ہر بات انکشاف تھی۔ اسے رات کا منظر یاد آ گیا جب زرینہ بڑی خانم کے بستر کے ساتھ بیٹھی سجاد کا نام لے کر رو رہی تھی اور وہ اس کا سر تھپک رہی تھیں۔ ایک طرف بڑی خانم کو اپنے شوہر کی بھتیجی سے اتنی ہمدردی تھی کہ اسے حویلی کا منتظم بنا دیا تھا لیکن دوسری طرف وہ اپنی سگی پوتی سے ملنے کو تیار نہیں تھیں۔ لازمی بات تھی کہ وہ سجاد خان کے منگ کو چھوڑنے اور امریکا جا بسنے سے خوش نہیں تھیں۔ اتنے عرصے تک دونوں طرف سے رابطہ نہ ہونے سے ظاہر تھا کہ تعلقات انتہائی حد تک کشیدہ تھے۔ وہ سجاد خان کی اولاد تھی، شاید اسی لیے اس سے یہ سلوک ہو رہا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کے باپ کو تو بلا لیا گیا تھا یعنی تعلقات میں بہتری آئی تھی' تب اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جا رہا تھا؟ کیا اس لیے کہ وہ خاندان سے باہر کی عورت کی بیٹی تھی؟

''سنبھل کر بی بی۔'' گل نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ چونکی' بے خیالی میں وہ خطرناک حد تک ترچھی ڈھلان پر قدم رکھنے جا رہی تھی۔ وہ ایک پگڈنڈی سے نیچے اترنے لگیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''بی بی جی... زیادہ دور نہیں جانا ہے، خان جی نے دیکھ لیا تو بُرا مانیں گے۔''

رل اسے سخت جواب دینے والی تھی لیکن پھر رک گئی۔ وہ بے چاری ملازمہ تھی' عین ممکن تھا کہ صمد خان یا چھوٹی خانم رل کو کچھ نہ کہتے لیکن اس غریب پر ان کا عتاب آتا۔ اس نے مزید نیچے جانے سے گریز کیا اور واپس پلٹ کر درمیان کے جنگل کے ساتھ چلنے لگی۔ یہ جنگل نیم دائرے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے حویلی کا اوپری منظر بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ پورا پہاڑ بلند و بالا دیوار اور چیڑ کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درخت بلندی تک چلے گئے تھے۔ جنگل کا آخری حصہ سیبوں اور آڑو کے باغات تک چلا گیا تھا۔ باغ ایک چھوٹی چار دیواری سے جنگل سے الگ ہو رہا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچے تو کسی کے زور سے بولنے کی آواز آئی۔ رل چونک گئی کیونکہ آواز صمد کی تھی۔ گل نے بھی آواز پہچان لی تھی، اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''بی بی جی... واپس چلیں۔''

لیکن رل اس کی بات ان سنی کر کے آگے بڑھی۔ باغ کی چار دیواری کے ساتھ اس نے درختوں کے درمیان صمد اور چند دوسرے افراد کو دیکھا۔ حلیے اور انداز سے وہ سب ملازم لگ رہے تھے' وہ ایک آدمی کو پکڑ کر درخت کے تنے سے باندھ رہے تھے اور صمد کے ہاتھ میں چھوٹا سا ہنٹر تھا۔ جیسے ہی ملازم اس آدمی کو باندھ کر پیچھے ہٹے، صمد نے اچانک ہی پوری طاقت سے ہنٹر مارا۔ بندھے ہوئے آدمی کے ساتھ رل کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ اسے صمد سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کسی بندھے ہوئے آدمی کے ساتھ ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کرے گا۔ چیخ سن کر صمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہت سخت تاثرات تھے اور اس کی پوری شخصیت ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ تیزی سے رل کی طرف آیا اور قریب آ کر دھیمے لیکن سخت لہجے میں بولا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ حویلی جاؤ۔''

رل نے کہنا چاہا لیکن وہ سنے بغیر ہی واپس مڑ گیا پھر اس نے دوسری بار ہنٹر بلند کیا تو رل سے دیکھا نہیں گیا، وہ پلٹ گئی مگر مضروب کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی لیکن چیخیں بہت دور تک سنائی دیتی رہیں۔ وہ اندھا دھند آگے بڑھی تھی اگر گل نہ روکتی تو وہ ڈھلان سے اتر جاتی۔ اسے کچھ دیر میں احساس ہوا کہ آنسوؤں کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''آرام سے بی بی جی... آرام سے۔''

حویلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ اسے کیوں رونا آیا تھا۔ صمد کے سخت لہجے پر یا اس آدمی کی چیخوں پر جسے صمد ہنٹر سے مار رہا تھا۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ باہر کیوں گئی، اس سے تو بہتر تھا کہ وہ حویلی میں رہتی۔ حویلی کے رواج کے مطابق ناشتا سب اپنے کمرے میں کرتے تھے یا الگ کرتے تھے۔ صرف دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے میز پر ایک ساتھ آتے تھے۔ وہ بھی صرف زرینہ اور صمد ہی ہوتے تھے۔ اگر صمد مصروف ہوتا تو وہ نہیں آتا تھا۔ گل دوپہر کے کھانے کا کہنے آئی تو رل نے پہلے پوچھا۔ ''صمد بھی موجود ہے؟''

''جی، خان جی موجود ہیں۔ کچھ دیر پہلے آئے ہیں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے اور میں تھک گئی ہوں اس لیے آرام کروں گی۔''

گل چلی گئی۔ یہ غلط تھا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی کیونکہ وہ تقریباً دو ڈھائی میل پیدل چل کر آئی تھی لیکن ساتھ ہی اسے غصہ آ رہا تھا۔ صمد کو اس سے اس لہجے میں بات کرنے کا کیا حق تھا؟ پھر اسے خیال آیا کہ حق تو ہے، وہ اس کا فرسٹ کزن ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سمجھی گل ہو گی۔ اس نے بلند آواز سے اجازت دی تو دروازہ کھلا اور صمد اندر آیا۔ اس کے چہرے پر وہی نرم اور خوشگوار تاثرات تھے۔ رل اٹھ بیٹھی۔ ''آپ...؟''

''جی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو بھوک نہیں ہے، حالانکہ اتنی دیر پیدل چل کر آپ کو لازمی بھوک لگنی چاہیے۔''

''آپ سے کس نے کہا کہ میں کتنی دیر پیدل چلی ہوں؟'' رل نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''رل! مجھے افسوس ہے۔'' صمد کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ ''اس وقت آپ کو وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''آپ نے مجھ سے اس طرح بات کیوں کی؟ میرا اس خاندان سے تعلق ہے لیکن میں حویلی میں مہمان ہوں۔''

''تعلق تو ہے... آپ میرے چچا کی بیٹی ہیں۔''

''جی ضرور۔'' رل نے طنز کیا۔ ''جسے اس خاندان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''مجھے اس کا بھی افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے کچھ چھپایا نہیں جا رہا ہے۔ اگر کہیں لاعلمی ہے تو وہ بھی آپ کی بہتری کے لیے ہے۔''

''کیسی بہتری... جبکہ میرا یہاں کے کسی معاملے سے تعلق ہی نہیں ہے۔''

''رل! آپ نہیں جانتیں، ہم لوگ کن حالات سے

گزرتے رہے ہیں۔ آپ بہت غلط وقت پر یہاں آئی ہیں۔''

''اس لیے کہ چار دن بعد گیارہ اگست پھر بدھ کے دن آ رہی ہے؟''

''بالکل اور اس دن خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد اس دنیا سے گزر جاتا ہے۔''

''میں ان چیزوں کو نہیں مانتی۔''

''مانتا میں بھی نہیں ہوں لیکن اسے کیا کہا جائے کہ حقائق اور واقعات سامنے ہیں' ان کو کسی صورت جھٹلایا نہیں جا سکتا۔''

''صمد! میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔'' رل اپنا غصہ بھولنے لگی۔

''میں ضرور بتاؤں گا لیکن ایک شرط پر... آپ چل کر ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ چھوٹی خانم بھی بھوکی بیٹھی ہیں۔''

رل کو اس اطلاع پر حیرت ہوئی۔ کیا اس کی اتنی اہمیت تھی کہ زرینہ اس کی خاطر اب تک بھوکی بیٹھی تھی؟ اس نے گہری سانس لی۔

''ٹھیک ہے لیکن آپ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔''

وہ نیچے آئے۔ زرینہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے آتے ہی کھانا لگ گیا اور حسب روایت خاموشی سے کھایا گیا۔ رل کو حیرت تھی کہ کئی ایسی ڈشز بھی تھیں جو وہ شوق سے کھاتی تھی۔ نہ جانے ان لوگوں کو اس کا پتا کیسے چلا تھا۔ رل کا خیال تھا کہ صمد کھانے کے فوراً بعد کام پر چلا جائے گا لیکن وہ رل کے ساتھ نشست گاہ میں آ گیا۔ اس نے قہوہ منگوایا۔ رل اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ ملازمہ کے جاتے ہی اس نے جھجکتے ہوئے پوچھ لیا۔ ''وہ شخص کون تھا؟''

''کون...؟'' صمد نے بے خیالی میں کہا پھر چونکا۔ ''اچھا... جسے سزا دی جا رہی تھی۔ وہ ایک ملازم ہے اور اس نے ایک دوسرے ملازم پر چوری کا الزام لگایا تھا مگر تحقیقات سے وہ خود مجرم ثابت ہوا۔''

''تو آپ اسے خود سزا دے رہے تھے، کیا یہاں مقامی قانون لاگو نہیں ہوتا؟''

''ہوتا ہے۔'' صمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن میں اسے پولیس کے حوالے کرتا تو اصل سزا سے پہلے اسے بہت سے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا۔ پھر وہ کئی مہینے یا سال کے لیے جیل چلا جاتا اس لیے اسے مقامی رواج کے مطابق سزا دی گئی۔ یہاں چوری کرنے والے کو پچاس ہنٹر مارے جاتے ہیں۔''

''لیکن آپ خود...''

''میں سمجھ رہا ہوں لیکن یہاں کا حاکم میں ہوں اور باقی سب ملازم ہیں۔ پہلے سزا دینے کا کام ایک شخص کرتا تھا لیکن وہ بے انصافی سے کام لیتا تھا۔ جس سے اس کے تعلقات اچھے ہوتے ان سے رعایت کرتا اور جن سے اچھے نہیں ہوتے تھے، ان کو زیادہ سزا دیتا تھا۔ اس سے لوگوں میں دشمنیاں جنم لے رہی تھیں اس لیے سزا کا کام میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس سال میں یہ دوسرا واقعہ ہے جب کسی فرد کو سزا ہوئی ہے۔''

''میں نے دیکھا ہے آپ نے جاگیر کا سسٹم بہت اچھا رکھا ہوا ہے۔''

صمد مسکرایا۔ ''شکریہ... میں نے اس سلسلے میں باقاعدہ کورسز کیے ہیں اور بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری بھی رکھتا ہوں۔ جاگیر کی موجودہ شکل میری پندرہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔''

رل اتنا جانتی تھی کہ صمد کی کوئی بیوی نہیں ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے کبھی شادی کی تھی یا نہیں۔ اس نے جھجکتے ہوئے یہ سوال پوچھ لیا۔ صمد مسکرایا۔ ''شروع میں فرصت نہیں ملی' پڑھنے اور کورسز کرنے میں لگا رہا پھر جاگیر کا سسٹم ٹھیک کرتا رہا۔ جب یہ کام بھی ہو گیا تو میرے پاس کوئی بہانہ نہیں رہا اس لیے مجھے بڑی اور چھوٹی خانم کو صاف کہنا پڑا کہ میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' رل بے چین ہو گئی حالانکہ اسے یہ سن کر اچھا لگا تھا کہ صمد نے شادی نہیں کی تھی۔ ''کیوں' کیا آپ کسی کو پسند کرتے تھے اور وہ آپ کو مل نہیں سکی؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' صمد نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنی بدقسمتی میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا ہوں...''

''کیا مطلب؟''

''میرے والد، چچا اور تایا بچ نہیں سکے اور ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی شکار ہوئیں۔ اب اس خاندان میں صرف تین افراد بچے ہیں۔ بڑی خانم، میں اور...''

''میں۔'' رل نے اس کی بات مکمل کی۔

''اسی وجہ سے چھوٹی اور بڑی خانم آپ کے یہاں آنے کی مخالفت کر رہی تھیں اور اسی وجہ سے سجاد چچا نے آپ کو سختی سے منع کیا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس کے باوجود میں آ گئی تو اس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل تو میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی ہوں، دوسرے میں تقدیر پر یقین رکھتی ہوں۔ شاید بابا بچنے کے لیے امریکا چلے گئے تھے لیکن ان کی تقدیر میں موت یہاں لکھی تھی اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں چلے آئے۔ اسی طرح اگر میری تقدیر میں ایسا کچھ لکھا ہے تو میں چاہوں یا نہ چاہوں، وہ ہو کر رہے گا۔''

''سچی بات ہے کہ میں بھی یقین نہیں رکھتا لیکن بچپن سے سب کچھ میرے سامنے ہوتا رہا ہے۔'' صمد نے کہا پھر رک گیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''دیکھتے ہیں اس بار کیا ہوتا ہے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ ہوگا؟''

''بات یقین کی نہیں، ایک مسلسل ہونے والے واقعات کی ہے۔ انتالیس سال میں یہ دن ایک بار بھی خالی نہیں گیا۔ حویلی کے کسی نہ کسی فرد کو ساتھ لے کر گیا۔''

''صمد! آپ مجھے بتائیں یہ سب کیسے ہوا؟'' رمل نے التجا کی۔ ''آپ تو سب جانتے ہیں۔''

''میں نے کہا نا سب صرف بڑی خانم یا چھوٹی خانم جانتی ہیں لیکن میں جو جانتا ہوں، وہ آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ ابھی مجھے کام سے جانا ہے اس لیے آج رات کھانے کے بعد ورنہ کل ضرور بتاؤں گا۔''

صمد کے جانے کے بعد رمل نے زرینہ سے ملنے کی کوشش کی لیکن ملازماؤں نے اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی کہ وہ کہاں ہے۔ بڑی خانم کے بارے میں گل کا کہنا تھا کہ وہ آرام کر رہی ہیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رمل نے سوچا کہ شاید وہ اس سے ملنا ہی نہیں چاہتی ہیں۔ اس نے بڑی تلخی سے سوچا کہ اس کا قصور کیا ہے؟ اگر ان کا تنازع اپنے بیٹے سے تھا تو اس میں پوتی کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اسے خیال آیا کہ اسے یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے لیکن پھر اسے صمد کا خیال آیا جو اسے حقائق سے آگاہ کرنے والا تھا۔ پھر گیارہ اگست بھی قریب تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس دن ہوتا کیا ہے۔ اسے دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ ملازمت پیشہ تھی لیکن یہاں آنے کے بعد اسے دوپہر میں نیند آنے لگی تھی۔ اس دوپہر کو بھی وہ سو گئی۔ شام کے وقت اٹھی تو موسم بدل گیا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور لگتا تھا کسی وقت بھی بارش ہونے والی ہے۔ کچھ دیر بعد گل دستک دے کر اندر آئی۔ ''آپ اٹھ گئیں بی بی جی... چائے لاؤں؟''

''صرف چائے لانا۔'' رمل نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''اور چھوٹی خانم کا پتا چلا؟''

''جی وہ نیچے ہیں۔'' گل باہر جاتے ہوئے بولی۔

رمل فریش ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آئی اور برش اٹھا کر بال سلجھانے لگی۔ اس نے آئینے میں دیکھا اور چونک گئی کیونکہ آئینے میں احساس ہوا کہ وہ عورت گل سے مختلف تھی۔ اس کے کھلے اور گھنے سیاہ بال اس کی پشت پر پھیلے تھے اور اس نے وہی لباس پہنا ہوا تھا جو اس دن خواب میں بالکونی میں نظر آنے والی عورت نے پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ رمل کا بدن لرزنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا لیکن دبیز قالین کی وجہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں آئی۔

''کک... کون ہو تم؟''

رمل کی آواز پر عورت کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ پھیلا ہوا تھا جس میں چائے کی پیالی تھی۔ رمل کا سانس رکنے لگا۔ یہ وہی چہرہ تھا زخموں اور نشانوں سے پُر۔ پھر رمل کی نظر چائے کی پیالی پر گئی جس میں خون جیسا کوئی سرخ سیال تھا اور اس میں دو گول سی چیزیں تیر رہی تھیں۔ وہ چیزیں نہیں بلکہ آنکھیں تھیں۔ بے ساختہ رمل کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی تو کرسی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی لمحے گل کی آواز آئی۔

''بی بی جی، کیا ہوا خیریت تو ہے؟''

گل دروازے کے پاس ٹرے لے کر کھڑی تھی، اس نے جلدی سے ٹرے میز پر رکھی اور لپک کر اس کے پاس آئی۔ اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں بی بی؟''

''ہاں... ہاں... تم ابھی آئی ہو؟''

گل اس سوال پر حیران ہوئی۔ ''جی بی بی، بس آپ کی چیخ سنی تو میں دروازہ کھول رہی تھی، اندر آئی تو آپ کو گرے ہوئے دیکھا۔ آپ ٹھیک ہیں نا... چوٹ تو نہیں آئی؟''

رمل نے گہرا سانس لیا۔ ''ہاں میں ٹھیک ہوں، بس چکر آ گیا تھا۔ مجھے ایک گلاس پانی دو۔''

گل نے اسے پانی دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ پانی پینے سے حواس بحال ہوئے اور چند لمحوں میں اس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی۔ گل اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''بی بی! اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کو بلا لوں، یہاں حویلی کا اپنا ڈاکٹر ہے۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' رمل صوفے پر گر گئی۔ ''مجھے چائے دو۔''

گل نے اسے چائے بنا کر دی۔ رمل بے خیالی میں گرم چائے کا گھونٹ لے گئی۔ اس کا ذہن اسی عورت میں الجھا ہوا تھا جسے وہ پہلے صرف اپنا خواب سمجھی تھی لیکن ابھی جو ہوا، وہ اسے خواب سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے سب جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ کوئی لمحاتی جھلک نہیں تھی۔ گل بدستور غور سے اسے دیکھ رہی تھی، اس نے پھر کہا۔ ''بی بی جی! آپ پریشان ہیں؟''

''نہیں۔'' رمل نے نرم لہجے میں کہا۔ ''شاید آب و ہوا تبدیل ہوئی ہے اس لیے ایسا ہوا لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔''

''شکر ہے بی بی جی لیکن آپ کو ذرا بھی محسوس ہو تو بتایئے گا ڈاکٹر ایک منٹ میں آ جائے گا۔''

''گل! تم نے بتایا تھا کہ تمہیں اور دوسرے لوگوں کو یہاں ایک عورت دکھائی دیتی ہے۔ تم نے اسے خود دیکھا ہے؟''

''کئی بار بی بی جی۔'' گل خوفزدہ نظر آنے لگی۔ ''کیا آپ کو بھی دکھائی دی ہے؟''

''ارے نہیں۔'' رمل زبردستی ہنسی۔ ''میں تو صرف پوچھ رہی ہوں۔ وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟''

''کیسی لگتی ہے؟'' گل نے سوچا۔ ''بس جی عورت لگتی ہے۔''

''میرا مطلب ہے اس کا لباس کیسا ہوتا ہے؟ اس کی عمر کتنی لگتی ہے؟ سر کے بال کھلے ہوتے ہیں؟''

گل چونکی۔ ''آپ کو کیسے پتا جی... کہ اس کے سر کے بال کھلے ہوتے ہیں؟''

''شاید تم نے ذکر کیا تھا۔''

''دیکھنے میں جی جوان لگتی ہے، سفید رنگ کا سوٹ پہنا ہوتا ہے اور چہرہ... اللہ معاف کرے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے اسے مارا ہو۔ آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے نظر آتے ہیں۔''

جیسے جیسے گل حلیہ بیان کر رہی تھی، رمل کا جسم سرد پڑ رہا تھا۔ وہ بالکل اسی عورت کا حلیہ بتا رہی تھی جسے رمل نے چند منٹ پہلے دیکھا تھا۔ گل اب خاموش اور سہمی ہوئی تھی۔ ''بی بی جی! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا... ان دنوں اور اس جگہ کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا ہے۔''

''یہ سب توہمات ہیں۔'' رمل نے کہا لیکن خود اسے اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن کا شدت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ اسی لمحے باہر بادل گرجے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ آغاز اتنا تیز تھا کہ پورا ماحول دھندلا گیا اور چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی شام ہو گئی تھی اور بادل بھی سیاہ تھے اس لیے رات سے پہلے رات کا سماں ہو گیا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے آنے لگے تو گل نے اٹھ کر کھڑکیاں بند کیں پھر اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

''میں بھول گئی، میں نے چھوٹی خانم کو بتا دیا تھا کہ آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں، رات کے کھانے پر آپ ان سے مل سکیں گی۔''

رمل کو غصہ آ گیا۔ وہ بے شک بڑی تھیں اور رشتے میں اس کی پھوپی بھی لگتی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی سائل کا سا سلوک کریں۔ یہ تو مہمان نوازی کے آداب کے بھی خلاف تھا۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ یہاں بن بلائی مہمان تھی اور اسے یہاں خوش آمدید نہیں کہا گیا تھا۔ اس نے گل سے کہا۔ ''میں آج رات کا کھانا اپنے کمرے میں کھاؤں گی۔''

''لیکن بی بی جی یہاں...''

''تم نے میری بات سن لی ہے؟'' رمل کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''جی بی بی۔''

''اب تم جا سکتی ہو۔'' رمل نے کہا تو گل سر جھکا کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد رمل کو اپنے لہجے پر افسوس ہوا۔ اسے پشیمانی ہوئی۔ غصہ اترا تو اسے اکیلے کمرے میں خوف آنے لگا لیکن اب وہ گل کو بلاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس نے خود سے کہا۔ ''اچھی بات ہے سزا بھگتو۔ اس جگہ آئے تمہیں دو دن بھی نہیں ہوئے ہیں اور تم نے انسانوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔''

اس سے پہلے اسے نہیں معلوم تھا کہ جاگیردارانہ نظام کیا ہوتا ہے اور اسے اب پتا چلا تھا کہ یہ نظام چند لوگوں کو کس طرح سیکڑوں ہزاروں لوگوں کی قسمت کا مالک بنا دیتا ہے۔ اس واقعے نے رمل کو خوفزدہ تو کیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا اور اسے شدت سے انتظار تھا کہ صمد اسے ماضی کے واقعات سے آگاہ کرے۔ اس نے رات کے کھانے پر آنے کو کہا تھا اور اب رمل کو خیال آیا کہ وہ کھانا کمرے میں کھانے کو کہہ چکی تھی مگر صمد کے بارے میں اسے امید تھی کہ وہ اسے ضرور پوچھنے آئے گا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے سہم کر دیکھا اور بولی۔

''کون ہے؟ آ جاؤ۔''

اس کا خیال تھا کہ گل ہو گی لیکن وہ زرینہ کو دیکھ کر حیران رہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئی پھر کھڑی ہوگئی۔ "آپ...؟"

"ہاں ابھی گل نے بتایا ہے کہ تم کھانا کمرے میں کھانے کو کہہ رہی ہو اور شاید تمہاری طبیعت بھی خراب ہے۔" زرینہ ذرا آگے آکر بولی۔

"ہاں معمولی سا چکر آگیا تھا۔" رِل بولی پھر اسے خیال آیا۔ "آپ کھڑی کیوں ہیں؟ آئیں بیٹھیں۔"

زرینہ صوفے پر بیٹھ گئی تو رِل نے کہا۔

"لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔"

"تب تمہیں کھانے کے لیے نیچے آنا چاہیے۔"

رِل سنجیدہ ہوگئی۔ "معذرت کے ساتھ آپ لوگوں کا سلوک میرے ساتھ رشتے داروں جیسا تو نہیں ہے لیکن مہمان نوازی کے آداب کے بھی خلاف ہے۔"

"تمہارا اشارہ شاید بڑی خانم کی طرف ہے۔" خلافِ توقع زرینہ نرمی سے بولی۔ "لیکن میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ میں تمہارے آنے کے بعد جب ان سے ملی تو میں نے تمہارے لیے ان سے بات کی لیکن وہ نہ جانے کیوں کوئی جواب نہیں دے رہی ہیں۔"

رِل مایوس ہوئی۔ "کیا وہ انکار کر رہی ہیں؟"

"نہیں... مگر کوئی جواب بھی نہیں دیتی ہیں۔"

"وہ مجھے پسند نہیں کرتیں؟"

"تم پہلے سے ایسی باتیں مت سوچو۔" زرینہ کھڑی ہوگئی۔ "تم نیچے آؤ گی؟"

رِل نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے، میں آؤں گی۔"

رِل حیران ہوئی۔ وہ بہت مضبوط ارادے کی مالک تھی اور اس کے فیصلے اتنی آسانی سے نہیں بدلتے تھے لیکن ان لوگوں میں نہ جانے کیا بات تھی۔ پہلے وہ صمد کی بات مان گئی اور اپنا فیصلہ بدل لیا اور اب وہ زرینہ کی بات مان گئی تھی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ڈنر کے لیے نیچے نہیں جائے گی۔ شاید یہ رشتوں اور خون کی کشش تھی جو اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بارش بدستور جاری تھی البتہ اس کی شدت کم ہو رہی تھی۔ آٹھ بجے سے پہلے وہ تیار ہو چکی تھی۔ اس بار اس نے ہلکا پھلکا میک اپ بھی کیا تھا۔ لیکن جب وہ نیچے پہنچی تو یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ صمد آج حویلی نہیں آئے گا۔ بارش کی وجہ سے وہ وادی میں پانی کے ذخیرے کے پشتوں کی دیکھ بھال کے لیے چلا گیا تھا۔ یہ ذخیرہ صمد نے خود بنوایا تھا۔ زرینہ نے کہا۔

"اب وہ کل ہی آئے گا۔"

"اچھا۔" رِل نے مایوسی سے کہا تو زرینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اس بار اس نے بڑی خانم سے ملنے کو نہیں کہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اٹھنے لگی تو زرینہ نے کہا۔

"رک جاؤ، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ رِل کو نشست گاہ میں لے آئی۔ زرینہ کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات تھے۔ "تم جانتی ہو، یہ خاندان کن سانحات سے گزر رہا ہے؟"

"کسی حد تک..."

"گیارہ اگست بدھ کا دن حویلی کے لیے ہمیشہ منحوس ثابت ہوا ہے۔ آخری بار سجاد..." وہ بولتے بولتے رک گئی۔ "کاش میں نے بڑی خانم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہوتا، سجاد کو خط نہ لکھا ہوتا۔"

"میں تقدیر کی قائل ہوں۔" رِل نے کہا۔ "بابا کی قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا اس لیے وہ یہاں آئے ورنہ اتنے سالوں سے وہ امریکا میں تھے۔"

"میں نے اسے بھی سمجھایا تھا کہ گیارہ اگست سے پہلے یہاں سے چلا جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا... زرینہ! انسان اپنی موت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"اس لیے اگر آپ مجھ سے کہیں گی کہ میں گیارہ اگست سے پہلے یہاں سے چلی جاؤں تو میرا جواب بھی وہی ہوگا جو بابا نے دیا تھا۔ انسان موت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"کیا تم میری درخواست نہیں مانو گی؟" زرینہ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے مجبور نہ کریں۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد آپ مجھے کبھی یہاں نہیں دیکھیں گی۔"

"میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ تم اس حویلی کے وارثوں میں شامل ہو۔"

"اگر آپ مجھے اس خاندان کا ایک حصہ تسلیم کرتی ہیں تو جو دوسروں کے ساتھ ہوگا وہی میرے ساتھ بھی ہوگا۔"

"میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔"

"بات وہی ہے... جو میرے مقدر میں لکھا ہے اسے آپ یا میں چاہنے کے باوجود نہیں بدل سکتے۔" رِل نے کہا پھر اسے خیال آیا۔ "آپ جانتی ہیں کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"

زرینہ کھڑی ہوگئی اور اس کے چہرے پر وہی سرد تاثر آگیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ "میرا خیال

ہے کہ اب تم آرام کرو۔"

رِل اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا موڈ پھر خراب ہو گیا تھا۔ اگر زرینہ اسے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی تو انکار بھی کر سکتی تھی۔ اس طرح توہین آمیز انداز میں نظرانداز کیوں کیا؟ زرینہ کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ اس نے کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھوئے اور نائٹ سوٹ پہن کر بستر پر آگئی۔ آج سردی ہو رہی تھی اس لیے گل ہلکے کمبل کے بجائے موٹا اور گرم کمبل لے آئی۔ اس نے کمبل بیڈ پر رکھ کر رِل سے پوچھا۔

"بی بی جی! کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں باہر ہوں۔"

نو بج گئے تھے اس لیے رِل نے اسے روکنا ضروری نہیں سمجھا۔ "نہیں، تم ایک جگ میں پانی لا دو اور پھر چلی جانا۔ میں سونے جا رہی ہوں۔"

گل پانی کا جگ اور گلاس لے آئی اور پھر چلی گئی۔ رِل نے اندر سے دروازہ اور تمام کھڑکیاں بند کیں۔ بالکونی والا دروازہ بھی بند کر لیا۔ شام والے واقعے کے بعد اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی لائٹس بند کر کے چھوٹی لائٹ جلا لی۔ اس سے کمرے میں مکمل اندھیرا ابھی نہیں ہوا تھا اور روشنی اتنی تیز بھی نہیں تھی کہ اس کی نیند میں مخل ہوتی۔ رِل نے کمبل کمر تک کھینچ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند آنکھوں سے دور تھی۔ حالانکہ جب وہ نیچے سے آئی تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس سو جائے۔ اب سونے کی کوشش کر رہی تھی تو نیند غائب تھی۔ تنگ آکر وہ اٹھ بیٹھی اور اس نے بیڈ کے اوپر دیوار میں لگا ریڈنگ لیمپ آن کر کے ادھورا ناول اٹھا لیا مگر اس میں چند خوفناک سین پڑھ کر اسے ڈر لگا تو اس نے ناول رکھ دیا اور تکیہ سینے سے لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کمرے میں ٹی وی نہیں تھا ورنہ وہ ٹی وی سے وقت گزاری کر لیتی۔ باہر بارش جاری تھی لیکن بند کھڑکیوں کی وجہ سے کوئی آواز اندر تک نہیں آ رہی تھی۔

اچانک رِل کو لگا جیسے کہیں دور کسی عورت نے اذیت بھری سسکی لی ہو۔ رِل کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

وہ اس آواز کو وہم قرار نہیں دے سکتی تھی۔ بے شک آواز دور کی تھی لیکن بہت واضح تھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ دوسری بار آواز زیادہ واضح اور زیادہ نزدیک سے آئی۔ رِل نے بے ساختہ بالکونی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے آواز بالکونی سے آئی ہو لیکن بالکونی خالی تھی اور وہاں تک رسائی کا واحد راستہ اس کے کمرے سے گزر کر جاتا تھا۔ کمرا بند تھا، پنکھا ساکت تھا، اس کے باوجود بالکونی کے دروازے اور کھڑکیوں پر موجود پردے لہرانے لگے جیسے شیشے غائب ہوں اور باہر سے ہوا ان پردوں کو اڑا رہی ہو۔ پھر رِل کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ اس نے پردہ اڑنے سے بالکونی کے دروازے کے نچلے حصے میں کسی عورت کے پاؤں دیکھے جس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ رِل نے بمشکل اپنی چیخ پر قابو پایا اور بستر سے اتر کر دروازے کی طرف لپکی۔ کسی چیز سے اس کا پاؤں الجھا اور وہ منہ کے بل گری۔ قالین کی وجہ سے اسے شدید چوٹ نہیں آئی، اس کے باوجود ماتھا لگا تو اسے چکر آگیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی لیکن وہ جلد از جلد اس کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ ہر لمحے اسے لگ رہا تھا کہ ابھی وہ عورت بالکونی کا دروازہ کھول کر اندر آجائے گی اور وہ اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جب اس نے پہلی بار اس عورت کا چہرہ دیکھا تھا تو اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں کی جگہ موجود گڑھے اسے نگل جانا چاہتے ہوں۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر راہداری میں آگئی۔ راہداری ویران تھی اور تمام کمروں کے دروازے حسبِ معمول بند تھے۔ رِل نے چیخ کر کسی کو مدد کے لیے پکارنا چاہا لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بیک وقت خوف اور بے بسی کے احساس نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ وہ ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک راہداری کے آخری سرے پر واقع کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے کسی مرد کے زور زور سے بولنے اور ایک عورت کی التجا آمیز آوازیں آنے لگیں۔ مرد کے لہجے میں نفرت اور درشتی نمایاں تھی۔ کمرے سے بہت تیز روشنی نیم روشن راہداری میں آ رہی تھی۔ رِل سحرزدہ سی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ خیال محو ہو گیا تھا کہ یہ کمرا گزشتہ انتالیس برسوں سے خالی تھا اور اس میں کوئی نہیں رہتا تھا۔

پھر کسی کشش کے زیرِ اثر وہ اس طرف بڑھنے لگی۔ اس کے پاؤں لرز رہے تھے لیکن کوئی انجانی طاقت اسے کشاں کشاں اس طرف لیے جا رہی تھی۔ منظر اب بھی رہ رہ کر گھوم رہا تھا اور رِل کو اپنی سوچ پر مکمل اختیار نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ کمرے کے اتنے قریب آگئی کہ اندر کا منظر نظر آنا شروع ہو گیا۔ پہلی نظر میں ایسا لگا جیسے کمرے میں کوئی طوفان آکر گزر گیا ہو۔ کوئی چیز صحیح سلامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیشے اور دوسرے میٹریل سے بنی آرائشی اشیا، بوتلیں، کپڑے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری چیزیں بکھری ہوئی تھیں اور ان میں سے اکثر ٹوٹ چکی تھیں۔ ایک طرف پلاسٹر آف پیرس سے بنے مجسمے کا سر دھڑ سے الگ ہو کر گرا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل سے سرخ سیال بہہ کر پھیلا ہوا تھا۔ مرد اور عورت کی آوازیں آرہی تھیں لیکن وہ اب تک سامنے نہیں آئے تھے۔ رِل رفتہ رفتہ کمرے کے سامنے پہنچ گئی اور اب وہ پورے کمرے کا منظر واضح دیکھ سکتی تھی مگر اسے کمرے میں کوئی نظر نہیں آیا۔ مرد اور عورت کے لڑنے کی آوازیں بدستور آرہی تھیں لیکن وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ آوازیں بالکل سامنے سے آرہی تھیں۔ رِل کا ذہن شدت سے چکرانے لگا۔

یہ پُراسرار معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کمرے میں کوئی نہیں رہتا تھا لیکن اب یہاں سے آوازیں آرہی تھیں اور کمرا بھی کھلا ہوا تھا اور اسے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں تو رِل بے ساختہ راہداری کے آخر میں دیوار سے چپک گئی۔ دو سائے کمرے سے نکلے اور پھر اس نے اسی عورت کو دیکھا۔ وہ اسی سفید لباس میں تھی۔ اس کے چہرے اور سر سے خون بہہ رہا تھا اور زخموں کے نشانات تھے جیسے اس کے ساتھ مار پیٹ کی گئی ہو۔ اس کا سفید لباس بھی جا بجا لہو رنگ ہو رہا تھا۔ وہ جیسے کسی سے ڈر کر پیچھے ہٹ رہی تھی مگر رِل کو دوسرا شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ عورت کی آنکھیں سلامت تھیں اور ان سے اتنا زیادہ خوف جھلک رہا تھا کہ رِل نے اس سے پہلے کبھی کسی کی آنکھوں میں اتنا خوف نہیں دیکھا تھا۔

”خدا کے لیے... خدا کے لیے۔“ عورت کے منہ سے درد بھری آواز نکلی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ وہ کس سے ڈر رہی تھی اور کس سے بات کر رہی تھی۔ رِل کو کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سحر زدہ سی عورت کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک عورت الٹ کر گری جیسے کسی نے اسے تھپڑ مارا ہو۔ آواز بھی ویسی ہی آئی تھی۔ وہ روتے اور کراہتے ہوئے فرش پر چاروں ہاتھوں پیروں کے بل رینگنے لگی۔ پھر کسی نے اس کی کمر پر وار کیا اور وہ دوبارہ گری۔ کچھ دیر ساکت پڑی رہی۔ پھر ہمت کر کے دوبارہ اٹھی اور... کھڑی ہو گئی پھر اس نے راہداری میں مخالف سمت میں موجود پہلا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ چیخ چیخ کر پناہ مانگ رہی تھی۔ پھر وہ اس کمرے کے برابر والے کمرے تک آئی جس سے وہ خود نکلی تھی۔ یہ رِل کے کمرے سے پہلے والا کمرا تھا۔ وہ اس کا دروازہ پیٹنے لگی۔ اس کی درد بھری آواز پوری راہداری میں گونج رہی تھی۔

رِل کو تعجب ہوا، اس کے سوا کوئی نہیں نکلا تھا۔ یہاں زرینہ اور بڑی خانم کے کمرے تھے اور بڑی خانم کے ساتھ مستقل رہنے والی ملازمہ بھی تھی۔ کسی نے اس عورت کی چیخیں اور فریاد نہیں سنی تھی۔ ابھی عورت دروازہ پیٹ رہی تھی کہ عقب سے نظر نہ آنے والے شخص نے اس پر دوبارہ وار کیا۔ اس بار اس کے سر پر کچھ مارا تھا۔ عورت کا سر پھٹ گیا اور وہ چیخ کر دیوار سے ٹکرائی پھر دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھی۔ اب وہ رِل کے کمرے کے دروازے پر تھی۔ وہ ہاتھ مار کر اپنی کمزور ہو جانے والی آواز میں پناہ کے لیے التجا کر رہی تھی۔ اچانک وہ مڑی اور اس نے چیخ مار کر جھکائی دی جیسے کسی وار سے بچ رہی ہو اور پھر پلٹ کر مخالف سمت کے دوسرے کمرے کے دروازے تک آگئی اور اسے بجانے لگی۔ خوف سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔ اب اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ رِل سوچ رہی تھی کہ یہ عورت آگے کیوں نہیں جا رہی ہے؟ خالی کمروں کے دروازے پیٹ رہی ہے، اسے زرینہ یا بڑی خانم کے کمرے کی طرف جانا چاہیے۔

اس دروازے سے مایوس ہو کر عورت اس سے اگلے دروازے تک پہنچی۔ اس کی بے تابی سے لگ رہا تھا کہ اگر اسے پناہ نہ ملی تو پھر شاید موت ہی اسے پناہ دے گی۔ وہ اب رِل کے کمرے سے آگے والے دروازے کو بجا رہی تھی۔ یہ راہداری میں پہلا کمرا تھا۔ اس کے مخالف میں بڑی خانم کا کمرا تھا۔ پھر وہ بڑی خانم کے کمرے کی طرف مڑی۔ اس کمرے کا دروازہ بجایا تو رِل نے سکون کا سانس لیا۔ اب اس عورت کو پناہ مل جاتی اور وہ اس نظر نہ آنے والے شخص کی دست برد سے بچ جاتی۔ مگر مسلسل دروازہ بجانے پر بھی کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا اور نہ ہی کوئی آواز آئی۔ عورت اب سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ مسلسل چیخنے سے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹی تھی کہ اچانک چیخ کر نیچے گری اور پھر کوئی اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ عورت چیخ رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر نادیدہ شخص اسے پوری قوت اور پوری بے رحمی سے کھینچتا ہوا آخری کمرے تک لایا اور جیسے ہی وہ اندر گئے، دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں بے پناہ سناٹا چھا گیا۔ رِل سوچ رہی تھی کہ ابھی جو اس نے دیکھا تھا، کیا وہ سچ تھا یا پھر اس نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ اسی لمحے کسی نے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھا۔ رِل نے مڑ کر دیکھا تو اس کے سامنے وہی عورت تھی۔ زخم زخم چہرہ اور آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے۔ رِل کے منہ سے بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساختہ چیخ نکلی اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

نیند یا غنودگی میں رمل کو کئی بار ایسا لگا جیسے لوگ اس کے پاس بول رہے ہوں، اس کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔ وہ ان کی باتیں سن رہی تھی لیکن اس کا ذہن انہیں گرفت کرنے میں ناکام تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر تھی۔ ایک ہلکا کمبل اس کے سینے تک موجود تھا اور اس کا جسم یوں سن اور کمزور ہو رہا تھا جیسے وہ نہ جانے کتنے دنوں کی نیند کے بعد اٹھی ہو۔ سب سے پہلے اس کی نظر قالین پر سر جھکائے بیٹھی گل کی طرف گئی۔ پھر اس نے ڈرپ اسٹینڈ دیکھا جس پر ڈرپ لٹکی ہوئی تھی اور اس سے قطرہ قطرہ ڈرپ نکل کر اس کے بازو میں لگی سوئی سے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا گئی۔ کیا میں بیمار ہوں؟ اس نے سر گھما کر باہر کی طرف دیکھا تو اسے باہر تاریکی کی جھلک دکھائی دی۔ اسے تعجب ہوا کہ ابھی تک رات ہی تھی، کیا صبح نہیں ہوئی؟ گل نے اس کی حرکت محسوس کر لی اور لپک کر اس کے پاس آئی۔ وہ جوش سے بولی۔ ”بی بی جی! شکر اللہ کا آپ کو ہوش آ گیا... سب پریشان ہو گئے تھے۔“

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ رمل نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”اٹھیں نہیں، لیٹی رہیں آپ۔“ گل نے کہا۔ ”ابھی ڈاکٹر آپ کو دیکھ کر گیا ہے۔ ایک منٹ میں اسے بلاتی ہوں اور چھوٹی خانم کو بتاتی ہوں۔ آپ لیٹی رہیں۔“

”ذرا رکو، میرا حلق خشک ہو رہا ہے، پہلے مجھے پانی دے دو۔“

گل نے اسے سہارا دے کر پانی پلایا پھر وہ باہر چلی گئی۔ رمل کی توانائی رفتہ رفتہ بحال ہو رہی تھی لیکن بازو میں لگی ڈرپ کی وجہ سے وہ اٹھ نہیں سکی۔ پانچ منٹ بعد زرینہ اندر آئی۔ اس نے جھک کر رمل کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

”شکر ہے بخار اتر گیا۔“

”مجھے کیا ہوا تھا؟“

”پتا نہیں، میں رات کو کمرے سے نکلی تو تم راہداری کے آخری حصے میں بے ہوش پڑی تھیں اور تمہیں بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔“

”آج رات؟“

زرینہ مسکرائی۔ ”آج نو تاریخ کی رات ہے اور ابھی دس بجے ہیں۔ تم سات تاریخ کی رات بارہ بجے مجھے راہداری میں بے ہوش نظر آئی تھیں اور تمہیں تقریباً دو دن بعد ہوش آیا ہے۔“

رمل حیران رہ گئی۔ ”دو دن بعد؟“

زرینہ نے سر ہلایا۔ ”بخار بہت شدید تھا اور بار بار چڑھ اتر رہا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر مسلسل دیکھتا رہا اور آج دوپہر میں بخار اتر گیا۔ کمزوری سے بچانے کے لیے تمہیں ڈرپ اور طاقت کی دوائیں دیتے رہے تھے۔ اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”ہلکی سی کمزوری ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تم اتنی رات گئے باہر کیوں نکلی تھیں اگر تمہاری طبیعت خراب تھی؟“ زرینہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

”مجھے نہیں یاد کہ میں کب باہر گئی۔ میری طبیعت ضرور خراب تھی لیکن بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میں لیٹ کر سو گئی تھی۔“ رمل نے اصل بات گول کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے نائٹ سوٹ بھی پہن لیا تھا۔“

”ہاں تم اسی لباس میں تھیں اور شاید جب راہداری میں بے ہوش ہوئیں تو تمہیں سردی لگ گئی۔“

اس دوران میں گل ڈاکٹر کو لے آئی۔ اس نے رمل کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”یہ ٹھیک ہیں، بس کمزوری ہے۔ ایک دو دن ہلکی غذا لیں اور ٹھنڈ کے معاملے میں احتیاط کریں۔ فی الحال نہانے سے گریز کریں۔ ہاں، گرم پانی میں تولیا بھگو کر استعمال کر سکتی ہیں۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ کے لیے بستر سے نہ اٹھیں۔“

ڈاکٹر ہدایات کے ساتھ کچھ گولیاں دے کر رخصت ہو گیا۔ اس نے ڈرپ نکال دی تھی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ گل اس کے ساتھ سامان لے گئی۔ اکیلے ہوتے ہی زرینہ نے کہا۔ ”کسی کو نہیں معلوم ہے کہ تم راہداری میں بے ہوش پائی گئی تھیں۔ اس لیے کسی کو بتانا بھی مت۔ میں تمہارے لیے سوپ بھجواتی ہوں۔“

رمل اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا صمد اور بڑی خانم اسے دیکھنے آئے تھے لیکن وہ پوچھ نہیں سکی۔ زرینہ چلی گئی۔ کچھ دیر میں گل آئی تو رمل اس کی مدد سے واش روم گئی۔ پہلی بار کھڑے ہونے پر اسے چکر آ گیا مگر چلنے اور حرکت کرنے سے اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ ڈاکٹر نے نہانے سے منع کیا تھا اس لیے اس نے گرم پانی میں تولیا بھگو کر جسم صاف کیا۔ اب وہ خود کو کہیں بہتر اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ سوپ نے اسے مزید سہارا دیا اور اس نے گل سے چائے کی فرمائش کی۔ گل چائے لینے چلی گئی اور رمل سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے جو دیکھا وہ حقیقت تھی یا اس کے بخار زدہ ذہن نے اسے کوئی خواب دکھایا تھا مگر نہیں... وہ سب اس کے ذہن میں اتنا

واضح تھا کہ وہ کسی صورت اسے خواب تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ سوچ میں گم تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اجازت دی تو صمد اندر آیا۔ رمل جلدی سے اٹھ بیٹھی اور اس نے دوپٹا لے لیا۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“ صمد اس کے پاس آ کر بولا۔

”ٹھیک ہوں لیکن آپ کو کیا؟“ رمل نے شکوہ کیا۔ ”اب دیکھنے آئے ہیں؟“

”اب؟“ وہ ہنسا۔ ”کل سارا دن میں تمہارے پاس ہی رہا ہوں، صرف کھانے کے لیے یہاں سے گیا تھا۔ رات کو بھی نہ جاتا لیکن مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے چلا گیا پھر آج صبح سے یہاں تھا، دوپہر میں جانا پڑا۔ فارم میں ایک مسئلہ سامنے آ گیا تھا، اس سے نمٹ کر ابھی آ رہا ہوں۔“

رمل شرمندہ ہو گئی۔ ”سوری... میں سمجھی کہ آپ آئے ہی نہیں۔“

”صرف میں نہیں... بڑی خانم بھی آئی تھیں حالانکہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے میں انہیں واپس لے کر گیا تھا۔“

رمل کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”سچ... دادی جان آئی تھیں؟“

صمد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”رمل! شاید تمہیں یقین نہیں ہے لیکن یہاں موجود سب لوگ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔“

”سب کون؟“ رمل نے پوچھا۔

”سب... بڑی خانم، چھوٹی خانم اور... میں بھی۔“ آخری الفاظ صمد نے جھجک کر کہے۔ رمل شرما گئی۔ اسی اثنا میں گل چائے لے آئی۔ اس نے صمد کو موجود پا کر جلدی سے سلام کیا اور چائے کا پوچھا۔

”ہاں لے آؤ، لیکن اس سے پہلے ایک کرسی لے آؤ۔“

گل کے جانے کے بعد رمل نے کہا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے تمام واقعات کے بارے میں بتائیں گے۔“

”ہاں، کہا تو تھا لیکن تمہاری طبیعت خراب ہو گئی۔ اب بھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ رمل نے جلدی سے کہا۔ ”اور دو دن سے آرام ہی تو کر رہی تھی۔“

”پھر بھی آرام کی ضرورت تو ہے۔“ صمد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، یہ بتاؤ کہ تم باہر کیوں گئی تھیں؟ چھوٹی خانم بتا رہی ہیں کہ تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔“

”ہاں، ان کو میں نے یہی کہا ہے۔“

صمد چونکا۔ ”یعنی اصل بات کچھ اور ہے؟“

رمل نے سر ہلایا۔ ”میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی لیکن پہلے آپ مجھے بتائیں کہ یہ کیا پُراسراریت ہے جس نے ہمارے خاندان کو ختم کر کے رکھ دیا ہے؟“

صمد سوچ میں پڑ گیا جیسے واقعات ذہن میں تازہ کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ”واقعات ناقابلِ یقین ہیں۔ خود مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا جب تک میں نے خود ان کا مشاہدہ نہیں کر لیا۔“

☆☆☆

اکبر خان اور امیر خان اپنے باپ کے دو ہی وارث تھے۔ یہ سارا علاقہ انگریزوں کے دور میں اسے الاٹ ہوا تھا۔ پھر مرنے سے پہلے اس نے طے کر دیا کہ پہاڑ کا شمالی حصہ امیر خان کا ہوگا اور جنوبی حصہ اکبر خان کو ملے گا۔ اکبر خان کے پانچ بیٹے تھے۔ اکبر خان خود معمولی پڑھا لکھا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے پڑھیں۔ اسے بیٹی کی خواہش تھی لیکن قدرت نے اس کے مقدر میں صرف بیٹے لکھے تھے۔ اس لیے جب امیر خان کے گھر پانچویں اولاد بیٹی کی صورت میں ہوئی تو اس نے بھائی سے اسے مانگ لیا۔ زرینہ، سجاد سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ زرینہ سے بڑی امینہ پہلے ہی زاہد خان کی منگ تھی۔ مگر اکبر خان کو یہ بیل منڈھے چڑھتی ہوئی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی وجہ زاہد خان کا کردار اور فطرت تھی۔ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے برعکس فطرت کا مالک تھا۔ خود پسند، خود غرض، تنگ نظر اور نہایت سفاک۔ بچپن سے اسے دوسروں کو اذیت دے کر خوشی ہوتی تھی۔ گھر میں ہوتا تو بھائیوں کو مارتا پیٹتا اور ان کی چیزیں توڑ دیتا۔ باہر جاتا تو ملازموں کے بچوں پر تشدد کرتا۔ شکایتیں آئیں تو مجبوراً اکبر خان نے اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔

گھر میں قید ہو کر زاہد خان نے گھر والوں کا جینا حرام کر دیا۔ بھائی اس سے چھوٹے تھے لیکن اتنے بھی چھوٹے نہیں تھے کہ اس کی زیادتیاں خاموشی سے برداشت کرتے۔ نتیجے میں جھگڑے شروع ہو گئے اور ایک موقع پر ریاض اور عماد نے مل کر زاہد کو مارا تو اکبر خان کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ ان کے خاندان میں بڑوں کا ادب کیا جاتا تھا اور یہی تربیت اکبر خان اور بڑی خانم نے اپنی اولاد کو دی تھی۔ اس واقعے نے اکبر خان اور بڑی خانم کو فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ زاہد کو گھر سے دور شہر بھیج دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے۔ وہ وہیں رہتا اور وہیں تعلیم حاصل کرتا۔ اکبر خان نے پشاور میں اس کے لیے گھر لیا اور ملازم رکھے جو اس کی خدمت کرتے تھے۔ دولت کی کمی نہیں تھی اس لیے وہ ہر مہینے بڑی رقم زاہد کو بھیجتا تھا۔

زاہد سے جان چھڑاتے ہوئے اکبر خان شاید یہ بھول گیا تھا کہ اس نوجوان لڑکے کو اکیلے رہنے کا موقع ملے گا تو وہ مزید بگڑ جائے گا۔ کئی سال بعد اکبر خان کو پتا چلا کہ زاہد نہ صرف شراب کا عادی ہو گیا ہے بلکہ اس نے خراب عورتوں سے تعلقات بھی استوار کر لیے ہیں۔ اس نے زاہد پر سختی کرنا چاہی لیکن بائیس سال کا زاہد اس کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ اب اکبر خان کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ اس نے زاہد کا جیب خرچ بند کر دیا لیکن زاہد نے جواب میں جرم کی راہ اختیار کی تو مجبوراً اکبر خان کو اس کا جیب خرچ بحال کرنا پڑا۔ زاہد اس کے لیے ناسور بن گیا تھا جس کا واحد علاج یہ تھا کہ اسے کاٹ کر جسم سے الگ کر دیا جائے مگر وہ اس کی اولاد تھا۔ اکبر خان بیٹے کی وجہ سے جلتا کڑھتا رہا اور صرف پچاس برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت سجاد بہت چھوٹا تھا۔ اس کے اور زاہد کے درمیان بیس برسوں کا فرق تھا۔ مرنے سے پہلے اکبر خان نے خود امینہ سے زاہد کی منگنی ختم کر دی تھی اور امیر خان کو مجبور کیا کہ اس کی شادی کر دے۔ امیر خان نے امینہ کی شادی اس کی ماں کے خاندان میں کر دی تھی۔

باپ کے مرتے ہی زاہد حویلی میں واپس آ گیا اور باپ کی دولت اپنے بے جا شوق کی نذر کرنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ جاگیر کو ڈبو دیتا، بڑی خانم نے بروقت فیصلہ کیا اور انہوں نے خاندان کے بڑوں کو جمع کر کے یہ فیصلہ کروایا کہ جاگیر کی آمدنی کے چھ حصے ہوں گے اور وہ اس کے چھ وارثوں میں برابر تقسیم ہوں گے۔ البتہ جاگیر تقسیم نہیں ہوگی۔ زاہد نے اس فیصلے پر بہت ہنگامہ کیا لیکن جب اسے دھمکی دی گئی کہ اس فیصلے سے انحراف کرنے پر اسے یہاں سے نکال دیا جائے گا اور پھر وہ یہاں نہیں آ سکے گا تو وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ویسے بھی اس کا دل یہاں نہیں لگتا تھا اس لیے وہ پشاور واپس چلا گیا۔ جاگیر وہ صرف رقم لینے آتا تھا۔ بڑی خانم کی دانش مندی نے جاگیر اور اس کی آمدنی کو زاہد خان کی دست برد سے بچا لیا تھا۔ زاہد کے علاوہ تمام بھائی پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے ذہن کے تھے، انہوں نے زمین کو اچھی طرح سنبھال لیا۔ باپ کی زندگی میں ہی عماد اور ریاض زمین پر اس کے ساتھ دیکھ بھال کا کام کرتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد شہباز بھی اس میں شریک ہو گیا لیکن سجاد کو زمین سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی خانم سے کہا۔ ”میں پڑھنا چاہتا ہوں۔“

بڑی خانم نے اس کی خواہش کے مطابق اسے کالج میں پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا۔ اس نے ایف ایس سی کا انتخاب کیا۔ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ کالج میں پہلے سال کے امتحان سے پہلے سجاد گھر آیا... کیونکہ اس کے بعد اسے سال بھر تک گھر آنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کا کالج گرمیوں میں تین مہینے کے لیے بند ہوتا تھا اور وہ ستمبر میں واپس جاتا۔ گھر پر ایک حیرت انگیز خبر اس کی منتظر تھی۔ زاہد خان نے شادی کر لی تھی۔ وہ کچھ دن پہلے حویلی آیا تو اس کے ساتھ ایک جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ رخسانہ سے زاہد نے چند مہینے پہلے ہی شادی کی تھی۔ رخسانہ کا تعلق افغانستان سے تھا۔ اس کا باپ جنگ کے زمانے میں ملک چھوڑ کر یہاں چلا آیا اور پھر اس نے چکر چلا کر یہیں رہائش اختیار کر لی۔ شامیر خان اور زاہد کے درمیان کاروباری تعلق تھا۔

شامیر خان جرائم پیشہ شخص تھا۔ شریف تو خود زاہد بھی نہیں تھا اور وہ جس کاروبار میں شریک تھا، وہ اصل میں منشیات اور ہتھیاروں کی اسمگلنگ کا تھا لیکن شامیر بدمعاش بھی تھا اور اس کے پاس لڑنے مرنے والے ساتھیوں کی کمی نہیں تھی۔ زاہد اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ راضی ہو گیا۔ رخسانہ سے نکاح کر کے وہ اسے کچھ عرصے بعد حویلی لے آیا تھا۔ بڑی خانم اس شادی پر راضی نہیں تھیں اس لیے انہوں نے اور باقی سب نے زاہد اور رخسانہ کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ سجاد کے علاوہ تمام ہی بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ریاض، عماد اور شہباز کی عمروں میں ایک دو سال کا فرق تھا اس لیے بڑی خانم نے ان کی شادیاں ایک سال کے اندر ہی کی تھیں۔ سجاد اس وقت اٹھارہ سال کا تھا۔ بڑی خانم کی خواہش تھی کہ اس کی شادی بھی کر دی جائے لیکن سجاد نے فی الحال شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ رخسانہ ایک مظلوم عورت ہے۔ زاہد اس پر تشدد کرتا تھا اور ویسے بھی اسے ٹھیک سے نہیں رکھتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کی بیوی نہیں اس کی زرخرید کنیز ہو جس کے ساتھ وہ جیسا سلوک چاہے کرے۔ اوپر سے سب نے رخسانہ کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ سجاد نے بڑی خانم سے کہا۔ ”اس معاملے میں رخسانہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔“ بڑی خانم نے سختی سے کہا۔ ”اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ میری مرضی کے بغیر اس حویلی میں آئی ہے۔“

”اسے تو شاید پتا بھی نہ ہو کہ زاہد بھائی کون ہیں اور اسے کہاں لے جائیں گے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس شادی میں اس سے پوچھا بھی نہیں گیا ہوگا۔ اس لیے اس کے ساتھ درست رویّہ نہیں رکھا گیا ہے۔“

”آپ اس کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہیں؟“ زرینہ نے کہا۔ ان دنوں بڑی خانم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ انہیں دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ تیرا سال کی زرینہ کے لہجے میں حسد تھا۔

”اس لیے کہ وہ سچ مچ ایک مظلوم عورت ہے۔“ سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مظلوم کے ساتھ زیادتی اللہ کو پسند نہیں ہے۔“

بڑی خانم کو غصہ آ گیا۔ ”سجاد! اب تُو بتائے گا کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا ٹھیک نہیں ہے۔“

”میری ایسی مجال کہاں بڑی خانم... لیکن میں نے جو بات محسوس کی وہ کہہ دی۔ اتنا تو میرا حق بنتا ہے، اب آگے آپ کی مرضی، حویلی کا ہر فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے۔“

”تب تم اس معاملے میں مت بولو۔“ بڑی خانم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”وہ عورت اسی قابل ہے۔ اس نے زاہد کو اپنے چنگل میں پھنسایا ہے۔“

سجاد کو افسوس ہوا۔ بڑی خانم اپنے بیٹے کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس کی زندگی میں کسی دوسرے کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف اپنے لیے جیتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر چیز اور ہر انسان صرف استعمال کی چیز ہوتی ہے۔ رخسانہ خاصی خوب صورت عورت تھی۔ شاید اسی وجہ سے زرینہ نے سجاد کی بات کا غلط مطلب نکالا تھا۔ حالانکہ سجاد کے نزدیک وہ صرف اس کی بڑی بھابی تھی اور پوری طرح احترام کے لائق تھی۔ مگر حویلی والے اسے اس کا مقام دینے کو تیار نہیں تھے۔ زاہد خان کو پہلے ہی اس کی پروا نہیں تھی۔ اب گھر والوں کی طرف سے اطمینان ہوا تو وہ مزید شیر ہو گیا۔ رخسانہ اس کے نزدیک اس شخص کی بیٹی تھی جس نے زاہد کو دھوکا دے کر اس کی بہت بڑی رقم ہتھیا لی اور جواب میں اسے اپنی بیٹی تھما دی تھی۔ وہ اکثر اسے کہتا کہ اس کا باپ جتنی رقم کھا کر بیٹھ گیا ہے، اس میں وہ رخسانہ جیسی دس عورتیں حاصل کر سکتا تھا۔ وہ بے چاری سہمے ہوئے انداز میں صرف اتنا کہتی۔

”خان جی! اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”تیرا قصور یہ ہے کہ تو اس شخص کی بیٹی ہے۔“

حالانکہ شامیر خان نے بے غیرتی سے اپنی بیٹی زاہد جیسے درندے کے حوالے کر دی تھی۔ رخسانہ اس سارے معاملے کی مظلوم ترین فریق تھی جسے اپنے باپ کے جرم کا تاوان ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ بڑی خانم کا رویّہ سجاد نے دیکھ لیا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی رخسانہ سے ہمدردی رکھتے تھے تب بھی بڑی خانم، اپنی بیویوں اور زاہد کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اوپری بیڈ رومز میں کونے والا کمرا زاہد کا تھا۔ پانچوں بھائی اور بڑی خانم اسی ایک فلور پر رہتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ زاہد شراب پیتا ہے۔ بڑی خانم نے اس پر پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں پیے گا اور نشے کی حالت میں کمرے سے باہر نہیں آئے گا۔ اس لیے زاہد سرِ شام ہی کمرے میں قید ہو جاتا۔ جب زیادہ پینے سے نشہ ہو جاتا تو وہ کسی بہانے سے رخسانہ پر مشقِ ستم کرتا تھا۔ مار پیٹ اور گالیوں و دھمکیوں کی آوازیں باہر راہداری تک سنائی دیتی تھیں۔

زاہد مالی مشکلات کا شکار تھا۔ پشاور والا مکان گنوا چکا تھا۔ اسی مکان کو فروخت کر کے اس نے شامیر خان کے ساتھ کاروبار میں رقم لگائی تھی۔ جاگیر سے حاصل ہونے والا اپنا حصہ وہ چھ مہینے سے زیادہ نہیں چلاتا تھا اس لیے اسے ہمیشہ اضافی رقم کی ضرورت رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خالی ہو رہا تھا۔ اس لیے معمول سے زیادہ پینے لگا تھا اور اس کا خبیث باطن بھی زیادہ ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔ رخسانہ پر اس کی سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رخسانہ کو بلا ضرورت کمرے سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بے چاری ہمہ وقت ایک قید میں رہتی تھی۔ کمرے میں اس کا شوہر ہوتا اور وہی اس کے لیے سب سے زیادہ باعثِ آزار تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے جسم پر زخم لگاتا تھا تو اپنی زبان سے اس کی روح پر زخم لگاتا تھا۔ اگست کا مہینا آیا تو زاہد حد سے زیادہ پینے لگا۔ وہ صبح سے شام تک نشے میں رہتا اور اسی عالم میں سو جاتا۔

رخسانہ کی شامت بھی زیادہ آنے لگی تھی۔ مار پیٹ اور گالیوں کی آوازیں پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہونے لگی تھیں۔ ایک شام زاہد رخسانہ کو تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اتفاق سے سجاد اپنے کمرے میں موجود تھا۔ سجاد کا کمرا وہی تھا جو ربل کو ملا تھا۔ رخسانہ رو رہی تھی اور دبی آواز میں فریادیں کر رہی تھی کہ زاہد اسے کس بات کی سزا دے رہا ہے۔ سجاد سنتا رہا پھر اس سے برداشت نہیں ہوا تو وہ کمرے سے نکلا اور اس نے زاہد کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آنے والی آوازیں رک گئیں پھر زاہد باہر آیا، اس نے کھردرے لہجے میں سجاد سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”زاہد بھائی! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ اس بے گناہ عورت کے ساتھ بُرا سلوک کیوں کر رہے ہیں؟“

زاہد نشے اور غصے میں تھا۔ ”وہ میری بیوی ہے اور میں اس کے ساتھ جو چاہے کروں، تم کون ہوتے ہو اس معاملے میں بولنے والے؟“

سجاد کو بھی غصہ آ گیا۔ ”میں آپ کا بھائی ہوں اور رشتے سے وہ میری بھابی لگتی ہے۔ آپ کی وجہ سے حویلی کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔“

زاہد جیسے پاگل ہو گیا، اس نے پہلے سجاد کا گریبان پکڑ لیا لیکن دوسرے بھائیوں نے آ کر اسے چھڑایا تو وہ گن لینے کے لیے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے الماری سے پستول بھی نکال لیا تھا لیکن اس موقع پر رخسانہ نے شوہر کو روک لیا، وہ اس سے چمٹ گئی اور اسے باہر آنے سے روک دیا۔ اس دوران میں بھائی سجاد کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر زاہد کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی بڑی خانم کے سامنے پیشی ہوئی۔ وہ کڑے تیوروں کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ”سجاد! تجھے کیا ضرورت تھی زاہد سے الجھنے کی؟“

وہ ابھی تک غصے میں تھا۔ ”بڑی خانم... میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ اس طرح تو کوئی جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے اور آپ سب خاموش ہیں۔“

”سجاد!“ بڑی خانم نے گرج کر کہا۔ ”تجھے کہا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھ اور زاہد کے معاملے میں دخل نہ دے۔“

”بہتر ہے۔“ سجاد نے تلخی سے کہا۔ ”اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔“

سجاد اسی وقت وہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا لیکن پھر بھائیوں اور بھابیوں نے اسے زبردستی روک لیا۔ سجاد ان کے آگے مجبور ہو گیا۔ لیکن اب وہ زیادہ وقت حویلی سے باہر رہتا تھا اور شام کو اپنے کمرے میں سونے کے بجائے مہمان خانے میں رک جاتا تھا۔ گیارہ اگست کے دن صبح سے موسم بارش والا تھا اور شام ہوتے ہی گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ سجاد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ مہمان خانے میں رکنے کے بجائے بڑی خانم کے حکم پر اوپر کمرے میں آ گیا۔ حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے بخار ہو رہا تھا اور سر میں درد تھا۔ اس نے رات کو برائے نام کھایا اور دوا کھا کر لیٹ گیا۔ رات کسی وقت اس کے ذہن پر غنودگی سی طاری تھی۔ وہ جاگ رہا تھا لیکن اس کا ذہن ارد گرد کا ادراک نہیں کر پا رہا تھا۔ اچانک اسے رخسانہ کے چلّانے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی زاہد کی چیخم دھاڑ بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔

زاہد حد سے زیادہ تشدد پر اتر آیا تھا۔ رخسانہ کی چیخوں میں کرب اور اذیت نمایاں تھی۔ سجاد نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مارے نقاہت کے اس سے اٹھا نہیں گیا۔ آوازوں سے لگ رہا تھا، رخسانہ کمرے سے نکل آئی تھی اور زاہد کے تشدد سے بچنے کے لیے دوسروں سے پناہ کی فریاد کر رہی تھی۔ وہ دروازے پیٹ رہی تھی لیکن کوئی اس کی فریادیں نہیں سن رہا تھا، سب گونگے بہرے بن کر بیٹھے تھے۔ رخسانہ باری باری سب کے دروازے پر جا رہی تھی۔ پناہ کے لیے التجا کر رہی تھی مگر اس کی فریاد، اس کی التجائیں سب رائگاں... جا رہی تھیں۔ سجاد بے بسی کے عالم میں بستر پر پڑا تھا۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی کیونکہ رخسانہ اب اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ زاہد اس کے پیچھے پیچھے تھا، وہ اسے مسلسل تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں کسی درندے کی غراہٹوں سے مشابہ تھیں۔ سجاد قالین پر گرا تو دوبارہ نہیں اٹھ سکا پھر رخسانہ آگے چلی گئی۔ لیکن اسے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ زاہد اسے بالوں سے پکڑ کر کمرے میں لے جانے میں کامیاب رہا اور کچھ دیر بعد رخسانہ کی چیخیں رک گئیں۔ اچانک خاموشی ہوئی تو سب ایک عجیب سے احساسِ جرم کے ساتھ کمرے سے نکل آئے۔ سب ہی نے محسوس کیا تھا کہ کوئی خوفناک بات ہو گئی ہے۔ بڑی خانم بھی کمرے سے نکل آئی تھیں، وہ سب زاہد کے کمرے کے سامنے جمع تھے۔ پھر ریاض نے ہمت کر کے دستک دی۔ اندر سے زاہد بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”زاہد! دروازہ کھولو... تم نے رخسانہ کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

زاہد نے عجیب سی آواز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے مار دیا ہے... لیکن یہ میرے سامنے زندہ کھڑی ہے... مجھے معلوم ہے کہ اب یہ مجھے مار دے گی۔“

”زاہد! دروازہ کھول۔“ بڑی خانم بے چین ہو گئیں۔

مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اس کے بجائے کچھ دیر بعد اندر

سے فائر کی آواز آئی اور بڑی خانم چیخنے لگیں۔ ”ریاض، شہباز، عماد... دروازہ توڑ دو۔“

مگر دروازہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں تھا، یہ بڑا مضبوط دروازہ تھا۔ نوکر آئے اور انہوں نے کوشش کر کے لاک والی جگہ نکال دی اور دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہو گئے۔ بڑا خوفناک منظر تھا۔ ایک طرف رخسانہ کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ زاہد اس پر لوہے کی ایک راڈ سے تشدد کرتا رہا تھا۔ اسی راڈ سے آخری وار کر کے اس نے رخسانہ کی گردن توڑ دی تھی۔ اس کے بعد اس نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ پستول اس کے الٹے ہاتھ میں تھا جبکہ وہ سیدھے ہاتھ سے کام کرتا تھا۔ بڑی خانم تو یہ منظر دیکھ کر غش کھا کر گر گئیں۔ باقی سب کا بھی برا حال تھا۔ سجاد ویسے ہی کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے گھر میں کیا سانحہ ہو گیا ہے اور اگلا دن یہاں کتنی تاریکی... پھیلانے والا ہے۔

سجاد نے بھائی اور بھابی کی تدفین میں شرکت کی اور اگلے دن وہ شہر چلا گیا۔ وہ اس سانحے پر دل برداشتہ اور اپنے گھر والوں سے ناراض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر بڑی خانم اور دوسرے لوگ رخسانہ کے ساتھ زیادتی پر خاموش نہ رہتے اور زاہد کو باز رکھنے کی کوشش کرتے تو شاید اتنا بڑا سانحہ پیش نہ آتا۔ جس وقت وہ جا رہا تھا اور شہباز اسے گاڑی میں بس اسٹاپ تک چھوڑنے گیا تو اس نے راستے میں زاہد کے آخری الفاظ سجاد کو بتائے۔ اس نے تلخی سے کہا۔ ”زاہد بھائی نے رخسانہ کی روح کو نہیں اپنے ضمیر کو دیکھا تھا اور اسی ضمیر نے اسے خودکشی پر مجبور کر دیا۔ کاش! وہ اپنا ضمیر پہلے دیکھ لیتے۔“

شہباز اس سے متفق تھا۔ ”لیکن جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔“

سجاد اور حویلی کے دوسروں لوگوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ سوگ کا ماحول تو کچھ عرصے میں ختم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی زاہد سے خون کا رشتہ تھا لیکن سوائے خانم کے کسی کو اس سے دلی لگاؤ نہیں تھا۔ بھائی اور ان کی بیویاں اس سے بیزار رہتے تھے۔ زاہد کے بعد حویلی کا ماحول دوبارہ سے خوشگوار ہو گیا۔ ہر وقت کی کشیدگی کے ساتھ ساتھ اس کی طرف سے ہمہ وقت مالی مطالبات بھی ایک مسئلہ بنے رہتے تھے۔ جب بھائیوں کی طرف سے مخالفت ہوتی تو وہ ان سے جھگڑا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے جاگیر کے معاملات بھی خراب ہو رہے تھے۔ وقت گزرتا گیا، عماد اور شہباز صاحب اولاد ہو گئے۔ عماد کا بیٹا صمد تھا اور شہباز کے گھر بیٹی رشنا نے جنم لیا۔ ریاض کی بیوی سمیرا کے ساتھ کچھ مسائل تھے جن کی وجہ سے وہ کئی بار ماں بنتے بنتے رہ گئی اور اس کا علاج جاری تھا۔

پانچ سال بعد سجاد انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے واپس حویلی آیا تو خوب جشن منایا گیا۔ اس سے پہلے ان کے سارے خاندان میں کسی نے انجینئرنگ کی ڈگری نہیں لی تھی۔ بڑی خانم بھی خوش تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اب سجاد کی بھی شادی کر دیں۔ وہ چوبیس سے اوپر کا ہو گیا تھا اور ان کے ہاں لڑکوں کی شادی زیادہ سے زیادہ بیس سال کی عمر میں کر دی جاتی تھی۔ زرینہ، سجاد سے پانچ سال چھوٹی تھی اور وہ انیس کی ہو چکی تھی۔ لڑکیوں کے لحاظ سے یہ عمر خاصی زیادہ تھی۔ یہاں لڑکیاں پندرہ سولہ سال کی عمر میں بیاہ دی جاتی تھیں۔ جولائی اور اگست کا مہینا بہت مصروفیت کا ہوتا تھا۔ فصلیں پک رہی ہوتی تھیں، درختوں سے پھل اتر تا تھا اور شدید بارشوں سے باغوں اور کھیتوں کو بچانے کی جدوجہد کی جاتی تھی۔ اس کے بعد ستمبر کا مہینا سکون کا ہوتا۔ بڑی خانم نے فیصلہ کیا کہ سجاد اور زرینہ کی شادی ستمبر میں کر دی جائے۔ سجاد کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ زرینہ اسے پسند نہیں تھی تو ناپسند بھی نہیں تھی۔ سجاد کے نزدیک وہ اس کے بڑوں کی پسند تھی اس لیے اس کی پسند بھی تھی۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ اس بار گیارہ اگست بدھ کے دن آ رہی ہے۔ اس تاریخ سے دو دن پہلے سجاد اپنے کمرے میں تھا کہ اسے عورتوں کے چیخنے کی آواز آئی۔ شام کا وقت تھا۔ وہ باہر نکلا تو زاہد کے خالی کمرے سے ملازمائیں بدحواسی میں نکل رہی تھیں۔ اس نے ایک ملازمہ کو روکا۔ ”کیا ہوا، کیوں چلا رہی ہو؟“

”چھوٹے خان جی... وہاں ایک عورت ہے۔“

ملازمہ نے جواب دیا اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ اس کے ساتھ دوسری دو ملازمائیں کسی قدر بہتر حالت میں تھیں، انہوں نے بتایا کہ وہ اس کمرے کی صفائی کر رہی تھیں کہ انہوں نے سفید کپڑے پہنے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ اچانک ہی وہاں آئی تھی۔ اس کا چہرہ اور سر بری طرح زخمی تھا اور اس کی آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے۔ سجاد اور دوسرے لوگ اس عورت کا حلیہ سن کر چونکے۔ اس دوران میں کمرے اور اس کے آس پاس مکمل دیکھ لیا گیا، وہاں کوئی عورت یا غیر متعلقہ شخص موجود نہیں تھا۔ یہ ساری ملازمائیں نئی تھیں اور انہیں زاہد خان والے واقعے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ انہوں نے رخسانہ کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے جو حلیہ بتایا، وہ رخسانہ کا ہی تھا۔ کچھ دیر میں سب بڑی خانم کے کمرے میں جمع تھے اور وہاں سب سے پہلے ریاض کی بیوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمیرا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔
"یہ وہی ہے، بڑی خانم۔۔۔ وہ انتقام لینے آئی ہے۔"
"چھ سال بعد اسے انتقام کا خیال آیا ہے؟" بڑی خانم نے ناگواری سے کہا۔
"آپ بھول رہی ہیں۔" سجاد بولا۔ "اس بار گیارہ اگست بدھ کے دن آئے گی۔ پانچ سال پہلے بھی یہ بدھ کے دن تھی۔"
وہ سب خاموش اور خوف زدہ ہو گئے۔ ملازماؤں کو جھٹلانے کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ کسی ایک نے نہیں بلکہ تینوں نے اس عورت کو دیکھا تھا۔ گیارہ اگست کی شام کو موسم بے حد خراب ہو گیا اور رہ رہ کر گرج چمک کے ساتھ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ سردی بھی غیر متوقع طور پر بڑھ گئی تھی اس لیے سب اپنے کمروں میں تھے۔ سجاد جاگ رہا تھا اور مطالعہ کر رہا تھا۔ جیسے ہی دس بجے، اسے چیخ کی آواز سنائی دی اور مسلسل ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی عورت پر تشدد کیا جا رہا ہو۔ سجاد کے ذہن میں پانچ سال پہلے والا واقعہ گھوم گیا۔ یہ بالکل ویسی ہی آوازیں تھیں۔ وہ باہر نکلا تو سب ہی خوف زدہ ہو کر اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔ آوازیں واضح طور پر زاہد کے کمرے سے آ رہی تھیں جو خالی تھا۔ بڑی خانم نے اضطراب سے کہا۔
"اندر چلو۔۔۔ کوئی کمرے سے باہر نہ نکلے۔"
"لیکن۔۔۔" سجاد نے کہنا چاہا۔
"سنا نہیں۔" بڑی خانم نے چلا کر کہا تو سب ہی اپنے کمروں میں واپس چلے گئے۔ اب آوازیں باہر راہداری سے آ رہی تھیں۔ عورت اسی طرح تڑپ کر اور رو کر پناہ کے لیے فریاد کر رہی تھی لیکن کسی کی جرأت نہیں تھی کہ دروازہ کھولتا۔ سب دم سادھے بیٹھے رہے اور آوازیں سنتے رہے۔ ان کے کمروں کے دروازے بج رہے تھے۔ پھر آوازیں دوبارہ زاہد کے کمرے کی طرف پلٹ گئیں۔ ایک دھماکے سے دروازہ بند ہوا اور خاموشی چھا گئی۔ بہت دیر خاموشی کے بعد اچانک ایک بار پھر کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ اس بار سجاد تڑپ کر باہر آیا۔ چیخ دوبارہ سنائی دی اور اس بار اسے اندازہ ہو گیا کہ چیخ ریاض کے کمرے سے آئی ہے۔ دیگر۔۔۔ لوگ بھی اس وقت کمروں سے نکل رہے تھے۔ سجاد سب سے پہلے پہنچا اور اس نے دروازے کو دھکیلا، دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ زور کی وجہ سے اندر جا گرا۔ تب اس نے دیکھا کہ چھت سے لگے فانوس سے بجلی کا تار نکل کر نیچے موجود ریاض کی گردن سے لپٹ گیا تھا اور سمیرا نے اسے پکڑا تو وہ بھی کرنٹ کا شکار ہو گئی۔ اسی لمحے سجاد نے کچھ دور ایک عورت کو سفید لباس میں دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ دروازے کے بجائے دیوار سے گزر گئی اور اس کا رخ زاہد والے کمرے کی طرف تھا۔ زاہد اور ریاض کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ سجاد نے اسے بہت واضح دیکھا تھا پھر اس نے اٹھ کر جلدی سے سوئچ بورڈ سے فانوس کے تمام بٹن بند کیے مگر اتنی دیر میں کرنٹ نے ریاض اور سمیرا کی جان لے لی تھی۔
حویلی میں ایک بار پھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ فانوس سے یہ تار نیچے کیسے آیا اور ریاض کی گردن سے کیسے لپٹ گیا۔ سمیرا اسے بچانے آئی تو خود بھی ماری گئی۔ فانوس کی تار اتنی لمبی نہیں تھی کہ وہ لٹک کر نیچے تک آتی۔ زاہد اور رخسانہ کی اموات کی وجہ سمجھ میں آتی تھی لیکن ریاض اور سمیرا کے ساتھ جو ہوا، اسے کوئی نہیں سمجھ سکا تھا۔ پولیس نے اسے حادثہ قرار دیا۔ یہ الیکٹرک وائرنگ کرنے والے کی غلطی قرار دی گئی۔ لیکن سجاد سمیت تمام حویلی والے جانتے تھے کہ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ سجاد نے ریاض کے کمرے میں جو دیکھا تھا، وہ خود تک محدود رکھا۔ ریاض اور سمیرا کے سوئم کے بعد اس نے بڑی خانم کو اس واقعے سے آگاہ کیا۔
"مجھے لگ رہا ہے کہ ہم نے ظلم کا جو بیج بویا تھا، وہ پھوٹ نکلا ہے اور اب ہمیں اس کی فصل کاٹنی پڑے گی۔"
"کیا مطلب؟" بڑی خانم نے تیکھے لہجے میں کہا۔
"کیسا ظلم؟"
"جو ایک مظلوم عورت کے ساتھ اس حویلی میں روا رکھا گیا تھا۔ وہ کسی سے فریاد بھی نہیں کر سکتی تھی۔" سجاد تلخی سے بولا۔ "اس کی آہ ہے جو اس حویلی کے لوگوں کو لگی ہے۔"
"سجاد! تم بہت زیادہ بول رہے ہو۔"
"جی، یہ میری مجبوری ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ اس طرح آپ کو میری باتیں سننا نہیں پڑیں گی۔"
وہ بڑی خانم اور بھائیوں کی مخالفت کے باوجود امریکا روانہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں ڈر کر جا رہا ہوں لیکن اب میں اس ماحول میں نہیں رہنا چاہتا جہاں گھٹن ہو۔"
زرینہ کا معاملہ سجاد نے ملتوی کر دیا اور جانے سے پہلے بڑی خانم سے کہا۔ "میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔ آپ چاہیں تو زرینہ کی شادی کہیں اور کر سکتی ہیں۔"
اس پر بھی سجاد کو بہت باتیں سننے کو ملیں مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حویلی کا ماحول مزید خاموش اور گھٹا ہوا ہو گیا۔ سجاد جا کر واپس نہیں آیا۔ کبھی کبھی اس کی

طرف سے خط آ جاتے تھے لیکن بڑی خانم کے حکم کے مطابق کوئی اسے جواب نہیں دیتا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی رابطہ کیا گیا۔ چھ سال بعد گیارہ اگست کی تاریخ پھر بدھ کے دن آئی۔ عماد کی بیوی شائستہ اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی اور سات سالہ صمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس دن بھی موسم خراب تھا۔ سب اپنے کمروں میں تھے۔ دس بجتے ہی وہی دردناک آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ کمرے سے شروع ہو کر راہداری میں گونجتی رہیں اور بالآخر دوبارہ کمرے میں پہنچ کر بند ہو گئیں۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے کمروں سے نکلے اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ سب زندہ سلامت تھے مگر خدشات ابھی باقی تھے۔
عماد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شام سے اس کے سینے میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ وہ آرام کر رہا تھا۔ آوازیں بند ہونے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے باہر آیا اور دوبارہ اندر چلا گیا۔ آدھی رات کے وقت شہباز کسی کام سے کمرے سے باہر آیا تو اس نے کسی کو عماد کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ وہ ایک عورت تھی اور اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی بس ایک لحاتی جھلک دکھائی دی تھی۔ شہباز عماد کے کمرے کی طرف لپکا۔ اس وقت وہ خانم والے کمرے میں ہوتا تھا اور عماد کا کمرا اسی لائن میں ریاض کے بعد والا تھا۔ عماد کے کمرے کا دروازہ بند تھا، شہباز نے دستک دی اور جب کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا مگر عماد کی طرف سے خاموشی تھی۔ ذرا سی دیر میں بڑی خانم سمیت سب وہاں جمع ہو گئے۔ ملازموں نے دروازہ توڑا تو عماد اپنے بستر پر ابدی نیند سو رہا تھا۔
ڈاکٹر نے ہارٹ اٹیک تشخیص کیا تھا۔ عماد کو سوتے میں دل کا دورہ پڑا اور وہ اسی حالت میں انتقال کر گیا۔ حویلی والوں پر ایک قیامت اور گزر گئی۔ بڑی خانم غم سے بے حال تھیں لیکن انہوں نے سجاد کو مطلع کرنے سے منع کر دیا۔ بیوگی کی چادر اوڑھ لینے والی شائستہ نے فیصلہ کیا کہ اس کا جنازہ بھی حویلی سے نکلے گا حالانکہ بڑی خانم چاہتی تھیں کہ وہ صمد کو لے کر یہاں سے چلی جائے۔ وہ صمد کے لیے فکر مند تھیں لیکن شائستہ نے کہا۔ "بڑی خانم! قصوروار تو ہم ہیں، یہ معصوم ہے۔ اس کی حفاظت اللہ کرنے والا ہے اور ہمیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی چاہیے۔"
بڑی خانم خاموش رہیں۔ حالانکہ یہی بات کہنے پر وہ سجاد سے ناراض ہو گئی تھیں لیکن اب تین بیٹے گنوا دینے کے بعد شاید انہیں احساس ہو رہا تھا۔ گیارہ اگست بدھ کے دن کا اگلا شکار خود شائستہ ہوئی۔ صمد اس وقت اٹھارہ سال کا تھا اور اس نے ریاض والا کمرا لے لیا تھا جو برابر میں تھا۔ زاہد والا کمرا مستقل بند کر دیا گیا تھا اور اب وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ صمد کے علم میں یہ واقعات تھے لیکن ان کی شدت اتنی نہیں تھی کیونکہ باپ کے مرنے پر وہ صرف سات سال کا تھا۔ اس بار بدھ کے دن گیارہ اگست پورے گیارہ سال بعد آئی تھی۔ صمد کالج میں سیکنڈ ایئر کا امتحان دے کر گھر آیا تھا۔ وہ دس سال کی عمر سے شہر کے ایک اچھے اسکول میں پڑھتا رہا تھا اور وہیں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ جاگیر کی دیکھ بھال اب شہباز کے سپرد تھی۔ صمد چھٹیوں میں آتا تو وہ بھی ہاتھ بٹاتا تھا۔ اسے اس کام سے فطری دلچسپی تھی۔ گیارہ اگست کا دن آیا تو صمد نے دیکھا، اس کی ماں بہت خوف زدہ تھی۔ اس نے صمد سے کہا۔
"لگ رہا ہے اس بار میری باری ہے۔"
"آپ وہم نہ کریں۔"
"میرے بچے! یہ وہم نہیں، حقیقت ہے۔"
شام کو شائستہ کا خوف بڑھ گیا کیونکہ اس نے اس مہینے کے دوران دو بار اسی عورت کو دیکھا تھا جسے رخسانہ کی روح سمجھا جاتا تھا۔ کسی اور نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے شائستہ سمجھ رہی تھی کہ اس بار اس کی باری ہے۔ باپ کی موت کے وقت صمد ایک تو بچہ تھا، دوسرے وہ یہاں نہیں تھا۔ ریاض اور سمیرا کی موت کے وقت وہ صرف ایک سال کا تھا۔ لیکن اب وہ جوان اور سمجھ دار تھا۔ اس لیے شائستہ نے اسے وہ سب بتا دیا جو اب تک ہوتا آیا تھا۔ صمد کے لیے یہ سب ایک انکشاف تھا۔ پھر جب دس بجے اس نے وہ آوازیں سنیں تو اسے بھی یقین آ گیا۔ خود اس کے کمرے کا دروازہ بھی بجایا گیا تھا۔ عورت کی دردناک چیخیں اور اس پر تشدد کرنے والے مرد کی غراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر آوازیں تھم گئیں۔ اس کے کچھ دیر بعد صمد کو ماں کے کمرے سے اس کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیں۔ وہ بھاگتا ہوا شائستہ کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے شائستہ کو بالکونی میں ریلنگ کے بالکل ساتھ دیکھا۔ وہ ریلنگ کی طرف جھک رہی تھی اور یوں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی جیسے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو، کسی ایسی ہستی سے جو اسے نیچے دھکیلنا چاہتی ہو۔ صمد بہت تیزی سے بھاگا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شائستہ الٹ کر ریلنگ سے نیچے گر چکی تھی۔ اس کی آخری چیخ اتنی تیز تھی کہ پوری حویلی میں سنائی دی۔ وہ تقریباً پچیس فٹ کی بلندی سے نیچے پکے فرش پر سر کے بل گری اور فوراً ہی مر گئی۔ جب صمد نے نیچے جھانکا تو اسے ماں کی لاش کے پاس ایک سفید ہیولہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سادکھائی دیا اور اگلے ہی لمحے وہ غائب ہو چکا تھا۔
ماں کی موت پر پہلی بار صمد کو صحیح معنوں میں اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ جس خطے میں بستے تھے، وہاں رہنے والوں کے لیے موت نامانوس چیز نہیں تھی۔ اس لیے صمد کے لیے بھی خاندان میں ہونے والی اموات ایک فطری عمل کی حیثیت رکھتی تھیں مگر شائستہ کی موت نے اسے چونکا دیا تھا۔ شائستہ نے ایک ہولناک حقیقت پہلی بار اس کے سامنے رکھی تھی۔ خاص طور سے زاہد اور رخسانہ کی کہانی پہلی بار اس کے علم میں آئی تھی۔ اس نے اپنے کانوں سے سب سنا تھا پھر اس نے ماں کو مرتے دیکھا تھا۔ اسے ایسی باتوں پر قطعی یقین نہیں تھا لیکن اب اس کا یقین ڈول گیا تھا۔ بڑی خانم اس واقعے کے بعد اتنی ڈر گئیں کہ انہوں نے شہباز سے حویلی سے چلے جانے کو کہا لیکن شہباز نے انکار کر دیا۔ ”ٹھیک ہے ہمارے ساتھ پے درپے حادثات ہو رہے ہیں لیکن موت سے تو آدمی کہیں نہیں بچ سکتا۔ اور پھر میں چلا جاؤں گا تو جاگیر اور زمین کون دیکھے گا؟“
اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا، حویلی میں وہی واحد مرد رہ گیا تھا۔ صمد ابھی پڑھ رہا تھا اور وہ صرف گرمیوں میں حویلی آتا تھا۔ سجاد امریکا میں تھا، پہلے بڑی خانم ناراضی کی وجہ سے اس سے رابطے کو تیار نہیں تھیں لیکن اب وہ اس کی حفاظت کے خیال سے اسے حویلی بلانے کو تیار نہیں تھیں۔ بے شک وہ ان کی نظروں سے دور تھا لیکن زندہ تو تھا۔ صمد چھٹیاں ختم ہوتے ہی چلا گیا۔ اس کا رزلٹ آیا تو اس نے زرعی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ شہباز کی بیٹی رشنا اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ بڑی خانم کی خواہش تھی کہ ان کی آپس میں منگنی کر دی جائے لیکن بچپن سے وہ دونوں بہن بھائی جیسے جذبات رکھتے تھے۔ اس لیے شہباز نے انکار کر دیا۔ جب رشنا اٹھارہ سال کی ہوئی تو اس کی شادی خاندان میں ایک لڑکے سے کی گئی۔ صبیح آرمی آفیسر تھا۔
اگلی گیارہ اگست بدھ کے دن چھ سال بعد آئی۔ شہباز کی بیوی سینہ کی طبیعت خراب تھی۔ شہباز نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے ڈاکٹر کو دکھانے ایبٹ آباد لے جائے گا۔ وہ صبح نکلے، ایبٹ آباد پہنچے۔ سینہ کو ڈاکٹر کو دکھایا۔ پھر سینہ نے اصرار کیا کہ وہ آج رات ایبٹ آباد میں رک جاتے ہیں۔ وہ آنے والی رات سے خوف زدہ تھی، خود شہباز مرد ہوتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ وہ بیوی کی بات مان گیا اور اس نے ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا۔ شام کے وقت اس نے حویلی کال کر کے اپنے نہ آنے کی اطلاع دی لیکن زرینہ نے بتایا کہ بڑی خانم کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اور انہیں اسپتال لے جانا ہے۔ بڑی خانم کا سن کر شہباز فکر مند ہو گیا اور وہ دونوں حویلی پہنچ گئے۔ مگر اس دوران میں موسم اتنا خراب ہو گیا کہ بڑی خانم کو اسپتال لے جانا ملتوی ہو گیا۔ بارش بہت تیز تھی اور ایسے میں سفر ناممکن حد تک دشوار ہو جاتا تھا۔
حسبِ روایت دس بجتے ہی حویلی کا اوپری حصہ ان ہی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا جو ہر بار کسی کی موت کا پیغام لے کر آتی تھیں۔ اس سے پہلے وہ سب بڑی خانم کے کمرے میں تھے لیکن سینہ کی طبیعت خراب ہونے لگی تو شہباز اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ آوازیں شروع ہوتے ہی سب نے اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند کر لیے۔ جب آوازیں ختم ہوئیں تو زرینہ نے باہر دیکھا اور اسی لمحے اسے شہباز کے کمرے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بہت بھاری چیز گری ہو۔ صمد اور زرینہ وہاں پہنچے تو ایک ہیبت ناک منظر سامنے تھا، نہ جانے کیسے لکڑی کی بنی ہوئی بہت وزنی الماری شہباز پر گری ہوئی تھی اور سینہ ایک طرف بے ہوش پڑی تھی۔ صمد نے پہلے خود کوشش کی پھر نوکروں کو بلایا اور انہوں نے مل کر الماری ہٹائی لیکن اتنی دیر میں شہباز مر چکا تھا۔ بے حد وزنی الماری نے اس کے سینے کو بری طرح کچل دیا تھا۔
بڑی خانم جن کی طبیعت پہلے ہی خراب ہو رہی تھی، یہ خبر سن کر وہ بے ہوش ہو گئیں۔ صمد، سینہ اور بڑی خانم کو لے کر اسی طوفانی بارش میں اسپتال روانہ ہو گیا۔ اس نے نہ جانے کیسے یہ راستہ طے کیا۔ لیکن اسپتال تک پہنچتے پہنچتے سینہ بھی زندگی ہار چکی تھی۔ اس کے سامنے شہباز پر الماری گری تھی اور اس صدمے نے اس کی جان لے لی تھی۔ بڑی خانم کی جان تو بچ گئی لیکن فالج نے ان کے جسم کا دایاں حصہ مکمل طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ ابھی وہ اسپتال میں تھیں کہ حویلی کے برابر والے قبرستان میں دو قبروں کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ حویلی آئیں تو زندہ لاش بن گئی تھیں۔ انہوں نے حویلی کا سارا انتظام زرینہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سجاد کی طرف سے شادی سے انکار کے باوجود زرینہ نے حویلی سے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بڑی خانم کے ساتھ زرینہ کے گھر والوں نے بھی زور دیا کہ وہ اب واپس آ جائے اور امینہ کی طرح اس کی شادی بھی کہیں اور کر دی جائے لیکن زرینہ نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں اسی حویلی میں رہوں گی اور بڑی خانم کی خدمت کروں گی۔“
زرینہ کے فیصلے کے آگے سب مجبور ہو گئے۔ بڑی خانم معذور ہو گئی تھیں، زرینہ ہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی اور

ساتھ ساتھ حویلی کے تمام معاملات بھی وہی چلاتی تھی۔ اس نے کچھ عرصے میں سب اتنی خوبی سے سنبھال لیا جیسے کسی وقت بڑی خانم دیکھتی تھیں۔ صمد اپنی تعلیم مکمل کر کے آ گیا تھا۔ ایک سال کے دوران اس نے بیرونِ ملک جا کر ماؤنٹین فارمنگ کے کورس کیے اور پھر واپس آ کر جاگیر کو جدید فارم کی صورت دینے میں لگ گیا۔ اب تک زمین روایتی انداز میں کاشت کی جا رہی تھی۔ صمد نے اپنے کارکنوں کو بھی جدید تربیت دلوائی۔ دس سال میں اس نے جاگیر کی صورت ہی بدل دی۔ اس کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جبکہ پہاڑ کے دوسری طرف امیر خان کی اولاد کہیں زیادہ زمین کی مالک ہونے کے باوجود اتنی آمدنی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ صمد نے اپنے ملازموں کی فلاح و بہبود کا بھی خیال رکھا تھا اس لیے وہ پوری جانفشانی سے کام کرتے تھے۔ بڑی خانم اور زرینہ اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتے رہے لیکن وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زرینہ سے کہا۔ ”شاید آنے والی بدھ کی گیارہ اگست پر میرا نام لکھا ہو اور میں کسی کو اپنی بدقسمتی میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔“
”بڑی خانم اس جاگیر کا وارث چاہتی ہیں۔“
”کیا فائدہ اس وارث کا جو مرنے کے لیے اس دنیا میں آئے۔“
بڑی خانم بگڑے ہوئے الفاظ میں بات کرتی تھیں اور صرف زرینہ ہی ان کی بات کا مطلب سمجھتی تھی۔ کسی حد تک صمد بھی سمجھ لیتا تھا۔ صمد کے انکار کے بعد وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ اس کی بات بھی درست تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اب اس جاگیر کا کوئی وارث جیتا نہیں رہے گا۔ وقت گزرتا گیا۔ جن دنوں صمد جاگیر کو ترقی یافتہ فارم کی صورت میں لا رہا تھا پھر وہی تاریخ آ گئی۔ شہباز اور سینہ کے حادثے کو چھ سال گزر گئے تھے۔ جولائی کے شروع میں بڑی خانم کی حالت خراب ہونے لگی۔ صمد نے کئی سال پہلے ایک کل وقتی ڈاکٹر کا بندوبست کر لیا تھا جو یہیں رہتا تھا اور اس نے مشورہ دیا تھا کہ بڑی خانم کو اسپتال منتقل کر دیا جائے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات اسی حویلی میں گزارنا چاہتی ہیں۔ برسوں سے وہ سجاد کو دیکھنے کی خواہش دبائے بیٹھی تھیں لیکن اب مرنے سے پہلے وہ اسے دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ سجاد گیارہ اگست سے پہلے آ کر ان سے مل لے اور پھر اس تاریخ سے پہلے واپس چلا جائے۔ ان کی خواہش پر زرینہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی سجاد کو خط لکھ دیا۔ اس نے پہلے صمد سے مشورہ کیا اور

خدارا ◉ خدارا
شوگر کے مریض
ذرا عقلمندی سے کام لیں
کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔
المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787
آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے بھی اتفاق کیا کہ سجاد چچا ایک بار آ کر بڑی خانم سے مل لیں اور پھر واپس چلے جائیں۔ لیکن سجاد کو خط تاخیر سے ملا اور وہ اگست کے پہلے ہفتے میں پہنچ پایا۔ پھر اس نے واپس جانے سے بھی انکار کر دیا اور وہ گیارہ اگست کی رات اپنے باتھ روم کے ٹب میں مردہ پایا گیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی موت ڈوبنے سے واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق معدے میں ایک خواب آور دوا کے اثرات بھی ملے تھے۔

☆☆☆

رِل گم صم تھی اور اس کی نظروں کے سامنے دو دن پہلے والا منظر گھوم رہا تھا۔ اب اسے کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے رخسانہ اور زاہد کو دیکھا تھا۔ نہ جانے یہ کیا بھید تھا؟ مرنے والوں کی روحیں ہر بار اس مخصوص تاریخ کو آتی تھیں اور حویلی والوں کے سامنے اس واقعے کا ری پلے کر کے دکھاتی تھیں۔ اس کے بعد حویلی کے لوگوں میں سے کسی ایک کی قضا آ جاتی تھی۔ رِل نے صمد کے خاموش ہونے کے بعد اسے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ صمد نے کہا۔ ”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رخسانہ کی روح حویلی کے لوگوں سے انتقام لے رہی ہے۔“

”میں اس بات کو نہیں مانتی کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ زندگی و موت کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔“

”اس اختیار کو یوں سمجھو جیسے ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کر دیتا ہے۔ روح کو اختیار حاصل نہیں ہو گیا ہے کہ وہ کسی کی جان لے سکے سوائے اس کے کہ اللہ نے اس کے مقدر میں لکھ دیا ہو۔“

”پھر بھی یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ حالانکہ میں خود سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔“

”سجاد چچا بھی اس کا شکار بن گئے حالانکہ وہ یہاں سے کتنی دور چلے گئے تھے۔“

”ان کی موت اسی طرح لکھی تھی شاید۔“ رِل نے سرد آہ بھری پھر چونکی۔ ”لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ بابا نے رخسانہ کی حمایت کی تھی اور یہ اس کی روح کر رہی ہے تو اس نے ان سے کیوں انتقام لیا؟“

”ہاں، واقعی یہ سوچنے والی بات ہے۔ اس طرح تو انتقام اندھا ہو گیا۔ دیکھا جائے تو رخسانہ اس حویلی میں لینے والے کسی فرد کو نہیں بخشے گی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جو لوگ شکار ہوئے انہوں نے شاید کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ روح کو اندر جانے کا موقع مل گیا... تو آپ بھی دیکھ چکے ہیں اور میں بھی کہ دیواریں اور دروازے اس کا راستہ نہیں روک پاتے۔“

”تب وہ انتخاب کیسے کرتی ہے؟“

”یہ تو سمجھ میں نہیں آ رہا... شاید مرنے سے پہلے رخسانہ نے جن جن کمروں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا، وہی لوگ ترتیب وار اس کا نشانہ بن رہے ہیں۔“

”سوائے سجاد چچا کے کیونکہ ان کا کمرا آخری نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ سب سے آخر میں نشانہ بنے ہیں اب تک۔“ رِل نے صمد کی طرف دیکھا۔ ”نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا کہ بابا کی موت بھی اسی طرح ہوئی ہے جس طرح حویلی کے دوسرے لوگ مارے گئے ہیں۔“

”نہیں، ان کی موت سے پہلے بھی وہی خوفناک آوازیں آئی تھیں۔ اتفاق سے میں یہاں نہیں تھا، کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا لیکن چھوٹی خانم نے خود سجاد چچا کے کمرے کے باہر اس پُراسرار عورت کو دیکھا تھا اور انہوں نے خود جا کر دیکھا تھا۔ سجاد چچا باتھ روم میں تھے اور اس وقت تک ان کا انتقال ہو چکا تھا۔“

”مجھے جو چیزیں ملی تھیں، ان میں بابا کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں تھی۔“

”پوسٹ مارٹم کسی کا نہیں ہوا تھا لیکن جب پولیس کو پتا چلا کہ سجاد چچا امریکی شہری ہیں تو ان کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔“

”بابا نے کبھی کوئی خواب آور دوا استعمال نہیں کی۔“

”ممکن ہے یہاں ان کو ضرورت پڑ گئی ہو۔“ صمد نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”رات بہت ہو گئی ہے، اب سو جاؤ... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

رِل حیران رہ گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے، وہ اتنی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ داستان بھی تو نصف صدی کی تھی۔ صمد کے جانے کے بعد وہ لیٹ گئی مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ خیالات ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ صبح کسی وقت اسے نیند آئی اور پھر وہ دیر تک سوتی رہی۔ اسے گل نے اٹھایا۔ ”بی بی! آپ نے کچھ کھایا نہیں ہے اور دوا بھی لینی ہے۔“

رِل کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے معمولی سا ناشتا کیا اور دوا لے کر دوبارہ لیٹ گئی۔ شام تک اس کی حالت اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ اس نے کمرے میں چہل قدمی کی۔ چائے کے ساتھ چند ہلکی پھلکی چیزیں لیں۔ رات کے کھانے کے لیے وہ تیار ہو کر نیچے گئی۔ حیرت کی بات تھی کہ بڑی خانم اسے دیکھنے کے لیے دوبارہ نہیں آئی تھیں جبکہ اس کی طبیعت خرابی کے دوران وہ اس کے سرہانے موجود رہی تھیں۔ ڈنر ٹیبل پر

زرینہ اور صمد موجود تھے۔ وہ دونوں ہی سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ کھانے کے بعد زرینہ نے اس سے کہا۔ ”کل گیارہ اگست ہے، میں اور سب چاہتے ہیں کہ تم کل کے دن حویلی میں نہ ہو۔“

صمد نے کہا۔ ”میں نے ایبٹ آباد میں ایک اچھے ہوٹل میں کمرا بک کرا دیا ہے۔ تم کل سے پرسوں صبح تک وہیں رہو گی۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی۔“ رِل نے انکار کر دیا۔

”احمقانہ بات...“ زرینہ نے کہنا چاہا۔

”معذرت کے ساتھ۔“ رِل نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں اسی خاندان کی بیٹی ہوں اور صرف ڈر کر یہاں سے نہیں جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ بابا کی طرح میرا بھی ایمان ہے کہ موت اپنے وقت اور جگہ پر آئے گی۔ انسان اس سے کسی صورت نہیں بھاگ سکتا۔ میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تو میرے ساتھ بھی برا نہیں ہوگا۔“

”سجاد نے بھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا۔“ زرینہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”لیکن وہ بھی اسی طرح اور اسی تاریخ کو موت کا نشانہ بنا۔“

”ٹھیک ہے، بابا بھی گیارہ اگست کے دن اس دنیا سے گئے لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ کسی کے انتقام کا نشانہ بنے ہیں۔“

”وہ انتقام کا ہی نشانہ بنا ہے۔“ زرینہ بولی تو رِل نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے زرینہ کا لہجہ عجیب سا لگا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

”میں کل یہیں رہوں گی اور زندہ رہی تو پرسوں صبح ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ رِل نے کہا اور فوراً محسوس کیا کہ صمد بے چین ہو گیا ہے۔ ”میں آج دادی جان سے ملنا چاہتی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ زرینہ کچھ کہتی، صمد نے کہا۔ ”تمہاری طبیعت خراب ہونے پر وہ جتنی پریشان تھیں، میرا خیال ہے کہ اب تم براہِ راست بھی ان کے کمرے میں جا سکتی ہو۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔ میں ان کی پوتی ہوں اور مجھے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ رِل نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”صمد! آپ میرے ساتھ چلیں گے؟“

زرینہ وہیں بیٹھی رہی۔ واضح طور پر اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ رِل براہِ راست بڑی خانم سے ملے۔ وہ دونوں اوپر آئے۔ بڑی خانم جاگ رہی تھیں۔ ملازمہ نے انہیں کھانا کھلا دیا تھا اور اب چمچ سے قہوہ پلا رہی تھی۔ رِل کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور ان کے خدوخال کی کرختگی نرمی میں بدل گئی۔ انہوں نے اپنا درست ہاتھ اوپر کیا اور رِل بے ساختہ ان کے سینے سے لگ گئی۔ بڑی خانم کے وجود سے اسے باپ کی خوشبو آئی اور وہ بے ساختہ رونے لگی۔ بڑی خانم اس کا سر سہلا رہی تھیں اور اپنی ناقابلِ فہم زبان میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ صمد نے آہستہ سے کہا۔ ”بڑی خانم کہہ رہی ہیں مت رو، انہیں تکلیف ہو رہی ہے تمہارے رونے سے۔“

رِل نے ان کے چہرے پر پیار کیا۔ ”میں ساری زندگی ان رشتوں سے محروم رہی۔ مجھے یہاں آنے سے پہلے پتا ہی نہیں تھا کہ میری دادی جان زندہ ہیں۔“

رِل کی اس بات پر بڑی خانم کی آنکھوں میں حیرت آ گئی لیکن رِل کو اس کا ہوش نہیں تھا۔ وہ باپ کے بعد سب سے قریبی رشتے کو پاس پا کر سب بھول گئی تھی۔ وہ کسی بچی کی طرح بڑی خانم کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی اور انہوں نے اسے اپنے بازو میں لے لیا۔ وہ بار بار اسے پیار کر رہی تھیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں پھر شاید بیٹا یاد آ گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رِل ان کے آنسو صاف کر رہی تھی اور انہیں چپ کرا رہی تھی۔ وہ ان کے پاس سے اٹھنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن صمد نے مجبور کر دیا۔ ”بس، اب بڑی خانم کو آرام کرنے دو۔ تمہاری اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن کل سے میں جب چاہوں گی دادی جان کے پاس آؤں گی، کوئی مجھے نہیں روکے گا۔“ رِل نے شرط رکھ دی تو بڑی خانم نے سر ہلا کر اس کی توثیق کر دی۔ رِل نے ان کا رخسار چوما۔ ”جب تک میں یہاں ہوں، آپ کا ہر کام میں کروں گی۔“

رِل اتنی خوش تھی کہ وہ آنے والے دن کا خطرہ بھی بھول گئی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ بڑی خانم کے کمرے میں آ گئی۔ ان کو ناشتا کرایا۔ اس نے ملازمہ سے چند منٹ میں طریقہ سیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا ناشتا بھی وہیں منگوا لیا۔ بڑی خانم اس کو دیکھ کر اتنی خوش تھیں کہ ان کی ملازمہ نے کہا۔ ”میں دس سال سے بڑی خانم کی خدمت کر رہی ہوں، میں نے کبھی انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا۔“

ناشتے کے بعد رِل نے ملازمہ کے ساتھ مل کر بڑی خانم کو صاف ستھرا کیا اور ان کا لباس تبدیل کرایا۔ وہ دن میں دو بار لباس بدلتی تھیں۔ ان کے بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی کی اور پھر انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر اپنے کمرے کی بالکونی میں لے آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر بعد وہ بڑی خانم کو واپس لے آئی کیونکہ وہ زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی تھیں۔ کل سے زرینہ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً اپنے کمرے میں تھی۔ شاید اسے رمل کا اس طرح آزادی سے بڑی خانم سے ملنا پسند نہیں آیا تھا۔ رمل دوپہر میں بھی وہیں رہی۔ پھر جیسے جیسے شام قریب آنے لگی، بڑی خانم اور دوسرے لوگ مضطرب نظر آنے لگے۔ اس دوران میں زرینہ صرف ایک بار آئی اور اس نے بڑی خانم سے کچھ کہا تو بڑی خانم کے چہرے پر ناگواری نظر آئی۔ انہوں نے تیز لہجے میں کچھ کہا جسے صرف زرینہ سمجھ سکتی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ رمل یہاں سے چلی جائے اور بڑی خانم نے انکار کر دیا تھا۔ رمل نے دوپہر کا کھانا بھی بڑی خانم کے ساتھ کھایا اور وہ اس پر بہت خوش تھیں۔ وہ برسوں سے اکیلی تھیں، سب سے الگ کھانا کھاتی تھیں۔ اب ان کی پوتی آ گئی تھی۔ رمل نے پہلے ان کو کھلایا اور پھر ان ہی کے کمرے میں خود کھایا۔ شام ہوتے ہی موسم بدل گیا، شفاف آسمان سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپ گیا اور جیسے ہی سورج غروب ہوا موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ صمد شام ہوتے ہی حویلی آ گیا تھا۔ جب بارش شروع ہوئی تو وہ بھی بڑی خانم کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے رمل سے طبیعت کا پوچھا۔ ”اب بالکل ٹھیک ہوں۔ صبح سے دادی جان کے ساتھ ہوں۔“

”بہت ضدی ہو۔“ صمد نے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں گئیں یہاں سے؟“

رمل مسکرائی۔ ”آخر کس خاندان سے ہوں؟“

”تم لنچ میں نیچے نہیں آئیں؟“

”میں نے یہیں دادی جان کے ساتھ لنچ کیا تھا۔ میں نے سوچ لیا ہے جب تک میں یہاں ہوں، دادی جان کے ساتھ رہوں گی اور ان کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔“

”اور جب تم چلی جاؤ گی تب...؟“

رمل کے پاس فی الحال اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آٹھ بجے تو صمد نے کہا کہ اس کا کھانا بھی یہیں منگوایا جائے۔ رمل نے پہلے بڑی خانم کو کھلایا مگر آنے والے وقت کے خوف و پریشانی میں انہوں نے بہت کم کھایا۔ یہی حال رمل اور صمد کا بھی تھا۔ کھانے کے بعد سب نے اپنی اپنی پسند کا مشروب منگوایا۔ زرینہ دوبارہ نہیں آئی تھی۔ رمل نے صمد کو بتایا تو اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں، آج چھوٹی خانم کا موڈ خراب لگ رہا ہے۔“

”اس لیے کہ میں دادی جان کے کمرے میں بلا روک ٹوک موجود ہوں؟“ رمل نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”شاید۔“ صمد نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ ساڑھے نو بج گئے تھے اور سب کی نظریں گھڑی پر مرکوز تھیں۔ بڑی خانم کے اشارے پر ملازمہ نے کمرا اندر سے بند کر لیا تھا۔ اچانک جیسے گھٹن سی ہو گئی تھی اور سب سہمے جا رہے تھے۔ کسی کا بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بڑی خانم نے اشارے سے رمل اور صمد کو پاس بلا لیا۔ وہ بستر پر ان کے دائیں بائیں آ گئے تو انہوں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ وال کلاک کی سوئی کھسک کر دس تک پہنچ گئی۔ جیسے ہی دس بجے ایک دردناک چیخ فضا میں گونجی۔ رمل سہم کے بڑی خانم سے لگ گئی۔ بڑی خانم کچھ کہہ رہی تھیں اور ان کے چہرے پر خوف تھا۔ صمد نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

مگر بڑی خانم نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسلسل کہہ رہی تھیں۔ رمل نے سوالیہ نظروں سے صمد کی طرف دیکھا تو اس نے انگریزی میں کہا۔ ”یہ کہہ رہی ہیں، اس بار ان کی باری ہے۔ رخسانہ کی اصل مجرم وہی ہیں۔“

”نہیں۔“ رمل نے بے ساختہ کہا۔

آوازیں بڑھ رہی تھیں اور پھر وہ باہر راہداری میں نکل آئیں۔ رخسانہ کی روح ایک ایک دروازے پر جا کر پناہ کی التجا کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بڑی خانم کے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آوازیں بلند بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔ اس کی ہیبت سب پر طاری تھی۔ صمد مرد ہوتے ہوئے بھی گم صم تھا۔ ملازمہ ایک کونے میں سر چادر میں چھپائے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھر آواز بڑی خانم کے دروازے تک آ گئی۔ رمل نہیں جان سکی کہ اسے کون سی طاقت حرکت میں لے آئی۔ اس سے پہلے کہ بڑی خانم یا صمد کچھ سمجھ سکتے، وہ تیزی سے بستر سے اتری اور دروازے تک آ گئی۔ عقب سے صمد نے چلّا کر اسے دروازہ کھولنے سے منع کیا لیکن اتنی دیر میں وہ دروازہ کھول چکی تھی۔ دروازے کے بالکل سامنے وہی سفید کپڑوں والی زخمی اور لہولہان عورت موجود تھی جو سالوں سے مدد کے لیے پکارتی آئی تھی لیکن کسی نے اس کی پکار نہیں سنی تھی۔ اس کے پیچھے ایک تومند آدمی لوہے کی راڈ اٹھائے موجود تھا۔ اس کا سر گھٹا ہوا اور کرخت چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ اس نے عورت کے بال پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ رمل غصے سے چلّائی۔

”نہیں، تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ بہت ہو گیا، چلے جاؤ یہاں سے۔“

اس وقت رمل سارا خوف بھول گئی تھی اور اسے اس شخص پر شدید غصہ آ رہا تھا جو ایک بے گناہ عورت کو اذیت دے رہا تھا۔ آدمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ یوں دھندلا پڑنے لگا جیسے دھوئیں سے بنا ہو اور دھواں منتشر ہو رہا ہو۔ کچھ دیر بعد وہاں مرد نہیں تھا لیکن عورت موجود تھی۔ جیسے جیسے مرد غائب ہو رہا تھا، عورت کے جسم پر موجود زخموں اور خون کے نشانات غائب ہوتے جا رہے تھے۔ مرد کے غائب ہونے پر وہ بالکل ٹھیک نظر آنے لگی۔ اس نے مسکرا کر رمل کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ یوں ہلے جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ پھر وہ چلتی ہوئی برابر میں زرینہ کے کمرے کے دروازے تک گئی۔ پھر وہاں کوئی نہیں تھا۔ رمل سحر زدہ سی کھڑی دیکھ رہی تھی۔ عورت کے ہٹتے ہی صمد ہمت کر کے آگے آیا۔ اس نے راہداری میں جھانکا اور رمل سے پوچھا۔ ”وہ کہاں گئی؟“

”چھوٹی خانم کے کمرے کے سامنے پہنچ کر غائب ہو گئی۔“

”میرے خدا!“ صمد اچھل پڑا اور تیزی سے زرینہ کے کمرے کی طرف جھپٹا۔ اس نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ سامنے زرینہ بستر پر دراز تھی اور اس کی کھلی آنکھیں اوپر دیکھ رہی تھیں۔ رمل صمد کے پیچھے تھی، وہ دونوں تیزی سے زرینہ کے پاس آئے اور انہوں نے پہلی نظر میں محسوس کر لیا کہ زرینہ زندہ نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں اور سینہ دونوں ساکت تھے۔ صمد نے اس کا ہاتھ تھاما اور مایوسی سے بولا۔ ”نبض ساکت ہے۔“

رمل نے جھک کر سینے پر کان لگا کر دل کی دھڑکن چیک کرنا چاہی لیکن وہ بھی تھم چکی تھی۔ اسی لمحے اس کی نظر بستر پر کھلی ہوئی ڈائری پر گئی جس پر ایک چھوٹا سا پین بھی رکھا تھا۔ رمل نے غیر ارادی طور پر ڈائری اٹھا لی۔ اس دوران میں صمد انٹر کام پر حویلی کے ڈاکٹر کو کال کر رہا تھا۔ رمل نے کھلا ہوا صفحہ دیکھا۔ یہاں ایک ادھورا نوٹ لکھا ہوا تھا۔

”آج میرے انتقام کا ایک حصہ اور پورا ہو جائے گا۔ آج اس خاندان کا ایک فرد اور مٹ جائے گا۔ اگر رخسانہ کی روح نے ایسا نہ کیا تب بھی میں تو ہوں۔ جیسے پچھلی بار رخسانہ نے سجاد کو زندہ چھوڑ دیا تھا لیکن یہ کام میں نے کر دیا۔ چائے کی پیالی میں خواب آور دوا دینا آسان تھا اور اسے لے جا کر ٹب میں ڈبونا مشکل تھا لیکن میں نے یہ کام کر لیا۔ سجاد ہی میرا اصل مجرم تھا۔ اس نے مجھے مسترد کیا تھا۔ وہ میرا محبوب تھا لیکن مجھے ٹھکرا کر وہ میرا بدترین دشمن بن گیا تھا۔ میں نے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھوٹا محط لکھ کر اسی لیے اسے یہاں بلوایا تھا۔ بڑی خانم نے مجھ سے نہیں کہا تھا۔ اسے مار کر میرے اندر برسوں سے سلگتا انتقام اب پورا ہوا ہے۔ لیکن نہیں۔۔۔ ابھی اس خاندان کا ایک فرد باقی ہے۔ کل صبح تک وہ نہیں رہے گا، تب یہ جاگیر اور یہ حویلی میرے بھائیوں اور بھتیجوں کو ملے گی۔ میرا انتقام تب جا کر پورا۔۔۔"

تحریر یہاں تک پہنچ کر رک گئی تھی۔ شاید موت نے جو رخسانہ کی روح کی صورت میں آئی تھی، اسے مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنی تحریر اور اپنا انتقام پورا کر سکتی۔ رل نے ڈائری دوپٹے تلے کر لی کیونکہ ڈاکٹر آ گیا تھا اور زرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ معائنے کے بعد اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کسی وجہ سے دل اچانک بند ہونے سے موت واقع ہوئی ہے۔"

"اگر میں اسپتال لے جاؤں تو۔۔۔"

"لے جائیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "بہ ظاہر موت طبعی ہے۔"

ذرا سی دیر میں زرینہ کی موت کی خبر ساری حویلی میں پھیل چکی تھی۔ ملازمائیں بھی آ گئی تھیں۔ صمد نے امیر خان کی حویلی کال کر کے اطلاع دی۔ بڑی خانم کو رل نے بتایا۔ وہ صدمے سے دوچار تھیں۔ رل نے ڈائری اور اس کی تحریر کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔ وہ چاہتی تھی کہ زرینہ کی تدفین کا کام نمٹ جائے تو وہ صمد کو ڈائری دکھائے گی اور وہی فیصلہ کرے گا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ کچھ دیر میں زرینہ کے بہن بھائی آ چکے تھے۔ امیر خان اور اس کی بیوی کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ صمد نے کہا کہ زرینہ کو بھی حویلی کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا لیکن اس کے بہن بھائی نہیں مانے اور اگلی صبح وہ زرینہ کی لاش اپنی حویلی کے ساتھ موجود قبرستان میں دفنانے لے گئے۔ صمد ساتھ گیا تھا۔ رل بڑی خانم کا بہانہ کر کے رک گئی۔ بے شک قدرت نے اس کے باپ کی قاتلہ کو سزا دے دی تھی لیکن وہ اس کی تدفین میں شرکت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صمد بھی شام تک آ گیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد رل نے اسے زرینہ کی ڈائری دکھائی تو صمد سکتے میں رہ گیا۔ صرف آخری تحریر ہی نہیں بلکہ زرینہ نے کئی ایسی تحریریں پہلے بھی لکھی تھیں جن سے پتا چل رہا تھا کہ وہ سجاد اور اس کے خاندان سے شدید نفرت کرتی تھی اور صرف انتقام لینے کے لیے یہاں رکی ہوئی تھی۔ جب گیارہ اگست بدھ کے دن حویلی کا کوئی فرد دنیا سے رخصت ہوتا تو زرینہ اپنے کمرے میں خوشی سے رقص کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ رخسانہ کی روح اسے کچھ نہیں کہے گی کیونکہ اس کا تعلق اس خاندان سے براہِ راست نہیں تھا۔ اگر اسے بھی خطرہ تھا تو وہ انتقام کی خاطر اسے مول لینے کو تیار تھی۔ پوری ڈائری دیکھ کر صمد نے گہری سانس لی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ چھوٹی خانم ایسی نکلیں گی۔"

"نا تمام آرزوئیں اور انتقام کی خواہش انسان کو اس مقام تک لے جاتی ہے جس کے بارے میں اس نے کبھی خود بھی نہیں سوچا ہوتا۔" رل نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہر حال ان کی موت کے ساتھ ہی یہ معاملہ بھی ختم ہو گیا ہے۔"

"یعنی اب اسے کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے؟"

"ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔ ممکن ہے صرف زرینہ ملوث ہو۔ اس صورت میں بات کھلی تو بلا وجہ دلوں میں کدورتیں آ جائیں گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" صمد نے اس کی تائید کی اور ڈائری نشست گاہ کے آتش دان کی بھڑکتی آگ میں ڈال دی۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں گیارہ اگست کے آسیب سے بھی نجات مل گئی ہے۔"

"شاید۔" رل بولی۔ "رخسانہ کی روح مرنے کے بعد بے چین تھی کہ کوئی تو اس کے حق میں بولے، اس پر ہونے والے ظلم کو روکے۔"

"تم نے یہ کام کر دکھایا۔" صمد نے پُر ستائش لہجے میں کہا۔ "مجھے تم پر فخر ہے اور اس حویلی میں رہنے والوں پر افسوس ہے۔ اگر وہ ذرا سی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے تو آج یہ حویلی آباد ہوتی۔"

"حویلی اب بھی آباد ہو سکتی ہے۔" رل بولی۔ "آپ کو اب شادی کر لینی چاہیے۔"

"میں تیار ہوں۔" صمد نے کہا۔ "بشرطیکہ وہ لڑکی بھی مان جائے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟" رل نے انجان بن کر کہا ورنہ صمد کی آنکھوں سے صاف جھلک رہا تھا۔ "اور وہ کیوں نہیں مانے گی؟"

"ہے ایک لڑکی جو یہاں سے بہت دور جانا چاہتی ہے۔"

"اگر کوئی اسے نہ روکے تو اسے جانا ہی ہوگا۔"

صمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اور اگر میں اس سے کہوں کہ ہمیشہ کے لیے یہاں رک جائے تب۔۔۔؟"

رل نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے پر بکھرتے رنگوں نے صمد کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

⌘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk